ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

ڈاکٹر رفیق زکریا

www.KitaboSunnat.com

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

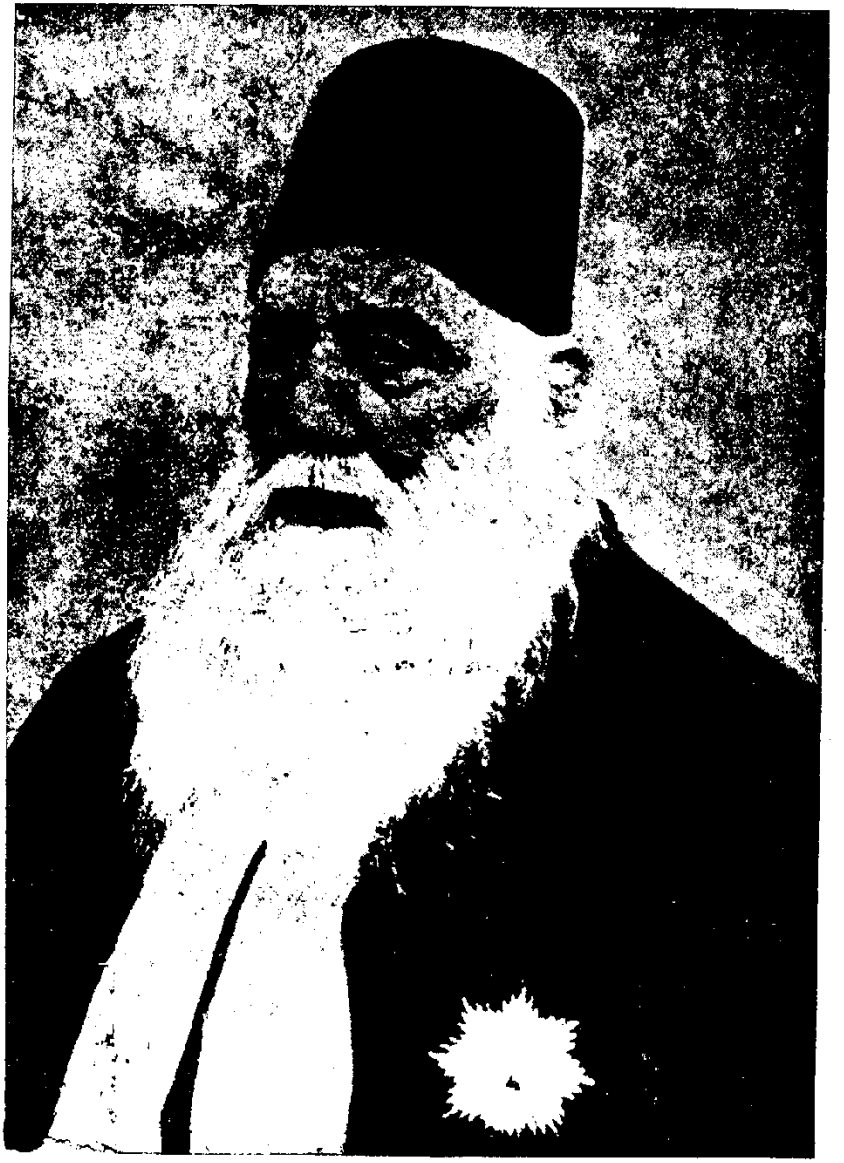

Allama Iqbal

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

24633

ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

1885 تا 1906 کے سیاسی حالات کا تجزیہ

Indian Council of Historical Research
LIBRARY

مصنف:
ڈاکٹر رفیق زکریا

مترجم:
ڈاکٹر ثاقب انور

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔ 110066

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Hindustani Siyasat Mein
Musalmano Ka Urooj
By Dr. Rafiq Zakaria

© قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1985

دوسرا اڈیشن : 2003 تعداد 1100

قیمت : -/134

سلسلۂ مطبوعات: 500

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ ا، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

طابع : [illegible] نئی دہلی۔ 110016

احکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

24633

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقہ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتساب

اُن نوجوان نسلوں کے نام جن کا ماضی سے کوئی
واسطہ نہیں رہا لیکن جو اپنے مستقبل کی جانب پُرامید
نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

رفیق زکریا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیباچہ

ڈاکٹر رفیق زکریا کی کتاب "ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج"، ہمیں ایک ایسی گہری بصیرت سے روشناس کراتی ہے جس کی روشنی میں ہم اُن عوامل کا بخوبی جایزہ لے سکتے ہیں جنھوں نے 1906ء سے قبل کے بیس برسوں میں مسلم سیاست کو اس کے ابتدائی تشکیلی دور نے متاثر بھی کیا اور قومی سیاسی دھارے میں مسلمانوں کے عملی اشتراک کا رخ بھی متعین کیا ماضی کی جانب اگر طایرانہ نظر دوڑائی جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جدوجہد آزادی کے دوران ملّتِ اسلامیہ کے عملی تعاون کی خوبیوں اور خامیوں کے لیے جو عوامل ذمہ دار تھے ان میں سے اکثر وہی تھے جن پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ویسے ایک لحاظ سے ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ کا ہم سے اس قدر قریب ہے کہ شاید ہم اُسے اس کے اپنے مناسب تناظر میں رکھتے ہوئے سمجھ نہ پائیں۔ تاہم اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے ملک پر برطانوی تسلط کے آخری مراحل کی تاریخ کا از سرِ نو جایزہ لیتے ہوئے بعض بنیادی مسائل کو مناسب طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ کون سے واقعات ہوتے ہیں جو اقلیتوں میں سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں نمایاں کردار انجام دیتے ہیں اور ماضی میں ایسے واقعات کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور متصل رہے ہیں؟ کیا اس دور کی قیادت واقعتاً اس بات کی اہلیت رکھتی تھی کہ ملّت کی رہنمائی کے اُس فرض کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکے جو اس کے کاندھوں پر آن پڑا تھا؟ مختلف فرقوں کے مابین ایک دوسرے کے تعلق سے مختلف توقعات اور خدشات سے متاثر ہوئے؟ ہماری جدوجہد آزادی کے تشکیلی مدارج کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم ان مسایل کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں۔ اس قسم کے مطالعے ہمیں ان مسایل کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حل میں بھی بے حد مدد دیں گے جن کا عملاً آج ہمیں سامنا ہے۔

میرے خیال میں چار فیصلہ کُن عوامل ایسے ہیں جنھوں نے اُس دَور کی ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کے کردار کو بے حد متاثر کیا جس کا احاطہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ مذکورہ عناصر اس طرح ہیں (ا) مسلم قوم میں پائی جانے والی قیادت کی نوعیت (ب) تعلیمی ترقی کے میدان میں جو مواقع ہندوؤں اور مسلمانوں کو حاصل تھے ان کو استعمال کرنے میں دونوں قوموں کے مابین کیا فرق رہا؟ (ج) من حیث القوم مسلمانوں نے اپنے سماجی ڈھانچے میں کس تیز رفتاری سے اصلاح قبول کی اور اس اصلاح کا رُخ کس جانب رہا؟ اور (د) فرقہ وارانہ تنازعات کا اثر ملّتِ اسلامیہ پر کیا پڑا؟ زیرِ نظر کتاب میں ان امور پر اس عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ قارئین کے لیے مختلف مسایل کا سمجھنا آسان ہوگیا ہے۔

قایدانہ عظمت کو جانچنے کا چاہے کوئی پیمانہ مقرر کر لیجیے، ہر اعتبار سے ہمیں سرسید احمد خاں کو ایک عظیم رہنما تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کتاب میں سرسید کی تحریک کے اغراض و مقاصد اور اُس کی کامیابی کا تفصیلی جایزہ لیا گیا ہے۔ سرسید نے مسلم قوم کی سب سے بڑی خدمت اس طرح انجام دی کہ اُسے جدید علوم کے انقلاب آفریں تصورات اور نظریات سے روشناس کراتے ہوئے ماضی پرستی کے دروں بینی سے نجات دلائی۔ سرسید کے شانہ بہ شانہ ہندو قوم کے مصلحین بھی اپنی قوم کی اسی قسم کی اصلاحات میں مصروف تھے۔ اس کتاب کے فاضل مصنف نے ان مختلف علوم کا جایزہ بڑی عمدگی سے لیا ہے جو اُن دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں علیحدہ مقبول ہوتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا جایزہ بھی لیا ہے کہ انتخابِ علوم کے اس فرق کی وجہ سے کون کون سے نتایج مترتب ہوئے۔ جن کی روشنی میں دونوں قوموں نے اُس عہد کے سماجی اور سیاسی مسایل کو جداگانہ انداز میں حل کرنے کی کوشش کی۔ اندازِ فکر کا یہ فرق اس بات کا متقاضی تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین غیر معمولی غلط فہمیاں پروان چڑھیں۔ چنانچہ بدیسی حکمرانوں نے ان غلط فہمیوں کا جی کھول کر استحصال کیا، کیوں کہ ان کے نقطۂ نظر سے ایسا کرنا ہی ان کے عین مفاد میں تھا۔ اس قسم کی غلط فہمیوں اور عدم اعتماد کو پیدا ہونے سے موثر طور پر روکا جا سکتا تھا بشرطیکہ دونوں قوموں کو ایسی تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی جو حقیقی معنوں میں جدید ہونے کے ساتھ ہی ساتھ گروہی عصبیت سے پاک ہوتی اور دونوں قوموں کو حریت پسند بنانے میں ممد و معاون بھی ثابت ہوتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر ذکریا نے متعدد ماخذات سے اعداد و شمار فراہم کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح اس دور کے مسلمان ملازمتوں اور تعلیم کے میدان میں اپنی ہمسایہ قوم سے پچھڑ گئے تھے اور شرکتی اداروں میں انھیں کس طرح ان کی تعداد کی بہ نسبت کم نمایندگی ملا کرتی تھی ۔ مسلمانوں کے بعض رہنما اس فرق کو جداگانہ انتخابات یا خصوصی مراعات کے ذریعے مٹانا چاہتے تھے لیکن ان دونوں ان طریقوں کو اپنا کر دونوں کے درمیان خلیج کو پاٹنا ممکن نہ ہو سکا کیونکہ انھیں روبہ عمل لا کر مسلمانوں کے علاحدگی پسند رجحانات کو تقویت پہنچائی گئی جب کہ اس وقت کے تقاضے کے تحت مسلمان بھی حصولِ آزادی کے وسیع تر مقصد کی خاطر دیگر تمام اقوام کے ساتھ مل کر بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ اس کتاب کے فاضل مصنف نے بڑی عمدگی سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ گو اس قسم کے علاحدگی پسندی کے رجحان میں ابتداءً بڑی دل کشی محسوس ہوئی لیکن اسی رجحان نے آگے چل کر ہندستانی قوم کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کر ڈالا اور نتیجتاً مسلمان قومی دھارے سے کٹ کر رہ گئے ۔ فاضل مصنف اس درست نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گو "اس قسم کے علاحدگی پسند رجحان کی بدولت مسلمانوں کو یہاں وہاں تھوڑے بہت وقتی فوایدِ ضرور حاصل ہوئے لیکن مکمل تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس طرح مسلمانوں کو فایدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا"۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں سماجی اصلاح کا کام کرنے والی قوتیں گذشتہ صدی کے آخری نصف حصے میں زیادہ موثر کردار نبھانے لگی تھیں ۔ دونوں ہی قوموں کے رجعت پسند حلقوں میں ان اصلاح پسند تحریکوں کی کم و بیش مخالفت ہی کی گئی ۔ حالانکہ ان اصلاحی قوتوں کو اگر زیادہ کامیابی مل پاتی تو دونوں ہی قومیں بیرونی حکمرانوں کے مقابل زیادہ موثر طور پر صف آرا ہو سکتی تھیں ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں جیسی قدیم قوموں میں سماجی اصلاح کرنا ایک سست رَو عمل Slow Process ہے جسے عملی حقایق کی روشنی میں جانچا جانا چاہیے ۔ یہی وہ کٹھن مرحلہ ہوتا ہے جس میں قیادت کا امتحان مضمر ہوتا ہے ۔ تاہم ہمیں یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ مصلحین کو اپنی اپنی قوموں میں نمایاں کامیابیاں ضرور حاصل ہوئیں ۔ ان کامیابیوں کا تناسب البتہ دونوں قوموں میں مختلف رہا۔

انھیں عوامل کی بنا پر ان دو دہائیوں کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پایا جانے والا سماجی فاصلہ بڑھتا ہی رہا جو وقتاً فوقتاً دونوں کے مابین فرقہ وارانہ تنازعات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا باعث بھی بنا۔ یہاں اس قسم کے فرقہ وارانہ تنازعات کی معلوم علتوں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مثلاً جھوٹی خبریں اور مبالغہ آمیز افواہیں، معاشی مواقع کے سلسلے میں پیدا ہونے والے تلخ جذبات جو مذہبی جنون کی شکل اختیار کر لیتے تھے، اور مذہبی احیا پسندی پر مبنی سیاست گذشتہ صدی کے اختتام پر پائے جانے والے یہ سبھی رجحانات کسی حد تک آج بھی موجود ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کی تحقیقات کرنے والے مختلف کمیشنوں کی رپورٹوں سے صاف ظاہر ہے کہ آج بھی ان دونوں قوموں میں ایک دوسرے کے لیے عدم اعتماد اور جارحیت کے مخفی جذبات موجود ہیں جو بسا اوقات معمولی معمولی واقعات پر مشتعل ہو کر دھماکہ خیز صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ کتنی بڑی بدبختی ہے کہ آزادی کے 22 سال بعد بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف عدم اعتماد پایا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے خائف ہیں۔ دونوں قوموں کے درمیان پایا جانے والا مستقل فرقہ وارانہ تناؤ اور اس کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والے فرقہ وارانہ تصادمات ہی وہ زبردست خطرہ ہیں جن کا ہمیں آج سامنا ہے۔ ایک معنوں میں من حیث القوم ہماری بقا کا دارومدار ہی اس سوال پر ہے کہ ہم کس طرح اس خطرے کا مقابلہ کریں۔ محض انتظامی سطح پر ایسے تصادمات کو روکنے یا ختم کرانے سے ہی اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے بنیادی علاج کے لیے ہمیں مملکتی سطح پر ایسے شفا بخش نسخے تجویز کرنے ہوں گے جو مرض کی ان بنیادی وجوہات ہی کا خاتمہ کر سکیں جو خوف اور عدم اعتماد کو جنم دیتے ہیں اور تقویت پہنچاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس قسم کا فائدہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ یہ دونوں قوموں کے انداز فکر اور ردعمل کی گہری بصیرت حاصل کرنے اور ان کے درمیان پائے جانے والے علتی تاریخی رابطوں کو سمجھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

فرقہ وارانہ علاحدگی پسندی کے خلاف ہماری جنگ کی اساس بعض مضبوط بنیادی ایقانات پر رکھی جانی چاہیے۔ اولاً ہندستانی شہریت کی بنیاد کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے اس ملک میں ترجیحی شہریوں کے تصور کے پھلنے پھولنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں کوئی ذات، قوم یا نظریہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حب الوطنی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندستانی شہریت کی بنیاد مشترکہ حقوق اور مشترکہ فرایض کے نظریے پر قایم ہے۔ اس بنیادی نظریے میں ترمیم یا تبدیلی کرنے کی ہر کوشش کی بجائے خود دستور کے اصولوں سے انحراف کے مترادف قرار دی جائے گی۔ ثانیاً ملک کی معاشی ترقی اس طور پر ہونی چاہیے کہ اس کے فواید منصفانہ طور پر عوام کے ہر طبقے کو حاصل ہو سکیں اور ثالثاً قومی سطح پر فرقہ وارانہ سیاست کے خلاف ایک مضبوط سیاسی رائے عامہ استوار کی جانی چاہیے — بے شک ہمارے دستور کی اساس ایسے ہی اہم اصولوں پر رکھی گئی ہے۔

قوم کی تعمیر جیسے اہم مسایل کو سلجھانے کے لیے جن جن راہوں کو متعین کیا جانا ہے اُن کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف کئی تجویزیں سامنے آئیں گی لیکن ایسی کسی تجویز کو قبول کرنے سے پہلے ہمارے سامنے ایسے حقایق موجود ہونے چاہئیں جنھیں بڑی احتیاط کے ساتھ دستاویزی شکل میں جمع کر کے اور موزوں تناظر میں رکھ کر بے لاگ طور پر پیش کیا گیا ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب کامیابی کے ساتھ ان تمام معیارات پر پوری اُترتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر زکریا کی یہ کاوش نہ صرف اہلِ نظر سے ایسا خراجِ تحسین حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوگی جس کی کہ یہ مستحق ہے بلکہ کئی دوسرے محققین کو جدید تاریخ کے آئندہ ادوار کے اسی قسم کے تحقیقی مطالعے کی جانب راغب بھی کرے گی۔

وائی۔ بی۔ چوان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ اِس کتاب کے بارے میں

اس کتاب کی اساس اُس تحقیقی کام پر رکھی گئی ہے جو میں نے لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس تحقیق کی ابتدا ۱۹۴۷ء کے لندن میں "برنجوں" کی بارش کے تاریک ماحول میں پروفیسر لاسکی کے ساتھ بحث کے دوران ہوئی جو چوتھی دہائی میں ہندستانی طلبا کے لیے عظیم سرچشمۂ فیضان بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہی مجھے اس کام پر آمادہ کیا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ مجھے پروفیسر ایچ۔ ایچ۔ ڈوڈ ول جیسی شخصیت کی رہبری حاصل ہوگئی جو چھ جلدوں پر مشتمل کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کے مدیر تھے ـــــ اُنھی کے زیرِ نگرانی میں نے اپنے تحقیقی کام کی ابتدا کی۔ لیکن اُس کے تقریباً ایک سال بعد جب اُن کا انتقال ہوگیا تب میں نے پروفیسر (اب سر) سی۔ ایچ۔ فلپس سے رہنمائی حاصل کرنی شروع کی جو فی الحال لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے ڈائریکٹر ہیں۔ میرے مقالے کو ۱۹۴۹ء میں لندن یونیورسٹی نے ممتحنوں کے بورڈ کی سفارش پر منظور کرلیا۔ اس بورڈ میں مرحوم سر ریگی نالڈ کمپلینڈ جیسے مشہور مورخ جو ۱۹۴۲ء میں ہندستان آنے والے کرپس مشن Cripps Mission میں ایک رکن کی حیثیت سے شامل تھے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، ایک عظیم ماہر اقتصادیات اور لندن اسکول آف اکنامکس کی پروفیسر ڈاکٹر ویرا اینٹسی Dr. Vera Anstey اور میرے استاد پروفیسر فلپس شامل تھے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی پیدایش سے قبل مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس تحقیق کا مقصد یہی تھا کہ حقیقی صورتِ حال کا پتہ لگایا جائے۔

پہلے پہل تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُس دَور کی کتابوں اور سرکاری ریکارڈ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

24633

علاوہ شاید ہی مجھے کچھ اور تحقیقی مواد حاصل ہو سکے لیکن جب انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں میری نظر ڈھیروں پارلیمانی پرچوں، رپورٹوں، روئیدادوں یا مختلف تنظیموں کے کتابچوں اور پمفلٹوں پر پڑی تو حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مجھے اخباروں اور رسالوں سے بھی بے حد مدد ملی۔ اُن دنوں اخبارات تقریروں اور بیانوں کے خلاصے شایع نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اُنھیں جوں کا توں نقل کیا جاتا تھا۔ رسالوں اور مجلّوں کے لیے مضامین لکھتے وقت مضمون نگار حتی الامکان جامعیت اور اکثر قطعیت کا خیال رکھتے تھے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے جہاں ایک جانب میرا کام آسان ہو گیا وہیں دوسری جانب سخت محنت طلب بن گیا۔

یہ کتاب من وعن اس مقالے جیسی نہیں ہے جسے میں نے لندن یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کتاب کا مواد وہی ہے تاہم اسے جس انداز میں یہاں پیش کیا جا رہا ہے اس کے باعث وہی مواد عام قارئین کے لیے نہایت ہی سلیس اور قابلِ فہم بن گیا ہے۔ اس کتاب میں اوّل سے آخر تک میری یہی کوشش رہی ہے کہ میں اُس تشکیلی عہد کے دوران ہندستانی سیاست میں پائے جانے والے موافق اور مخالف رجحانات کا معروضی اور بے لاگ تجزیہ پیش کر سکوں۔ جو ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی پیدایش کے ساتھ شروع ہو کر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ اکیس سالہ دور ہے جسے جدید ہندستانی تاریخ کا سب سے نازک دور قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ اب پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مسلم "قومیت" کے نظریے کے بانی سرسید تھے نہ کہ مسٹر جناح۔ کیوں کہ اس برِصغیر کی تقسیم کی موافقت میں مسٹر جناح نے جو بھی دلایل پیش کیے وہ نہ صرف یہ کہ من وعن وہی تھے جو سرسید نے کانگریس کی مخالفت کرتے ہوئے پیش کیے تھے بلکہ آخر الذکر کی تقاریر سے نقل کیے گئے تھے حتیٰ کہ مسٹر جناح نے جو الفاظ استعمال کیے تھے وہ بھی اکثر وہی تھے جنھیں سرسید نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کیا تھا۔ مزید برآں اُن تمام قضیات اور تنازعات کی ابتدا بھی اُسی زیرِ تبصرہ دور (۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۶ء) میں ہوئی جن کے بادل ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندستانی سیاست کے مطلع پر چھائے رہے۔ کیا یہ ایک عجیب بات نہیں ہے کہ برطانیہ کے خلاف کی جانے والی جدوجہد کی نصف صدی سے زیادہ مدت کے دوران ان قضیوں کا حل دریافت کرنے کے ضمن میں بہت ہی کم پیش رفت ہو پائی؟ اس عرصے میں پائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانے والے تنازعات اور قضیوں نے ہمیں برطانوی عہد کے خاتمے تک پریشان رکھا اس کی قیمت ہمیں ہندستان کی تقسیم کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ لیکن اس غیر معمولی قیمت کے ادا کرنے پر بھی مسلے کا حل برآمد نہ ہوسکا بلکہ اس کی وجہ سے ہماری تلخیوں میں اور اضافہ ہوگیا۔

دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکنے کے بعد بھی، ہندستان ہو یا پاکستان، ہر جگہ کے دونوں مذہبی گروہ آج تک آپسی تعلقات میں مکمل ہم آہنگی پیدا نہیں کر پائے ہیں۔ میرے خیال میں پاکستان کی تخلیق کی وجہ سے پرانے جھگڑے کو ایک نئی جہت حاصل ہوگئی ہے اس کتاب کی وجہ سے دونوں قوموں کے مابین پائے جانے والے شکوک وشبہات اور ڈر اور خوف میں اگر تھوڑی سی بھی کمی واقع ہوگئی اور اگر ان میں ایک دوسرے کے لیے مفاہمت کا تھوڑا سا جذبہ بھی پیدا ہوگیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری اس ناچیز سعی کا انعام مجھے حاصل ہوگیا۔

آنجہانی مسٹر وائی۔ بی۔ چوان کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ غیر مبہم الفاظ میں فرقہ واریت کو بے نقاب کیا ہے بلکہ ان کی ذات سیکولرازم کے حق میں کیے جانے والے جہاد کے دوران حکومت کے لیے قوت اور توانائی کا سرچشمہ بنی رہی ہے دراصل وہ ایک دانشور ہیں جو سیاست کے میدان میں آگئے ہیں۔ اُن کے نظریات پُرمغز ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس وجہ سے بھی ہماری توجہ اور احترام کے لائق ہیں۔

آخر میں، پروفیسر سی۔ ایچ۔ فلپس کی خدمت میں ہدیۂ ممنونیت پیش کرنا چاہوں گا جن کی نگرانی اور رہنمائی میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

رفیق زکریا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیباچہ

طبع دوم (انگریزی)

اپنی اشاعت کے ایک سال سے کم عرصے میں **ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج** کی تمام جلدیں فروخت ہوگئیں۔ چنانچہ اب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شایع کیا جارہا ہے۔ اس کتاب کی قیمت Rs 45/- اور اس کے بھاری بھرکم مواد کے باوجود مختلف اداروں اور باذوق قارئین نے اس کتاب کی جس گرمجوشی کے ساتھ پذیرائی کی اُسے دیکھ کر اظہارِ ممنونیت کیے بغیر نہیں رہ سکتا مؤرخوں اور نقادوں نے بھی اس کتاب کو بے حد پسند کیا ہے۔ اُن کی رائے زنی اور تبصروں نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اُن میں سے چند حضرات نے تو اس کتاب کا اس قدر باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا کہ اُن بعض غلطیوں اور تناقضات کی نشاندہی بھی کرڈالی جو کتاب میں در آئی تھیں۔ میں نے اس ایڈیشن میں مناسب مقامات پر انھیں درست کردیا ہے۔ میں اپنے ایسے تمام محسنوں کا بے حد مشکور ہوں۔

ابتدا ہی سے اس کتاب کی اشاعت میں سومیا پبلی کیشنز کے مینجنگ ڈایرکٹر مسٹر کے۔ آر۔ سامنت نے گہری شخصی دلچسپی لی ہے۔ ان کا شدید اصرار رہا کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن جلد از جلد شایع ہوجانا چاہیے۔ میری ایما پر وہ اس کتاب کی قیمت کو گھٹانے پر بھی راضی ہوگئے، حالانکہ یہ دوسرا ایڈیشن ان قدیم تصاویر سے مزین ہے جن کی بازآفرینی اتنا آسان کام نہیں تھا۔ تب بھی انھوں نے نہایت ہی عمدگی سے اپنے کام کی تکمیل کرلی ہے۔ بلاشبہ میں ان کے اس تعاون کے لیے اُن کا بے حد ممنون ہوں۔

رفیق زکریا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

مضامین	صفحہ
دیباچہ	5
کچھ اس کتاب کے بارے میں	10
دیباچہ طبع دوم	13
پس منظر	17
سیاسی سرگرمیاں	75
دستوری ارتقا	164
انتظامی اصلاحات	213
انگریزی تعلیم کے اثرات	249
پریس کا کردار	292
مذہبی اور سماجی اصلاحات	325
معاشی تبدیلیاں	363
فرقہ وارانہ تنازعات	381
قیادت کی خصوصیات	425
نتائج	481
ضمیمے	502
(ا) ہندستان میں ۱۸۷۷ء، ۱۸۷۸ء، ۱۸۷۹ء	502

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ۱۹۷۱ء کے دوران ایسی آسامیوں کی تعداد بتلانے والا
گوشوارہ جن کا مشاہرہ Rs 150/- یعنی ڈیڑھ سو روپیہ سے کم نہ ہو۔

(ب)۔ دی یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے اصول وضوابط 504
مع مکتوبات سرپرستان و فہرست ملحقہ اسلامی ادارہ جات۔

(ج)۔ مغربی تعلیم کی حمایت میں : از سرسید 514

(د)۔ انڈین نیشنل کانگریس کی دستوری تجاویز کے بارے میں 519
دارالعوام میں مسلم عرضداشت۔

(ہ)۔ بالائی ہند کی محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن کے 524
اصول وضوابط

(و)۔ سپاس نامہ وفدِ اسلامی مع اسمائے اراکین اور لارڈ منٹو کی 527
جانب سے دیا گیا اس سپاس نامے کا جواب۔

(ز)۔ مسلم آل انڈیا کنفیڈرسی : نواب ڈھاکا کا منصوبہ۔ 545

کتابیات 549

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلا باب

پس منظر

1857-1885

مسلمان ہندستان میں اُس وقت سے بستے آئے ہیں جب 712ء میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تھا۔ ابتداً ان کی تعداد تھوڑی تھی لیکن رفتہ رفتہ اُنھوں نے اس ملک میں کافی قوت حاصل کر لی۔ ان کی فتوحات اور سلطنتوں نے ہندستانی تاریخ کے دھارے کو متاثر کیا۔ اِسی طرح ان کی تہذیب و ثقافت بھی کافی حد تک موثر ثابت ہوئی۔ انھوں نے ہندستانی زندگی کو نئی تازگی اور توانائی عطا کی۔ انھوں نے اِس ملک کے فکری خزانوں کو بھی مالا مال کیا۔ لیکن مغلوں کے زوال کے بعد ہندستانی مسلمان ایک فعّال قوت کی شکل میں اپنی حیثیت برقرار نہ رکھ سکے۔ اُنھوں نے اپنے اسلاف کی حکمرانی کی پُرشکوہ داستانوں پر ضرورت سے زیادہ تکیہ کرنا شروع کر دیا اور نتیجتاً مجہولیت اور زوال پذیری کا شکار ہو گئے۔ اگرچہ سلطنت مغلیہ کے کھنڈرات اور بکھرے ہوئے شیرازے سے چند چھوٹی موٹی مسلم ریاستیں اُبھریں لیکن اُن کے پاس مسلمانوں کے لیے کوئی تعمیری لائحہ عمل موجود نہیں تھا۔ مسلمان اپنا سیاسی اقتدار تو کھو ہی چکے تھے ساتھ ہی انھوں نے اس ملک میں بھرپور زندگی گزارنے کی تڑپ بھی کھو دی۔ فرقہر (FARQUHAR) جب یہ کہتا ہے تو شاید غلط نہیں کہتا: "تمام قوم (مغلیہ) سلطنت کے ساتھ ہی غرق ہو گئی"۔

یہ جانچنے کے لیے کہ انحطاط کس سرعت کے ساتھ مسلمانوں میں پھیلا مغل شہنشاہ شاہ عالم کا بذاتِ خود لکھا ہوا وہ فارسی مرثیہ پڑھیے جو اُس نے 1788ء میں اُس وقت لکھا تھا جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُس کی بینائی چھین لی گئی تھی۔ اُس مرثیے کے چند اشعار کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے

"اے بادشاہ، وہ بھی کیا زمانہ تھا جب تو اقتدارِ اعلیٰ کی خلعت زیب تن کیے رہتا تھا۔ ساری دنیا کے کان تیری آواز پر جمے رہتے تھے اور مختلف قومیں تیری باتوں کو سُن کر صدائے آفریں بلند کیا کرتی تھیں۔ مگر اب۔ حیف سب کچھ اُلٹا ہے۔ کیوں کہ زر و جواہر کے لالچی فریبی غداروں نے تیرے تخت اور تیری سلطنت کو دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔

لیکن اے میری بے تاب روح! صبر کر اور پیچ و تاب سے اجتناب کر کہ ایسا کرنا تیرے شایانِ شان نہیں۔ وقار کے ساتھ تخت و تاج اور بینائی سے محرومی کے صدمے کو برداشت کرنا سیکھ۔ یہ جان لے کہ تکبّرِ شاہانہ اور اوجِ ثریا تک پہنچانے والے اقتدار کی اصل حقیقت ایک لمحاتی طمطراق سے بڑھ کر کچھ اور نہیں"[2]

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے قریباً ایک سو سال بعد تک مسلمانوں پر اِسی قسم کا انحطاطی جذبہ طاری رہا۔ اِس دوران وہ احساسِ محکومی کی آگ میں جھلستے رہے۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھار مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی چنگاریاں بھڑک اُٹھتی رہیں کیوں کہ انھوں نے ہندستان میں مسلمانوں کے اقتدار کو ہڑپ لیا تھا۔ لیکن اُن وقتی شورشوں کی وجہ سے حالات اور بھی ابتر ہوتے گئے۔ بقول سلیمنؔ "زیادہ تر مسلمان ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر" قدیم اسلامی دورِ حکومت کی واپسی کے خواب[3] اِس لیے نہیں دیکھتے کہ اُنھیں آلِ تیمور سے کوئی غیر معمولی لگاؤ ہے بلکہ اِس لیے کہ "اس طرح اُنھیں پھر سے منصب اور عہدے حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا کیوں کہ اِس ملک میں منصب کا حصول ہی سب کچھ ہے"[4]

لیکن یہ صرف عہدوں کی خواہش نہیں تھی جس نے مسلمانوں کو اپنے شاندار دورِ حکمرانی کی یادوں میں مگن رکھا تھا بلکہ اُنھیں اِس بات کا بھی یقینِ واثق تھا کہ صرف وہی اِس ملک میں طبقۂ امراء سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشہور مصنف سلیمن (1835-37) میں ہندستان کا دورہ کرتے ہوئے جہاں کہیں پہنچا اُس نے وہاں مسلمانوں میں برتری کے احساس کو اِس شدت سے موجود پایا کہ اُس کے لیے مسلمانوں کو یہ سمجھانا مشکل ہو گیا کہ اس ملک میں اہلِ برطانیہ کی بالادستی قایم ہو چکنے کے بعد اُن کی پُرانی حیثیت برقرار نہیں رہی۔ قطع نظر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اِس سے کہ عہدِ مغلیہ میں کبھی واقعتاً ان کے آباواجداد کا تعلق طبقۂ اُمراء سے رہا ہو یا نہ رہا ہو، وہ انحطاط کا ہر مسلمان اِس خوش گمانی میں مبتلا رہا اور اپنی اولاد کو بھی اس خوش گمانی میں مبتلا کرتا رہا اور اس کا اور اس کے اہلِ خاندان کا تعلق طبقۂ خواص سے رہا ہے۔ سلیمن نے اس رجحان کو "ایک نہایت عام قسم کی معصومانہ خود بینی قرار دیا ہے۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے:

"ہمیں ہندستان اور دیگر نوآبادیات میں ایسے انگریز مل جاتے ہیں جو بلند بانگ قدامت پسندانہ (TORY) خیالات اور جذبات کا اظہار محض یہ تاثر دلانے کے لیے کرتے رہتے ہیں کہ اُن کے اہلِ خاندان طبقۂ اُمراء سے متعلق ہیں یا تھے۔" 5

غیر ملکیوں کے زیرِ تسلط رہتے ہوئے اِس قسم کا رجحان مسلمانوں کے لیے سود مند ثابت نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ اِس کے برخلاف ان کی انحطاط پذیری میں اس رجحان کے باعث مزید اضافہ ہو گیا۔ تاہم 1857ء کے ہنگامے میں مسلمانوں نے اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بازیافت کی بھرپور کوشش کی لیکن اِس بار اُنھوں نے بالکل ہی مختلف قسم کے حالات میں ایک انوکھا کردار نبھانے کی کوشش کی۔

اس باب میں راقم الحروف نے مسلمانوں کی مراجعت اور اس کے نتائج کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے جس کا مقصد اوّل تو یہ معلوم کرنا ہے کہ مسلمانوں پر انگریزوں کی مسلط کردہ انتظامی اور سماجی تبدیلیوں کا کیا اثر مترتب ہوا؟۔ دوم یہ کہ مسلمانوں نے ان تبدیلیوں پر کس قسم کے ردِّ عمل کا اظہار کیا؟ اور سوم یہ کہ من حیث القوم مسلمانوں نے اپنے آپ کو بدلے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے کیا عملی رویہ اختیار کیا؟۔

یہ بات ایک مسلم الثبوت حقیقت کے طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ ہندستان میں اپنی بالادستی کے ابتدائی دور ہی سے انگریزوں نے مسلمانوں کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا۔ نئے حکمراں اپنے اقتدار کے ابتدائی ایّام کی فطری امید شکستگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی بجا لیکن اکثر بے جا طور پر خواہ مخواہ ہی مسلمانوں پر اس بارے میں شک کرنے لگے تھے کہ کہیں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو زیخ دین سے اُکھاڑ پھینکنے کی سازشوں میں مصروف نہ ہوں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کئی اعلیٰ ترین منتظمین نے مسلمانوں کو دولتِ برطانیہ کے مقبوضہ علاقوں کے لیے انتہائی خطرناک افراد قرار دیا تھا اور بعض انگریز عہدیدار تو مسلمانوں سے ایک قسم کی کراہیت محسوس کرنے لگے تھے۔ رابرٹ کلائیو نے لارنس سلیون کو 30 دسمبر 1758ء کو جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خط لکھا تھا اس میں وہ لکھتا ہے " یہ کوتاہ ذہن اور بدطینت مسلمان بذبۂ احسان مندی سے بالکل عاری ہیں ۔ انھوں نے ایک ایسا سیاسی طریقہ اپنا رکھا ہے جو اس ملک کے سوا اور کہیں نہیں پایا جاتا یعنی جو چاہو کر گزرو ۔ طاقت کے ذریعے نہیں بلکہ دھوکے دہی کے ذریعے "[6]

کلائیو کے دور سے لارڈ ہیسٹنگز کے دور تک پچاس سال سے زیادہ مدت کا طویل وقفہ گزرا جس کے دوران برطانوی تسلط میں توسیع کے ساتھ ہی ساتھ استحکام بھی پیدا ہوا ۔ تاہم اس طویل عرصے میں بھی مسلمانوں کے خلاف پائے جانے والے شکوک اور شبہات بدستور قایم رہے حتیٰ کہ ہیبر HEBER جیسا شخص جو مسلمانوں کے کردار اور تہذیب کے بارے میں رطب اللسان ہے[7] لکھتا ہے : " جوں ہی کوئی مناسب موقع ہاتھ لگے مسلمان بطور خاص ہمارے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے "[8] وہ اس صورتِ حال کے لیے ہیسٹنگز کے اُس برتاؤ کو موردِ الزام گردانتا ہے جو اس نے دہلی کے قدیم شہنشاہ اور اودھ کے بادشاہ کے ساتھ روا رکھا تھا[9] حالانکہ ہیسٹنگز کا برتاؤ اتنا ہی بُرا تھا جتنا کہ اوروں کا ۔ چناں چہ اس کے جانشین لارڈ ایمہرسٹ LORD AMHERST کا رویہ بھی کوئی ٹھیک نہیں رہا ۔ بہ حیثیت مجموعی فرنگیوں نے مسلمانوں اور ان کے حکمرانوں کے بارے میں ایک ایسا رویہ اختیار کر رکھا تھا جو ان کی نمائندگی کرتا تھا ۔ چناں چہ ہنری مارٹن نے اس رویے کو خالص نصرانیت کا رنگ دینا چاہا جب اُس نے رُوحانی کرب کے عالم میں لکھا : " فطرتِ انسانی جب اپنی اسفل ترین شکل میں نمودار ہونا چاہتی ہے تو ایک مسلمان کا روپ دھار لیتی ہے " وہ دعا کرتا ہے : " میں قیامت کے دن اس حال میں کیوں نہ اُٹھایا جاؤں (جس سے یہ ثابت ہو جائے) کہ میں اپنی دنیوی زندگی میں اُن لوگوں (مسلمانوں) پر ترس کھاتا رہا ' ان کے لیے دعا میں کرتا رہا جنھیں میدانِ حشر میں بربادی اور سرزنش کا سامنا کرنا ہوگا "[10]

مسلم بیزاری کا یہ رجحان ۱۸۴۲ء میں اُس وقت نقطۂ عروج پر پہنچ گیا جب لارڈ ایلن برو LORD ELLEN BOROUGH نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا ۔ موصوف نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی نفرت کو کبھی مخفی رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی ۔ مثال کے طور پر سومنات کے مندر کے دروازوں کی تجدید

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے موقعے پر، جسے محمود غزنوی نے تاراج کر دیا تھا، گورنر جنرل موصوف نے ہندو راجاؤں اور سرداروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: "آج بالآخر آٹھ سو سالہ پرانی بے عزتی کا بدلہ لے لیا گیا۔"[11] صاحبِ موصوف کا خطبہ کچھ اس قسم کی جذباتیت آمیز ڈرامائی اصطلاحوں سے بھرا ہوا تھا کہ ڈیوک آف ویلنگٹن نے اسے "فتح کا نغمہ"[12] قرار دیا تھا۔ ایلن برو کی خواہش یہ بھی تھی کہ مغل شہنشاہ اور اُس کے افراد خاندان شاہی محل کی سکونت ترک کر دیں اور اپنے القاب، خطابات اور مُراعات سے دست بردار ہو جائیں تاکہ ان چیزوں کو ملکۂ برطانیہ کے نام کے ساتھ منسوب کیا جا سکے جس کے بعد وہ "بادشاہِ غازی"[13] کہلا سکیں۔ موصوف کے خیال میں "دونوں مذاہب کے مابین توازن برقرار رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں کا دماغ درست کیا جائے۔"[14] اُن دنوں گورنر جنرل کے لیے ہر کسی کا دماغ درست کرنا بڑا ہی آسان کام تھا چاہے اُس کے پیچھے کچھ ہی مقصد کیوں نہ ہو۔

اِسی طرح لارڈ ڈلہوزی کا رویہ بھی ہندستانی مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ رہا حالاں کہ اس شخص نے ہندستان میں برطانوی نظم و نسق کے انصرام میں فیصلہ کُن کردار نبھایا ہے۔ 18 اگست 1853ء کو اُس نے اپنے ایک دوست کو جو خانگی خط لکھا تھا اس کے حسبِ ذیل اہم پیراگراف میں ڈلہوزی نے کھل کر اپنی مخصوص ذہنیت کا اظہار کیا ہے:

> اودھ کا بادشاہ خردماغی کی جانب مائل نظر آتا ہے۔ میں چاہتا بھی یہی ہوں کہ ایسا ہی ہو۔ اپنی روانگی سے پہلے اُسے ہضم کر پانا میرے لیے بڑی طمانیت کا باعث ہوگا۔ دلی کا بوڑھا بادشاہ اپنی موت آپ مر رہا ہے۔ اگر کورٹ آف ڈائریکٹرس کی فرسودہ حماقت آڑے نہ آتی تو میں کبھی کا اُس کھوسٹ کے ساتھ ہی خاندان تیموریہ کا خاتمہ کر چکا ہوتا۔[15]

اُس دور میں مسلمانوں کے بارے میں اہلِ برطانیہ جس قسم کے خیالات اور جذبات رکھتے تھے ان کا اظہار کسی نے اتنے بہتر پیرائے میں نہیں کیا جتنا فرینڈ آف انڈیا نامی اخبار کے اُس اداریے میں کیا گیا ہے جس کا عنوان تھا "پلاسی کی صد سالہ تقریب"۔ آگے چل کر اس اخبار کا نام تبدیل ہو کر (اسٹیٹسمین) ہو گیا۔ یہ اداریہ 1857ء میں عین بغاوت کے موقعے پر قلمبند کیا گیا تھا:

> کسی قوم کے خلاف اگر اس قسم کے الزامات عاید کیے جائیں کہ اس نے کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری قوم کو مکمل طور پر روند ڈالا ہے یا یہ کہ اُس نے کسی ایسی تخلیق کا بچپن ہی میں گلا گھونٹ دیا ہے جو آگے چل کر اپنے عہد کی سب سے حسین تخلیق ثابت ہوتی تو اس قسم کے الزامات کو یقیناً سنگین کہا جائے گا۔ ہمارے اہلِ وطن کے خلاف صرف ایک سکھوں کے معاملے کو چھوڑ کر دوسری کسی قوم کے بارے میں اس قسم کے سنگین الزامات عاید نہیں کیے جا سکتے۔ مسلمانوں کا اقتدار جنگ پلاسی سے بہت پہلے کمزور ہو چکا تھا اور کلائیو کو سراج الدولہ کے زمانے میں جس قسم کے مسلمانوں سے سابقہ پڑا تھا ہمیں بھی اُسی قسم کے مسلمانوں سے اودھ کے معزول شدہ بادشاہ کے زمانے میں واسطہ پڑا۔ بے رحم، نفس پرست اور غیر روادار مسلمان نہ تو حکمرانی کے لیے موزوں ہیں نہ ہی محکوم بننا چاہتے ہیں، وہ اقتدار کو خداداد حق کے طور پر استعمال کرنے کے مدعی ہیں لیکن جہانبانی کے اُس وصف سے عاری ہیں جو قدرت کی جانب سے اُن قوموں کو عطا کیا جاتا ہے جنھیں دنیا پر تسلّط قایم کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔ اسی وجہ سے قدرت نے مسلمانوں کو ایک ایسی قوم کا ماتحت بنا دیا جو بھرپور توانائی اور مستحکم ارادے کی مالک ہے۔ مسلمان اُن کافروں سے انتہائی حقارت آمیز طور پر نفرت کرتے ہیں جنھوں نے انھیں سرنگوں کیا ہے۔ وہ نہ کبھی ہماری اچھائیوں کو گوارہ کریں گے اور نہ ہماری بالادستی کو نظرانداز کریں گے۔ ہماری قیادت اُن کے لیے چاہے کتنی ہی باعثِ رحمت نہ ثابت ہو ان کی جانب سے اس کا صلہ ہمیں بددعاؤں ہی کی شکل میں ملے گا۔ ہم اُن کے اور ایک خیالی بہشتِ اراضی کے درمیان کھڑے ہیں وہ لوگ ہمیں نیک فرشتوں کا مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہیں[16]

لہٰذا مسلمانوں کے لیے 1857ء کی سرکشی برطانیہ کے خلاف محض ایک بغاوت نہ تھی، بلکہ وہ اُن کی کھوئی ہوئی مراعات کی بازیابی کی آخری جان توڑ کوشش تھی۔ اُس وقت ہندستان میں ان کی تعداد پانچ کروڑ تھی لیکن ان کے پاس قیادت اور تنظیم کا فقدان تھا۔ اُن میں سے بیشتر لوگ قلاّش ہو چکے تھے جب کہ اُن کا شہنشاہ بہادر شاہ دہلی میں بے بسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اُنھیں صلیب CROSS سے نفرت تھی کیوں کہ اُسی نے ہلال کی جگہ لے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لی تھی۔ سر ایس۔ ایچ کننگھم S.H. CUNNINGHAM کے الفاظ میں "مسلمانوں کو شکایت تھی۔ انھیں رسوا شدہ اقتدار اور مجروح شدہ وقار کا دوہرا غم کھائے جا رہا تھا۔"[17]

لیکن اس بغاوت میں مسلمانوں کا حصہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نہیں تھا۔ شاید انھوں نے دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ واضح طور پر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ جب کہ مغل شہنشاہ کو اُن نازک دنوں میں سرکشی کی علامت بنا لیا تھا۔[18] انگریزوں نے زیادہ تر انھیں پر شک کیا اور نتیجے میں انھیں سب سے زیادہ نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ سر جارج کیمبل نے لندن کے اخبار دی ٹائمز کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ "سب سے واضح، مقبول اور شدید نظریہ یہ ہے کہ بغاوت مسلمانوں نے کی تھی"[19] حالانکہ وہ خود جس نتیجے پر پہنچا وہ مسلمہ نظریے سے مختلف تھا۔[20]

لیکن کیمبل کی یہ آواز صدا بہ صحرا بن کر رہ گئی۔ اُسے شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اس کے ہم وطن مسلمانوں کے خلاف کس قدر شدید نفرت رکھتے ہیں۔ بغاوت فرو کیے جانے کے فوری بعد رسل نے لندن کے اخبار دی ٹائمز میں ایک خط شایع کروایا تھا جس میں وہ لکھتا ہے "ہمیں شمع محمدی کے پروانوں کے ساتھ جو معاندت ہے وہ اس مخاصمت کے مقابلے میں زیادہ شدید ہے جو ہم شیو SHIVA اور وشنو کے پرستاروں کے ساتھ رکھتے ہیں۔ مسلمان ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں.... اگر ہم بہ یک جنبش محمد کی حدیثوں اور معبدوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ بات عیسائی مذہب اور برطانوی حکومت دونوں کے لیے فالِ نیک ثابت ہوگی۔"[21]

برطانوی عہدیداروں میں مسلمانوں کے خلاف یہ نفرت اس قدر شدت اختیار کر چکی تھی کہ بقول رسل کئی عہدیدار اس خیال کی پُرزور حمایت کرنے لگے تھے کہ دہلی کی جامع مسجد کو منہدم کر دیا جائے "تاکہ" اہلِ ایمان" پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ہندستان میں ان کا وقار کس حد تک مجروح ہو چکا ہے۔ ایک ایسے گورنر جنرل نے، جس کے لیے رسل نے "روشن خیال" ENLIGHTENED کے الفاظ استعمال کیے ہیں،[22] تو یہ تجویز بھی پیش کر دی تھی کہ "آگرے کے تاج محل کو منہدم کر دیا جائے اور سنگِ مرمر کی سلوں کو فروخت کر دیا جائے۔"[23]

1857ء کے غدر کے بعد حالات اور زیادہ ابتر ہو گئے۔ لارڈ رابرٹس کا رویہ مخصوص برطانوی ذہنیت کا غماز تھا۔ وہ مسلمانوں سے اتنا زیادہ خفا تھا کہ اس نے اپنی بہن بیریٹ کو ایک خط

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں لکھا تھا کہ انگریزوں کو چاہیے کہ "وہ زندگی کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کو روبہ کار لائیں ..... اور ان بدقماش مسلمانوں پر واضح کر دیں کہ خداوند کی نصرت کے سہارے انگریز آیندہ بھی ہندستان کے آقا بنے رہیں گے"[24]۔ ہندستان پر اپنا تسلط جمائے رکھنے اور اسے تقویت پہنچانے کے لیے انگریزوں نے ضروری سمجھا تھا کہ مسلمانوں کو پیروں تلے دبائے رکھا جائے۔ 1857ء کی بغاوت نے اس نقطۂ نظر کو درست سمجھنے کا سامان فراہم کر دیا تھا۔

چنانچہ انگریز عہدیداروں کی یہ عادت سی بن گئی تھی کہ ملک میں جہاں کہیں بدامنی پھیلے یا کسی قسم کا بگاڑ پیدا ہو تو وہ اس کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے سر مڑھ دیا کرتے تھے۔[25] وہ انھیں انتظامی عہدوں پر دیکھ کر خوش نہیں ہوتے تھے اور اکثر اُن کے ساتھ حقارت آمیز تمسخر کا برتاؤ روا رکھتے تھے۔ اس کے برخلاف ہندوؤں کے ساتھ اُن کا برتاؤ فراخدلانہ تھا اور وہ انھیں ماتحت انتظامی عہدوں پر بہ خوشی بھرتی کر لیتے تھے جہاں وہ اپنے عہدیدارانِ بالا کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے تھے[26] اور مکمل فرماں برداری روا رکھتے تھے۔[27]

اس کے برخلاف بقول سر الفریڈ لائل: "مسلمانوں نے بدیسی حکمرانوں کا اعتقاد کھو دیا تھا جس کے نتیجے میں اُنھوں نے اعلا درجے کی ماتحتانہ رسول [illegible] فوجی خدمات میں اپنی عددی اکثریت گنوا دی تھی"۔[28]

"برادرانِ اسلام" کے خلاف انگریزوں کے اس معاندانہ رویے سے سرسید احمد خاں، جن کے بارے میں اگلے ابواب میں تفصیلی گفتگو ہوگی، اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے 1860ء میں انگریزوں کے اس رویے کو تبدیل کرانے کے مقصد سے ایک پمفلٹ شایع کروایا۔ اُنھوں نے اولاً اسے اردو زبان میں تحریر کیا اور بعد ازاں اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کروایا اور اس کی کاپیاں نہ صرف ہندستان کے اعلیٰ انگریز عہدیداروں بلکہ انگلستان کے پارلیمانی ارکان اور وہائٹ ہال کے عہدیداروں کو بھی بھجوا دیں۔ انھوں نے اس پمفلٹ کو "ہندستان کے وفادار مسلمان" کا عنوان دیا۔ اس پمفلٹ کے موضوع کی وضاحت اس کے عنوان ہی سے ہو جاتی ہے۔ اس میں 1857ء کی بغاوت کے دوران مسلمانوں کی وفاداری کے بارے میں بھرپور مواد شامل کیا گیا تھا۔ ایک مقام پر اس مروجہ خیال کا حوالہ دیتے ہوئے کہ مسلمان ہی بغاوت کو بھڑکانے کے لیے بنیادی طور پر ذمہ دار ہیں، انھوں نے لکھا: "اس خوفیں ڈرامے کے بعض حصوں پر سے پہلے ہی پردہ اُٹھ چکا ہے لیکن دن بدن جوں جوں مزید تفصیلات روشنی میں آئیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گی اور جب اصل حقیقت واضح ہو جائے گی تب دنیا پر یہ بھید آشکار ہو جائے گا کہ ہندستان میں رعایا کا اگر ایسا کوئی طبقہ موجود تھا جو اپنے مذہبی اصولوں کے اعتبار سے، اپنی عادات واطوار کے لحاظ سے اور اپنی شریف النفسی کی بنا پر سب سے زیادہ عیسائیوں سے قریب تھا اور جس نے ان کے ساتھ ان کی آزمایش اور ابتلا کے دور میں دوستی اور مروت کا سلوک کیا تو ویسا طبقہ صرف اور صرف مسلمانوں کا تھا۔ تب وہ زبانیں جو آج مسلمانوں کو بدنام کرنے سے نہیں تھکتیں موثر طور پر خاموش کر دی جائیں گی۔"[30] آگے چل کر مسلمانوں کے خلاف الزام تراشیوں اور زبان درازیوں کا سلسلہ موقوف تو ہو گیا لیکن اس کے لیے ایک طویل مدت تک سرسید اور ان کے ساتھیوں کو اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرنی پڑیں۔

اس قسم کے مایوس کن پس منظر میں مسلمانوں نے برطانیہ کے زیر تسلط اپنی بقا کی جدوجہد شروع کی۔ اُن پر نہ صرف حکمران طاقت ہی عدم اعتماد کا اظہار کرتی تھی بلکہ اُن کے خلاف ہندوؤں کا ابھرتا ہوا متوسط طبقہ بھی اظہار ناپسندیدگی کرتا تھا۔ اس صورت حال کے لیے مسلمان کچھ کم ذمہ دار نہ تھے۔ اگرچہ ان سے اقتدار عملاً چھن چکا تھا تاہم اُن کے کئی رئیسوں اور شرفا کا برتاؤ بوربونوں BOURBONS کی طرح ہوا کرتا تھا جو نہ تو حالات سے کوئی سبق حاصل کرنا چاہتے تھے اور نہ کچھ فراموش کرنے پر آمادہ تھے۔"[31] پدرم سلطان بود" کے تصور ہی سے وہ دلی تسکین حاصل کرنے لگے تھے۔ بقول ہیر، مسلمان اپنے آپ کو خالص مشرقی انداز میں "میدانِ جنگ کے شیر"، "عقل مند اور بہادر سورما"، "ایوان کے ستون" اور "شمشیر رزم" سمجھنے لگے تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کی اکثریت نے فوج یا سرکاری عہدوں پر ترقی کرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو بالآخر شراب نوشی، افترا پردازی اور ڈاکہ زنی کی صورت اختیار کر لی تھی۔[32]

حکومت مفادِ عامہ کے لیے جب کوئی اقدام تجویز کرتی تو مسلمان ضرور اس میں برائی کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے اور اُن اقدامات کو اپنے لیے روحانی آلودگی کا باعث سمجھتے۔ وہ ہندوؤں کی جانب اس انداز سے دیکھتے گویا وہ اب بھی کسی مسلمان بادشاہ کے زیر تسلط ہوں۔ خود فریبی کے اس رجحان نے انھیں تباہ کن نتائج سے دوچار کر دیا۔ بیرونی حکومت، مسلمانوں کی مخالفت کو تحقیر آمیز طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لاتی رہی جب کہ ہندو ہر موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے رہے اور اس بات پر خوش ہوتے رہے کہ مسلمانوں نے ان کے لیے ترقی کا میدان کھلا چھوڑ دیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا حالی نے اپنے مشہور مسدس میں مسلمانوں کی زبوں حالی کو بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ گریہم بیلی GRAHAM BAILEY نے اس نظم کو بجا طور پر "انیس کے عہد کے بعد کی سب سے عظیم نظم قرار دیا ہے۔"(33)

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا عَلَم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا وہ اُمت لقب جس کا خیر الاُمم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

وگرنہ ہماری رگوں میں لہو میں ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں طبیعت میں فطرت میں عادت میں خُو میں
نہیں کوئی ذرہ نجابت کا باقی
اگر ہو کسی میں تو ہے اتفاقی

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے ہمارا قدم ننگ اہلِ وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے (34)

اُس دور میں مسلمانوں کے حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو گئے تھے کہ ایک اور مقام پر مولانا حالی کو انتہائی یاسیت کے ساتھ کہنا پڑا ہے :۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے (35)

یہ صرف ایک شاعر کے جذبات ہی نہیں تھے بلکہ مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت نے اس زبوں حالی سے تو افق پیدا کر لیا تھا۔ وہ بڑی صدق دلی سے یوں محسوس کرنے لگے تھے کہ جس طرح انفرادی طور پر ایک شخص اپنی زندگی کی ابتداء طفلگی کے دور سے کرتا ہے اور عنفوانِ شباب کے دور میں پہنچ کر ایک صحت مند کڑیل جوان بن جاتا ہے اور بعد ازاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضعفِ پیری کا شکار ہو کر لقمہ اجل بن جاتا ہے۔ یہی صورت قوموں پر بھی صادق آتی ہے۔ چناں چہ مسلمان قوم پر بھی عنفوانِ شباب کا دور آ کر گزر گیا اور اب وہ ضعفِ پیری کا شکار ہیں اور اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ بقول ان کے یہ ایسا اٹل Inexorable قانونِ فطرت ہے جس میں تغیر و تبدّل Immutability کی کوئی گنجائش نہیں ہے[36]۔ جس طرح ایک فرد اپنے عہدِ پیری کو عنفوانِ شباب کی رنگین یادوں کے سہارے گزار دیتا ہے۔ اُسی طرح مسلمان بھی من حیث القوم اپنے دورِ انحطاط کو اپنی سربلندیوں اور کامرانیوں کی خوشگوار یادوں کے سہارے گزار رہے تھے۔

مسلمانوں میں یہ رجحان خطرناک حد تک پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ نہ صرف ان کے حق میں مہلک ثابت ہو رہا تھا بلکہ اس کے باعث نظمِ مملکت کے چلانے میں بھی کئی دشواریاں لاحق ہو رہی تھیں کیونکہ ہندستانی سماج کا ایک حصّہ مائل بہ ارتقا تھا تو دوسرا مائل بہ انحطاط۔ وہ برطانوی حکمراں جس نے سب سے پہلے اس مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کیا وہ ارل آف مایو EARL MAYO تھا۔ چنانچہ اس کی ہدایت کے بموجب حکومتِ ہند نے ایک قرارداد اجرائی کے لیے منظور کی جس میں مسلم رعایا کی تعلیمی حالتِ زار کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ کس طرح رعایا کا اتنا بڑا اور اتنا اہم طبقہ مروجہ تعلیمی نظام کے ساتھ فعّال قسم کا تعاون کرنے کی بجائے مجہول قسم کا خاموش تماشائی بنا ہوا ہے اور ان مادی اور سماجی فوایدسے اپنے آپ کو محروم کیے ہوئے ہے جن سے رعایا کے دوسرے طبقے بھرپور طریقے سے متمتع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ہز ایکسلنسی نے اپنی کونسل کے ذریعے ہدایات جاری فرمائیں کہ حکومت مزید باضابطگی سے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ انھوں نے مقامی حکومتوں اور منتظمین کو اس بارے میں تفصیلی رپورٹیں پیش کرنے کا حکم بھی صادر فرمایا[37]۔ بعد ازاں حکومتِ ہند نے اپنی قرارداد[38] مورخہ 13 جون 1873ء میں ان رپورٹوں کی تنقیح کرتے ہوئے مسلمانوں کے پچھڑے پن کا تجزیہ ANALYSIS پیش کیا جس کی روشنی میں گورنر جنرل کی کونسل نے اس توقع کا اظہار کیا کہ اُن تمام صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے اور جہاں مذہبی اقلیت ہونے کی بنا پر نہ انھیں دولت کے معاملے میں برتری حاصل ہے اور نہ اثر و رسوخ کے معاملے میں وہاں حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ اس بات کا اطمینان حاصل کرے کہ تعلیمی معاملات میں آیندہ بھی مسلمانوں کی اسی طرح ہمت افزائی کی جاتی رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا کہ آیندہ یہ دیکھنا سرکار کی ذمہ داری ہوگی کہ جہاں کہیں ابتدائی تعلیم کے میدان میں مختلف طبقوں کے مابین خلا محسوس ہو اسے فوری طور پر پُر کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح کثیر التعداد رعایا کے مختلف طبقوں کو تعلیم کی ایسی سطح پر پہنچا دیا جائے جہاں سب کے لیے یکساں ترقی کے مواقع موجود ہوں۔

لیکن اُس شخص کا نام جس نے پہلے پہل مسلمانوں کے انحطاط اور اس کی وجہ سے برطانوی سلطنت کو لاحق امکانی خطرات سے ہندستانی اور برطانوی عوام کو آگاہ کیا۔ سر ولیم ہنٹر تھا۔ اُس کی کتاب موسومہ Indian Musalmans: Are They bound in Conscience to rise against the queen. مطبوعہ 1871ء کی وجہ سے سب سے پہلے اس مسئلے کو ایک ہنگامی صورت حال ہوئی۔ ہنٹر نے اپنی کتاب میں معقول دستاویزی شہادتیں فراہم کی تھیں اور مدلل مباحث سے کام لیا تھا۔ اس کتاب کے مواد کو مصنف نے (جو خود بھی ایک تجربہ کار رسول عہدیدار تھا) نہ صرف فورٹ سینٹ ولیم Fort st. William میں واقع دفتر معتمدی سے حاصل کیا تھا بلکہ اس مواد کے حصول میں اُس نے ای۔ ایم میلونی اور ای۔ سی۔ بیلی جیسے قابلِ اعتماد دوستوں سے بھی تعاون حاصل کیا تھا جو ہندستانی سول ملازمت میں ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز تھے۔ لہٰذا بے محل نہ ہوگا اگر مسلمانوں کی حالتِ زار کی سنگینی کو سمجھنے کے لیے ہنٹر کے فراہم کردہ مواد کے کچھ حصے پر نظر ڈال لی جائے کیونکہ اس کتاب سے متاثر ہو کر حکومتِ ہند نے مسلمانوں سے متعلق اپنی پالیسی کو کافی حد تک تبدیل کر دیا تھا۔

ہنٹر اپنی کتاب میں (1) فوجی خدمات (2) حصولِ مالگذاری اور (3) عدلیہ اور سررشتہ سیاسیات کی خدمات کو "سرکاری زندگی کی تین منصفانہ اور واضح اجارہ داریاں"[91] (Three fair and ostensible monopolies) قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جہاں تک پہلی قسم کی ملازمت کا سوال ہے "ایسا کوئی مسلمان جو پیدائشی طور پر نجیب الطرفین ہو ہمارے فوجی دستوں میں شامل نہیں ہو سکتا"[91] صفحہ کے آخر میں لکھے ہوئے ایک حاشیے میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ مسلمان کس مضحکہ خیز حد تک کم تعداد میں گورنر جنرل کے ہاتھوں فوجی کمیشن حاصل کر پائے ہیں اور "ملکہ کے ہاتھوں تو ایک مسلمان بھی یہ اعزاز حاصل نہ کر سکا"[92]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری قسم کی خدمت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنٹر نے لارڈ کارنوالس اور سر جان شور Sir John Shore کی اس پالیسی کو ہدفِ ملامت بنایا ہے جس کے ذریعے انھوں نے بنگال میں دوامی وراثت یا بندوبست دوامی کے طریقے کو ختم کر دیا تھا۔ یہ پالیسی مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنی۔ ہنٹر نے اپنے موقف کی حمایت میں مسٹر جیمس او کنسلی کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے "دوامی وراثت" کے مسئلے کا بہ نظرِ غایر مطالعہ کیا تھا۔ بقول اُن کے "بنگال میں اس تبدیلی کی وجہ سے اُن ہندو مزارعین کا موقف مستحکم ہو گیا انھیں پٹہ دار انہ حیثیت حاصل ہو گئی جو ابتداً غیر اہم خدمات پر مامور ہوا کرتے تھے۔ اس طرح ہندوؤں کو زمینات میں مالکانہ حقوق حاصل ہو گئے اور ان کے پاس وہ تمام دولت جمع ہو گئی جو اگر مسلمانوں کی حکومت بدستور قایم رہتی تو مسلمانوں کو حاصل ہوتی۔"(43)

تیسری قسم کی سرکاری خدمات کے بارے میں ہنٹر پرزور طریقہ پر رقمطراز ہے:
"ان دیسی شرفاء میں جو مہودہ دیوانی ملازمتوں یا عدالت عالیہ کی منصفی جیسے عہدوں تک پہنچ پائے ایک بھی مسلمان شامل نہیں ہے"(44) اپنے دعوے کے ثبوت میں اس نے حسبِ ذیل اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔

(1) اعلیٰ ترین عہدوں پر" اب تین ہندوؤں کے مقابلے میں صرف ایک مسلمان فائز ہے"

(2) دوسرے درجہ کے عہدوں پر" اب دس ہندوؤں کے مقابلے میں صرف ایک مسلمان فائز ہے"

(3) تیسرے درجہ کے عہدوں پر" اب ۲۰ ہندوؤں اور انگریزوں کے مقابلے میں صرف تین مسلمان فائز ہیں"

(4) ادنیٰ درجہ کی ملازمتوں پر" اب ۶۹ کے مقابلے میں صرف چار مسلمان فائز ہیں"

(5) ہنگامی اور عارضی اسامیوں پر" اب ایک بھی مسلمان فائز نہیں ہے"(45)

مسلمان امراء کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی افسردہ کُن تھی کیونکہ "ایک سو سال سے کچھ کم مدت پہلے تک حکومتی اقتدار کی باگ ڈور اُن ہی مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں میں سنبھال رکھی تھی"(46)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کے کم اہم محکمہ جات میں صورت حال اور بھی زیادہ ابتر تھی، تینوں درجے کے اسسٹنٹ گورنمنٹ انجنیروں میں 14 ہندوؤں کے مقابلے میں ایک بھی مسلمان موجود نہیں تھا۔ امیدواروں میں چار ہندو اور دو انگریز تھے جبکہ ایک بھی مسلمان امیدوار منتخب نہیں کیا گیا تھا۔ محکمہ تعمیرات عامہ کے سب انجنیروں اور سپروائزروں کی فہرست میں 24 ہندوؤں کے مقابلے میں صرف ایک مسلمان شامل تھا۔ اور سیروں کے زمرے میں 63 ہندوؤں کے مقابلے میں صرف دو مسلمان شامل تھے۔ دفتر محاسب میں 53 ہندوؤں کے مقابلے میں ایک بھی مسلمان موجود نہیں تھا۔ اعلیٰ درجے کے ماتحتین کے محکمے میں 27 ہندو موجود تھے جب کہ مسلمان ایک بھی نہیں تھا۔[47]

ہنٹر یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ "اُن صریح Patent حقایق کی مثالوں کا انبار لگا دے جو عہدیداران دیوانی کی فہرست کے ہر صفحے پر اظہر من الشمس موجود تھے"[48] تاہم اُس نے گزیٹڈ عہدوں کی ایک ایسی مبسوط فہرست تیار کی تھی جس کے لیے انگریز ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اہل قرار دیے گئے تھے[49] اور یہ ثابت کیا کہ 1871ء میں بنگال میں سرکاری تقرراتت کچھ اس طرح کیے گئے کہ یورپین عہدیداروں کے مقابلے میں ہندو عہدیداروں کی تعداد نصف تھی جبکہ مسلمانوں اور یورپینوں کے درمیان 1/19 کا تناسب پایا جاتا تھا۔ اس صورت حال پر بڑے ہی دُکھ کے ساتھ تبصرہ کرتے ہوئے ہنٹر لکھتا ہے: "آج کلکتہ میں شاید ہی کوئی سرکاری دفتر ایسا ہو جہاں کوئی مسلمان دربان Portion قاصد یا قلم تراشنے اور دوات میں سیاہی بھرنے والے چپراسی سے بڑھ کر کسی خدمت پر مامور ہونے کی توقع کر سکے۔"[50]

قانون اور طب جو اُس دور میں انتہائی معزز اور نفع بخش پیشے تصور کیے جاتے تھے، مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کے حصول سے بڑھ کر ناممکن الحصول بنا دیے گئے تھے اس بات کے ثبوت کے طور پر ہنٹر کئی واضح مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے "میں خواہ کسی محکمہ یا کسی پیشے پر نظر دوڑاؤں، ہر جگہ ایک ہی جیسی عدم مساوات پائی جاتی ہے"[51] اُس نے مثال کے طور پر 1869ء کے کلکتہ یونیورسٹی سے متعلقہ اعداد و شمار اس طرح پیش کیے ہیں:

1۔ طب کے گریجویٹ : ہندو = 3، انگریز = ایک، مسلمان = صفر

2۔ طب کے ہیچلر : ہندو = 10، انگریز = ایک، مسلمان = صفر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

3 ۔ طب کا لائسنس پانے والے : ہندو = 58، انگریز = پانچ ، مسلمان = ایک

ان حالات میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے اژدہام نے مسلمانوں پر سرکاری ملازمتوں اور معزز اور منفعت بخش پیشوں کے تمام دروازے بند کر دیے تھے[52]

جن دنوں ہنٹر بنگال میں مسلمانوں کی حالت کے بارے میں تحقیقات کرنے میں مصروف تھا اُن ہی دنوں لارڈ ہوبرٹ نے اپنی مشہور یادداشت مرتب کی جس کا تعلق "مسلمانوں کی تعلیم اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تقرر سے تھا"[53]

اُس نے اپنی تحقیقات کا دائرہ مدراس کی حد تک محدود رکھا اور اُن مختلف وجوہات کی وضاحت کرنی چاہی جو بقول اُس کے "سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی بتدریج کمی کا باعث بنے"[54] اُس نے جن وجوہات کی نشاندہی کی ہے اُن میں سے اکثر جانی پہچانی تھیں۔ مدراس کے گورنر کی حیثیت سے ہوبرٹ نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے جو معلومات اکٹھا کیں اُن کے بموجب وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ "جہاں تک اس پریسیڈنسی (صوبے) کا تعلق ہے مسلمانوں کی ملازمت میں یہ کمی حقیقی ہے نہ کہ قیاسی"[55] اپنی یادداشت سے منسلک ایک گوشوارے میں اُس نے بتلایا کہ کس طرح غیر معہودہ دیوانی خدمات کے اونچے درجوں کے لیے منتخبہ 485 امیدواروں میں 417 امیدوار ہندو تھے اور مسلمانوں کو ان اسامیوں میں سے صرف 13 جگہیں مل سکی تھیں۔ محکمہ جاتی سطح پر یہ تقسیم حسب ذیل تھی :

(ا) محکمہ عدلیہ

صدر امین خاص (بہ مشاہرہ پانچ سو روپیہ) : ہندو = 10، مسلمان = صفر، دیگر = 2

ضلع منصف (بہ مشاہرہ 200 تا 300 روپیہ) : ہندو = 27، مسلمان = 6، دیگر = 17

(ب) محکمہ مال اور انتظام

ڈپٹی کلکٹر اور مجسٹریٹ (بہ مشاہرہ 250 تا 600) ہندو = 31، مسلمان = 2، دیگر = 17

تحصیلدار ہندو = 143، مسلمان = 4، دیگر 9

سب مجسٹریٹ ہندو = 146، مسلمان = 7، دیگر 4

بمبئی پریسیڈنسی میں بھی مسلمانوں کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں تھی۔ اگرچہ اُس زمانے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر شاذ ہی ہندستانیوں کا تقرر کیا جاتا تھا تاہم اس صوبے کی انڈین آرمی اینڈ سول سروس لسٹ بابتہ 1871 میں کسی ایک بھی مسلمان کا نام موجود نہیں ہے۔ محکمہ عدلیہ کے جن چار اہم عہدوں پر ہندستانی فائز تھے اُن میں سے تین پر ہندو اور ایک پر پارسی عہدیدار مامور تھا(56)

برطانوی دور میں سرکاری ملازمتوں کو حاصل کرنے کے لیے انگریزی زبان سے کماحقہٗ واقفیت لازمی تھی اور مسلمان اس زبان سے بے بہرہ تھے۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ان ہندو اور مسلمان طلباء کے متعلق حسبِ ذیل اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیے جو 1871-72 کے تعلیمی سال کے دوران بمبئی پریسیڈنسی کے مختلف سرکاری تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم تھے۔ یہ اعداد و شمار صرف اُن اداروں سے متعلق ہیں جہاں مخصوص علوم جیسے کہ قانون، طب، انجینئرنگ، تدریس اور صنعتی فنون وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی(57)

ڈویژن	مسلمان	ہندو
سنٹرل (مرکزی)	21	339
شمال مشرقی	—	49
شمالی	13	149
جنوبی	11	160
سندھ	32	39
	77	736

بمبئی کے سینٹ زیویئر کالج جیسے خانگی تعلیمی ادارے میں ایک بھی مسلمان طالب علم زیرِ تعلیم نہیں تھا(58)

چنانچہ اُس دور میں بحیثیت مجموعی سماجی اور معاشی اعتبار سے مسلمان نہایت کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ اس صورت حال سے سرسید اس قدر دل گرفتہ تھے کہ انھوں نے 26 مئی 1875 کو عظیم آباد (پٹنہ) کے مسلم زعماء کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا:

"اب آپ تمام ہندستان پر نگاہ دوڑائیے اور اس کے مختلف اداروں کو پیشِ نظر رکھیے۔ سرکاری محکموں کو لیجیے، کارخانوں یا محکمہ ریلوے کو لیجیے چھوٹی چھوٹی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دکانوں سے لے کر بڑے بڑے تجارتی مراکز کو دیکھیے یا کسی بھی قسم کے خانگی کاروبار کو لے لیجیے اور پتہ چلائیے کہ ان تمام جگہوں پر ملازمت پانے والوں میں مسلمان کتنے ہیں؟ میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ان کا تناسب ہزار میں ایک سے بڑھ کر نہیں ہوگا۔" (59)

اگرچہ بعض اعلیٰ عہدیدار مسلمانوں کے ساتھ خاص طور پر مُربیانہ سلوک روا رکھنے کے دل سے خواہش مند تھے تاہم زیر تبصرہ مدت کے آخری دنوں تک صورت حال میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ۲۳ جون 1877 کو لارڈ لٹن نے لارڈ سالسبری کو لکھا تھا: "یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہندستان کا برطانوی سامراج ایک مسلمان قوت ہے۔ مسلمان رعایا کے جذبات حکومت برطانیہ کے لیے غیر معمولی استحکام کا باعث بنتے ہیں یا غیر معمولی خطرے کا، اس بات کا انحصار بالکلیہ ملکہ معظمہ کی حکومت کی اختیار کردہ پالیسی پر ہوگا۔" (60) تاہم ایسے بلیغ اظہار کے باوجود جو لٹن کے میلانِ طبع کے عین مطابق تھا مسلمانوں کی حالت میں کوئی خاص بہتری واقع نہیں ہوئی۔ اس دَور کے عصری تقاضوں کے برخلاف ان کی حالت انتہائی پست تھی۔

انگریزوں کو اس بات کا احساس ضرور تھا کہ مسلمانوں کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جانا چاہیے لیکن وہ اس بات سے لاعلم تھے کہ اپنے ارادے کو کس طرح عملی جامہ پہنائیں۔ انھوں نے غیر جانبدارانہ موقف اختیار کر رکھا تھا تاکہ ان کی حکومت پر کسی قسم کا الزام عاید نہ کیا جا سکے۔ زندگی کی دوڑ میں مسلمان اس بُری طرح پچھڑ گئے تھے کہ اب انھیں آگے لانے کا احساس انگریزوں کو کافی مدت کے بعد ہوا۔ اب انگریزوں کے سامنے اصل دِقت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو خصوصی مراعات کیونکر عطا کریں کیوں کہ وہ مذہبی غیر جانبدارانہ پالیسی کا اعادہ خود ہی کئی بار کر چکے تھے۔ کیا وہ مسلمانوں کو خصوصی مراعات دے کر ہندوؤں کی ناراضگی مول نہ لے لیتے؟ ٹائمز اخبار کے حسب ذیل کلمات برطانوی ذہن کے اسی انتشار کی غمازی کرتے ہیں:

ہمارے ہندستانی مسلمانوں کی شکایات کا ازالہ بڑی حد تک ممکن نہیں ہے نہ تو اب انھیں حکمراں قوم کا رُتبہ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہی انھیں اُن کے قدیم مراتب کے متناسب مراعات سے نوازا جا سکتا ہے۔ اگر ہم پر مسلمانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے کچھ فرض عاید ہوتا ہے تو ہندوؤں کے لیے بھی ہم پر ایسے ہی فرائض عاید ہوتے ہیں اور اپنی حکمتِ عملی وضع کرتے ہوئے ہم اس مخمصے میں پھنس جاتے ہیں کہ آخر ہمیں کس حد تک مسلمانوں کے اُن مطالبات کو تسلیم کرنا چاہیے جن کی اساس مذہبی عدم رواداری کے اصول پر رکھی گئی ہو اور جن کے پسِ پُشت سیاسی عوامل کارفرما ہوں۔ اگر مسلمان چاہیں تو ان کے لیے اسکولوں کے دروازے کھلے ہیں جہاں وہ عصری علوم سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر انھیں انتظامی عہدوں سے محروم رکھا گیا تو محض اس لیے کہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں وہ پچھڑ گئے اور ہم اُن پر سبقت لے گئے۔ مزید یہ کہ ان عہدوں کے لیے جس قسم کے اعلیٰ کردار کی ضرورت ہوتی ہے اُس کا اُن میں فقدان ہے۔ اِسی طرح آزاد معیشت کے دروازے اگر اُن پر بند ہو گئے ہیں تو اس کی ذمہ داری بھی یا تو خود اُنہی پر عاید ہوتی ہے یا پھر وہ اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ تاہم اس امر کا احساس بھی لازمی ہے کہ رعایا کے اتنے بڑے باعزت حصّے کو جس نے حال ہی میں اپنے نیک ارادوں کا ثبوت پیش کیا ہے اس "بے کیف انحطاط" سے محفوظ رکھنے کی ممکنہ کوشش کی جائے۔[61]

یہ انحطاط نہ صرف یہ کہ بڑا ہی بے کیف تھا اور اس کے خلاف مسلمان صدائے احتجاج بلند کرتے رہے اور عرضداشتیں پیش کرتے رہے جن کے جواب میں انگریز قوم تسلّیاں بھی دیتی رہی تاہم انحطاط کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اس کی روک تھام نہ ہو سکی۔ اور جوں جوں وقت گذرتا گیا حالات مزید ابتر ہوتے گئے۔ 1881ء کے اوایل میں سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن نے لارڈ رپن کو جو تفصیلی یادداشت پیش کی اُس میں کہا گیا تھا کہ 1871ء میں گزیٹڈ عہدیداروں کے تقررات میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب 7:1 سے کم تھا لیکن 1880ء تک یہ تناسب گھٹ کر 10:1 کا رہ گیا۔"[62]

یادداشت پیش کرنے والوں کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ

"دیگر کم اہم محکمہ جات میں جہاں سرکاری سرپرستی پر زیادہ نگرانی نہیں رکھی جاتی وہاں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی حالتِ زار کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔"[63] اُس یادداشت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ حالات میں مزید ابتری پیدا ہو چلی تھی۔ اپنے دعوے کی دلیل میں یادداشت پیش کرنے والوں نے زیادہ تر بنگال کی صوبائی حکومت کے مختلف محکموں میں ملازمین کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے واضح کیا تھا کہ کس طرح ہندوؤں اور عیسائیوں کے مقابلے میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یوں تو یادداشت میں اس ضمن میں کئی مثالیں پیش کی گئی ہیں لیکن ذیل میں صرف چند ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں:

محکمہ خارجہ میں 54 عہدیداروں میں من جملہ صرف 2 مسلمان تھے۔ محکمہ داخلہ کے 63 عہدیداروں میں سے صرف ایک مسلمان تھا۔ خزانہ اور مال کے محکمہ جات کے 75 عہدیداروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا۔ کنٹرولر جنرل کے ماتحت 63 عہدیداروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا۔ عدلیہ، سیاسیات و تقررات کے محکمہ جات میں کام کرنے والے 82 عہدیداروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا۔ ریونیو بورڈ کے 113 مددگاروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا۔ یہی حال محکمۂ (محصول) کا تھا جس کے عہدیدار بالا اور ماتحتین کی تعداد 130 تھی۔ بالکل یہی حالت محکمہ انسداد اور ہندستانی محکمہ ڈاک کے ڈائریکٹر جنرل کے دفاتر کی بھی تھی۔ محکمہ ڈاک میں چند مسلمان ضرور کام پر مامور تھے لیکن اُن کی تعداد 2035 میں سے صرف 110 تھی۔

یہ حالتِ زار اُن مسلمانوں کی تھی جن کی تعداد ہندستان کی جملہ آبادی کی ایک چوتھائی کے برابر تھی اور جو صرف ایک سو سال پہلے تک حکومت کے بیشتر عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے بطور خاص بنگال اور شمال مغربی صوبہ جات میں۔

اس یادداشت میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی حالتِ زار میں بہتری پیدا کرنے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ ملازمتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس تناسب میں فوری توازن پیدا کرے۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ حکومت اس قسم کا توازن صرف اُسی وقت پیدا کر سکتی ہے جب وہ یونیورسٹی سے کامیاب کردہ امتحانات پر غیر ضروری زور دینا ترک کر دے۔ یادداشت میں اس امر پر بھی حکومت کو متنبہ کیا گیا کہ اگر حکومت نے اس ضمن میں فوری اقدامات نہیں کیے تو مسلمان قوم اسی طرح انحطاط اور زبوں حالی کا شکار بنی رہے گی جو نہ صرف ملّت اسلامیہ کے لیے بلکہ حکومتِ برطانیہ کے مفادات کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی نقصان دہ ہوگا۔[64]

اپنے دکھ درد کی ایسی داستانیں بار بار سُنانے کے باوجود ہر میدان میں مسلمان ہزیمت اُٹھاتے رہے۔ ہر لفٹیننٹ گورنر کو مسلمانوں کی جانب سے دیے گئے استقبالیوں اور صدارتی جلسوں میں اس قسم کی داستانیں لازماً سُننی پڑتی تھیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے مایو Mayo نے جو فیض رساں Benevolent حکمتِ عملی تیار کی تھی اُسے نافذ ہوئے دس سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی۔ پھر بھی سید امیر علی کو اگست 1882ء میں "انیسویں صدی" نامی رسالے میں شکایتاً لکھنا پڑا کہ آج بھی انگریز عہدیدار مسلمانوں کے حقیقی جذبات و احساسات کو سمجھنے سے اُتنے ہی قاصر ہیں جتنے کہ نصف صدی قبل تھے[65] انھوں نے مختلف حقایق اور اعداد و شمار کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی کہ کس طرح مسلمانوں کو ملازمتوں اور آزاد پیشوں سے دور رکھا گیا۔

سیّد صاحب کے خیال کے مطابق حکومتِ ہند کے اُن تمام شعبوں پر جو بالراست مقامی باشندوں سے متعلق ہیں، عملاً ہندو قابض ہیں۔ بقول اُن کے حکومت کے ہر شعبے میں ہندوؤں کو بالادستی حاصل ہے اور وہ اپنے طاقتور اثر و رسوخ کو جان بوجھ کر مسلمانوں کو سرکاری عہدوں اور ریاستی مراعات سے محروم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں کیوں کہ اُن کے نزدیک مسلمان مادرِ وطن کے چہیتے سپوت نہیں بلکہ بیرونی حملہ آور ہیں[66] امیر علی کہتے ہیں کہ ہندو اپنے اس اثر و رسوخ کو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے محروم کرنے کے لیے استعمال کر رہے تھے بلکہ جو مسلمان کسی نہ کسی طرح سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے انھیں بھی ملازمت سے برخاست کرانے کے لیے اس اثر و رسوخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس الزام کے ثبوت کے طور پر امیرؒ نے بنگال کے ایک مسلمان اعلیٰ عہدیدار کی تحریر سے اقتباس پیش کیا جس نے چند روز قبل انھیں لکھا تھا.....

"اگرچہ اس ضلع کے دفتری عملے میں چند مسلمان عہدیدار موجود ہیں لیکن ان کے لیے اپنی ملازمتوں کا تحفظ بڑا ہی مشکل کام ہے تاوقتیکہ اُن کے عہدیداران مجاز بھی مسلمان ہی نہ ہوں"[67]

ان حالات کی روشنی میں امیر علی نے مشورہ دیا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس عدم توازن کو فوری طور پر ختم کیا جائے۔ اپنی تجویز کی وضاحت کرتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے وہ کہتے ہیں :

میرے انگریز قارئین کو یہ بات عجیب سی لگتی ہوگی کہ میں مسلمانوں کی خوشحالی کے لیے سرکاری ملازمتوں کو سنگ بنیاد تصور کرتے ہوئے ان کے حصول پر اس قدر زور دیتا ہوں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ مسلمانوں کا ملازمتوں جیسے ذریعہ معاش پر اس حد تک تکیہ کرنا ہمارے قومی کردار میں پائی جانے والی کمزوری کی غمازی کرتا ہے۔ تاہم یہ بات بھی فراموش نہیں کی جانی چاہیے کہ مسلمانوں کی وہ فاتح قوم جس کی ایک صدی قبل تک دولت واقتدار پر اجارہ داری قایم تھی ابھی تک اپنے آپ میں تاجرانہ اور کاروباری رجحانات پیدا نہیں کرپائی ہے۔ نصف صدی کے انحطاط نے اُن میں جہد وعمل کی روح کو فنا کر دیا ہے۔ سرمائے کا فقدان بھی ان کی تاجرانہ ترقی کی راہ میں بہت بڑا روڑہ بنا ہوا ہے[68]۔

جوں جوں حالات میں بگاڑ پیدا ہوتا رہا توں توں مسلمان اپنی خصوصی مراعات کے لیے زیادہ سے زیادہ واویلا مچاتے رہے۔ برطانوی حکومت بھی اب اُن کی باتوں پر زیادہ توجہ سے کان دھرنے لگی۔ چنانچہ رپن اُس یادداشت سے بے حد متاثر ہوا جو مرکزی اسلامی تنظیم نے پیش کی تھی۔ اس یادداشت پر فوری توجہ دی گئی۔ اس کی ہدایات کے مطابق سبھی مقامی حکومتوں نے اس یادداشت کے بارے میں اپنی رپورٹیں پیش کیں اور 83-1882ء میں ایجوکیشن کمیشن نے اس پر تفصیلی بحث ومباحثہ کیا۔ چونکہ یہ معاملہ لارڈ رپن کی سبکدوشی تک زیر تحقیق ہی رہا اس وجہ سے وہ حالات کی بہتری کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات نہ کرسکا۔ البتہ اُس کے جانشین لارڈ ڈفرن نے کلکتہ پہنچتے ہی مسلمانوں کے اُس وفد کو جس کی قیادت ٹیپو سلطان کے پڑپوتے شہزادہ فرخ شاہ کر رہے تھے اس بات کا یقین دلایا کہ اس کی حکومت مسلمانوں کی شکایات اور مطالبات پر پوری ہمدردی سے غور کرے گی اور یہ کہ اُس کی پرخلوص ہمدردیاں اُن لوگوں کے شامل حال رہیں گی جو ترقی کی دوڑ میں بعض ایسے عوامل کی وجہ سے پیچھے رہ گئے جن پر انھیں کوئی قابو نہ تھا[69]۔

بالآخر 15 جولائی 1885ء کو حکومت ہند نے اس موضوع پر ایک مفصل قرارداد جاری کی[70] جس میں تمام صوبائی اور مقامی حکومتوں سے صلاح ومشورے کے بعد حکومت نے اپنے اس ایقان کا اظہار کیا کہ ماضی میں مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں جو چیز سب سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ حایل رہی وہ یہ تھی کہ یا تو مسلمانوں میں سرکار کے مروّجہ نظامِ تعلیمی سے بھرپور استفادہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی یا یہ کہ وہ دانستہ طور پر اس کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ مسلمانوں کا یہی رویّہ وارن ہسٹنگز کے دَور سے حکومت کے لیے تاسف کا باعث رہا تھا۔ اسی طرح حکومت کو اس بات کا بھی افسوس رہا کہ بعض صوبوں میں مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مساویانہ مسابقت میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ بعد ازاں قرارداد میں مفصل طور پر اُن "متعدّد کوششوں" کا ذکر کیا گیا جو برطانوی حکومت مسلمانوں کی ان ناکامیوں کی چھان بین اور آئندہ ان کے تدارک کے بارے میں کرتی رہی۔ اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ لارڈ مایو کی مساعی اور ارل آف نارتھ بروک کی قرارداد مورخہ 13 جون 1873 کا ذکر کیا گیا۔

زندگی کی دوڑ میں اگر مسلمان ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے تھے تو محض اپنی خامیوں کی وجہ سے۔ وہ مروّجہ سرکاری نظامِ تعلیم اور خصوصاً انگریزی تعلیم کو اپنا کر ہی سرکاری ملازمتوں میں اپنے جائز حقوق کے تحفظ کے بارے میں خوش امید ہو سکتے تھے۔ اس ضمن میں گورنر جنرل نے تعلیمی کمیشن کی ان سفارشات کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو مسلمانوں کو دوسری اقوام کے ساتھ ایک ہی قطار میں لا کھڑا کرنے کے ضمن میں پیش کی گئی تھیں۔

جہاں تک سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین عدم توازن کا تعلق ہے جس پر یادداشت پیش کرنے والوں نے بہت زور دیا تھا۔ حکومت نے یہ وضاحت پیش کی کہ سرکاری محکمہ جات میں اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے لیے یا تو امیدواروں کو مقابلے کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنی ہوتی ہے یا مطلوبہ معیارِ قابلیت پر پورا اترنا پڑتا ہے جس کا تعلق امیدواروں کی ذات یا قوم سے ہرگز نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں دیگر اقوام کے مقابلے میں کم نمائندگی حاصل ہوئی ہو تو اس کی ذمہ داری کسی طرح حکومت کے عمل یا اس کے افسروں پر عاید نہیں کی جا سکتی۔ درحقیقت بعض صوبہ جات میں گذشتہ کچھ عرصے سے مسلمانوں کے ساتھ خصوصی ترجیحی سلوک کیا جاتا رہا تھا جبکہ بعض مقامی حکومتوں کی رپورٹوں سے یہ منکشف ہوا کہ یادداشت پیش کرنے والوں نے عام طور پر سرکاری ملازمتوں میں کم نمائندگی سے متعلق اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے مبالغے سے کام لیا تھا۔ صوبہ بنگال میں البتہ مسلمانوں کی نمائندگی تعداد کے اعتبار سے واقعی بہت کم تھی۔

چنانچہ گورنر جنرل اُن عہدوں کے تعلق سے مسلمانوں کے ساتھ کوئی خصوصی رعایت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں برت سکتے تھے جو مقابلے کے امتحانات کے ذریعہ پُر کیے جاتے ہوں۔ ایسی مراعات کا عطا کیا جانا ایک تو قرینِ مصلحت نہیں تھا دوسرے یہ بات خلاف مسلمانوں کی ترقی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی۔ قرارداد میں مزید کہا گیا:

لیکن ایسی بھی کئی نوکریاں ہیں جن کا دیا جانا مقامی حکومتوں، ہیڈ کوارٹروں اور مقامی عہدیداروں کے ہاتھ میں ہے۔ گورنر جنرل کی خواہش ہے کہ اُن تمام صوبوں میں جہاں مسلمانوں کو ملازمتوں میں مناسب نمایندگی حاصل نہیں ہے جب کبھی اسامیاں خالی ہوں، مقامی حکومتوں اور صوبائی ہائی کورٹ اس عدم توازن کو دور کرنے کی کوشش کریں اور اپنے ماتحتین پر واضح کر دیں کہ آیندہ تقرّرات کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھا جانا کس قدر ضروری ہے۔[71]

اگرچہ یہ ایک اہم فیصلہ تھا تاہم تنہا یہی فیصلہ مسلمانوں کے تمام امراض کا تریاق نہ بن سکا۔

اس مسئلے کا ایک اہم پہلو اور بھی ہے جس کی وضاحت ہم نے ابھی تک نہیں کی ہے۔ انتظامیہ میں مسلمانوں نے اپنی برتر حیثیت کو کیونکر ختم ہونے دیا؟ اس بُری طرح سے انھوں نے کیوں کر ہزیمت برداشت کی؟ یہ صورت حال کئی وجوہات کی بنا پر پیدا ہوئی جن میں چند کی جانب پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے جو بات ذہن نشین کر لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ یہ صورتِ حال آناً فاناً ظہور پذیر نہیں ہوئی بلکہ تقریباً ایک صدی کے عرصے میں حالات نے یہ صورت اختیار کی۔ جنگِ پلاسی کے خاتمے کے بعد مغل شہنشاہ شاہ عالم نے 12 اگست 1765 کو باضابطہ طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی کے حقوق عطا کر دیے جن کی رو سے کمپنی کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ سرکاری محاصل وصول کر سکے۔ لیکن اس کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوا اور وہ بدستور سرکاری اعتماد اور ذمہ داریوں کے اہل گردانے جاتے رہے۔[72] سرکاری زبان فارسی تھی اور فوجداری مقدمات کے فیصلے نواب ناظم کیا کرتے تھے۔ درحقیقت کافی طویل عرصے تک بنگال کے عدلیے اور مالیے کا تمام تر نظم و نسق مسلمانوں ہی کے سپرد رہا۔[73]

1783ء میں لارڈ کارنوالس نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر کے دونوں محکمے علیحدہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علیحدہ عہدیداروں کے تفویض کیے۔ بیشتر اعلیٰ انتظامی عہدے یورپینوں کے لیے مختص کر دیے گئے۔ اس نے عدلیہ کے نظم میں بھی کئی تبدیلیاں کیں[74]۔ مسلمانوں پر ان تمام اقدامات کا مضر اثر مرتب ہوا کیوں کہ اس طرح کئی مسلم اُمراء کو اچھے خاصے عہدوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لارڈ ایمہرسٹ کی گورنر جنرلی کے اختتام تک مسلمانوں کو ناقابل تلافی حد تک نقصان پہنچ چکا تھا۔ مسلمان جاگیرداروں سے سرکاری محصول کی وصولیابی کا حق چھن گیا اور مسلم عمایدین' مال کی جگہ انگریز تعلقہ داروں (کلکٹروں) نے لے لی۔ اس پر مستزاد یہ کہ بندوبست دوامی (The Permanent Settlement) جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے' مسلمانوں کے تابوت میں آخری کیسل ثابت ہوا۔ مسلمان اپنی زمینوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے جنھیں ہندوؤں نے خریدا۔ اسی کے ساتھ ایک طرح سے بنگال میں ہندوؤں کی خوشحالی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا آغاز ہوا۔

ہندستان کے دیگر علاقوں میں حالات اس قدر خراب نہ تھے تاہم وہاں کے کئی مسلمان خاندان بھی سماجی اور سیاسی اُتھل پتھل کے مضر اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔

مزید برآں لارڈ ولیم بینٹنک نے گورنری کا عہدہ سنبھالنے کے بعد جب زمینداروں کی ملکیت کی دستاویزات کی جانچ پڑتال کا حکم دیا تو اس مقصد کے لیے خصوصی عدالتیں قایم کی گئیں جنھیں بقول ہنٹر اور بخانن Buchanan "اکثر مجزوں" جھوٹے گواہوں' خاموش اور سخت گیر بازیافتی عہدیداروں Resumption Officers نے گمراہ کیا[75]۔ جو کوئی مغل عطیات کے بارے میں اپنی ملکیت ثابت کرنے میں ناکام رہا اُسے اپنی زمینوں اور جایداد سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے نتیجے میں متعدد مسلم گھرانے کنگال ہو گئے[76]۔

"بازیافت کی اِن کارروائیوں" سے قطع نظر مسلمانوں پر دوسری اُفتاد یہ پڑی کہ 1837ء میں سرکاری زبان کے طور پر فارسی کا استعمال ترک کر دیا گیا۔ فارسی کی جگہ انگریزی اور دیگر صوبائی زبانوں کو سرکاری کام کاج میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس اقدام کے فطری تقاضے کے طور پر کئی اہلکاروں اور صیغہ داروں کو اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مسلمان نہ تو انگریزی ہی سے واقف تھے اور نہ انھوں نے بنگالی' اُڑیا' مراٹھی' تلگو' تامل اور گجراتی جیسی صوبائی زبانوں سے کوئی خاطر خواہ واقفیت بہم پہنچائی تھی جن کا ارتقا برطانوی حکومت کے زیر سرپرستی تیزی سے ہو رہا تھا۔ مزید برآں اسلامی ضابطہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فوجداری کی جگہ تعزیراتِ ہند کے نفاذ نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت کو مزید ابتر بنا دیا۔

اس ضمن میں محمڈن کالج کلکتہ کے پرنسپل ڈبلیو نساولیز کے سلسلۂ خطوط کے چند اقتباسات قابلِ ملاحظہ ہیں جو انھوں نے دی ٹائمز کو لکھے کیوں کہ ان خطوط میں بیان کیے گئے عوامل بڑی حد تک مذکورہ بالا عوامل سے ملتے جلتے ہیں۔ بقول نساولیز مسلمانوں کی اہم ترین شکایات یہ تھیں:(78)

انام کمیشن نے کئی مسلمان خاندانوں کو بلاوجہ اُن انعامی زمینات سے محروم کر دیا جو انھیں ہندستان کے مسلمان حکمرانوں نے عطا کی تھیں

اُس قانون نے اسلامی ضابطہ دیوانی اور مذہبی قوانین کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا جس کی رُو سے اپنا مذہب تبدیل کر کے عیسائی بن جانے والے افراد کو بھی حق وراثت عطا کیا گیا۔

حکومت نے قاضیوں اور مفتیوں کے عہدے ختم کر کے مسلمانوں کی معاشی اور سماجی زندگی پر ایک ضربِ کاری لگائی۔

حکومت نے مسلمانوں کے تعلیمی مدات اور اوقاف پر غاصبانہ تصرف کے ذریعے انھیں ایسے تمام فوائد سے محروم کر دیا جس کے وہ قانوناً مستحق تھے (اس ضمن میں بطور خاص مشہور محسن فنڈ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے)(79)

حکومت نے اپنی الطاف وعنایات کے دروازے اُن مسلمانوں پر بند کر دیے جو اپنے علوم، قوانین، ادب اور زبان پر مہارت تامہ رکھتے تھے۔

ہندوؤں نے انھیں جان بوجھ کر ہر قسم کی سرکاری ملازمت سے دور رکھنے کی کوشش کی اور حکومت نے اس ناانصافی کے تدارک کی کوئی کوشش نہیں کی۔

ان تمام عوامل کا اجتماعی اثر یہ ہوا کہ مسلمان تمام سرکاری عہدوں سے محروم ہو گئے۔ اور چونکہ زیادہ تر مسلمانوں کا انحصار سرکاری ملازمتوں پر ہوا کرتا تھا اس لیے بے روزگاری اور غربت ان کا مقدر بن گئی۔

مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجوہات خواہ کچھ ہی رہی ہوں یہ حقیقت ہے کہ بنگال اور دیگر صوبوں کے مسلمان رہنماؤں کو اس بات کا احساس انتہائی شدت کے ساتھ ہونے لگا کہ اگر ان کے ہم مذہبوں کو وقت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے تو انھیں فوری طور پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزی تعلیم کی جانب متوجہ ہوجانا چاہیے اور اپنی سماجی عادات واطوار میں بدلے ہوئے حالات کے مطابق مناسب تبدیلیاں پیدا کرلینی چاہئیں۔

لیکن ایسا کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس کے لیے نہ صرف مسلمانوں کے نقطہ نظر میں انقلابی تبدیلی درکار تھی بلکہ ان کے ماحول میں بھی ایسا ہونا لازمی تھا۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت قدیم معتقدات اور پرانے رواج کی گرویدہ تھی جس کی وجہ سے وہ اس انقلابی تبدیلی کے مخالف تھے۔ ان حالات میں اُن مٹھی بھر مسلمانوں کو جنھوں نے نئی قدروں پر ہندوستان میں اسلامی ڈھانچے کو استوار کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس سلسلے میں اصلاح پسندوں کی راہ کا سب سے بڑا روڑا وہ علماء ثابت ہوئے جنھیں اُس وقت بھی خواص وعوام میں یکساں نفوذ حاصل تھا۔[80] یہ گروہ عہد رفتہ کے اسلام کی باقیات میں سے ایک ہے جس کی اساس قدیم روایات اور فرسودہ رواجوں پر قایم ہے علماء کے اس گروہ نے نہ صرف ہندوؤں کے ساتھ عدم تعاون کی تلقین کی بلکہ حکومت کی جانب سے کیے جانے والے عوامی فلاح وبہبود کے ہر اقدام کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے خواہ اُس میں کتنی ہی اچھائیاں کیوں نہ ہوں۔ اُن مٹھی بھر مسلمانوں کو جنھوں نے انگریزی تعلیم کو اپنا رکھا تھا ان علماء نے "کافر" قرار دے دیا اور ان کا سماجی مقاطعہ کر ڈالا۔ حالی نے لکھا: "ہر وہ شخص جس نے اپنی ابتری کو بہتری میں بدلنے کی کوشش کی عیّار اور بزدل قرار دیا گیا۔ اُس پر طعن وتشنیع کی بوچھاڑ کی گئی جس میں الحاد کا فتویٰ سب سے عام ہے۔"[81]

علما کے کہنے کے مطابق مسلمانوں کی نجات کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ از سرِ نو اُس اسلام کی جانب رجوع کریں جس کی تشریح خود علماء کی کی ہوئی ہو۔ "سماجی اداروں اور معاشی روابط" کی نئی دنیا سے علماء نے بقول پروفیسر ٹوائنبی "راہبانہ علیحدگی" (Asceticism Acceptance) اختیار کر رکھی تھی۔ علماء کے نزدیک یہ نئی دنیا نوعی اور فطری اعتبار سے بجز برائیوں کی آماجگاہ کے اور کچھ نہیں جس سے انسان کو فرار اختیار کرنا چاہیے۔ ہر وہ شخص جسے اپنی آخرت کی روحانی زندگی کی فکر ہے وہ اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے گا اور اس نئی دنیا کی تسخیر اس بات میں مضمر ہے کہ اس سے راہِ فرار اختیار کی جائے۔"[82]

نتیجتاً اُنھوں نے جدید مغربی تصورات کے خلاف مذہبی جنگ یعنی ایک قسم کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاد کی تلقین کرنی شروع کر دی جو "فتح" کے نام پر "ہزیمت" اٹھانے کے حکم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

علماء نے نہ صرف اَن پڑھ عوام کی مذہبی جبلتوں کو اُکسا کر ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ اُنھوں نے کئی شاعروں اور ادیبوں کی تائید حاصل کر کے دانشوروں پر بھی اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ جن ادیبوں اور شاعروں نے علماء کے موقف کی تائید کی اُن میں سب سے اہم نام عظیم اردو شاعر اکبر الہ آبادی کا ہے جنھوں نے اپنے طنز و مزاح کے ذریعے بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ ہندستان میں رائج ہونے والے نئے رجحانات اور نئی تحریکوں کا مذاق اڑایا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی وجہ سے اکبر کے شیدائیوں نے اُنھیں لسان العصر کا خطاب دے ڈالا۔

وہ اپنی ایک نظم میں ہندستان میں لائی جانے والی نئی سماجی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

روشنی جن میں نئی ہے وہ مری سنتے نہیں
لاکھ سمجھاؤ کہ صاحب ہے یہ فانی روشنی
انجم و شمس و قمر لیکن ہیں میرے ہم طریق
وضع پر قایم ہیں اُن میں ہے پُرانی روشنی (83)

اکبر نظامِ نَو پر ہنستے رہے پھبتیاں کستے رہے کیوں کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اِس نظام میں نہ تو خلوص ہے اور نہ ہی سچائی۔ اُنھوں نے خاص طور پر مسلمانوں میں عہد رفتہ کی عظمت کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ انھوں نے مکمل جاہ و جلال کے ساتھ ماضی کی رنگا رنگ تصویر کشی کی۔ انھوں نے تہذیب جدید کی سطحیت کو خوب خوب اُجاگر کیا اور اس کا مقابلہ اعلیٰ مشرقی قدروں کے ساتھ کیا۔ اپنے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے اکبر نے اردو ادب کو عظیم ترین طنزیہ نظموں کا خزینہ عطا کیا۔ انھوں نے اپنی مخصوص نظموں میں مغرب زدہ ہندستانیوں کا مذاق اس طرح اڑایا ہے:

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
[illegible] کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے (84)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک اور مقام پر اکبر کے طنز کا نشتر اس قدر تیز تو نہیں تاہم یہاں اکبر کی خود اظہاریت بدرجہ اتم موجود ہے۔

اللہ رے انقلابِ طرز و مذاقِ مشرق
حافظ کے شعر کیسے سب پڑھ رہے ہیں ریڈر
لیلیٰ کا ناز رخصت اسکول مسٹریس ہیں
سودائے قیس غایب اب وہ بنے ہیں لیڈر

نئی تبدیلیوں کے خلاف مخالفت کا یہ طوفان اگرچہ بہت شدید تھا لیکن یہ زیادہ دیر اُن نئی طاقتوں کے مقابلے میں ٹک نہ سکا جنھوں نے اوروں کے ساتھ ساتھ ہندستانی مسلمانوں کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لے رکھا تھا۔ اس کی بھی کئی وجوہات تھیں۔ اوّل تو یہ کہ برطانیہ والوں نے انگریزی تعلیم کی ہر طرح ہمت افزائی کرنے کا بیڑا اُٹھا رکھا تھا۔ دوسری جانب ہندوؤں، پارسیوں اور سکھوں کی وہ مادّی ترقی تھی جو انھوں نے انگریزی تعلیم کی وجہ سے کی تھی۔ تیسری جانب سرسید احمد خاں، سید امیر علی اور بدرالدین طیب جی جیسے مخلصین کی انتھک کوششیں تھیں اور آخر میں ہندستان کے بااثر مسلمانوں میں اس بات کا بڑھتا ہوا شعور تھا کہ مسلمان پرانے اور فرسودہ طریقوں سے چپکے رہ کر کوئی ترقی نہیں کر سکتے جیسا کہ حالی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

اے ہندستانی مسلمانو! کیا تم آج بھی ماضی کی اُسی دنیا سے چمٹے ہوئے ہو جس میں تمہارے آبا و اجداد رہا کرتے تھے؟ خبردار!
تمہارا سفینہ شکستہ ہے اور سمندر میں بھیانک طوفان آیا ہوا ہے(86)

شبلی اگرچہ خود ایک مشہور و جید عالم تھے لیکن انھوں نے قدامت پسند علما پر سخت حملے بھی کیے ہیں انھوں نے اسلام اور اسلامی تاریخ کے اپنے تمام علم کو (جس میں وہ ید طولیٰ رکھتے تھے) علما کے موقف کی نفی کرنے کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات پیش کر کے اس بات کو واضح کیا کہ مسلمانانِ ہند کے لیے لازمی ہوگیا ہے کہ وہ نئی طاقتوں کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی زندگیوں کو وقت کے بدلتے ہوئے سانچوں میں ڈھال لیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے ایک مقالے میں جس کا عنوان "اقوامِ غیر کی تقلید" تھا اس بات کو حق بجانب قرار دیا کہ عند الضرورت غیر اقوام کی تقلید کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں کوئی مضائقہ نہیں۔ علمائے وقت کے نظریے کے برخلاف اپنے اس تقلیدی نظریے کو درست ثابت کرنے کے لیے شبلی نے تاریخ اسلام سے کئی مثالیں پیش کی ہیں۔

شبلی نے قرآنی آیات، احادیث کے متن اور فقہی احکامات کو پیش کر کے اس بات کو ثابت کیا کہ ہر دور میں اسلام نے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ یہی لچک تو دراصل اسلام کی ہمہ گیریت اور آفاقیت کی ضامن ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کس طرح ابتدائی خلفاء بنو امیہ اور بنو عباس نے لباس، مکانات، طرز رہائش، پولیس کا نظم و نسق، تعمیرات عامہ، ڈاک کا نظام سرحدوں کی تقسیم، طب، فلسفہ، ادب اور فنون کے میدانوں میں جی کھول کر غیروں سے اور خصوصاً یونانیوں اور ایرانیوں سے اچھی اچھی باتیں مستعار لیں۔ شبلی نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ اس ملک میں اسلامی ترقی کے لیے ہندستانی علماء نے کوئی خاطر خواہ خدمت انجام نہیں دی۔[87]

رائے بریلی کے وہابی لیڈر سید احمد کے دور ہی سے علما نے اس امر کا چرچا کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہندستان دارالحرب[88] ہے۔ اس لیے تمام سچے مسلمانوں کو کسی پڑوسی اسلامی مملکت میں ہجرت کر کے چلا جانا چاہیے۔ یہ نظریہ نہ صرف برطانوی انتظامیے کے لیے خطرے کا باعث تھا جیسا کہ ہندستان کی متعدد وہابی بغاوتوں کے دوران محسوس کیا گیا، بلکہ خود مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھا کیوں کہ اس طرح مسلمانوں کو دائماً غیر یقینی حالات میں زندگی بسر کرنا پڑتی۔ وہ پہلا عالم دین جس نے اس نظریے کی صداقت کو چیلنج کیا، مولوی کرامت علی جونپوری کی ذات تھی۔ انھوں نے برملا اعلان کیا کہ برطانیہ کے زیر تسلط ہندستان "دارالحرب" نہیں بلکہ "دارالامن" ہے[89]۔ کیونکہ برطانوی حکمراں مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتے اور جمعہ کی نماز کا انعقاد مسلمان کسی وقت یا دشواری کے بغیر کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں اسلام جہاد کی قطعی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہندستان کے مشرکین پر کسی قسم کے حملے کا جواز موجود ہے۔[90]

سرسید، مولوی چراغ علی اور سید امیر علی جیسے مسلمان مصلحین کی کوششوں کے باعث دارالحرب کے نظریے نے آہستہ آہستہ دم توڑ دیا۔ ان بزرگوں نے اس نظریے کو اتنا گہرا دفن کر دیا کہ اُس کے پھر سے سر اٹھانے کا امکان ہی باقی نہ رہا۔

مسلمان مصلحین کو علما کے علاوہ عیسائی تبلیغی مشنریوں کے ساتھ بھی نبرد آزمائی کرنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑ رہی تھی ۔ اُن عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کو راسخ العقیدہ مسلمان اسلام کے لیے بہت بڑا چیلنج سمجھتے تھے اور اُن دنوں انگریزی تعلیم کا سارا انتظام چونکہ انھی عیسائی مبلغین کے ہاتھوں میں تھا اس لیے شدید خواہش کے باوجود اکثر مسلمان والدین اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دینے کے لیے ان عیسائی مبلغین کے حوالے کرنے سے گریز کرتے تھے[91]۔ اُن دنوں کئی ہندوؤں اور عماد الدین اور صفدر علی جیسے چند مسلمانوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا جس کے باعث مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی کہ ہندستانیوں کو انگریزی تعلیم دینے کا اصل مقصد انھیں اپنے مذہب سے بیگانہ کر کے عیسائی بنانا ہے[92]۔ خود حالی نے بھی کہا کہ "حکومتی سرپرستی اور اثر و رسوخ کے باعث عیسائیت میں ایک طرح کی مقناطیسی کشش پیدا ہو گئی ہے جس کے باعث لوگ اس کی جانب کھنچے چلے جا رہے ہیں"[93]۔ سیرام پور میں انگلش باپٹسٹ مشن English Baptist Mission کے کیری، مارشمن اور وارڈ جیسے اور کلکتے کے نواح میں اینگلیکن چرچ کے ٹجانن، ڈیوڈ براؤن اور ہنری مارٹن جیسے مبلغین کے تبلیغی کام کو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی کہ جوق در جوق ہندستانی عیسائیت کو اپنانے لگے جس کی وجہ سے بعض اچھے خاصے مغرب زدہ مسلمانوں کو بھی تردد لاحق ہوا اور انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ انگریزوں نے نہایت ہی لطیف طریقے سے ہندستان میں عیسائیت کی عام ترویج کے لیے جہاد سا چھیڑ دیا ہے[94]۔

لیکن بعض مسلمان مصلحین نے اس صورتِ حال سے خاطر خواہ فایدہ اٹھایا۔ انھوں نے عوامی خطبات اور مطبوعہ مضامین کے ذریعے مسلمانوں پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دی کہ جب تک مسلمان انگریزی زبان سیکھ کر مغرب کے جدید نظریات سے کماحقہٗ واقفیت بہم نہ پہنچا لیتے اُس وقت تک عیسائی مبلغین کے حملوں سے اسلام کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ یہ مصلحین بطور خاص چراغ علی اور امیر علی مسلمانوں کے سامنے اسلامی عقاید اور فقہی مذاہب کی مدلل اور عام فہم تشریح پیش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ مسلمانوں کے نئے دانشور طبقے کو بے حد متاثر کر سکے جو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ترویج کے باعث بتدریج اُبھر رہا تھا۔ دراصل تبلیغ اسلام کے اس جدید انداز کی وجہ سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دلوں میں نہ صرف اپنے مذہب کی دفعتہً ہی جاگزیں ہوئی بلکہ انھیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ اسلام نہ صرف نئے نظام ہی کا مقابلہ کر سکتا ہے بلکہ اس سے بھی اعلیٰ و ارفع ثابت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو سکتا ہے۔(95)

جس زمانے میں مسلمان اپنے ہم مذہبوں میں انگریزی تعلیم اور مغربی نظریات کی ترویج کا کام کر رہے تھے اُس وقت ہندوؤں میں سیاسی اور سماجی شعور بیدار ہونے لگا تھا کیونکہ تعلیم کی اس دوڑ میں وہ مسلمانوں سے پچاس سال آگے تھے۔ راجا رام موہن رائے ہندوؤں میں یہ شعور 1830ء کے اوایل ہی میں پیدا کر چکے تھے۔ راجا صاحب نے اُس دور میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول پر واضح کر دیا تھا کہ سرکاری عہدوں پر مقامی باشندوں کا حق ہے۔ اُن کے برہمو سماج نے، جو کہ بنیادی طور پر ایک سماجی ادارہ تھا، ہندوؤں میں کسی حد تک سیاسی شعور بیدار کرنے میں نمایاں کردار انجام دیا۔ یہی کام دوارکا ناتھ ٹیگور کی قایم کردہ زمینداروں کی اُس انجمن نے بھی کیا جس کی داغ بیل 1833ء میں رکھی گئی تھی۔ یہ تنظیم جلد ہی سرکار اور ہندو زمیندار طبقے کے مابین رابطے کی صورت اختیار کر گئی اور ایک وقت میں تو یہ اتنی طاقتور ہو گئی کہ فرینڈ آف انڈیا اور کلکتہ کو ریر جیسے مقتدر برطانوی اخبارات نے اسے مسلسل تنقید کا ہدف بنا لیا۔ کے۔ سی۔ متراؔ نے (K.C. Mitra) اپنی انگریزی کتاب میں اس تنظیم کو ہندستان میں منظم دستوری احتجاج کا بانی قرار دیا ہے(96) اس کے کوئی تیرہ برس بعد 29 اکتوبر 1851ء کو بنگالی ہندوؤں کے ایک گروہ نے جس کا تعلق نئے ابھرنے والے متوسط طبقے سے تھا ایک ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا نام انھوں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا۔ اس نئی تنظیم کا مقصد حکومت کو ان سرگرمیوں سے باخبر رکھنا تھا "جو برطانیہ اور ہندستان کے مشترکہ مفادات کو آگے بڑھائیں اور اس محکوم ملک کے مقامی باشندوں کی حالت میں بہتری پیدا کرنے کا باعث ہوں(97)"۔ دی ہندو پیٹریاٹ اس تنظیم کا ترجمان تھا۔ 1853ء تک اس تحریک کی سرگرمیاں بنگالی حدود سے باہر پہنچ چکی تھیں۔

اس کے علاوہ بھی دیگر کئی کم اہم عوامی ادارے تھے جن کا نظم و نسق ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا اور جو ہِل، برک، شیریڈن اور فوکس Fox جیسے برطانوی مفکرین سے متاثر تھے۔ ان اداروں کے ارکان لبرلزم کا گہرا مطالعہ کرتے تھے جو اُن دنوں مغربی فکر کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں اس بات کا شعور بیدار ہونے لگا کہ اپنے ملک کی قومی زندگی میں اُنھیں کونسا جایز مقام حاصل ہونا چاہیے۔ یہ احساس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوؤں میں کس قدر جلد پیدا ہوا اس کا اندازہ الگزنڈر ڈف کے ذیل کے بیان سے ہوتا ہے جس میں وہ بڑے خوف و ہراس کے ساتھ ہندوؤں میں "غیر مطمئن اور بے چین شورش پسندوں" کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے جو "اقتدار اور سرکاری مناصب کے بھوکے ہیں اور جن میں حکومت کے خلاف شدید ترین باغیانہ جذبات موجود ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت نے ناجائز طور پر وہ اقتدار ہڑپ کر لیا ہے جس کے جائز حقدار وہ خود ہیں۔"(98)

مزید برآں ہندوؤں نے اپنی سرگرمیوں کے دایرے کو ہندستان ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ جان ڈکنسن اور ہیچ۔ڈی۔سیمور ایم۔ڈی جیسے ہمدردوں کی اعانت سے انھوں نے مارچ 1853 میں لندن میں انڈیا ریفارم سوسائٹی قایم کی جسے بہت جلد جان برائٹ (John Bright) کابڈن (Colden) اور دسکاونٹ گاڈرچ (جو بعد میں مارکوس آف رپن بن گئے) جیسے مشہور برطانوی رہنماؤں کی ہمدردیاں حاصل ہوگئیں۔ جدید تعلیم یافتہ ہندوؤں کے اثر کی وجہ سے ایک دہائی سے کم وقفے میں لندن انڈیا سوسائٹی اور ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن جیسے دیگر ادارے بھی عالم وجود میں آ گئے۔ عناصر ترکیبی کے اعتبار سے اول الذکر ادارہ خالص ہندستانیوں پر مشتمل تھا جبکہ آخر الذکر میں یوروپینوں کے لیے رکنیت کے دروازے کھلے تھے چنانچہ اس میں کئی ایسے پارلیمانی ارکان اور امرا شریک تھے جنھیں ہندستانی امور سے دلچسپی تھی۔(99)

ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کی 25 جولائی 1867 کو منعقد ہونے والی ایک میٹنگ میں ڈبلیو۔سی۔بنرجی نے جو بعد میں انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے صدر بھی منتخب ہوئے ایک مقالہ بعنوان "ہندستان کے لیے ایک نمایندہ اور جوابدہ حکومت" پڑھا جس میں کہا گیا کہ موجودہ طرز کا انتظامیہ یقیناً ناکامیاب ہو جائے گا کیوں کہ نہ تو اس کی بنیاد جواب دہی کے اصول پر رکھی گئی ہے اور نہ ہی اسے عوامی حمایت اور ہمدردی حاصل ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں بنرجی نے ہل، مازینی اور آسٹن کی تحریروں سے اقتباسات پیش کرتے ہوئے اس امر کا ادعا پیش کیا کہ ہندستان بھی کینیڈا کی قسم کی جوابدہ حکومت کے قیام کے لیے انتہائی موزوں ملک ہے۔(100)

اس کے برخلاف مسلمانوں میں بہت کم سیاسی شعور پروان چڑھا کیوں کہ اُن کے پاس نہ تو ضروری تعلیم تھی اور نہ روابط۔ بقول کپ لینڈ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے سیاسی نظریات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے۔ غالباً اس دور کا ایک اوسط ہندو طالب علم اکثر نوجوان انگریزوں کے مقابلے میں یورپ کے لبرل نظریات اور نیشنلسٹ تحریکوں کے بارے میں زیادہ جانتا تھا۔ ایک مسلمان اوسط طالب علم تو اس بارے میں بہت ہی کم جانتا تھا۔[151] اسی وجہ سے مسلمان اپنے آپ کو نہ تو مناسب طور پر منظم ہی کر سکے اور نہ ان میں ہندوؤں کے ساتھ سیاسی احتجاج میں شریک ہونے کی خواہش تھی۔ کیونکہ سیاست کی پیچیدگیاں ان کی فہم و ادراک سے بالا تھیں۔ وہ 1857 کے غدر کی کافی قیمت ادا کر چکے تھے اور اب اس قدر مفلس اور سہمے ہوئے تھے کہ مزید خطرات مول لینا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ تاہم مسلمان ہندستان میں رواج پانے والے سیاسی میلانات اور نظریات سے بالکلیہ منحرف نہیں رہے۔ جوں جوں ان میں انگریزی تعلیم عام ہوتی گئی توں توں ان کی سیاست سے دلچسپی بڑھتی رہی اس سلسلے کا پہلا اقدام بنگال کے مشہور مسلم لیڈر نواب عبدالطیف کی جانب سے کیا گیا۔ انھوں نے اپریل 1863 میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس سوسائٹی کا جلسہ ہر مہینے نواب صاحب کے دولت کدے واقع ٹولٹولا لین کلکتہ پر منعقد ہوا کرتا تھا جس میں متمول مسلمان سیاسی اور سماجی مسائل پر علمی بحثیں کیا کرتے تھے۔

سوسائٹی کے بانیوں نے اس ادارے کے قیام کا مقصد "مسلمانوں کے اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقوں کو خطبات اور مجالس مذاکرہ کے ذریعے ادب، سائنس اور سماج کے مختلف موضوعات کے بارے میں مفید معلومات بہم پہنچانا قرار دیا تھا"۔[152] اس سوسائٹی کے خطبات اور لکچرس اس کی ماہانہ میٹنگوں میں اردو یا انگریزی میں دیے جاتے تھے۔ بعض اوقات ان کی زبان فارسی اور عربی بھی ہوا کرتی تھی۔

نواب صاحب اور ان کے رفقا مغرب سے بے حد متاثر تھے وہ اندھی تقلید کی حد تک انگریزی افکار و خیالات کے قائل تھے۔ وہ برطانوی حکومت کے اس حد تک مدح خواں تھے کہ انھوں نے برملا اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ ہندستان پر برطانوی حکومت سے بہتر آج تک کوئی حکومت قایم نہیں ہوئی۔

اس سوسائٹی نے خصوصاً بنگالی مسلمانوں میں عصری مسائل سے کسی حد تک دلچسپی پیدا کی۔ اس سوسائٹی کی میٹنگوں میں لوگ بھاری تعداد میں شریک ہوا کرتے تھے ہندستان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے طول و عرض میں بسنے والے سربرآوردہ مسلمان گھرانوں کے پانچ سو سے زیادہ افراد نے اس سوسائٹی کی رکنیت قبول کر رکھی تھی جس کی سرپرستی بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر کیا کرتے تھے

سیاسی اعتبار سے یہ سوسائٹی حکومت کی دل و جان سے وفادار تھی۔ اس کی میٹنگوں میں حکومت پر کسی بھی قسم کی تنقید کی اجازت نہیں تھی خواہ وہ کتنی ہی نرم یا تعمیری ہی کیوں نہ ہو۔ اس ادارے کا نصب العین ہی برطانوی حکومت کی غیر متزلزل وفاداری تھا۔ جس کی توثیق اکثر مذہبی احکامات کے ذریعے بھی کی جاتی تھی جو مسلمان برطانوی حکومت سے اختلاف رکھتے تھے یا اس پر تنقید کیا کرتے تھے۔ یہ سوسائٹی انھیں اسلام سے غداری کرنے والے افراد قرار دینے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتی تھی۔ اس مقصد کے لیے سوسائٹی نے چند چوٹی کے علماء سے فتوے بھی حاصل کر لیے تھے۔ مسلمانوں کی جانب سے وداع ہونے والے اور نئے آنے والے لیفٹیننٹ گورنروں اور وائسرایوں کی خدمت میں الوداعی اور استقبالیہ خطبات پیش کرنا اس سوسائٹی کا خاص مشغلہ تھا جن میں بڑے ہی خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ اور محاوروں کی مدد سے حکومتِ برطانیہ کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کا اظہار کیا جاتا تھا۔

سال میں ایک بار کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں یہ سوسائٹی علمی مذاکرے Conversazione کی مجلس منعقد کیا کرتی تھی جس میں سرکردہ یورپینوں اور ہندوؤں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اس موقعے پر طبعی فلسفہ، کیمیا، طبیعات اور برقیات سے متعلق ایک سائنسی نمایش کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ اس مجلسِ مذاکرہ کے انعقاد کا ایک مقصد تو یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو سائنٹفک مطالعے کی جانب راغب کیا جائے دوسری جانب اس کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ مسلمانوں کا رابطہ سرکردہ یورپینوں اور بنگال کے ہندوؤں سے قایم کیا جائے جس زمانے میں ڈیوک آف ایڈن برگ ہندستان تشریف لائے تھے انھوں نے 29 دسمبر 1869ء کو ایک ایسی ہی مجلس مذاکرہ میں شرکت کی تھی اور سوسائٹی کو اپنی آمد کی یادگار کے طور پر اپنی ایک تصویر تحفتاً عنایت کی تھی۔

اگرچہ اس سوسائٹی نے مسلمانوں میں سیاسی شعور کو بیدار کرنے کے سلسلے میں کوئی خاص خدمت انجام نہیں دی تاہم اس نے مسلمانوں کو برطانوی تہذیب کے ان گوشوں سے روشناس کرانے میں جو ہندستانیوں کی زندگی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ قابل قدر کردار ادا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا۔ مثال کے طور پر اس سوسائٹی نے مسلمانوں میں انگریزی زبان و ادب کی ترویج کے سلسلے میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ اسی کی کوششوں کے باعث یہ مضامین پہلے پہل کلکتہ کے مدرسے میں اور بعد ازاں بنگال کے دیگر تعلیمی اداروں میں داخل نصاب کیے گئے۔ یہ سوسائٹی اہل ثروت سے چندے جمع کر کے غریب مسلمان طالب علموں کی فیس ادا کیا کرتی تھی

اس سلسلے کا دوسرا قدم سرسید نے اٹھایا (جنھیں اُس وقت تک "سر" کا خطاب نہیں ملا تھا) اُنھوں نے ۶ جنوری 1864ء کو غازی پور کے مقام پر ایک دارالترجمہ قایم کیا جو بعد ازاں علی گڑھ منتقل کیا گیا اور سائنٹیفک سوسائٹی کہلائی یا اس کا افتتاحی جلسہ سرسید کے مکان پر منعقد کیا گیا تھا جس کی صدارت ایک اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس مسٹر جی۔ ایف۔ آئی گراہم G.F.I. Graham نے انجام دی۔ جنھوں نے بعد میں سب سے پہلے سرسید کی سوانح لکھی۔ اپنی تقریر میں گراہم نے سوسائٹی کے بانی کو خوبصورت خراج عقیدت پیش کیا۔ اُنھوں نے کہا "ہندستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک مسلمان نے تن تنہا بغیر کسی مدد کے اس سوسائٹی کا تصور کیا اور اس کا قیام عمل میں لایا تاکہ مغربی دنیا کی اقوام کے علم اور ادب سے مشرق کے اُن گنت لوگوں کو واقف کرایا جا سکے"(103)

اس سوسائٹی کے قیام کے اغراض و مقاصد کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید نے مقامی باشندوں کی اُس "عظیم جہالت" کا شکوہ کیا ہے جو ان میں یوروپین اقوام کے "اطوار اور وسائل" سے عدم واقفیت کے باعث پائی جاتی ہے۔ انھوں نے سیاسی تعلیم پر خاص زور دیا۔ وہ کہتے ہیں: "قدیم زمانے میں ہمیں سیاسی معیشت کے تصور سے آگاہی حاصل تھی لیکن اس موضوع پر ہمارے قدیم مصنفین کی کوئی بھی کتاب آج موجود نہیں ہے ..... سیاسی معیشت سے لاعلمی کے باعث ہندوستانی باشندے اُن اصولوں سے قطعی لاعلم ہیں جن کی بنیاد پر ان کے ملک میں حکمرانی کی جا رہی ہے"(104) اُس مقصد کے لیے سوسائٹی نے سیاسیات اور معاشیات کے موضوع پر کئی یوروپین کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں کروایا۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی رائے عامہ کو متاثر کرنے میں ان کتابوں نے کوئی معمولی اثر نہیں ڈالا ہوگا۔

کوئی دو برس بعد ۱۰ مئی 1866ء کو سرسید نے دوسرا اہم کارنامہ انجام دیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے خالص سیاسی تھا۔ انھوں نے علی گڑھ کے مقام پر یوروپینوں اور ہندستانیوں پر مشتمل ایک مقتدر مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ آیندہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ہندستانی معاملات کو مزید اہمیت دیتے ہوئے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اُسی جلسے میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سرسید نے اپنی طویل تقریر میں ہندستان میں ایک ایسے ادارے کے قیام کی ضرورت پر زور دیا جو برطانوی پارلیمنٹ کو ہندستانی عوام کی ضروریات اور خواہشات سے باخبر رکھ سکے۔ انھوں نے برطانوی پارلیمنٹ کے تعلق سے ہندستانی عوام کی عدم دلچسپی اور لاعلمی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا " جب تک آپ لوگ اپنے معاملات کو برطانوی پارلیمنٹ کے روبرو پیش نہیں کریں گے آپ کیوں کر توقع رکھ سکتے ہیں کہ اُس کے ارکان آپ کے معاملات سے گہری دلچسپی لینے لگیں ؟ " " فرد کے حقوق و فرایض " سے متعلق اسٹورٹ مل کی تحریر سے اقتباس پیش کرتے ہوئے سرسید نے سامعین سے کہا کہ وہ " اخلاقی بزدلی " کو ترک کر دیں(105)

تاہم سرسید نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ہندستانیوں کو یہ کام اپنے حکمرانوں کے ساتھ وفاداری قایم رکھتے ہوئے اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے انجام دینا چاہیے۔ انھوں نے عوام سے خواہش کی کہ وہ حکومت کے روبرو اپنی شکایات اور بیم و رجا کو نہایت احترام اور ایمانداری کے ساتھ بلا جھجک اس طرح پیش کیا کریں کہ آپ کا یہ عمل ان کے نزدیک حکومت کے ساتھ آپ کی حقیقی وفاداری کا مماثل ہی نہیں مترادف بن جائے "(107)

سرسید کا بنیادی مقصد دراصل مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو عام کرنا تھا اسی وجہ سے ان کی سیاسی اور نیم سیاسی کوششیں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں۔ کیونکہ ان کی جانب سرسید نے کبھی سنجیدگی سے توجہ ہی نہیں کی۔ اس کے علاوہ سرسید کو سیاسی احتجاج سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی وہ اسے پسند کرتے تھے۔

عملی سیاست سے سرسید کی عدم دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جب امیر علی نے مسلمانوں کے لیے سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن نامی ایک سیاسی تنظیم کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا تو اوّل الذکر نے کسی قسم کا تعاون پیش کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے یہ تنظیم حکومت کی وفادار ہی رہتی۔ امیر علی نے اپنی سرگزشت میں لکھا " ہندستان اور انگلستان میں کئی بار میں نے سرسید سے برطانوی ہند کی سیاسی معیشت میں مسلمانوں کے موقف اور ان کے مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ سرسید نے اپنی تمام تر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

توجہات انگریزی تعلیم اور مسلمانوں کی علمی تربیت پر ہی مرکوز کر رکھی تھیں۔ گو مجھے بھی ان چیزوں کی اہمیت کا اعتراف تھا لیکن میرا موقف یہ تھا کہ اگر ہندو محبانِ وطن کے شانہ بہ شانہ متوازی خطوط پر مسلمانوں کی سیاسی تربیت نہ کی جائے تو وہ من حیث القوم نئی ابھرتی ہوئی قومیت کے طاقتور دھارے میں غرق ہو جائیں گے۔ پہلے پہل تو انھوں نے میری پیش گوئی کی صداقت کو قبول ہی نہیں کیا لیکن مجھے یقین ہے کہ نیشنل کانگریس کے قیام نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ 1876ء میں جب میں نے سنٹرل نیشنل محمڈن اسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تو احتراماً انھیں اپنا گرانقدر تعاون پیش کرنے کے لیے مدعو کیا تھا لیکن انھوں نے ہماری دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" (108)

لیکن سرسید کی بے اعتنائی کے باوجود کلکتہ میں اس ایسوسی ایشن کا کامیاب افتتاح 12 مئی 1878ء کو عمل میں آ گیا۔ اس طرح مسلمانوں کو سیاسی پلیٹ فارم پر لانے کی پہلی منظم کوشش کا آغاز ہو گیا۔ ایسوسی ایشن کا صدر دفتر کلکتہ کی نمبر 2 روڈیا اسٹریٹ میں قایم کیا گیا۔ اس تحریک کی ایک ابتدائی رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا:

> یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے قیام سے پہلے ہندستانی مسلمانوں کی کوئی ایسی سیاسی جماعت موجود نہیں تھی جو حکومت کے روبرو وفادارانہ لیکن آزادانہ انداز میں اسی ملک کے ان مسلمانوں کی کثیر آبادی کی امیدوں اور امنگوں اور ضروریات و خواہشات کی ترجمانی کر سکتی جو اپنی تعداد اور تجانس Homogeneity کے اعتبار سے اُن تمام ہی مسائل کے ساتھ نہایت ہی اہم اور گہری وابستگی رکھتے ہیں جن کا تعلق ہندستان کی فلاح و بہبود سے ہے۔ (109)

وہ تمام ادارے جو اس ایسوسی ایشن سے قبل قایم ہو چکے تھے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے دراصل ادبی یا سائنٹیفک نوعیت کے تھے۔ چونکہ اس وقت تک مسلمانوں کی کوئی نمائندہ سیاسی جماعت موجود نہیں تھی اس لیے بسا اوقات حکومت کو مخصوص علاقوں کے مسلمانوں کے قومی مسایل کے تعلق سے انھی اداروں سے صلاح و مشورہ کرنا پڑتا تھا۔ (110) سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کا قیام ان مشکلات کو دور کرنے کے لیے عمل میں آیا تھا جن کا سامنا مسلمانوں کو کرنا پڑ رہا تھا۔ (111) ٹیپو سلطان کے ایک پڑپوتے شہزادہ محمد فرخ شاہ کو اس ایسوسی ایشن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا صدر اور امیر علی کو اس کا معتمد اور خازن منتخب کیا گیا۔ ہندوؤں کو اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ اس ایسوسی ایشن کی فرقہ دارانہ ساخت کسی طرح بھی اُن کے مفادات کے خلاف نہیں ہے اس تنظیم کی مجلس انتظامیہ میں کے۔ این۔ چٹرجی اور شالی گرام سنگھ نامی دو ہندوؤں کو شامل کیا گیا۔ اسی ایسوسی ایشن کے پراسپکٹس میں یہ بات زور دے کر کہی گئی کہ اس ملک کے مسلمانوں کی خوش حالی کا دارومدار بڑی حد تک ہندوستان کی دوسری قوموں کی خوش حالی پر منحصر ہے۔[112]

سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے قیام کے نتیجے میں ہندستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں ایسی ہی کئی مسلم انجمنیں قایم ہوگئیں جن کے اغراض و مقاصد تقریباً اسی قسم کے تھے اور جن کی کارکردگی کو کلکتہ ہی سے بہتر طور پر مربوط و منضبط کیا جاتا تھا۔ ان اہم مقامات میں جہاں ایسی انجمنیں قایم کی گئی تھیں بوگرا، چٹاگانگ، بھاگل پور، پٹنہ، گیا، امرتسر، مدراس، کراچی، بمبئی اور لکھنؤ قابل ذکر ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کا کام چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا (1) سماجی (2) ادبی (3) قانونی (4) سیاسی۔ یہ ادارہ وائسرایوں اور مقامی حکومتوں کے علم میں مسلمانوں کی شکایات کو لانے کے ضمن میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتا تھا۔

اُن دنوں تمام ہی عوامی تنظیموں کا دائرۂ کار محدود ہوا کرتا تھا اسی لیے اُن کی افادیت بھی محدود ہوا کرتی تھی۔ اُن تنظیموں کا کوئی راست یا بالواسطہ تعلق نہ تو حکومت سے ہوا کرتا تھا اور نہ ہی عوام سے ان کے قریبی روابط ہوا کرتے تھے۔ لیکن تعلیم یافتہ لوگ ان تنظیموں کو ان کے کام اور سماجی وقار کے باعث سنجیدگی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کو نوزائدہ جوش و خروش کے اظہار کا طبعی ذریعہ سمجھتے تھے۔ جب کبھی یہ تنظیمیں مقامی باشندوں کی شکایات اور مطالبات کو پیش کرتیں تو برطانوی حکام ان پر ہمدردی سے غور کرتے بعض اوقات ہندستان پر عملداری کے ساتھ حکومت کرنے کے لیے قوانین و ضوابط وضع کرتے وقت حکومت اِن تنظیموں کے مسلمہ رہنماؤں کے ساتھ صلاح و مشورہ بھی کیا کرتی تھی۔ لیکن اس کی حیثیت صرف اور خالص مشاورت ہی کی ہوا کرتی تھی اور اس بات کا اظہار بار بار کلکتہ اور لندن سے کیا جاتا تھا۔

دوسری دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ انجمنیں فرقہ واریت سے بالکل پاک تھیں۔ نام کے لحاظ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے تو یہ ہندستانی تھیں لیکن اغراض و مقاصد کے اعتبار سے یہ وسیع المشربی اور بے تعصبی کے اصولوں پر کاربند تھیں۔ لیکن عملی اعتبار سے یہ ادارے اپنے بانیوں اور منتظموں کے مذہبی عقاید کے لحاظ سے ہندو یا مسلم اداروں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ چنانچہ زمینداروں کی ایسوسی ایشن کا مسلم زمینداروں سے بہت ہی کم تعلق تھا۔ یہی حال برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا تھا جس کا کام کاج بنیادی طور پر ہندو ہی چلایا کرتے تھے۔ ایسی ہی صورتِ حال سرسید کے دارالترجمہ کی تھی۔ جو زیادہ تر مسلمانوں ہی کی ضروریات کی تکمیل کرتا تھا۔ ان کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے سرپرستوں میں بھی برائے نام ہی چند ہندو شامل تھے۔ عہد رفتہ کے اُس زریں دور میں افراد کو انجمنوں پر فوقیت حاصل تھی۔ انجمنیں تو صرف متعلقہ رہنماؤں کے عزائم کی تکمیل کا ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔"[13]

جوں جوں وقت گذرتا گیا توں توں یہ سیاسی سرگرمیاں اپنی محدودیت کے باوجود دستوری ارتقا پر اثر انداز ہونے لگیں۔ چھوٹے موٹے انتظامی امور کے بارے میں بطور استحقاق نہیں بلکہ نظرِ عنایت برطانوی عہدیداروں نے ان ہندستانیوں سے صلاح و مشورہ کرنا شروع کر دیا جنھوں نے برطانیہ کے دستوری رواج اور طریقوں سے واقفیت بہم پہنچائی ہو۔ پارلیمنٹ نے بھی اُن کی سرگرمیوں کو ملحوظِ خاطر رکھا اور 1861ء عیسوی کے کونسل ایکٹ کی رو سے چند "عالی مرتبت مقامی باشندوں" کو گورنر جنرل اور بنگال، مدراس اور بمبئی کے تینوں پریسیڈنسی گورنروں کی کونسلوں میں بیٹھنے کی اجازت دی (کیونکہ اس کے علاوہ اُن کے کرنے کے لیے اُس وقت اور کچھ کام نہیں تھا) اس طرح منتخب ہونے والے ارکان کو "زاید ارکان" کہا جاتا تھا اور ان سے صرف قانون سازی کے معاملات میں مشورہ کیا جاتا تھا انھیں عاملانہ معاملات سے کوسوں دور رکھا جاتا تھا۔ ایسے زاید اراکین کی نامزدگی کی پہلی فہرست میں جملہ چھ عوامی رہنماؤں میں سے تین کا تعلق ہندستان سے تھا۔ بعد ازاں یہ تناسب گھٹتا بڑھتا رہا لیکن کئی برسوں تک 15 یورپین اراکین کے مقابلے میں 3 ہندستانی اراکین کا اوسط قایم رہا۔

ابتدائی دو برسوں میں اس قانون کے تحت جن ہندستانیوں کا انتخاب عمل میں آیا وہ سب ہندو تھے لیکن 1869ء میں نواب محمد یوسف علی خاں کو گورنر جنرل کی کونسل کا رکن مقرر کیا گیا۔ وہ پہلے مسلمان ہیں جن کی نامزدگی اس طرح عمل میں آئی تھی۔ یہاں اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ان دنوں جو بھی نامزدگیاں کی جاتیں خواہ وہ ہندوؤں کی ہوں یا مسلمانوں کی اُن لوگوں کا تعلق لازماً سماج کے اونچے طبقے ہی سے ہوا کرتا تھا۔ ابتداً شہزادوں کو منتخب کیا جاتا تھا لیکن چند برسوں بعد دوسرے طبقے کے رہنماؤں کو بھی شامل کیا جانے لگا جو اعلیٰ سماجی حیثیت کے حامل تھے۔

چونکہ نواب صاحب وہ پہلے مسلمان ہیں جنھیں گورنر جنرل کی کونسل پر نامزد کیا گیا تھا اس لیے اُن کی زندگی کے پس منظر کا مطالعہ اس دور کے مسلمانوں کے حالات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ وہ رام پور کے والی تھے اور با اثر حلقوں میں ایک مدبر کی حیثیت سے قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ انھیں علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ تنگ نظر اور کوتاہ ذہن انسان نہیں تھے بلکہ وسیع النظری اور کشادہ قلبی ان کے خاص اوصاف تھے۔ انھوں نے اپنی ریاست کے باہر بھی سماجی مقاصد کے لیے جی کھول کر مدد دی۔ مثال کے طور پر انھوں نے علی گڈھ میں کالج کے قیام کے لیے سرسیّد کو ایک خطیر رقم کا عطیہ دیا۔ 1857ء کے غدر کے دوران انھوں نے برطانوی فوجی عہدیداروں کی بہت قدر کی۔ انھوں نے نہ صرف رام پور بلکہ مراد آباد کی بھی اُس وقت حفاظت کی جب انگریزی عہدیدار وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ انھوں نے 32 برطانوی خواتین اور بچّوں کی جانیں بچائیں۔ انھوں نے ضروری اشیاء اور کافی بڑی رقم نینی تال بھی بھجوائی۔ 1859ء میں فتح گڈھ کے مقام پر منعقدہ وائسرائے کے دربار میں لارڈ کیننگ نے کھلے بندوں اُن کی وفادارانہ خدمات کا اعتراف کیا اور ان کے اعزاز کو بڑھا کر ان کے لیے 13 توپوں کی سلامی مقرر کر دی۔ 1865ء میں نواب کے انتقال کے بعد ان کے جانشین اور لڑکے محمد کلب علی خاں کو وائسرائے کی کونسل کے رکن کی حیثیت سے نامزد کیا گیا لیکن اگلے ہی سال ان کی رکنیت ختم کر دی گئی اور ان کی جگہ خواجہ عبدالغنی نامی ایک ایسے شخص کو نامزد کیا گیا جو نہ تو شہزادہ تھا اور نہ شہزادگی سے کسی قسم کا تعلق رکھتا تھا۔ یہ تبدیلی کافی اہمیت کی حامل تھی۔ یہ مسلمانوں میں پیدا ہونے والی اُس تبدیلی کا ایک لحاظ سے اعتراف تھا جو اب تک صرف شہزادوں ہی کو رہنما سمجھتے آئے تھے۔

خواجہ عبدالغنی کا تعلق مشرقی بنگال کے زمینداروں کے ایک ایسے خاندان سے تھا جو برطانوی تسلط کے بعد افلاس کا شکار ہو گیا تھا۔ اپنی شخصی جدوجہد کے باعث انھوں نے

محکم لائبریری سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی حالت بڑی حد تک مستحکم کر لی تھی۔ 1857ء کے غدر کے دوران وہ انگریزوں کے وفادار رہے اور ان کی بڑی مدد کی۔ وہ ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھے لیکن ان کی مذہبیت وسیع المشربی پر مبنی تھی۔ 1869ء میں جس وقت شیعہ اور سُنّی مسلمانوں کے درمیان تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اُس وقت غنی نے اپنی کوششوں سے دونوں میں مصالحت کرا دی۔ اُنھوں نے لوشائی اور ناگا مہمات کے دوران حکومت کی جی کھول کر مدد کی۔ اُسی طرح قحط کے دوران بھی انھوں نے حکومت کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ خیراتی اداروں کو انھوں نے سیکڑوں ہزاروں روپیوں کے عطیات دیے' ڈھاکہ میں انھوں نے اپنے ذاتی مصارف سے آب رسانی کا کام مکمل کروایا تاکہ لوگوں کو خالص اور پاک وصاف پانی میسر آ سکے۔ حکومت اور عوام دونوں ہی نگاہوں میں اُن کے رفاہی کاموں نے انھیں ہر دلعزیز بنا دیا۔ گورنر جنرل کی کونسل پر نامزدگی سے قبل وہ بنگال کونسل کے رکن رہے۔ 1871ء میں انھیں سی۔ ایس۔ آئی (C.S.I.) کے اعزاز سے نوازا گیا' 1876ء میں "نواب" کے خطاب سے اور 1886ء میں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی K.C.S.I. کے اعزاز سے ان کی تکریم کی گئی۔ اُن کا انتقال 1889ء میں ڈھاکہ میں ہوا۔

گورنر جنرل کی کونسل پر رکن کی حیثیت سے غنی کو دو سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ کام کرنے کا موقع ملا۔ اُن کے بعد قریباً دس برس (1878ء — 1869ء) تک پھر مسلمان کی نامزدگی عمل میں نہیں آئی۔ اس خلا کی وجہ معلوم کرنا اس لیے مشکل ہے کہ ان دنوں نامزدگیاں فرقہ وارانہ بنیادوں پر نہیں کی جاتی تھیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ہندو اُن دنوں عوامی زندگی کے ہر میدان میں دیگر فرقوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے سبقت لے جا رہے تھے۔ اسی وجہ سے اُن دنوں کی سیاست جو اپنی اساس اور نوعیت کے لحاظ سے خالص مذہبی طرز کی تھی بالکلیہ ہندو ماحول میں پروان چڑھ رہی تھی اسی وجہ سے رفتہ رفتہ سیاست نے بھی ہندو رنگ اختیار کر لیا تھا۔

1879ء کے آخری حصے میں ممتاز الدولہ نواب سر فیض علی خاں بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کو گورنر جنرل کی مجلس کی رکنیت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اُس وقت کونسل کے نامزد ارکان کی تعداد (قانون اور ضوابط کی رو سے) 16 ہو گئی تھی جن میں ایک مسلمان اور چار ہندو شامل تھے۔ اگلے سال ایک اور مسلمان یعنی سرسید کا اضافہ کیا گیا۔ جبکہ ہندو ارکان کی تعداد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گھٹ کر صرف دو رہ گئی۔ ۱۸۸۳ء میں سر فیض علی کی رکنیت ختم کر دی گئی۔ اب کونسل میں تنہا سرسید باقی رہ گئے لیکن اگلے سال انھوں نے بھی استعفیٰ پیش کر دیا اور اگلے تین برسوں میں پھر کسی مسلمان کی نامزدگی عمل میں نہیں آئی۔ ۱۸۸۵ء میں آٹھ زاید ارکان میں دو ہندو تھے اور باقی تمام یوروپین۔

یہ صورتِ حال ہرگز اس بات کی غمازی نہیں کرتی کہ اُن دنوں مسلمانوں کے تعلق سے حکومت کا رویہ سخت گیر ہو گیا تھا۔ اس کے برخلاف حکومت تو مسلمانوں کے مسایل پر اکثر ہمدردانہ غور کرتی تھی اور ان کا خاص لحاظ رکھتی تھی۔ اب مسلمان بھی انگریزی تعلیم کی جانب ذوق و شوق سے مایل ہونے لگے تھے اور ایسی کئی تحریکیں چل پڑی تھیں جن کا مقصد انگریزی تہذیب کو مسلمانوں میں رائج کرنا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڈھ کے مقام پر سرسید نے علماء کے شدید اختلاف کے باوجود محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کی بنیاد رکھی جس کے باعث خلافِ توقع سرعت کے ساتھ تمام ملک کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم سے دلچسپی پیدا ہو گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کے لیے مدرسے قایم ہو گئے کچھ تو ان تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے اور کچھ سرسید کی ذاتی کوششوں کے باعث اب حکومت بھی مسلمانوں کی جانب زیادہ توجہ مرکوز کرنے لگی۔ ابتداً تو یہ لطف و عنایت برائے نام ہی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ حکومت کی فراخدلی میں اضافہ ہوتا رہا اور سال بہ سال ملکۂ معظمہ کی جانب سے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو عطیات و خطابات سے نوازا جانے لگا۔ ان دنوں چونکہ افسر شاہی بام عروج پر تھی اور ملکہ معظمہ کے نام میں عوام کے لیے وہی جادو تھا جو مشرقی فرماں رواؤں کے نام میں ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے یہ انعامات اور خطابات اُس دور کی عوامی زندگی کے آئینہ دار تھے۔ عوامی رہنماؤں اور حکمرانوں کے مابین کسی مابین کسی نزاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لازمی تھا کہ دونوں کے تعلقات آپس میں خوشگوار رہیں اور اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ اکثر رہنما سماجی فلاح و بہبود اور تعلیمی مسائل میں مصروف رہتے تھے اور سیاسی شورش پسندی کے خیال کو بھی اپنے نزدیک پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ دراصل سربرآوردہ ہندستانی اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ وہ "بادشاہ سے بڑھ کر بادشاہت پسند ہیں۔ حتیٰ کہ عوامی سطح پر جب کوئی سیاسی بحث چھڑتی تو انتہائی وفادارانہ انداز میں، ہر عوامی تنظیم کے منشور کے ابتدائیے میں، خواہ وہ مسلمانوں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تکلیم ہو یا ہندوؤں کی، ملکہ معظمہ کے ساتھ وفاداری کا پرشکوہ الفاظ میں اظہار کیا جاتا اور ملکہ معظمہ اپنی جانب سے ہندستانی رعایا کے وفادار رہنماؤں کی عزت افزائی کرنے سے شاید ہی چوکتیں۔

یہ خطابات و مناصب ہندستان کی عوامی زندگی میں مختلف فرقوں کی اضافی اہمیت کے آئینہ دار ہیں۔ 1861ء میں پہلی بار ملکہ معظمہ نے بعض ہندوستانیوں کو برطانوی خطابات سے نوازا۔ نائٹ کمانڈر Knight Commander کا خطاب پانے والے آٹھ ہندستانیوں میں 6 ہندو تھے اور 2 مسلمان۔ دس سال بعد 1871ء میں بعض اعلیٰ ترین خطاب پانے والوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نائٹ گرینڈ کمانڈر (اکثر شہزادے) : 11 ہندو، 1 مسلمان
نائٹ کمانڈر : 8 ہندو، 4 سکھ 2 مسلمان
کمپنین : 9 ہندو، 3 سکھ، 1 پارسی، 11 مسلمان

اس کے اگلے دس سال بعد اس طرح تقسیم ہوئی :

نائٹ گرینڈ کمانڈر : 9 ہندو، 1 سکھ، 4 مسلمان۔
نائٹ کمانڈر : 15 ہندو، 4 مسلمان۔
کمپنین : 16 ہندو، 1 سکھ، 12 مسلمان

1885ء میں خطاب پانے والوں کا فرقہ وارانہ تناسب اس طرح تھا :

نائٹ گرینڈ کمانڈر : 11 ہندو، 4 مسلمان
نائٹ کمانڈر : 12 ہندو، 1 سکھ، 2 مسلمان
کمپنین : 13 ہندو، 3 پارسی، 3 سکھ، 12 مسلمان

یکم جنوری 1878ء کو ملکہ معظمہ نے ایک نیا خطاب "آرڈر آف دی انڈین امپائر" وضع کیا۔ یہ خطاب بلحاظ عہدہ مصاحبین کو عطا کیا جاتا تھا۔ 1885ء میں 4 ہندوؤں اور 1 مسلمان کو اس خطاب سے نواز اگیا جبکہ کمپنین کا خطاب پانے والوں میں 25 ہندو، 4 سکھ، 4 پارسی اور 21 مسلمان شامل تھے۔ اُسی سال خواتین کے لیے مختص کردہ خطاب "امپیریل آرڈر آف دی کراؤن آف انڈیا" سے نوازی جانے والی ہندستانی خواتین 7 ہندو اور 2 مسلمان خواتین تھیں۔[14]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداً بہر حال زیادہ خطابات ہندؤں کو عطا کیے گئے مسلمان نوابوں کے مقابلے میں اُن دنوں ہندو راجاؤں پر زیادہ اعتماد کیا جاتا تھا۔ صرف نچلے درجے کے خطابات کی حد تک نئے مسلم امراء کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا گیا۔ یہ بات خاص طور مصاحبین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتی ہے۔ تاریخی ریکارڈ سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ خطابات فرقہ وارانہ بنیادوں پر دیے جاتے ہوں۔ اور نہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطابات عوامی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیے جاتے ہوں۔ بسا اوقات اِن خطابات کا مقصد شہزادوں، زمینداروں، مصلحوں اور عوامی خدمات انجام دینے والوں کی سماجی حیثیت کا اعتراف ہوتا تھا۔ اِن خطابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں عوامی زندگی میں مسلمانوں کا موقف کس قدر کمزور ہوا کرتا تھا۔

جوں جوں ہم اس دور کے اختتام تک پہنچتے ہیں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ بعض ذمہ دار مسلم رہنماؤں کی ہمہ جہتی کوششوں کے باوجود مسلمانوں کی حالت میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ اگرچہ مسلمانوں میں کسی قدر بہتری ضرور پیدا ہوئی لیکن نہ تو یہ وقت کے تقاضوں کے مطابق تھی اور نہ ہی اُن کے حسبِ حال تھی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے قائدین کی تمام تر توجہات کا مرکز تعلیمی مسئلہ رہا بالخصوص اعلیٰ انگریزی تعلیم۔ ذیل کی جدول میں مسلمانوں کی جامعاتی سطح پر تعلیمی ترقی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے:

1858ء تا 1887ء کے دوران ہندو اور مسلمان گریجویٹس میں مسلمانوں کا شعبہ وار فیصد

دور	فنون (آرٹس)	قانون	طب و سرجری (جراحت)	انجینیرنگ	جملہ
1858-63	1.13	—	2.2	—	1.1
1869-69	1.9	1.6	2.6	—	1.8
1870-75	1.2	1.5	4.2	—	1.6
1876-81	2.03	1.3	0.93	—	1.5
1882-87	3.6	4.3	2.0	1.5	3.6

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُن تمام برسوں میں ہندستان کی جملہ آبادی میں مسلمان کا فی صد 2.3 سے کچھ زیادہ تھا۔ اس قدر معمولی انگریزی تعلیم کی وجہ سے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان اپنے آپ میں کوئی ذہین طبقہ پیدا نہ کر پائے جسے ترقی کی امنگ بے تاب رکھتی اور جو سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمان بالکلیہ اطراف و اکناف میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے یکسر آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف چونکہ مسلمانوں میں نئی قیادت کے ابھرنے کے کوئی واضح امکانات موجود نہ تھے اس لیے زوال پذیر امراء کے طبقے نے، جس میں اب بیداری پیدا ہو چکی تھی، اس نئی صورتِ حال کا جی کھول کر استحصال کیا۔ اس طبقے نے انگریزی تعلیم کو اپنا کر اور انگریزوں کے ساتھ وفاداری جتلا کر اپنا موقف کافی مستحکم کر لیا۔ جہاں تک ہندوؤں کا سوال ہے اُن کے بیشتر رہنما اُس متوسط طبقے سے ابھرے جو کاروبار اور تجارت کے فروغ کے باعث اُن میں اُبھرا۔ نئی ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برا ہونے کی نیت سے ہندوؤں نے انگریزوں کی عادات و اطوار کو اپنانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔[115] مزید برآں مسلم رہنماؤں کے برخلاف سیاست کی جانب ہندو رہنماؤں کا نقطۂ نظر خالص مشرقی نہیں تھا بلکہ بڑی حد تک مغربی طرزِ فکر سے متاثر تھا۔[116] ہندو اور مسلم قیادت کے مابین پایا جانے والا یہ حقیقی اختلاف دونوں فرقوں کے درمیان دست و گریبانی کا باعث تھا وقت کے گزرنے اور مفادات کے ٹکراتے رہنے کے باعث اس اختلاف میں مزید شدت پیدا ہوتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگے کیونکہ دونوں ہی واقعات کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ مزید برآں ہندو قایدین صرف ہندستانی مسائل میں دلچسپی رکھتے تھے اور اپنے قدیم ماضی سے وجدان حاصل کیا کرتے تھے جبکہ مسلم رہنماؤں کی نگاہیں اس سلسلے میں ہندستان کے جغرافیائی حدود کو پھلانگ جاتی تھیں۔ ان کی ہمدردیاں دراصل وہاں وہاں تک پہنچ جاتیں جہاں جہاں اُن کے ہم مذہب آباد ہیں جیسے ترکی، ایران، مصر، عربستان، تریپولی، مراقش حتیٰ کہ چین۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں قیادتوں کے مابین ایک خلیج سی پیدا ہو گئی جو سیاسی شعور کی بیداری اور ہندستان میں دستوری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

(باب ۱ - پس منظر)

Notes and References

(1) Farquhar :- Modern Religious Movements in India (91)

(2) اس نظم کا انگریزی منظوم ترجمہ کیپٹن ڈبلیو فرینکلن نے کیا ہے اور اسے اپنی کتاب History of the Reign of Shah Alam میں ضمیمے کے طور پر شامل کیا ہے۔

(3) Sleeman: Rambles and Recollections, II, 182

(4) ایضاً Ibid, 183

(5) Ibid, 184

(6) Forest :- Life of Clive, II, 120

(7) Heber :- Narrative of a Journey, I, 177; II, 13, 17, 385.

(8) Ibid, I, 298

(9) Ibid.

(10) Henry Martin: Journal, II, 32

(11) تھامسن اور گیرٹ نے کتاب موسومہ Rise and Fulfilment of British Rule in India کے صفحے 353 پر نقل کیا ہے۔

(12) کرزن نے اپنی کتاب British Government in India کی دوسری جلد کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صفحہ 199 پر نقل کیا ہے۔

(13) Durand: Life of Sir H. Durand, I, 84.

Law, Sir Algaranan (Ed.): India under Lord Ellenborough, 65.

(15) ڈلہوزی نے یہ عبارت اپنے 16 اگست 1853ء کے خط میں لکھی۔ دیکھیے کتاب موسومہ Private Letters of the Marquess of Dalhousie صفحہ 262

(16) The friend of India, June 25, 1887

(17) Cunningham: Earl Canning, 65.

(18) جان لارنس کہتا ہے کہ جب مسلمان سپاہیوں نے "دیکھا کہ بغاوت کو وسعت دے کر ایک ایسی سیاسی تحریک کی صورت دی جا سکتی ہے جس سے مسلمانوں کے مفادات کو تقویت حاصل ہو سکتی ہے تو انھوں نے مستعدی کے ساتھ بغاوت کے شعلوں کو ہوا دینا شروع کر دیا۔" دیکھو Parl Papers, XXXV, Sess. (1859) 334-36

مزید برآں میجر جی۔ ایف میکین کے مطابق "سرکشوں نے جن کی بڑی تعداد اودھ کے ہندو سپاہیوں پر مشتمل تھی سلطنتِ مغلیہ کے دوبارہ قیام کا اعلان کر دیا اور بوڑھے کمزور بہادر شاہ کو، جو اندھے شاہ عالم کا بیٹا تھا، مجبور کر دیا کہ وہ شہنشاہ ہند کا کردار ادا کرے۔" دیکھو Pantaloon Mac Munn's: The Armies of India, 917

(19) Campbell: Memoirs of my Indian Career, II, 391-402

(20) "میں نے کسی اور مسئلہ پر اتنا غور و خوض نہیں کیا اور نہ اس قدر شواہد تلاش کیے۔ ہر قابلِ حصول شہادت کو پرکھ کر اب میں نہ صرف اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے جس کا مجھے کافی عرصے سے شک تھا بلکہ سابقہ توقعات کے برعکس اب مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا ہے کہ عامۃ المعلمین پر اس قسم کی الزام تراشی کرنا سراسر زیادتی ہے اور یہ کہ ہندستان میں کسی قسم کی مسلم عوامی تحریک کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔" Ibid - 392 - 93

اس بارے میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے:

T. Rice Holmes: A History of the Indian History, 44/43, 185

(21) Russell: My Diary in India, I, 74

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(22) شاید لارڈ ولیم بنٹنک Lord William Bentinck سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے

(23) Russell :- My Diary in India, II 73.

(24) Roberts: Letters Written during the Indian Mutiny P 115

(25) دیکھیے 1857/ میں لندن سے جاری کردہ پمفلٹ بعنوان " ہمیں مسلمانوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے"

(26) جی۔ او۔ ٹریویلین نے اپنی کتاب موسومہ The Competition Wallah (صفحہ 316) میں بتلایا ہے کہ " ہمارے ہم وطن اکثر' نرم طبیعت ہندو' پر طنز کیا کرتے تھے لیکن' فوجی خونخوار مسلمانوں کے لیے دشنام طرازیوں کا سلسلہ' بھی جاری رہتا"

(27) The Bombay Gazette, Feb. 16, 1874

(28) سر ورنی لووٹ نے اپنی کتاب موسومہ A History of the Indian Nationalist Movement میں نقل کیا ہے۔

(29) مزید دیکھیے کتاب موسومہ The Mutinies and the People اس کتاب میں وفاداری کا انعام پانے والوں کی جو فہرست دی گئی ہے اُس میں مسلمانوں کے کئی نام ملتے ہیں

(30) Sir Syed: The Loyal Muhammadans of India Part I, 3.

(31) 1857/ کے غدر کے بعد مسلم روسا کی زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے نذیر احمد کے مشہور ناول " مراۃ العروس" کا مطالعہ کیجیے۔

(32) دیکھیے مکتوب الڈھاکہ مورخہ 13 جولائی 824 ا موسومہ رائٹ آنریبل ڈبلیو ویس وین Heber: Journal, II, 340-41

(33) T. Grahame Bailey

(34) دیکھیے " مسدس حالی" صفحات 80-81 مکتبہ جامعہ دہلی 1941) ۔ مترجم ٹی گراہم بیلی کے انگریزی ترجمہ " مسدس حالی" سے ۔ ایضاً ۔ صفحہ 95

(35) ایس ۔ ایس ۔ ٹیوٹ کے انگریزی ترجمہ " رُباعیات حالی " سے ۔ دیکھیے ان کی کتاب The Quatrains of Hali صفحات 65-66

۔ اردو رباعی کے لیے دیکھیے " کلیات حالی" جدید کتاب گھر دہلی مطبوعہ مارچ 1960 صفحہ 133

(36) ۔ دیکھیے سرسید کا مکمل مضمون بعنوان " قوم کی زندگی اور موت" جو ماہنامہ " معارف"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے دسمبر 1869ء کے شمارے میں مصنف کی وفات کے بعد شایع ہوا۔

(37) وزارت داخلہ کی قرارداد نمبر 310-300 مورخہ 7 اگست 1871ء

(38) ۔ وزارت داخلہ کی قرارداد نمبر 7-2384-7 مورخہ (شملہ) 13 جون 1873ء

مزید دیکھیے "ہندستان کی مسلم رعایا کی تعلیمی حالت سے متعلقہ 1871-73 کے درمیان کی گئی مراسلت مشمولہ Selection from the Records of the Govt. of India (Home Deptt.)

(39) ۔ یالو نے بہ حیثیت وائسرائے کے جو یادداشت مرتب کی اُس میں ایک جگہ لکھا: "ہم لوگ ہندستانی رعایا کے نہ صرف ایک بڑے اور اہم طبقے کی ہمدردیاں اور اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں بلکہ ہمیں اس بات کا بھی خوف ہے کہ شاید ہم نے اس طبقے میں ایک مثبت سیاسی بے چینی Positive disaffection بھی پیدا کردی ہے۔"

ہندستان کے مختلف صوبوں سے حاصل کردہ ہندو اور مسلم طلبا کی تعداد کے اعداد و شمار پر تبصرہ کرتے ہوئے یالو کہتا ہے کہ حتیٰ کہ بنگال میں بھی جو کبھی مسلمانوں کا مضبوط قلعہ تصور کیا جاتا تھا مسلمان طلبا کی تعداد صرف 14000 ہے جبکہ ہندو طلبا تعداد میں ایک لاکھ کے برابر ہیں۔ تعلیمی میدان میں "اُس قوم کی اس افسوس ناک تعلیمی پسماندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے، جو حال حال تک اس ملک کی سب سے طاقتور قوم تھی" وہ مسلمانوں میں پائی جانے والی بے چینی کی وجوہات کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کا علاج بھی تجویز کرتا ہے۔

دیکھیے ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی تصنیف کردہ کتاب A Life of the Earl of Mayo جلد دوم صفحات 8-307 ۔ مزید دیکھیے۔

Annual Report on the administration of the Territories under the Lt. Governor of Bengal during the year 1870-71 Cal, 1872) 33-34

(40) Hunter :- Indian Musalmans, 159

(41) Ibid :- ,, , 159

(42) Ibid :- ,, , 159

43 ۔ ہنٹر نے اپنی کتاب Indian Musalman کے صفحہ 160 پر نقل کیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

44۔ ہنٹر کی کتاب Indian Musalman صفحہ 163

45۔ 163 " "

46۔ 163 " "

47۔ 165 " "

48۔ 165 " "

49۔ 166 " "

50۔ 167 " "

51۔ 169 " "

52۔ 172 " "

53۔ ہوبرٹ، یادداشت نمبر II مورخہ 29 جولائی 1872ء۔ مزید دیکھیے اس کی کتاب Essays and Miscellaneous Writings جلد دوم صفحات 270-84

مزید دیکھیے اس کی یادداشت نمبر XXX مولہ بالا جلد دوم صفحات 451-53

54 Essays and Miscellaneous Writings II, 272

55 II, 272

ہنٹر اور ہوبرٹ کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی تصدیق 31 جولائی 1872ء والے معزز دارالعوام کے خطبے کے اُس جواب سے ہوجاتی ہے جو 22 مئی 1874ء کو پیش کیا گیا جس میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ سے زیادہ تنخواہ والی آسامیوں پر ہندستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے اُن تقررات کے تقابلی اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں جو 1867ء، 1868ء، 1869ء، 1870ء اور 1871ء کے دوران عمل میں آئے۔ ان اعداد و شمار میں 17 فروری 1875ء کو بحکم جارج ہیملٹن انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ ان انڈیا، ترمیم کی گئی۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ (A)

56۔ دیکھیے انڈین آرمی اینڈ سول سروسز لسٹ بابتہ 1871ء

57۔ ملاحظہ ہو مہتمم تعلیمات بمبئی (ڈایرکٹر آف پبلک انسٹرکشن بمبئی) کی رپورٹ بابتہ 1871-72 ضمیمہ H، تختہ نمبر (VII) 108-109

58۔ ملاحظہ ہو۔ ایضاً۔ تختہ نمبر (IV) - 76

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

59۔ سرسید: لکچروں کا مجموعہ (اردو) 86

60۔ Lytton:- Personal and Literary Letters of E. 65

61۔ The Times، لندن، 14 اکتوبر 1871ء

62۔ ملاحظہ ہو Selection from the Records of the Govt. of India، ہوم ڈپارٹمنٹ سلسلہ نشان 2، صفحات 237-44 Home Dept (No CCV)

63۔ اس یادداشت کے تفصیلی متن کے لیے ملاحظہ ہو حوالہ مندرجہ بالا کے صفحات 237-44

64۔ اس یادداشت میں مسلمانوں کے معاملے کو جس انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اس سے نواب عبداللطیف متفق نہیں تھے جو اُس زمانے میں بنگال کے مشہور مسلم رہنما تھے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اس یادداشت میں مسلمانوں کے انحطاط اور زبوں حالی کی تمام تر ذمہ داری انتہائی غیر دانشمندانہ طور پر برطانوی حکومت پر ڈال دی گئی ہے اور خود مسلمانوں میں پائی جانے والی افراط و تفریط کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انھیں اس بات کی بھی شکایت تھی کہ یادداشت مرتب کرنے والوں نے اُن عوامل کو بالکل ملحوظ خاطر نہیں رکھا جن پر نہ تو حکومتِ برطانیہ کو دسترس حاصل تھی اور نہ خود مسلمانوں کو۔ انھوں نے یادداشت میں کیے گئے اس مطالبے کی بھی سختی سے مخالفت کی کہ ملازمتوں کی تقسیم میں تنہا مسلمانوں کو خصوصی مراعات سے نوازا جائے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اس قسم کا مطالبہ مساوات کے اُس اصول سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا جس کی اساس پر انگریزوں نے اپنے نظم و نسق کو استوار کیا تھا۔ ملاحظہ ہو وائسرائے کے نام نواب صاحب کی یادداشت موسومہ "ہندستانی مسلمانوں کی موجودہ حالت"۔ مزید ملاحظہ ہو مقامی حکومتوں کی جانب سے دیے گئے یادداشتوں کے جوابات مشمولہ Selections from the Records of the Govt. of India، وزارت داخلہ سلسلہ نشان 2، صفحات 245-345 Home Dept. No. CCV

65۔ "انیسویں صدی" LXVI، 193-215، The Nineteenth

66۔ 208 " "

67۔ 208 " "

68۔ 209 " "

69۔ ملاحظہ ہو لندن کے اخبار دی ٹائمز کے نامہ نگار مقیم کلکتہ کا ہفتہ واری تار جو الن کے انڈین میل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مورخہ 28 جنوری 1855 کے صفحات نمبر 77-76 میں شایع ہوا ہے۔

70۔ ملاحظہ ہو گزٹ آف انڈیا مورخہ 18 جولائی 1885 کی اشاعت کا ضمیمہ بعنوان "برطانوی ہند میں مسلمان قوم کی تعلیم اور ان کے سرکاری ملازمتوں پر تقرر کا مسئلہ"

71۔ مسلمانوں کو انتظامیہ میں مناسب نمایندگی دیے جانے کے خصوصی مطالبے کے جواز میں مسلم اخبارات نے بارہا اس قرارداد کے اقتباسات شایع کیے۔ خاص طور پر ملاحظہ ہو مسلم کرانیکل کی 12 جنوری 1901ء کی اشاعت کا اداریہ

72۔ ملاحظہ ہو F.D. Ascoli: Early Revenue History of Bengal (29-37)

73۔ ملاحظہ ہو Cambridge History of India, V, 434

74۔ " V, 445-446

75۔ فرینڈ آف انڈیا (30 اپریل 1846) کے مطابق "ان اقدامات کے نتیجے کے طور پر برطانوی حکومت نے اپنی آمدنی میں 4,500,000 (پینتالیس لاکھ) روپے سالانہ کے زائد محصول کا اضافہ کر لیا۔

76 ابتداً اس قسم کی جانچ پڑتال بڑی احتیاط اور دقت نظری کے ساتھ کی گئی لیکن بعد کے برسوں میں یہ ایک بے لطف اور اکتا دینے والا عمل ثابت ہوئی۔ بالآخر (مارچ 1871ء) کو حکومت نے اس جانچ پڑتال اور بازیابی کے اس سلسلے کو موقوف کر دیا۔ کے۔ سی۔ مترہ کے بقول "اس عہد کے اخبارات عمل بازیافت کی ستم ظریفیوں کے شکوؤں اور شکایات سے بھرے پڑے ہیں کیوں کہ یہ کارروائی باضابطہ طور پر کام کرنے والی عدالتوں کے ذریعے نہیں کی جا رہی تھی بلکہ خصوصی اور غیر معمولی ٹریبونلوں کے ذریعے کروائی جا رہی تھی۔ پٹنہ ٹیلر اسی قسم کا ایک ٹریبونل تھا جس کی صدارت مسٹر ولیم کر رہے تھے۔ اس ٹریبونل نے ایک ہی دن میں نوسو سے زاید مقدمات کا فیصلہ صادر کر دیا۔" ملاحظہ ہو کے۔ سی۔ مترہ کی کتاب مسمومہ دوارکا ناتھ ٹیگور صفحات 33-32۔

77۔ ملاحظہ ہو سید احمد امیر علی کا خطبہ بعنوان "ہندستان کے مسلمان" جو انھوں نے 16 نومبر 1871ء کو لندن کی اس ایسوسی ایشن کے روبرو پڑھا جو ہندستان میں سماجی ترقی کی امداد کے لیے قایم کی گئی تھی۔

78۔ W. Nassan Lees, Indian Musalman, 3-35

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

79 ۔ بنگال کے ہگلی ضلع میں رہنے والے ایک متمول مسلمان نے نیک مقاصد کے لیے "محسن فنڈ" قایم کیا تھا جس میں خطیر رقم محفوظ تھی۔ اگرچہ یہ فنڈ خالصتاً مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے قایم کیا گیا تھا لیکن برطانوی حکومت نے اس کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے ایک غیر مسلم کالج کے قیام پر اسے صرف کیا۔ اس کے برخلاف بنگالی مسلمانوں میں شدید غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ہنٹر W.W. Hunter کی کتاب ہندستانی مسلمان صفحات 86-87 / 184 مزید ملاحظہ ہو مہندر چندر مترا کی کتاب "لائف آف حاجی محمد محسن"۔

80 ۔ ہیوز نے اپنی ڈکشنری آف اسلام میں "علماء" کی تعریف یوں بیان کی ہے :

"عالم کی جمع ، وہ جو علم رکھتا ہے' فاضل' تبحر علمی رکھنے والا"۔ جمع کی شکل میں یہ اصطلاح' اسلامی قانون اور الٰہیات کے اُن فضلاء کے مجموعے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو شیخ الاسلام کی زیر صدارت اسلامی ریاست کی مذہبی اساس تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے فتاویٰ اور فیصلوں کے ذریعے ملت اسلامیہ کو درپیش انفرادی اور اجتماعی اہمیت کے مسایل کی یکسوئی کرتے ہیں۔ قسطنطنیہ کے علما کو جو خلافت کا مرکز ہے اور مکہ کے علماء کو جو اسلام کا مقدس ترین شہر ہے اپنے اثر و اقتدار کے لحاظ سے خاصی اہمیت حاصل ہے۔ آنحضرت صلعم کے صحابہ کو جو فوقیت خلفاء کے دور میں حاصل رہی تقریباً ویسی ہی اہمیت بعض امور میں آج بھی اسلامی ممالک کے دستور کے لحاظ سے علماء کو حاصل ہے تاکہ مشرقی فرماں رواؤں کی مطلق العنانی پر کسی نہ کسی قسم کی گرفت انھیں حاصل رہے۔ بحوالہ بالا صفحہ 650

81 ۔ مقالات حالی از حالی ' حصہ اوّل صفحہ 28

82 ۔ Tawney, R.H. Religion and the Rise of Capitalism P.25

83 ۔ ملاحظہ ہو طالب الہ آبادی کی اردو تصنیف اکبر الہ آبادی صفحہ 62

84 ۔ یہ رباعی "رباعیات اکبر" سے ماخوذ ہے جس کا انگریزی ترجمہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی انگریزی کتاب "اے کلچرل ہسٹری آف انڈیا" کے صفحہ 264 پر پیش کیا ہے۔

85 ۔ ملاحظہ ہو طالب الہ آبادی کی تصنیف اکبر الہ آبادی صفحہ 142

86 حالی ، مقالاتِ حالی (اردو متن) جلد اوّل صفحہ 34

87 شبلی ، مقالاتِ شبلی (اردو متن) جلد اوّل صفحات 178-181

اکثر شبلی اپنے دعوے کی دلیل میں کئی مثالیں اسلامی تاریخ سے پیش کرتے ہیں بمثال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے طور پر مشہور اسلامی فوج "جاں نثاری فوج" کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں، "سلطان محمود کے زمانہ میں جب یورپ نے اپنی افواج کے لیے جدید آلاتِ حرب کا استعمال شروع کیا اور ان کی تنظیم جدید کی تو سلطان کو بھی انہی خطوط پر اپنی فوج کی تنظیم جدید کا خیال پیدا ہوا لیکن جاں نثاری فوج نے اس بنا پر بغاوت کر دی کہ وہ کافروں کی تقلید نہیں کر سکتی۔ اس بغاوت میں فوج کا اتنا ہاتھ نہیں تھا جتنا کہ شیخ الاسلام کا۔ جس کے خیال کے مطابق اس قسم کی تقلید مذہباً جائز نہ ہوتی۔ سلطان محمود اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ جب تک اس کی فوج میں جدید تبدیلیاں نہیں کی جاتیں اُس وقت تک وہ یورپین اقوام کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن شیخ الاسلام اور اُس کی فوج اپنی ضد پر اڑے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں بے شمار مسلمان سپاہی مارے گئے اور ان کی اچھی خاصی فوج نیست و نابود ہو گئی۔ آج ہمارے علماء اور متعصب مسلمان اُسی فاش غلطی کو دہرا رہے ہیں۔"

حوالہ مندرجہ بالا۔ جلد اول صفحہ 178

88۔ اُس دور میں جن مشہور علمائے دین نے ہجرت کی حمایت کی اُن میں مولانا عبدالعزیز، مولانا عبدالحئی اور شاہ محمد اسماعیل شامل ہیں۔ ان علماء نے نہ صرف بڑے بڑے عوامی جلسوں ہی کو مخاطب کیا بلکہ اپنے افکار و خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے کئی ضخیم کتابیں بھی تحریر کیں مثلاً (1) سید احمد صاحب کی صراطِ مستقیم (2) محمد علی کی آثارِ محشر (3) شاہ محمد اسماعیل کی تقویت الایمان (4) اولاد حسین کی ہدایات الموحدین۔ اسی موضوع پر کلکتہ ریویو 1872ء کی جلد 52 کے صفحہ 396 پر شایع شدہ مضمون بھی ملاحظہ فرمائیے۔

89۔ ملاحظہ ہو کرامت علی کا "خطبۂ جہاد" جو نومبر کو کلکتہ کی ٹرن لٹریری سوسائٹی کے روبرو عربی زبان میں دیا گیا جسے بعد ازاں اردو اور انگریزی زبانوں کے قالب میں ڈھال کر مسلمانوں میں اس کی خوب خوب تشہیر کی گئی۔

90۔ بطور خاص ملاحظہ ہو چراغ علی کا مقالہ "جہاد کا تنقیدی جایزہ"۔ اسی طرح جی۔ ڈبلیو۔ لیٹنر کا "جہاد" کے موضوع پر وہ مضمون بھی ملاحظہ ہو جو ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو (Asiatic Quarterly Review) جلد دوم صفحات 338-58 پر شایع ہوا۔ مزید ملاحظہ ہو ابوسعید محمد حسین کا رسالہ جہاد مطبوعہ (لاہور 1917ء)

91۔ مشن اسکولوں میں بعض اوقات مذہبی تعلیم کی وجہ سے بچے عیسائیت قبول کر لیتے تھے چنانچہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گارساں دی تاسی نے سندھ حیدر آباد کا ایسا ہی ایک واقعہ بیان کیا ہے جس کی رو سے وہاں کے مشن اسکول کے ایک مسلمان طالب علم نے عیسائیت قبول کر لی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے ہی روز دو سو طالب علموں نے مدرسہ ترک کر دیا۔

(92) ۔ اس خیال کو اس بات سے مزید تقویت پہنچی کہ سر ولیم میور، سر ہربرٹ ایڈورڈز (Sir Herbert Edwards) اور کیپٹن۔ ڈبلیو۔ آر۔ ایکمان (Capt W.R. Aikman) جیسے اعلیٰ برطانوی عہدیدار تبدیلی مذہب کے کام میں کرسچین مشنریوں کی مدد کر رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ عیسائی مشنریاں اردو زبان میں متعدد کتابیں شایع کر رہی تھیں جن میں ہندستانی مسلمانوں سے کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنا "غلط" مذہب ترک کر کے عیسائیت کے "صحیح" مذہب کو اختیار کر لیں ایسی کتابوں میں سے چند مشہور کتابوں کے نام ہیں (1) مناظرہ دین (2) راہِ زندگی (3) تعلیم در تعلیم (4) تذکرۃ المومنین۔ عیسائیوں نے اسی مقصد کے تحت کئی رسالے بھی جاری کیے، جیسے کہ امرتسر سے "حقایق عرفان"، دہلی سے "مواعظِ عقبیٰ" اور الہ آباد سے "مخزنِ مسیحی"۔ مولویوں اور پادریوں کے مابین جاری رہنے والے اس نزاع کے بارے میں تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو L. Bevon Jones:- The People of the Mosque P. 233-42

(93) ۔ حالی: حیاتِ جاوید

(94) 1835/ کے اوائل میں کلکتہ کے آٹھ ہزار 8000 مسلمانوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک محضر حکومت کو پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ "حکومت کا مقصد صاف ظاہر ہے کہ وہ مقامی باشندوں کا مذہب تبدیل کروانا چاہتی ہے۔ برطانوی عہدیدار اسلامی اور ہندو علوم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انگریزی کی ہمت افزائی محض اس لیے کر رہے ہیں کہ اس طرح لوگوں کو عیسائی بنایا جا سکے" (دارالعوام کی ایک منتخبہ کمیٹی کے روبرو ڈبلیو۔ ایچ ولسن کی شہادت) ملاحظہ ہو مطبوعہ پارلیمانی کاغذات Sixth Report of the Select Committee- (1853) of the house of Commons on Indian Territories, 12

(95) ۔ اسلام اور عیسائیت کے مابین دینی نزاع کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو لکھنؤ میں 1911/ میں مسلمانوں میں تبلیغ عیسائیت کا کام کرنے والے اداروں Missions کی جنرل کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات Papers جو صرف نجی مطالعے کی غرض سے تحریر کیے گئے تھے) اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں میں تبلیغی کام کرنے والی عیسائی مشنریوں کی ٹریننگ اور مسلمانوں میں تقسیم کیے جانے والے عیسائی لٹریچر سے متعلق مباحث۔ مزید ملاحظہ ہو سی۔ بی لین پال کی انگریزی تصنیف Recollection of an Indian Missionary بحیثیت عیسائی مبلغ کے لین پال سب سے پہلے ۱۸۴۱ء میں ہندستان آیا۔ اس نے دیکھا کہ یہاں کے ہندو جذبۂ افتخار، اتحاد اور حب الوطنی سے یکسر عاری ہیں اور مسلمانوں کے "طوق چوبیں" کو گلے میں ڈالے رہنے پر قانع ہیں۔ اس لیے عیسائی مشنریوں کو ہندوؤں سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا لیکن مسلمانوں کے ساتھ معاملہ ہی کچھ اور تھا: "اگر انھیں اقتدار پھر سے حاصل ہو جائے تو وہ اپنی تعداد سے بیس گنا زیادہ عیسائیوں کو ہفتے کھیلتے نیست و نابود کر ڈالیں۔ بعض اوقات عیسائی مشنریوں سے وہ لوگ صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ اگر تم لوگ ہمارے حکمراں نہ ہوتے تو ہم تمہاری تبلیغ کو دلیل کے ذریعے نہیں بلکہ شمشیر کے ذریعے بند کروا دیتے"۔

حوالہ بالا صفحات 40-38 ان دونوں تصانیف میں اس موضوع پر عیسائی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

96. Mitra :- Memoir of D.N. Tagore, P. 34

97. ملاحظہ ہو برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کی سالانہ رپورٹ برائے ۱۸۵۷

98. A. Duff, Missionary Addresses 40-42

99. ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ابتدائی ارکان کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو اس ادارے کا جرنل جلد شمارہ 2 صفحات 20-117 اگرچہ فہرست میں کئی ہندستانیوں کے نام شامل ہیں تاہم یورپین ارکان کی تعداد اُن سے زیادہ ہے۔

100. ملاحظہ ہو ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کا جرنل 1867 جلد اوّل شمارہ 2 صفحات 99-157

101. Coupland :, India - A Restatement 91-92

102. ملاحظہ ہو: "Abstract of Proceeding of the Mohammadan Literary Society of Cal", Nov. 23, 1870

103. Graham :- Life and Work of Sir Syed, 49

104. گراہم نے یہ اقتباس اپنی کتاب Life and Work of Sir Syed کے صفحات 52-54 پر نقل کیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

105 ۔ اُن کتابوں میں جن کے ترجمے اردو زبان میں کیے گئے حسب ذیل انگریزی کلاسیکی کتابیں شامل ہیں۔

Rollins :- Ancient History,
Senior and Mills :- Political Economy,
Elphinstons :- History of India, and
Malcolm's :- History of Persia

106 Sir Syed's "A speech on the Institution of British Indian Association"

107 حوالا بالا صفحہ 7

108 Amir Ali Syed: "Memoirs in Islamic culture Vol V No. 4, 540

109 ۔ ملاحظہ ہو سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ کی پروگریس رپورٹ
Progress Report Page 1

110 ۔ ملاحظہ ہو سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ کی پروگریس رپورٹ بابتہ 1885ء صفحہ 1

111 ۔ ملاحظہ ہو۔ سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ کا پراسپکٹس 1878

112 ۔ ایسوسی ایشن کے اعزازی اراکین میں کرستو داس پال، ڈبلیو۔ سی۔ بونرجی، سریندر ناتھ بنرجی، مدھوسودن داس اور رمیش چندر متر جیسے مشہور ہندو رہنما شامل تھے۔

113 ۔ مسز بیسنٹ Mrs Besant نے لندن میں کانگریس کے ترجمان "انڈیا" کے نمایندے کو انٹرویو دیا۔ اُس کا حسب ذیل اقتباس کافی اہمیت رکھتا ہے۔

"مسز بیسنٹ Mrs Besant کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ہندو ازم کا احیا اور ہندو نظریات کی بازیافت۔ ان چیزوں کا موجودہ انڈین نیشنل کانگریس نامی تحریک سے کوئی تعلق ہے؟
انھوں نے جواب دیا: "کانگریس تحریک اسی کام کا ایک حصہ ہے۔"

India, Vol V, NO. 5, 142,

114 ۔ وہ دو مسلمان خواتین تھیں ملکہ عالیہ بیگم آف بھوپال اور ملکہ عالیہ بیگم آف حیدرآباد۔

115 ۔ پیارے چند متر نے اپنی انگریزی کتاب Biographical Sketch of David Hare میں واضح طور پر بیان کیا ہے کہ کس طرح ہندو نوجوان اپنی انگریزی تعلیم پر فخر کرتے ہوئے کھلے عام ہندو رسم و رواج کی خلاف ورزی میں گائے کا گوشت کھا کر اُس کی ہڈیاں تک برہمنوں کے گھر کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پھینکنے لگے تھے۔ صفحات (14 — 30)

اس کی مزید حالیہ مثالوں کے لیے اے۔ الگزینڈر کی وہ رپورٹ ملاحظہ فرمایئے جو اس نے دسمبر 1883ء کے آخری ہفتے میں کلکتے کے مقام پر منعقد ہونے والی مشنریوں کی دوسری دس سالہ کانفرنس کے موقع پر مرتب کی تھی جس کا عنوان تھا Work Among English Speaking Hindus یعنی "انگریزی بولنے والے ہندوؤں کے درمیان سرگرمیاں۔

116 "پچیس سال قبل (یعنی 1858ء کے لگ بھگ) ایک اوسط ہندستانی مسلمان خود کو عالمی مذہبی برادری کا ایک ایسا فرد تصور کرتا تھا جو ایک ایسے ملک میں بستا ہے جہاں ایک غیر جانبدار حکومت قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس کے سیاسی اور قومی افتخار کو اس بات سے تسکین حاصل ہوتی تھی کہ اس کے ہم مذہبوں کو ایران، ترکی، مراقش اور (برائے نام ہی سہی) مصر میں آزادی اور قومی اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔ گو اس کی وفاداریاں ملکہ کے ساتھ منسوب تھیں لیکن اس کے عزت نفس کو قسطنطنیہ و فیض Fez کے سلاطین اور تہران کے شاہ اور مصر کے خدیو کے وجود سے تسکین حاصل ہوتی تھی۔" ہزہائی نس آغا خاں کی تصنیف India in Transition صفحات (22 — 23)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرا باب

سیاسی سرگرمیاں

1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام نے ہندوستان میں اُن سیاسی طاقتوں کو ایک مرکز پر لا جمع کر دیا جو اس وقت تک مختلف علاقوں میں منتشر تھیں۔ اس کے باعث مشترکہ مفاد اور مشترکہ شکایات کی بنیاد پر ایک مشترکہ برادری کے احساس نے جنم لیا۔ اس تحریک نے کلکتہ سے مدراس اور لاہور سے بمبئی تک عوام کو ایک مرکز پر مجتمع کر دیا۔ کانگریس کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر دی ٹائمز The Times کے خصوصی نامہ نگار نے لکھا: "ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک شاید ہم پہلی بار ہندستانی بحیثیت ایک قوم کے مجتمع ہوئے ہیں۔"[1] اسی ایک واقعے سے جدید ہندستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

کانگریس نہ تو کسی فردِ واحد کی اختراع تھی اور نہ چند افراد کی تخلیق، خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں۔ اسے مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے چند تنظیموں کا اجتماع بھی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو دراصل نصف صدی کی اُن انتھک کوششوں کا نقطۂ عروج تھا جو مختلف حالات اور مختلف حیثیتوں میں راجہ رام موہن رائے دوارکا ناتھ ٹیگور اور کرستو داس پال جیسی شخصیتوں کی مرہونِ منت تھیں۔ یہ نتیجہ تھا برٹش انڈیا ایسوسی ایشن، برہمو سماج اور پرارتھنا سماج جیسی عوامی تنظیموں کی اُن کاوشوں کا جن میں یہ تحریکیں کئی دہوں تک منہمک رہیں۔[2]

لیکن اُن میں سے اکثر تحریکیں اور ان کے رہنما ہندو تھے اور ہر دور میں اُنکی خدمت کا دائرہ ہندوؤں ہی کی حد تک محدود رہا۔ لیکن یہاں اس امر کا اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ بات کسی جانبدارانہ حکمتِ عملی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ حالات ہی کچھ اس بات کے متقاضی تھے کیونکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان دنوں تعلیم و ترقی کے ہراول دستے میں ہندو قریب قریب پیش پیش تھے۔ چنانچہ کانگریس تحریک پر ابتدا ہی سے ہندو رنگ غالب رہا اگرچہ اس میں کافی وسعت موجود تھی۔ کانگریس کے رہنماؤں نے بارہا فرقہ واریت کے الزام کی تردید کی اور جہاں کہیں اسے موجود پایا فوراً اُسے دُور کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن خارجی قوتیں اُن کی کوششوں سے کہیں زیادہ طاقت ور ثابت ہوئیں۔ اُن کے مخالفین کی یہی کوشش رہی کہ اُن کے اقدامات کو ناکام بنا دیا جائے۔ مثلاً جوں ہی بمبئی میں کانگریس کا پہلا اجلاس ختم ہوا اس دور کے مشہور اینگلو انڈین اخبار Englishman نے اُسے "ہندو کانگریس" کہہ کر اس کے قیام کی مذمت کی۔[3]

پہلی کانگریس بالکلیہ ہندوؤں پر ہی مشتمل نہیں تھی۔ اس میں چند انگریز، پارسی اور عیسائی بھی شامل تھے۔ لیکن جملہ (72) نمایندوں میں مسلمان صرف 2 تھے۔[4] دونوں کا تعلق بمبئی سے تھا جہاں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ لیکن دونوں میں سے کوئی بھی ملتِ اسلامیہ کا جانا پہچانا فرد نہیں تھا۔ اجلاس کی کارروائی میں کوئی بھی چیز خاص طور پر ہندو رنگ لیے ہوئے نہیں تھی۔ سیاسی ترقی کے لیے ان کی مانگ بھی ہندستانیوں کے لیے تھی جو بھی ہندستانیوں کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔

لیکن یہی بات تھی جس کے باعث تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا۔[5] جب مسلمان وہاں موجود ہی نہیں تھے تو کانگریس کیوں کر تمام ہندستانیوں کی جانب سے مطالبہ کر سکتی تھی اس لیے پہلی کانگریس میں مسلمانوں کی عدم موجودگی پر ہندوؤں کو بہت افسوس ہوا لیکن انگریز عہدیدار اور اینگلو انڈین اخبارات اس پر بہت خوش ہوئے۔ اُنہیں کانگریس کے قیام کی وجہ سے برطانوی اقتدار کو خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔[6] دی ٹائمز The Times کسی قدر غصے میں "ہندو شورش پسندوں" کو کہتا ہے کہ چونکہ ہندستان کو طاقت کے بل بوتے پر فتح کیا گیا تھا۔ اس لیے "طاقت ہی کے بل بوتے پر یہاں حکومت چلائی جانی چاہیے۔"[7] یہ اخبار ایسی "شیطانی مشاورتوں" سے مسلمانوں کے گریز پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

اگر ہمیں ہزیمت اُٹھانی ہی پڑے تو چرب زبانی یا زود نویسی کی وجہ سے ممکن نہ ہو سکے گی۔ بلکہ مضبوط باہوں اور شمشیر بُراں کے ذریعے شاید ممکن ہو سکے۔"[8]

اس بات کا کسی کو علم نہیں کہ آیا مسلمانوں کے سب سے عظیم رہنما سرسید کو پہلی کانگریس میں مدعو کیا گیا تھا یا نہیں لیکن اگر انہیں مدعو کیا بھی جاتا تو وہ ہرگز اس میں شریک نہ ہوتے۔ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسے لوگوں میں گھل مل نہ سکتے تھے جن کا نہ تو کوئی پس منظر تھا نہ تہذیب تھی اور نہ جن کے پاس ایک حکمراں قوم جیسی تربیت ہی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ قائدین کے لیے جس طرح شخصی اوصاف اور اثرات کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ایک مخصوص ماحول کی بھی۔ تاہم پہلی کانگریس میں مسلمانوں کی غیر موجودگی کو جس شدت سے دی ٹائمز (The Times) نے محسوس کیا۔ اتنی شدت سے اینگلو انڈین اخبارات کو چھوڑ کر ہندوستان میں کسی اور نے محسوس نہیں کیا۔ لیکن جب دوسری کانگریس کا وقت قریب آنے لگا تو چند اہم مسلم رہنما اور تنظیمیں کھلے بندوں اس کی مخالفت پر اُتر آئیں۔ اس وقت تک سرسید نے اپنے آپ کو متنازعہ فیہ سیاسی مسایل سے الگ رکھا تھا لیکن کلکتہ میں دوسری کانگریس کے انعقاد سے ٹھیک ایک مہینہ قبل اُنہوں نے اپنے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں کانگریس تحریک کی مذمت کرتے ہوئے اسے ایک اشتعال انگیز (seditious) تنظیم قرار دیا اور سوال کیا کہ "کیا اس ملک کے حالات یہاں عوامی حکومت کے قیام کے لیے موزوں ہو گئے ہیں؟" اور خود ہی جواب دیتے ہوئے لکھا: "ہرگز نہیں"[15] اے۔ او۔ ہیوم اس اداریہ پر فوراً چونک پڑے۔ انہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ سرسید کے آرٹیکل سے کانگریس کے مقصد کو کس قدر نقصان پہنچے گا۔ اس لیے انہوں نے فوراً کلکتہ کے اسٹیٹسمن میں اس آرٹیکل کا ایک زوردار جواب شائع کروادیا۔ انہیں اس بات پر حیرت ہوئی کہ کوئی اور نہیں بلکہ سرسید جیسی شخصیت جن کے لیے ان کے دل میں بے حد عزت و احترام پایا جاتا تھا اس تحریک کی مخالفت پر اُتر آئی، جسے بحیثیت مجموعی وائسرائے بہادر نے بھی بہ نظرِ استحسان دیکھا تھا۔[16] انہوں نے سرسید کے اس الزام کی بھی تردید کی کہ کانگریس ہندوستان میں پارلیمانی طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ کانگریس زیادہ سے زیادہ جو چاہتی ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ایک ایسا نمایندگی کا عارضی طریقہ اپنایا جائے جس کے ذریعے حکومت اس ملک کے باشندوں کی آرزوؤں اور اُمنگوں سے پوری طرح واقف ہو سکے۔[17] انہوں نے سرسید کے اس عمل پر افسوس کا اظہار کیا جس کے ذریعے انہوں نے دوسروں کے نظریات کے خلاف ایک تقنیہ پیدا کر دیا تھا اور ان کی جگہ "خود کے بے بنیاد تصورات" کو پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔[18]

پہلی کانگریس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اُسے دیکھتے ہوئے دوسری کانگریس کی مجلس استقبالیہ نے اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھا کہ اس دفعہ مسلمانوں کو مناسب نمایندگی حاصل ہو سکے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہوں نے ہندستان کی دو سرکردہ تنظیموں یعنی سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن اور محمڈن لٹریری سوسائٹی سے وفود بھجوانے کی درخواست کی لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔

سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کی جانب سے اس کے سکریٹری امیر علی نے لکھا کہ کانگریس کے ایجنڈے میں جو اہم مسایل شامل ہیں اُن کو قبول کرنے کے لیے حکومت کو مجبور کرنے کی کوششوں کے اچھے نتایج برآمد نہیں ہوں گے۔ انہوں نے "حکومت کے تعلق سے بے اطمینانی" کے اس رویے کو پسند نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ "موجودہ حالات کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس ملک کے بہی خواہ حکومت پر اعتماد کا اظہار کریں۔"[16]

محمڈن لٹریری سوسائٹی نے اور واضح موقف اختیار کیا تھا۔ اس کے سکریٹری نواب عبداللطیف نے واضح کیا کہ "مسلمان جلد بازی میں تیار کی گئی ایسی تجاویز کو قبول کرنے کے موقف میں نہیں ہیں خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ مرتب کی گئی ہوں، جن کا مقصد وقت کی کسوٹی پر کھرے اُترنے والے اداروں میں انقلابی تبدیلیاں لانا ہو۔ متصادم مفادات کی موجودگی میں اس قسم کی انقلابی تبدیلیوں کے بارے میں سوچنا ہندستان کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر قرینِ مصلحت نہیں۔"[17]

کانگریس کے تعلق سے مسلمانوں کے رویہ پر ہندو اخبارات نے کڑی تنقیدیں کیں اخبار ایڈوکیٹ آف انڈیا (Advocate of India) نے اس رویے کو "خالص روسی قسم کے نظریہ حکومی" پر مبنی قرار دیا۔[18] حتیٰ کہ نرم الفاظ میں اسٹیٹسمن نے بھی اس رویے کو "ایک عظیم تحریک سے" مسلمانوں کی بے اعتنائی" قرار دیا اور امید ظاہر کی کہ "ان کی اولاد ان کے مقابلے میں زیادہ ہوش مند ثابت ہوگی۔"[19]

دوسری کانگریس میں جملہ (413) وفود نے شرکت کی جن میں سے (27) مسلمان تھے۔ ان (27) مسلمانوں میں (3) تاجر (12) زمیندار (3) صحافی اور باقی وکلاء تھے لیکن ان میں کوئی بھی امتِ مسلمہ کی سربرآوردہ شخصیت شامل نہیں تھی۔[20] مسلمانوں کو کانگریس کی جانب راغب کرنے اور انہیں کانگریس کی غیر فرقہ واریت کا احساس دلانے کی غرض سے تیسری کانگریس کی مجلسِ استقبالیہ نے بمبئی کے سرکردہ مسلم رہنما بدرالدین طیب جی کو تیسرے اجلاس کی صدارت کرنے کے لیے مدعو کیا۔ اگرچہ بدرالدین طیب جی نے کانگریس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے پہلے دو سالانہ اجلاسوں میں شرکت نہیں کی تھی لیکن تیسرے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے ان کا انتخاب کانگریس کے منتظمین کی بڑی کامیابی تھی۔ کیوں کہ انہوں نے بدرالدین طیّب جی کے ذریعے کانگریس کے خلاف چلائی جانے والی زوردار تحریک کا موثر جواب دیا تھا۔[21]

طیّب جی نے اپنے صدارتی خطبے میں واضح کیا کہ ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس ملک میں رہنے والے ہندو، مسلمان، پارسی اور عیسائی ایک دوسرے سے الگ رہیں اور عام نوعیت کی عظیم اصلاحات اور عظیم حقوق" کے حصول کے لیے جو سبھی کے یکساں فائدے کے لیے ہوں مل جل کر کام نہ کریں۔[22] اسی اصول پر طیّب جی اور ان کے رفقاء بمبئی میں کارفرما رہے۔ دوسرے صوبوں میں رہنے والے مسلم دوستوں سے بھی انہوں نے اسی اصول پر کاربند رہنے کی تلقین کی۔ چند ایک اہم شخصیتوں کو چھوڑ کر باقی تمام مسلمان رہنما ملک بھر میں اس اصول پر کاربند ہو گئے۔[23]

اس وقت تک سرسید نے شاید ہی کوئی سیاسی تقریر کی ہو۔ اختلافی مسائل میں تو وہ ہرگز نہیں اُلجھے تھے۔ انہوں نے اپنے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک یا دو بار کانگریس کی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا اور بس۔ ان کی اصل توجہ مسلمانوں کی تعلیم اور سماجی اصلاح پر مرکوز رہی۔ لیکن مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کی حالیہ کوشش پر وہ برہم ہو گئے اور عین اس وقت لکھنؤ میں اپنی تقریر کے دوران کانگریس پر برس پڑے۔ جب مدراس میں اس کا اجلاس جاری تھا۔[24] سرسید کی یہ تقریر کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تیار نہیں کی گئی تھی بلکہ نتیجہ تھی اس برہمی کا جو انہیں بقول "پایونیر" اس وجہ سے پیدا ہو گئی تھی کہ بعض لوگوں نے علی گڑھ کے ایک یا دو طالب علموں کو بہلا پھسلا کر 1887ء کی مدراس کانگریس میں شرکت پر آمادہ کر لیا تھا۔[25]

اس تقریر میں سرسید نے کانگریس پر کڑی تنقید کی اور کہا کہ ان حرکتوں سے سوائے چند بنگالیوں کے اور کسی کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ جو اتنے بہادر ہیں کہ کھانے کی چھری دیکھتے ہی اپنی کرسیوں کے نیچے دُبک جاتے ہیں۔" ان باتوں کی وجہ سے بیکار کی ہڑبونگ مچے گی جس سے حکومت کو شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے ساری قوموں کو مشورہ دیا کہ وہ ملکہ کے وفادار رہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو کھری کھری سُنائی اور متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے کانگریس میں شرکت اختیار کی تو انہیں قومی تباہی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ نمایندہ قسم کی حکومت میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اس طریقے کو اپنا کر مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔ سرسید کے خدشات کی تین بنیادیں ہیں جن کی تفصیل وضاحت انہوں نے اپنی تقریر میں اس طرح کی ہے :-

(۱) اگرچہ ہندو اور مسلمان ایک ہی کنویں کا پانی پیتے ہیں ایک ہی شہر کی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ پھر بھی دونوں کی حیثیت دو علیحدہ قوموں کی ہے۔" اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ بالفرض انگریز۔ اپنی تمام مسلح فوجوں، ہتھیاروں اور گولہ بارود کے ساتھ ہندستان سے رخصت ہو جاتے ہیں تو اس ملک پر حکمرانی کون کرے گا؟ "ان حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو قومیں ایک ہی تخت پر بیٹھ کر اقتدار کی مساوی طور پر حقدار ہوں؟ قطعاً نہیں اس صورت میں لازماً ایک قوم دوسری پر غالب آ کر اُسے دبا دے گی۔" یہ سوچنا کہ دونوں قومیں اقتدار میں برابر کی ساجھے دار ہوں گی، ایک ناممکن اور ناقابلِ تصوّر امر کی خواہش کرنے کے مترادف ہے۔

(۲) ہندستان میں پائے جانے والے حالات کے پیشِ نظر اس ملک کے لیے نمایندہ حکومت کا تصوّر مناسب نہیں ہے۔ سرسید کہتے ہیں کہ بالفرض ہمیں امریکیوں کی طرح بالغ حق رائے دہی حاصل ہو جائے اور ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کو ووٹ ڈالنے کا اختیار حاصل ہو جائے تب کیا ہوگا؟ مسلم رائے دہندگان مسلمان اُمیدواروں ہی کو ووٹ دیں گے جبکہ ہندو رائے دہندگان ہندو اُمیدواروں کو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو اُمیدوار کو مسلمان اُمیدوار کے مقابلے میں چار گنا زیادہ ووٹ حاصل ہونگے کیونکہ ان کی آبادی تعداد میں چار گنا زیادہ ہے۔ ان حالات میں مسلمان اپنے مفاد کا تحفظ کس طرح کر پائیں گے؟" اس کی مثال پانسوں کے اس کھیل کی طرح ہو جائے گی جس میں ایک کھلاڑی کے پاس تو چار پانسے ہوں اور دوسرے کے پاس صرف ایک۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) مسلمانوں کو اپنے مفادات کے تحفظ اور انتظامیہ میں موثر نمایندگی حاصل کرنے کے لیے انگریزوں پر انحصار کرنا چاہیے۔ سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ انگریزوں سے دوستی اور محبت کی توقع نہیں رکھ سکتی۔" یہ بھی ایک وجہ تھی جس کے باعث سرسید اس شدومد کے ساتھ نامزدگی کے اصول کی حمایت کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی ان مساعی پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے جن کے ذریعہ انہوں نے انتخابی طریقے کے بارے میں لارڈ رپن کی رائے تبدیل کروادی تھی اور وائسرائے کو اس بات پر راضی کرلیا تھا کہ لوکل بورڈوں اور میونسپلیٹیوں کے ایک تہائی ارکان نامزد کیے جایا کریں۔

سرسید کی اس تقریر نے تمام ہندستان میں تہلکہ مچادیا۔ ہندو اخبارات نے ان پر اتنی ہی شدت سے حملے شروع کردیے جتنی شدت سے سرسید نے کانگریس کو ہدف ملامت بنایا تھا۔ بنگالی دانشوروں کے حلقے میں خاص طور پر سرسید کے خلاف کافی غم وغصہ پایا جاتا تھا کیونکہ انہوں نے بنگالی بابوؤں کے خلاف طعن وتشنیع سے کام لیا تھا۔" انڈین مرر" (The Indian Mirror) نے انہیں دشمنوں کا آلہ کار کہا اور ایک ایسی شخصیت بتلایا جو شرمناکی اور گھٹیا پن میں ملوث ہو۔[27] اس طرح انہوں نے اپنے ناٹ ہڈ آف دی آرڈر آف دی انڈین امپائر کی بھی بے حرمتی کی جو انہیں موقع پرستی کے ذریعے حاصل ہوگیا ہے اور جس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ سرکاری اعزازات عام طور پر کس قبیل کے لوگوں کو عطا کیے جاتے ہیں۔[28] "دی نیشنل گارجین" اپنے تنقیدی کلمات میں بڑی ہی سختی سے لکھتا ہے کہ، "اگر کوئی شخص جان بوجھ کر اپنا گلا کٹوانے کا تہیہ کر ہی لے تو وہ علی گڑھ کا ستر سالہ مسلمان بوڑھا سرسید احمد خان ہی ہوسکتا ہے۔"[29] "ینگ بنگال" نے ان کی تقریر کو احمقانہ بچکانہ، خوشامد پرستانہ قرار دیا۔[30] جبکہ لاہور سے شائع ہونے والے "ٹریبیون" نے اُن کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کے عقل کی ضعیفی کا بھی ماتم کیا اور بڑے ہی دکھ کے ساتھ لکھا غریب بوڑھے سید! ضعیفی اور بیک کے مشوروں نے تمہیں تباہ کردیا ہے۔"[31] اس معاملے میں 'Bengalee' 'The Hindu Patriot' 'The Indian Spectator' اور 'The Hindu' جیسے ذمہ دار جریدے بھی اسی طرح سرسید پر تنقید کرتے رہے لیکن اُن کی تنقید کا لب ولہجہ زیادہ باوقار اور سنبھلا ہوا تھا۔[32]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے برخلاف (The Muslim Herald) سرسید کے لیے رطب اللسان ہے۔ "سرسید زیرِلب بات نہیں کرتے بلکہ ایک جری اور بہادر انسان کی طرح کھل کر وار کرتے ہیں۔ مکروفریب کے اس دور میں ایک ایسے شخص کا پایا جانا بڑا ہی غنیمت ہے جو لاگ لپٹ کی باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حقیقت بیانی سے کام لیتا ہے۔ ہم فخریہ طور پر سرسید کو اپنا رہنما اور نمایندہ تسلیم کرتے ہیں جو ہندستان میں اسلام کی معراج اور اس کے سر کا تاج ہیں۔ وہ اسلام جو پانچ کروڑ ہندستانی مسلمانوں کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح منظم اور متحد کرتا ہے۔ سرسید ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کی تقریر ہماری حکمتِ عملی کی غمازی کرتی ہے۔"[37]

کانگریسی رہنماؤں نے بھی سرسید کو جواب دیتے ہوئے تلخ کلامی سے کام لیا اور ان پر الزام عاید کیا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین منافرت پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ بنگالی تو سرسید کی تقریر سے اس قدر ناخوش تھے کہ اُن کی تنقیدیں سوقیانہ پن کی حدوں کو چھونے لگتیں۔ پنجاب کے اُبھرتے ہوئے رہنما لالہ لاجپت رائے نے، جو بعد میں کانگریس کے صدر بن گئے، لاہور کے "ٹریبیون" میں سلسلہ وار کھلے خطوط شائع کروا کر سرسید پر یہ الزام عاید کیا کہ وہ "دفتری خوشامد" کا شکار ہو کر اسی چیز سے منحرف ہو گئے ہیں جس کا پرچار وہ خود گزشتہ بیس برسوں سے کر رہے تھے۔[39] لالہ لاجپت رائے نے کہا کہ انہیں ان لوگوں کی حالتِ زار پر رحم آتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کے دن تقریباً پورے کر لیے ہیں اور جو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہوئے ہیں اور اس حال میں بھی اُنہی درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں جنہیں کبھی انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔[40]

کچھ عرصہ تک تو سرسید خاموش رہے لیکن بعد ازاں انہوں نے ایک تفصیلی جواب کے ذریعے اپنی مہرِ سکوت کو توڑا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت اور غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ انہوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ اُن سے بڑھ کر شاید کوئی اور شخص یہ نہیں چاہتا کہ ہندستان کے ان دونوں فرقوں میں دوستی اور اتحاد برقرار رہے اور وہ ایک دوسرے کی استعانت کرتے رہیں۔ وہ آگے چل کر کہتے ہیں "میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ ہندستان ایک پرندہ ہے جس کی ہندو اور مسلمان دو آنکھیں ہیں۔ اس پرندے کی خوبصورتی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس کی دونوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آنکھوں میں مساوی چمک برقرار رہے۔ اُن کے دل میں بنگالیوں کے خلاف کوئی شدید جذبات نہیں تھے بلکہ وہ تو اُن کی ترقی اور اعلیٰ رتبے پر فخر محسوس کیا کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ اُنھیں یہ احساس بھی دلانا چاہتے تھے کہ اگر انہوں نے " اس فرسودہ حال قوم کو اپنے پیروں تلے پامال کرنے کی کوشش کی تو اُنھیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرلیں گے۔"[37]

سرسیّد کو اس بات کا خدشہ تھا کہ کانگریس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت برائے نام تو انگریزوں ہی کی بنی رہے لیکن ملک کے اندرونی معاملات بالکلیہ اس کے ہاتھوں میں منتقل ہوجائیں۔ بقول ان کے کانگریس کو اگر اس کے صحیح خدوخال میں دیکھا جائے تو آپ کو ایک "خانہ جنگی" کی شکل نظر آئے گی۔ ایک ایسی خانہ جنگی جس میں کوئی ہتھیار استعمال نہ کیے جاتے ہوں لیکن ہمیں تو ہتھیاروں سے لیس خانہ جنگی پسند ہے۔ اقتدار منتقل ہوتا ہے ہوجائے دیجیے۔ مسلمان اس سے خوف زدہ نہیں ہیں۔ مقابلے کے امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں۔ ہمیں وہ قلم استعمال کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے جو ہمارے آباواجداد استعمال کرتے آئے ہیں اور جو دراصل آزاد اقتدار کے وثایق تحریر کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں قلم ہے۔"

ان تمام اختلافی امور میں تھیوڈور بیک (Theodore Beck) نامی کیمبرج کے گریجویٹ نے سرسیّد کی بے انتہا مدد کی جس کا تقرر اُن ہی دنوں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے عمل میں آیا تھا۔ لکھنؤ کی اس دھواں دھار تقریر سے کوئی ایک ماہ قبل Beck نے کم وبیش ایسی ہی باتیں Pioneer میں شائع ہونے والے سلسلہ وار مضامین میں کہی تھیں۔ کانگریس کے گزشتہ دونوں اجلاسوں میں منظور کی گئی مختلف قراردادوں کا تجزیہ کرتے ہوئے بیک Beck نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ کس طرح ان قراردادوں کا مقصد کسی نہ کسی شکل میں پارلیمانی جمہوری حکومت قایم کرنا تھا۔ لیکن بقول اس کے یہ بات کئی وجوہات کی بنا پر ناممکن العمل تھی۔ اس نے بعض وجوہات پر تفصیلی بحث بھی کی ہے۔ سب سے اہم وجہ اس نے یہ بتائی کہ چونکہ اس ملک میں دو یا دو سے زیادہ قومیں آباد ہیں اس لیے جمہوری نظام میں اکثریتی قوم اقلیتی قوم کو دبا دے گی۔[38] مزید براں ہندو چونکہ اکثریت میں ہیں اس لیے رائے دہندگان کے مذہبی رجحانات کے باعث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُن کے سیاسی اقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا اور جمہوریت کے نفاذ کی صورت میں وہ اتنے مطلق العنان فرمانروا بن جائیں گے جتنا شاید ہی کوئی مسلم فرمانروا بن سکا ہوگا[39] اسی وجہ سے بقول Beck مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ ایک بار اپنے انگریز سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے ہربرٹ گلیڈسٹن (Herbert Gladstone) نے بھی کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کی عدم دلچسپی کی یہی وجہ بتلائی اور واضح کیا کہ مسلمانوں کی یہ کانگریس بیزاری ان میں انگریزی تعلیم کے سلسلے میں پائی جانے والی پسماندگی کا ہرگز نتیجہ نہیں ہے[40]

ہندو پریس نے بیک Beck کے مضامین سے طویل اقتباسات نقل کیے اور ان پر سخت تنقید کیں۔ مثال کے طور پر (The Indian Mirror) نے اسی مقصد سے دو اداریے شائع کیے اور بیک Beck کو ایک غیر آتشی پسند جانور سے زیادہ حقیر شخصیت قرار دیا[41] (Worse than a base unaccommodated animal) لاہور کا یہ ترجمان آگے چل کر لکھتا ہے "یہ شخص نیشنل کانگریس کی چاہے جتنی مخالفت کرلے، یہ تحریک ایک ایسی حقیقت ہے جو دن بدن پھیلتی اور زور پکڑتی جارہی ہے۔ یہ تحریک اب ایک حقیقت بن چکی ہے حالانکہ اس اسکول ماسٹر کو یوں محسوس ہوتا ہوگا کہ اس طرح تاریخی تسلسل اور مطلق العنان شخصی حکومت کی روایات ٹوٹنے لگی ہیں۔ اُسے خواہ کتنا ہی تعجب کیوں نہ ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کانگریس ایک ایسی متجانس (Homogeneous) جماعت ہے جس کی شیرازہ بندی "غیر متجانس لوگوں" (Heterogeneous people) کے ذریعے عمل میں آئی ہے[42]۔ بیک کے اس بیان پر کہ ہندستانی پارلیمانی حکومت کے اہل نہیں ہیں اخبار پوچھتا ہے کہ چند دہائیوں پہلے تک خود برطانوی پارلیمنٹ کا کیا حال تھا جس نے مادر پارلیمان کی حیثیت سے دنیا کی دوسری کئی پارلیمانوں کو جنم دیا ہے؟ "کیا وہ خود ایک ایسا ادارہ نہیں تھا جو بہ ظاہر ایوانِ نمایندگان کی حیثیت رکھتا تھا لیکن دراصل چند بڑے خاندانوں کے بداطوار لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا تھا۔ جس میں فرضی انتخابی حلقوں (Rotten Boroughs) کے نمایندے اور چند ٹکوں کے عوض بک جانے والے ارکانِ پارلیمان جھوٹ، دغا اور مکر و فریب کے ذریعے ایک دوسرے کو اقتدار سے محروم کرنے کی سازش میں مصروف رہتے تھے[43]۔" اخبار Mirror اس بات کو بھی خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ہندستان مختلف قومیتوں والا ایک ملک ہے کیونکہ بقول اس کے "وہ ایک قوم ہو یا ایک سو قومیں ہوں۔ رعایا کی حیثیت سے قوم بن جاتی ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وقت آنے پر ہم جنسی اختیار کر لیتی ہیں۔"

بیک Beck کے خیالات کا جواب بڑے ہی جوشیلے انداز میں خود ہیوم (Hume) نے بھی دیا جس کے لب و لہجے میں کافی تلخی پائی جاتی تھی۔ کانگریسی تجاویز پر بیک نے جو اعتراضات کیے تھے ان کی دستوری خامیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے بیک کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اور سرسید کے مرکز تخلیق یعنی علی گڑھ سے باہر نکل کر چند اور مقامات کے حالات کا جائزہ لے اور اپنے ذہن و فکر کی مناسب اصلاح کرے۔ ہیوم نے بیک کو مزید یہ نصیحت کی کہ مسلمانوں کے فرقہ پرست گروہ کو خوش کرنے کے لیے گائی فاکس (Guy Fawkes) کا کردار ادا کرنے[95] یا ہندستانی سیاست پر اپنی رائے کے اظہار کے لیے منہ کھولنے سے پہلے اُسے یہ چاہیے کہ اس ملک میں کم از کم بارہ سال کا عرصہ حالات کا مشاہدہ کرنے میں گزارے۔

ایسے ہی اختلافی مسائل تھے جن میں بعض کمتر درجے کے مسلمان بھی بڑی شد و مد کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے اور یہی بات مسلمانوں کے سیاسی شعور کی واحد علامت بنی ہوئی تھی۔ کانگریس کے مقابلے میں مسلمانوں کے ہاں نہ تو کوئی تنظیم ہی تھی اور نہ کوئی ایسی قیادت جو خالصتاً مسلمانوں کے سیاسی مسائل میں دلچسپی لیتی۔ اسی وجہ سے کم از کم مسلمانوں کا بااثر طبقہ ہر بات کی رہنمائی کے لیے سرسید ہی کی جانب پُر اُمید نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ مذکورہ بالا تقریر کے بعد تو مسلمانوں نے بلا چوں و چرا انہیں اپنا سیاسی قائد تسلیم کر لیا[96]۔ چنانچہ بمبئی، مدراس، الٰہ آباد اور لاہور جیسے اہم مراکز پر جلسے منعقد کیے گئے اور سرسید کے خیالات کی توثیق کرنے والی قراردادیں منظور کی گئیں۔ امرتسر کی انجمن اسلامیہ، پنجاب کی محمڈن سنٹرل نیشنل ایسوسی ایشن الٰہ آباد کے "رفاہِ عام" اور دیگر عوامی اداروں نے باضابطہ طور پر سرسید کے موقف کی حمایت کا اعلان کیا۔

اس حمایت سے تقویت پا کر ۱۲ اگست 1888ء کو سرسید نے علی گڑھ سے ایک بیان جاری کیا جس میں کانگریس سے اختلاف رکھنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں سے متحد ہو جانے کے لیے کہا گیا تاکہ کانگریس کے حامیوں نے انگلستان میں جو یہ تاثر پیدا کیا کہ ہندستان کے سبھی لوگ کانگریس کے ساتھ ہیں۔ اس کی تکذیب کی جا سکے اور برطانوی عوام کو بتلایا جا سکے کہ نہ صرف مسلمان بلکہ کئی بااثر اور طاقتور ہندو بھی اس تحریک کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مخالف ہیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نامی ادارے کی بنیاد ڈالی جس کی ماہانہ فیس قصداً بہت زیادہ یعنی پانچ روپے مقرر کی گئی۔ اس ادارے کے قیام کا خاص مقصد یہ تھا کہ انگلستان کے عوام کو ہندستان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے وقتاً فوقتاً پمفلٹوں کی اشاعت عمل میں لائی گئی جنہیں لندن کی ایک ایجنسی کے ذریعے برطانوی اخبارات کے مدیروں اور ممبرانِ پارلیمنٹ میں تقسیم کیا جاتا رہا۔ ابتدائی مراحل میں اس ادارے کا کام کاج چلانے میں بنارس کے راجہ شیرا پرساد اور لکھنؤ کے سید امتیاز علی نے سرسید کی کافی مدد کی۔[97]

اس وقت تک کانگریس میں مسلمانوں کی حقیقی نمایندگی کا مسئلہ عوامی توجہات کا مرکز بن چکا تھا۔ سرسید اور ان کے ساتھی مسلسل یہ کہہ رہے تھے کہ کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت کرنے والے مسلمان وفود نقلی اور بناوٹی ہیں جبکہ اس کے برخلاف مخالفین کی جانب سے دعویٰ کیا جارہا تھا کہ کانگریس میں مسلمانوں سمیت ہندستان کی سبھی قوموں کو مناسب نمایندگی حاصل ہے۔ کانگریس کا ترجمان اس مسئلے کی یوں وضاحت کرتا ہے۔

> مسلمان تمام ہندستان کی آبادی کا $\frac{1}{5}$ واں حصہ ہیں۔ (بقول پلاوڈن (Plowden) ہر 10,000 ہندستانیوں میں 1974 مسلمان ہوتے ہیں) لیکن ہماری 196 ملین آبادی میں 44 ملین یا $\frac{11}{43}$ حصہ مسلمان ہیں۔ اب اگر صرف اس حسابی تناسب کو برقرار رکھا جاتا ہے تو کوئی ہوش مند انسان اس بات کا خواب میں بھی تصور نہیں کرسکتا کہ ایک ایسے اجلاس میں جہاں صرف سیکولر معاملات زیرِ بحث آتے ہیں۔ من جملہ 431 نمائندوں کے مسلمان نمائندوں کی تعداد 97 سے کچھ زیادہ ہونی چاہیے جبکہ واقعتاً اس اجلاس میں صرف مسلمانوں کے 33 نمایندوں نے شرکت کی۔[98]

مسلمان نمایندوں کی یہ نسبتاً "قلیل تعداد" ہمارے مسلمان بھائیوں میں اعلیٰ تعلیم کے فقدان کا فطری نتیجہ ہے۔" ان لوگوں کی بڑی تعداد جنہوں نے ہنوز کانگریس میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی، اس حسابی تجزیے سے متفق نہیں تھی۔ مختلف حلقوں میں یہ احساس تقویت حاصل کررہا تھا کہ چند نمایندوں کی شرکت کے باوجود درحقیقت عام طور پر مسلمان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف معاصر "دی ٹائمز" نے بھی کیا ہے، وہ کہتا ہے "ہمیں چاہیے کہ اپنی مناسب اور متوازن حکمتِ عملی وضع کرتے وقت اپنی مسلمان رعایا کے جذبات و احساسات کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔"[49]

لیکن کانگریسی رہنما اس صورتِ حال سے ہراساں نہیں ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کا دل جیتنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کام میں کئی ایسے انگریزوں نے بھی ان کی مدد کی جو یہ سمجھتے تھے کہ سیاسی اعتبار سے ہندو اور مسلمان ایک ہی جیسے ہیں۔ اپریل 1888ء میں تو سر ولیم ہنٹر (Sir William Hunter) جیسے شخص نے جو مسلمانوں کا زبردست حامی رہا ہے۔ لندن میں نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات واضح کر دی تھی کہ بنگال کے بعض نچلے علاقوں کو چھوڑ کر ہندستان کے بقیہ تمام علاقوں کے مسلمانوں نے کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت کی اور ان کی کارروائیوں میں حصہ لیا۔[50]

ہندستان کے بعض مسلم رہنماؤں نے اس بیان پر فوری شدید ردِّ عمل کا اظہار کیا اور میاں محمد شفیع نے جو بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بن گئے تھے، ایک طویل تردیدی بیان اخبارات میں شائع کروایا۔ "مسلم ہیرالڈ" میں چھپی رپورٹوں کی بنیاد پر شفیع نے دعویٰ کیا کہ جن مسلمانوں کی مدراس کانگریس میں شرکت اور نمایندگی کی تشہیر کی گئی تھی اُن میں سے بیشتر نے شرکت ہی سے انکار کر دیا تھا۔[51] اور اگر اُس موقعے پر چند مسلمان موجود رہے بھی ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ من حیث القوم مسلمانوں نے کانگریس کے نظریات کو تسلیم کر لیا ہے۔ جن مسلمان نمایندوں نے گزشتہ کانگریس میں شرکت کی اُنہیں "خود منتخب" قرار دیتے ہوئے شفیع نے ان کی شرکت کی حسبِ ذیل وجوہات بیان کی ہیں جو بڑی حد تک مبالغہ آمیز اور یک طرفہ ہیں۔[52]

(1) اُن میں اکثر کا تعلق چونکہ سماج کے نچلے طبقات سے تھا اس لیے کانگریس کے منتظمین نے انہیں مستقبل کے بارے میں ایسے حسین خواب دکھانے شروع کر دیئے جن میں وہ ملک کی اعلیٰ ترین شخصیتوں کے ساتھ مصافحے کا شرف حاصل کر پائیں گے۔

(2) ان میں بعض ایسے بھی تھے جو شہد کی طرح میٹھے الفاظ میں خوشامد اور ستائش کی وجہ سے دھوکا کھا گئے تھے۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں کوئی بھی جماعت بہ آسانی پھانس سکتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(3) شیعوں کو یہ کہہ کر تحریک میں شامل کیا گیا کہ اُن کے مخالفین یعنی سُنّی سرے سے تحریک میں موجود ہی نہیں ہیں۔

(4) بعض مسلمانوں نے محض ذوقِ تجسّس کی تسکین کی خاطر کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی۔ بعض سے شہرت اور تشہیر کا وعدہ کیا گیا تھا۔ بعض اس وجہ سے شرکت پر مجبور ہوئے کہ وہ مالدار ہندوؤں کے زیرِ اثر تھے یعنی بعض ہندو وکلاء کے موکل تھے اور بعض ہندو ساہوکاروں کے مقروض۔ اس طرح وہ اپنے مربّیوں کے آگے بے دام کے غلام بنے ہوئے تھے۔

شفیع نے اپنے اس نظریئے کے ثبوت میں کئی دلچسپ مثالیں پیش کیں ہیں۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ اگرچہ چند مسلمانوں نے کانگریس کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا ہے تاہم ان کی آواز کو اسلام کی آواز نہیں کہا جا سکتا۔ ہندستان کی مسلمان قوم کے کسی بھی سچے نمایندے کو کانگریس سے قطعی کوئی سروکار نہیں[53]۔ اور نہ صرف یہ کہ مسلم پریس نے کانگریس سے کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کے برخلاف 'Mohammadan Observer' Aligarh Institute Gazette 'Rafiq-e-Hind' Muslim Herald 'Victoria Paper' اور Imperial Paper جیسے مسلم اخبارات نے کانگریس کی سرگرمیوں کی مذمت کی۔ ملک بھر کی دیگر اسلامی تنظیموں اور انجمنوں نے یہی موقف اختیار کیا۔

اسی طرح سرسیّد نے بھی بدرالدین طیب جی کے اس [illegible] کا جواب دیتے ہوئے کہ کانگریس اپنے اجلاس کے دوران ایسے مسائل پر بحث نہیں کرے گی جن کی مخالفت مسلمان من حیث القوم کرتے ہوں[54]۔ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے والے وفود کی نمایندہ حیثیت پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا اور کہا کہ ان کو منتخب کرنے کے لیے کوئی دس مسلمان بھی ایک جگہ جمع نہیں ہوئے اور اُن ضلعوں کے روسا، جہاں سے وہ اجلاس میں شرکت کے لیے گئے تھے، تمام صورتِ حال سے یکسر نابلد ہیں[55]۔

طیّب جی کی اس یقین دہانی کا جواب دیتے ہوئے کہ کانگریس ایسی کوئی قرارداد منظور نہیں کرے گی جس پر ہندو یا مسلمان پوری طرح متفق نہ ہوں، سرسیّد نے کہا کہ بالاتفاقِ آرا کسی قرارداد کی منظوری کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کانگریس ایک 'قومی' تحریک بن گئی ہے۔ کانگریس کو اسی وقت ایک 'قومی تحریک' کہا جا سکتا ہے جبکہ اس کی تعمیر کرنے والے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افراد کے اغراض و مقاصد میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ طیب جی نے خود بھی تسلیم کیا کہ بعض معاملات میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں لیکن انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ اس قسم کے اختلافات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاملات کو کانگریس بالائے طاق رکھ دے۔ سرسید نے دریافت کیا کہ آخر ان معاملات کے حل کے لیے کانگریس کیا طریقۂ کار اختیار کرے جن کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین شدید اختلافات موجود ہوں۔ طیب جی نے اس بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ کیا ایسے علاحدہ مقاصد کی تکمیل کے لیے علاحدہ کانگریس قایم کی جائے؟ پھر اس بات کا بھی کیوں کر اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ آیندہ جب کبھی اُن کے مفادات آپس میں ٹکرائیں گے، وہ ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوں گے۔ طیب جی جو کچھ چاہتے تھے وہ محض یہ تھا کہ جب کبھی ہندو اور مسلمان کانگریس کے پلیٹ فارم پر مجتمع ہوں وہ آپسی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بھائیوں کی طرح باہم دیگر بغل گیر ہوں۔ یہ بات سرسید کو اس قدر مضحکہ خیز لگی کہ انہوں نے کانگریسی رہنماؤں سے مطالبہ کیا کہ وہ ایمان داری سے بتلائیں کہ کیا ایسی دو قومیں مل کر نیشنل کانگریس کی تخلیق کر سکتی ہیں جو بعض چھوٹی موٹی باتوں پر متفق ہونے کے باوجود اپنے عزائم اور مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں[56]۔ اس سوال کا جواب خود ہی دیتے ہوئے سرسید نے کہا "نہیں! بخدا ہرگز نہیں"[57]

کانگریس کی مخالفت تنہا مسلمانوں ہی نے نہیں کی بلکہ منشی نول کشور، راجہ شیو پرساد اور بنگا کے راجہ (Raja of Benga) کی طرح بعض بااثر زمینداروں نے بھی کانگریس کی کھل کر مخالفت کی۔ لیکن کانگریس کے منتظمین ان کی مخالفت سے قطعی متاثر نہیں ہوئے۔ شمال مغربی صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر سر آکلینڈ کالون کو مخاطب کرتے ہوئے ہیوم نے اپنے مشہور خط میں لکھا تھا: ان کی پرواہ کون کرتا ہے؟" لہٰذا سرسید ہی ایک ایسی شخصیت تھے جو اُن کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے وہ جتنا اُنہیں قریب لانے کی کوشش کرتے تھے اُتنا ہی ان سے دُور چلے جاتے تھے۔ بالآخر ہیوم اُن کی طرف سے یہ کہہ کر مایوس ہو گیا کہ "میرے خیال میں جہاں تک کانگریس کا سوال ہے یہ شخص کسی حد تک پاگل ہے"[58]

سرسید کی خواہ کتنی ہی مذمت کیوں نہ کی جاتی انکا کانگریس مخالف رویہ تبدیل ہونے والا نہیں تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا توں توں اپنے موقف کے برحق ہونے کا ان کا یقین پختہ ہوتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتا تھا کیونکہ انگریز عہدیدار نہ صرف ہندوستان میں بلکہ برطانیہ میں بھی اس موقف کی ستایش میں رطب اللسان تھے۔ سرسید کا ایقان تھا کہ جس لمحے مسلمان سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں شامل ہوں گے مکمل طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ اُن کے درخشاں مستقبل کی واحد ضمانت ہندستان میں برطانوی راج کا استحکام ہے۔ ان کے قریبی رفیق کار مولوی نذیر احمد اس ضمن میں فرماتے ہیں :-

> نیشنل کانگریس کے قیام کا نتیجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہمارا وقار ہمیں اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ دنیوی مفادات کے حصول کے لیے ہم ہندوؤں کے سایۂ عاطفت کو قبول کر لیں خواہ یہ مفادات کتنے ہی قیمتی اور عزیز کیوں نہ ہوں ..... اس حکومت میں ہمیں بھلائی ضرور ملے گی لیکن آپ کی نام نہاد کانگریس کے ہاتھوں نہیں بلکہ ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں، وایسرائے کے ہاتھوں لیفٹیننٹ گورنر کے ہاتھوں کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے ہاتھوں اور انشاء اللہ ہمیں دست سوال دراز کیے بغیر ہی بہت کچھ حاصل ہو جائے گا۔[53]

۱۸۸۵ء میں جب کانگریس کا قیام عمل میں لایا گیا اس وقت کئی اعلیٰ برطانوی عہدیدار اس تنظیم سے خوش گمانی رکھتے تھے۔ دراصل طے یہ پایا تھا کہ بمبئی کے گورنر لارڈ ریڈنگ (Lord Reading) کانگریس کے پہلے اجلاس کا افتتاح کریں گے۔ لیکن جوں جوں یہ تنظیم مستحکم ہوتی گئی اور برطانوی انتظامیہ پر اس کی تنقیدوں میں اضافہ ہوتا گیا توں توں برطانوی عہدیداروں کو اس جماعت سے خطرے کا احساس ہونے لگا اور وہ اس تنظیم کی سرگرمیوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ۱۸۸۸ء کے اختتام تک اس جماعت کی مذمت میں عام نہ صرف وسطی ہند کے پولٹیکل ایجنٹ سر لیپل گریفن (Sir Lepal Griffin) اور شمال مغربی صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر سر آکلینڈ کولون (Sir Auckland Colvin) نے کی بلکہ خود اس وایسرائے نے بھی اس کا مذاق اڑایا جس کے بارے میں اس وقت تک کانگریسی رہنما یہ "تشہیر" کرتے تھے کہ وہ کانگریس کے بہترین معاونین میں سے ایک ہے۔ ان باتوں سے سرسید کی ڈھارس بندھتی تھی اور انہی کی وجہ سے وہ اپنے موقف پر اور پختگی کے ساتھ جم گئے۔

سرسید کو اپنے پیروؤں کی جانب سے جو حمایت حاصل ہوئی وہ بھی ڈھارس بندھانے والی نہیں تھی۔ ملک بھر کے بااثر مسلمان ان کی آواز پر لبیک کہنے لگے تھے۔ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (Indian Patriotic Association) کے قیام کے چند ماہ کے اندر ہی ملک کے مختلف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصّوں سے 40 انجمنوں نے مطلع کیا کہ وہ مذکورہ بالا ایسوسی ایشن کے ساتھ الحاق کر لینا چاہتی ہیں۔ ابتداً ایسوسی ایشن کو بعض ہندو حلقوں کی حمایت حاصل تھی لیکن جلد ہی یہ ادارہ ایک مسلم تنظیم کی شکل اختیار کر گیا۔ اس صورتِ حال کے لیے سرسیّد کو موردِ الزام نہیں گردانا جا سکتا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ یہ ایسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تنظیم ہو جو کانگریس کی پالیسی اور پروگرام کی مخالفت کرتے ہوں لیکن ان کی اس کوشش کو اُن کے ساتھی معتمد (Co-secretary) راجہ شیو پرشاد نے اودھ کے ہندو اور مسلمان تعلقداروں کی جنرل میٹنگ میں جو 23 نومبر 1888 کو لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی، یہ تجویز پیش کر کے ناکام بنا دیا کہ دو مختلف تنظیمیں قایم کی جانی چاہییں۔ ایک ہندوؤں کے لیے اور دوسری مسلمانوں کے لیے جن کی قیادت متعلقہ قوموں کے افراد کے ہاتھ میں ہو۔ ان دونوں تنظیموں کے کام کو ایک مرکزی جماعت مربوط کرے گی جسے انجمن خیر خواہانِ ملک ہندیا (Indian Loyal Association) کہا جائے گا جس کی صدارت بنارس کے مہاراجہ فرمائیں گے اور سرسیّد اور بھگا کے راجہ (Raja of Bhinga) اس کے جوائنٹ سکریٹری ہوں گے۔ اگرچہ سرسیّد اس تجویز کو پسند نہیں کرتے تھے تاہم انہوں نے اسے گوارہ کر لیا۔ لیکن وہ جلد ہی راجہ شیو پرساد کے ہتھکنڈوں سے بے زار ہو گئے۔ راجہ شیو پرشاد کی کانگریس سے نفرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ اُن کی مرکزی تنظیم حکومت سے یہ مطالبہ کرے کہ تمام کانگریسی رہنماؤں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے ان پر مقدمہ چلایا جائے اور اس کے لیے ضرورت ہو تو قانون تعزیراتِ ہند (Criminal Procedure) میں بعض ضروری دفعات کا اضافہ کر دیا جائے۔[62] سرسیّد اپنے ہندو رفقاء سے اس بارے میں اتفاق نہ کر سکے اور انہوں نے اپنی قدیم ایسوسی ایشن کو دی یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (The United Indian Patriotic Association) کے جدید نام سے دوبارہ زندہ کر ڈالا۔[63]

ہندستان میں پائی جانے والی اس صورتِ حال پر لندن میں پہلا پارلیمانی ردِّ عمل 9 دسمبر 1888ء کو دارالعوام میں ظاہر ہوا جبکہ اولڈہیم (Oldham) کے ایک رکن پارلیمان جے۔ ایم۔ میکلین (J.M. Maclean) نے انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فور انڈیا مرجان گورسٹلے (Sir John Gorst) سے دریافت کیا کہ کیا انہوں نے سینٹ اینڈریوز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(St. Andrew's Day) کے موقع پر کلکتہ میں وائسرائے کی تقریر کے بارے میں رپورٹ پڑھی ہے۔ جس میں انہوں نے کانگریس کے ارکان پر یہ الزام عاید کیا ہے کہ وہ "ہندستان میں تاجِ برطانیہ کے وفادار سرکاری اعمال کے خلاف عوام میں نفرت کا پرچار کر رہے ہیں" اور اس تنظیم کے معتمدِ اعلیٰ اس بات کا فخریہ اظہار کر رہے ہیں کہ "نہ صرف عوامی بغاوت بلکہ فوجی بغاوت کی کنجیاں بھی ان کے اور ان کے رفقاء کے ہاتھ میں ہیں۔ اور مزید یہ کہ "کیا یہ معتمد عمومی سابق میں بنگال سیول سروس سے تعلق رکھنے والا وہی انگریز ہیوم ہے جو اس جماعت کے باغیانہ پمفلٹوں کا مصنف ہے اور جسے مقامی پریس 'بابائے کانگریس' (The Father of the Congress) کے نام سے یاد کرتا ہے"۔ اور مزید یہ کہ "کیا ہندستان میں برطانوی اقتدار کو زک پہنچانے والی اُن شر آمیز انقلابی تقاریر کے بارے میں جو کانگریس کے وفود کر رہے ہیں اور جن کے باعث ملک کے طول و عرض میں شورش پھیل جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ ہندستان کے مقامی راجوں مہاراجوں اور ہندستانی مسلمانوں کے قائدین نے کوئی فوری نمایندگی حکومت سے کی ہے۔ اس ضمن میں حکومتِ ہند کانگریس کی اگلی میٹنگوں کے بارے میں کون سے اقدامات روبہ عمل لانا چاہتی ہے؟"[67]

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں یہ پہلا موقع تھا جب کہ پارلیمنٹ میں کسی نے ہندستانیوں کی سیاسی سرگرمیوں کا ذکر چھیڑا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ مندرجہ بالا استفسار کا جواب دیا جاتا۔ چارلس بریڈلا (Charles Bradlaugh) نے اسپیکر سے دریافت کیا کہ کیا مذکورہ سوال میں غیر پارلیمانی زبان کا استعمال نہیں کیا گیا ہے؟ اور کیا یہ سوال اس اعتبار سے غیر موزوں نہیں ہے کہ اس میں مابہ النزاع مسئلہ چھیڑا گیا ہے؟ اسپیکر نے اس اعتراض کو درست قرار دیتے ہوئے معاملے کو 6 دسمبر 1888ء تک ملتوی کر دیا جبکہ یہ سوال دوبارہ مناسب تبدیلیوں کے ساتھ میکلین نے دریافت کیا جس کے جواب میں سر جان گورسٹ نے یہ بات تسلیم کی کہ "ہندستانی امرا اور سربرآوردہ مسلمانوں نے کانگریسی نمایندوں کی تقریروں اور مطبوعات کے مضر اور شر انگیز اثرات کی جانب حکومت کی توجہ مبذول کرائی ہے"۔ لیکن انہوں نے اُن اقدامات کے تعلق سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا جو حکومتِ ہند کانگریس کی اگلی میٹنگوں کے تعلق سے اختیار کرنا چاہتی ہے۔[68]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کانگریس کا چوتھا اجلاس اس قسم کے جارحانہ اور مخالفانہ ماحول میں الٰہ آباد کے مقام پر 1888ء کے کرسمس کے ہفتے میں منعقد ہوا۔ مقامی عہدیداروں نے مجلس استقبالیہ کی راہ میں کئی روڑے اٹکائے لیکن اس کے باوجود یہ اجلاس انتہائی منظم اور کامیاب ثابت ہوا۔ اس بارے میں پنجاب کے ایک مسلمان نمائندے مولوی محمد ہدایت رسول نے سچ ہی کہا ..... "اگر ہمارے شدت پسند برادران قوم کانگریس کی مخالفت کا اتنا زبردست ہوّا نہ کھڑا کرتے تو شاید آج کانگریس کو اتنی کامیابی نصیب نہ ہوتی۔"[69] انہوں نے کانگریس کو انگور کی اس بیل سے تشبیہ دی: "جوں توں بڑھتی رہتی ہے، جوں جوں اسے کاٹا جائے۔"[70]

اس اجلاس میں شریک ہونے والے سربرآوردہ نمائندوں کی تقاریر میں امور پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی:

(۱) کہ کانگریس ایک وفادار اور قانون کا احترام کرنے والی تنظیم ہے۔

(۲) کہ اس تنظیم کو مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔

مجلس استقبالیہ کے صدر نے اپنی پہلی ہی تقریر میں ان دونوں نکات پر خاصی روشنی ڈالی۔ انہوں نے حاضرین سے دریافت کیا: "کیا ہم غدار ہیں؟" جواب میں [illegible] نے بہ آواز بلند کہا: "نہیں نہیں" اپنی تقریر میں وہ مسلسل حکومت کو اس بات کی یقین دہانی کراتے رہے کہ "وقت پڑنے پر ہم اپنے مخالفین کو ثابت کر دکھائیں گے کہ دراصل وہ نہیں بلکہ ہم وفادار ہیں، وقت پڑنے پر وہ نہیں بلکہ ہم حکومت کی حمایت کریں گے، ضرورت کے وقت وہ نہیں بلکہ ہم اپنے کیسہ ہائے زر کے منہ حکومت کی اعانت کے لیے کھول دیں گے۔"[71]

اس اعتراض کا حوالہ دیتے ہوئے کہ مسلمان صریحاً کانگریس کے خلاف ہیں، پنڈت اجودیا ناتھ[72] نے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں حاضرین سے کہا: "ذرا اس ہال میں بیٹھے ہوئے نمایندوں پر نظریں دوڑایئے تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ اس وقت ہم میں اعلیٰ ترین خاندان سے تعلق رکھنے والے شرفاء اور دہلی اور اودھ کے سابق حکمران خاندانوں کے چشم و چراغ ہیں (.....) اور دیگر بہت سی اہم شخصیتیں تشریف فرما ہیں۔" تقریر جاری رکھتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ کانگریس کے گذشتہ اجلاس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں مسلم نمایندوں کی تعداد 83 تھی جبکہ اس بار ان کی تعداد دگنی سے زیادہ ہے۔ (سہ گنی! سہ گنی!" کی آوازیں۔ ف)[7]

پنڈت جواہر لعل نہرو کے فوری بعد لکھنؤ کے تعلقدار شیخ رضا حسین خاں پلیٹ فارم پر تشریف لے آئے اور انہوں نے اپنے پیش رو کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے تالیوں کی گونج کے درمیان اس بات کا اعلان کیا کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کانگریس کے ساتھ ہے۔ انہوں نے اس اعلان پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس اعلان کو ایک طرح کا مذہبی رنگ دیتے ہوئے سامعین کے روبرو لکھنؤ کے ایک سُنّی عالم دین کا فتویٰ بھی لہرا دیا جس میں کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی کو مباح قرار دیا گیا تھا۔[79]

اگلے روز بھی بہار سے تعلق رکھنے والے ایک اور مسلم نمایندے سید شریف الدین نے کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کانگریس میں شرکت کرنے والے وفود سے کہا کہ وہ اُن شدید تنقیدوں سے ہراساں نہ ہوں جو اُن کے خلاف مختلف گوشوں سے کی جا رہی ہیں کیونکہ یہ کھیل ان کے لیے نیا نہیں ہے۔ ان کی پہلی کانگریس پر "چند دیسی تعلیم یافتہ جنٹلمینوں کی کانگریس" کہہ کر پھبتی کسی گئی تھی، جبکہ دوسری کو "بنگالیوں کی کانگریس" اور تیسری کو "ہندوؤں کی کانگریس" کہا گیا تھا۔ انہوں نے شرکاء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "حضرات! آج 1888ء میں حالت یہ ہے کہ ہمارے روبرو نہ صرف ہندو، بنگالی اور مراٹھا حضرات موجود ہیں بلکہ میں فخر کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ اس کانگریس میں دو سو (۲۰۰) سے زیادہ مسلمان نمایندے بھی موجود ہیں۔" اِن وجوہات کی بنا پر فاضل مقرر نے اُمید ظاہر کی کہ اُن کے ناقد کم از کم اب اس تحریک کو اس کے صحیح نام کے ساتھ یعنی "انڈین کانگریس" کے طور پر تسلیم کر لیں گے۔[75]

چوتھی کانگریس کے آخری دن "کانگریس مسلم" تعلقات کے بارے میں پائے جانے والے مختلف وفود کے جذبات کو ایک ٹھوس شکل عطا کرنے کی غرض سے مدراس کے آنند چارلو (Anand Charlu) نے، جو بعد میں کانگریس کے صدر بھی بن گئے تھے، حسب ذیل قرارداد پیش کی:-

موضوعاتی کمیٹی (Subject Committee) کسی ایسے موضوع کو بحث و تمحیص کے لیے منتخب نہیں کرے گی یا کانگریس کا صدر ایسے کسی موضوع کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث کے لیے پیش کرنے کی اجازت نہیں دے گا جس پر ہندو یا مسلمان نمایندے اجتماعی طور پر بالاتفاق آرا معترض ہوں اور اگر کوئی قرار داد بحث کے لیے منتخب کر لی جائے لیکن بعد ازاں یہ محسوس ہو کہ اس موضوع پر بحیثیت مجموعی ہندو یا مسلم نمایندے بالاتفاق آرا یا تقریباً بالاتفاقِ آرا معترض ہیں یا اس تجویز کو ترک کر دیا جائے گا بشرطیکہ اس اصول کا اطلاق صرف انہی موضوعات پر کیا جائے جن کے بارے میں کانگریس نے ہنوز کوئی واضح موقف اختیار نہ کیا ہو۔[76]

اس قرارداد کو پیش کرتے ہوئے چارلو نے واضح کیا کہ اسے طیب جی جیسے "ہمارے بہترین مسلمان دوستوں" کی ایما پر مرتب کیا گیا ہے۔ جن دنوں طیب جی کانگریس کے منصبِ صدارت پر فایز تھے۔ اس قرارداد کی ایک نقل تمام صوبائی کانگریس کمیٹیوں کے مابین گشت کرائی گئی تھی جن میں سے ہر ایک نے اسے منظوری عطا کی تھی۔ اپنی تقریر کے دوران چارلو نے کہا: "آپ یقین جانیے کہ ہم بھائیوں کی طرح باہمی صلاح و مشورے سے ایک ساتھ مل جل کر کام کرنا چاہتے ہیں (پُرزور صدائے تحسین) ہم سب کسی مسئلے پر متفق ہو جائیں تبھی اپنا مشترکہ نقطۂ نظر حکومت کے روبرو پیش کریں گے اور اگر کسی مسئلے پر متفق نہ ہو پائیں تو اس مسئلے کو اس وقت تک اٹھا رکھیں گے جب تک کہ ہم میں اس موضوع پر ہم خیالی پیدا نہیں ہو جاتی۔"[77]

اس قرارداد کی تائید کرتے ہوئے پنڈت اجودیا ناتھ نے مسلمانانِ ہند کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں ایسے اعلیٰ جذبات رکھتے ہیں کہ "اگر میرا ضمیر اس بات پر متفق ہو جائے کہ مجھے مسلمان بن جانا چاہیے تو میں انتہائی فخر کے ساتھ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاؤں گا" (تالیاں) انہوں نے کہا کہ مسلمانوں سے زیادہ شریف قوم انہوں نے کہیں نہیں دیکھی۔ مسلمانوں سے زیادہ ذہین لوگوں سے وہ کبھی نہیں ملے۔ بعض لوگوں کا یوں کہنا کہ مسلمان دیگر اقوام کے مقابلے میں علم و فن کے میدان میں پچھڑے ہوئے ہیں۔ صریحاً احمقانہ فعل ہے۔ مسلمان ہمیشہ ہی سے بہادر رہے ہیں۔ ان سے بڑھ کر بہادر قوم دنیا بھر میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ "جھوٹے دوستوں" کے فریب میں ہرگز نہ آئیں اور خود کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"سچے دوستوں" سے الگ نہ رکھیں۔ کانگریس کے مقاصد کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ پرانے زخموں کو مندمل کر کے اس عظیم الشان سلطنت میں بسنے والی تمام قوموں کو ہم جنس اخوت کے ایک ہی بندھن میں باندھ دیا جائے۔"[78]

میں نے چوتھی کانگریس کی روداد پر اس قدر تفصیل کے ساتھ اس لیے روشنی ڈالی ہے کہ اس اجلاس کی حیثیت ہندستان کی سیاسی تاریخ میں ایک سنگ میل کی سی ہے تعلیم یافتہ ہندو اس سے پہلے کبھی بھی اس قدر مستقل (Aggressive) نہیں ہوئے تھے اس سے پہلے کبھی بھی انہیں ایسی مخالفت کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔ انہیں ایک طرف اپنی تحریک کی بڑھتی ہوئی قوت کا احساس تھا تو دوسری طرف وہ اُن خطرات کو بھی شدید طور پر محسوس کرنے لگے تھے جو ان کی تحریک کی کامیابی کی راہ میں حائل تھے۔ وہ سیاسی اصلاحات کے خواہاں ضرور تھے لیکن اہل برطانیہ کی ناراضگی مول لے کر نہیں۔ وہ تحریک ایجیٹیشن ضرور چلانا چاہتے تھے۔ لیکن انتظامی مسائل پیدا کر کے نہیں۔ اپنی تقریر میں راجہ سر نرپندر ناد صوراؤ نے اُنہی تعلیم یافتہ ہندوؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ابتدائی مرحلوں میں اگر وہ لوگ حدود سے تجاوز کر گئے تو یہ کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔ "لوگ چلنا سیکھنے سے پہلے ہی دوڑنا سیکھ لیتے ہیں۔ اپنے پیروں پر مضبوطی سے جمنا سیکھنے سے پہلے لوگ ضرور لڑکھڑاتے اور جھکولے کھاتے ہیں۔" کانگریسی حضرات دراصل سنجیدگی سے قانون کا احترام کرنے والے لوگ ہیں۔ اُن کے نوجوانوں میں پائی جانے والی جذبات کی فراوانی اور عنفوانِ شباب کی عجلت پسندی بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر فطری باتیں ہیں۔"[78]

لیکن ان کے مخالفین "ایسے شہد جیسے میٹھے" الفاظ سے مطمئن نہیں تھے انہوں نے اس تحریک کے قد کو ناپ لیا تھا اور اس کی طاقت کا اندازہ قایم کر لیا تھا۔[79] برطانوی عہدیداروں نے اس تحریک کے پسِ پشت اپنی بقا کے لیے خطرات کو منڈلاتے ہوئے دیکھا، جبکہ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ یہ جماعت انہیں پھانسنے کے لیے ان کے اطراف جال بچھا رہی ہے۔ گو سرکاری عہدیداروں اور مسلمانوں کی جانب سے شدید مخالفت کی گئی تاہم ۱۸۸۵ء میں الہ آباد کے مقام پر کانگریسی رہنماؤں نے بڑی بہادری کے ساتھ اس مخالفت کا مقابلہ کیا۔ اس مقابلے میں کانگریسی رہنماؤں کو جو فتح نصیب ہوئی وہ نہایت شاندار ہونے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باوجود زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکی۔

کانگریسی رہنما اپنی تنظیم کے خلاف لگائے جانے والے بغاوت اور غدّاری کے الزامات سے اُتنے پریشان نہیں ہوتے تھے جتنے مسلمانوں کی مخالفت سے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندستان میں مقیم کئی برطانوی عہدیداران کے مخالف ہیں لیکن انہیں اس بات کا علم بھی تھا کہ کئی برطانوی ممبرانِ پارلیمنٹ بشمول گلیڈسٹون (Gladstone) کی ہمدردیاں انہیں حاصل ہیں۔ انہیں برطانیہ کے بڑے پریس کی حمایت بھی حاصل ہے جس کی نمایندگی مانچسٹر گارجین، ڈیلی کرانیکل، اسٹار اور ڈیلی نیوز جیسے اخبارات کر رہے تھے۔ مزید برآں جس وقت لارڈ ڈفرن ... (Lord Dufferin) کی جگہ لارڈ لینس ڈاون (Lord Lans-downe) وائسرائے مقرر ہوئے تب انہوں نے کانگریس کو ایک ترقی پسند تحریک قرار دیا اور اپنی تمام ترہمدردیوں کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا۔[80]

درحقیقت حکومتی حلقوں کو کسی قسم کا خطرہ محسوس کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی کیونکہ کانگریس قایدین ہمیشہ برطانیہ کے ساتھ تعلقات کی استواری کا دم بھرتے تھے انہیں برطانیہ کی طبعی اور اخلاقی قیادت پر بھرپور اعتماد تھا۔ وہ برطانوی طرزِ معاشرت کا احترام کرتے تھے۔ انہیں اہلِ برطانیہ کے جذبۂ انصاف پروری پر پورا یقین تھا۔ وہ برطانیہ کی دستوریت اور پارلیمانی طریقوں پر فریفتہ تھے۔ وہ اتنے احمق نہیں تھے کہ برطانیہ سے قطع تعلق کی بات سوچتے۔ وہ اتنے حواس باختہ بھی نہیں ہوتے تھے کہ اس بات کو بھلا بیٹھیں کہ انہیں جو کچھ بھی مرتبہ اور مقام حاصل ہوا تھا، وہ سب برطانوی تعلقات ہی کی دین تھا۔ نتیجتہً 1885 - 1906ء کے تمام عرصے میں کانگریس نے اپنے صدارتی خطبوں، حکمتِ عملی کے اعلانوں اور سالانہ قراردادوں میں متواتر تاجِ برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعادہ کیا۔ جس کسی ہال یا شامیانے میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوتا وہاں "ملکہ معظمہ" کی تصویر آویزاں رہتی۔ جس سے بقول پنڈت مدن موہن مالویہ "ہماری کارروائیوں پر ان کی مہربان و مادرانہ اثر انگیزی کا ایک مدھم سا پرتو پڑتا رہتا"[81] صحیح فکر رکھنے والوں کے لیے خود کانگریس کا وجود ہی ہندستان میں برطانوی عملداری کی شاندار فتح اور عظیم برطانوی قوم کے لیے طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے۔[82]

اس تمام عرصے میں کانگریس نے کبھی برطانیہ سے جھگڑا مول لینے کی کوشش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں کی۔ وہ حکمرانوں سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ چاہتی تھی وہ محض یہ تھا کہ وہ اُن بیشتر وعدوں میں سے چند کو روبہ عمل لے آئیں جو انگلستان نے ہندستان سے وقتاً فوقتاً کر رکھے تھے۔ کانگریس ان وعدوں کو اپنی سالانہ رپورٹوں کے دوسرے صفحے پر متواتر کئی سال تک شائع کرتی رہی۔ ان میں دیگر وعدوں کے علاوہ 1833ء کی پارلیمنٹ کا ایکٹ، ملکہ وکٹوریہ کا 1858ء کا اعلان، لارڈ لیٹن کا وہ خطبہ جو انہوں نے 1876ء کے دہلی دربار کے موقعے پر دیا تھا اور وایسرائے کا وہ اعلان شامل تھا جو اُنہوں نے 1887ء میں ملکہ معظمہ کی جوبلی کے موقع پر کیا تھا۔ ان تمام اعلانات میں بڑے ہی پُروقار انداز میں اس بات کا تیقن دیا گیا تھا کہ تاجِ برطانیہ کی دیگر رعایا کی طرح ہندستانیوں کو بھی نہ صرف سرکاری عہدوں کے حصّوں میں بلکہ "آزادی، مساوات اور انصاف" کے معاملات میں بھی مساویانہ حقوق حاصل رہیں گے۔ کانگریسی رہنما بار بار اپنے پیروؤں سے کہتے رہتے "اگر تم جرأت، اعتدال اور معقولیت کے ساتھ اپنی گزارشات عظیم برطانوی قوم کے روبرو پیش کرتے رہے تو یقیناً وہ لوگ تمہاری باتوں پر کان دھریں گے جس طرح بربط کے تار موسیقار کی انگلیوں کے لمس کے ساتھ جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ اسی طرح انگلستان کا عظیم و عمیق ضمیر بھی آزادی اور انصاف کے ہر معقول مطالبے پر بیدار ہو جاتا ہے۔"

وفاداری کے اس غلامانہ اظہار کے باوجود ہر وہ اوسط درجے کا برطانوی عہدیدار جس کے کاندھوں پر ہندستان کا نظم و نسق چلانے کی ذمہ داری عاید تھی۔ کانگریس کی مقبولیت پر شدید کرب محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ اس تنظیم کے پھلنے پھولنے کے باعث اُسے اپنے استحقاق (Prerogatives) اور رتبے (Position) پر بجا طور پر آنچ آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔[84] پہلے پہل تو اعلیٰ برطانوی حکام نے اس تحریک پر کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی اس کے ممکنہ خطرات کے قایل ہو گئے۔ سر لیپل گریفن (Sir Lepel Griffin) جو وسطی ہندستان کے لیے گورنر جنرل کے نمایندے مقرر کیے گئے تھے۔ اس تحریک سے اس قدر متوحش ہوئے کہ انہوں نے سرِعام مرہٹوں اور راجپوتوں کو کانگریس کے خلاف اُبھارتے ہوئے انہیں متنبہ کیا کہ وہ "بنگالیوں کی نیشنل کانگرسوں اور نمایندہ اداروں کی باتوں کے جھانسوں میں نہ آئیں کیوں کہ اس قسم کی باتیں ہندستان کے لیے اتنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہی موزوں ہیں جتنی چاند کے لیے۔[۵۵]

اس رجحان سے سرسید کو بھرپور فایدہ حاصل ہوا کیونکہ اُن دنوں ان کی کانگریس مخالف تحریک مسلمانوں میں بتدریج مقبولیت حاصل کرتی جارہی تھی۔ اُن کی یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (United Indian Patriotic Association) سے اب تک مسلمانوں کی (۲۷) تنظیموں کا الحاق عمل میں آچکا تھا جو ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھیں ان میں کی بعض تنظیموں نے تو ایسے ضوابط بھی منظور کر رکھے تھے کہ ان تمام مسلمانوں کو متعلقہ تنظیم سے خارج کر دیا جائے جو کانگریس سے متعلق ہوں یا اُس سے کسی قسم کی ہمدردی رکھتے ہوں۔[۵۶]

کانگریس کے حامیوں کے خلاف سرکاری حلقوں کا معاندانہ اور مسلمانوں کا مخالفانہ رد یہ ایک ساتھ نمودار ہوا۔ اِسے محض ایک حسنِ اتفاق کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا کیونکہ دونوں کے مابین ایک قریبی تعلق کی موجودگی کا گہرا شبہ جڑ پکڑ چکا تھا کیونکہ سر آکلینڈ کولون (Sir Auckland Colvin) کے نام موسومہ اپنے پہلے مکتوب میں ہیوم (Hume) نے سرسید پر الزام لگایا تھا کہ وہ کانگریس کے تعلق سے برطانوی رویّے کو غلط رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ ہیوم کے الفاظ میں:-

> اس معاملے کو صداقت اور خلوص کی نظر سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ وہ نکات جنہیں بطورِ خاص غلط رنگ میں پیش کیا جارہا ہے۔ کچھ اس طرح ہیں، آپ خود شخصی طور پر کانگریس کی مخالفت پر کمربستہ ہیں، آپ اُن تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں جو بڑھ چڑھ کر کانگریس میں حصّہ لے رہے ہیں، ہر اس شخص کو آپ اپنی الطاف وعنایات سے سرفراز فرمائیں گے جو اس تحریک کی مخالفت کے لیے روپیہ خرچ نہیں کرے گا اور نجی اور عوامی سطحوں پر اس تحریک کی مذمت نہیں کرے گا.....

ہیوم نے یہ بھی لکھا کہ "سرسید جیسے لوگ اس قسم کے غلط پروپیگنڈے میں بڑی تندہی کے ساتھ مصروف ہیں اور انہوں نے اپنے احباب سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنی تمسخر آمیز جارحانہ تقاریر کا سلسلہ محض آپ ہی کی ایما پر جاری رکھے ہوئے ہیں۔[۵۷]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرکولون (Colvin) نے سرسیّد کو ان تمام الزامات سے بری قرار دیا اور انہیں ایک "انتہائی محتاط قسم کی صداقت پرست شخصیت" قرار دیا۔ کولون نے اپنے جواب میں یہ بھی کہا کہ جس طرح میں خود ان الزامات سے اپنے آپ کو مبرا پاتا ہوں اسی طرح سرسیّد بھی بے گناہ ہیں۔[88]

اس جواب سے ہیوم کی تشفی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے دوسرے مکتوب میں اسی موضوع پر کولون کو مخاطب کرتے ہوئے سرسیّد کو موردِ الزام گردانا کہ "وہ دیسی والیانِ ریاست کو یہ باور کرا کر کہ وہ آپ (کولون) ہی کے خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ ان سے زبردست چندے جمع کر رہے ہیں۔ سرسیّد یہ بھی باور کروا رہے ہیں کہ آپ اور وائسرائے ہند ایک دوسرے کے ساتھ اس معاملے میں سانٹھ گانٹھ کئے ہوئے ہیں (یہ بات آپ دونوں کے لیے بدنامی کا باعث ہے لیکن عام طور پر یہاں ایسی باتوں پر یقین کیا جانے لگا ہے)۔[89]

کولون اور ہیوم کی یہ مراسلت جوں ہی اخبارات کے لیے جاری کی گئی، سرسیّد نے فوراً ایک عوامی جلسے میں ہیوم کے الزامات کو "بے بنیاد اور من گھڑت" قرار دیتے ہوئے ان کی مذمّت کی۔ انہوں نے اس بات پر بڑے تعجب کا اظہار کیا کہ انگریز شرفا بھی بنگالی بابوؤں جیسا رویّہ اپنانے لگیں اور واضح کیا کہ دو سال قبل جب ہیوم نے کانگریس کے بارے میں انہیں لکھا تھا تو انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں انہیں بتلا دیا تھا کہ وہ کانگریس کے خلاف ہیں۔ اپنی تقریر میں انہوں نے ہیوم کو اس بات کا یقین بھی دلایا کہ "نہ صرف سر آکلینڈ کولون بلکہ سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند لارڈ ڈفرن Lord Dufferin اور پورا کا پورا دارالعلوم (House of Commons) کانگریس کے حق میں فیصلہ دے"، تب بھی وہ "ہمیشہ کی طرح کانگریس کی مخالفت جاری رکھیں گے"۔[90]

اُن ہی دنوں جب یہ نزاعی مسئلہ بڑے زور و شور سے اخبارات میں موضوعِ بحث بنا ہوا تھا، نواب مہدی علی نے جو محسن الملک کے نام سے مشہور تھے، برطانیہ کے عظیم لبرل لیڈر مسٹر گلیڈسٹن (Mr. Gladstone) کو ایک مکتوب روانہ کیا جس میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کانگریس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں جس کی مخالفت ہندستانی مسلمانوں کی جانب سے اس بنا پر کی جا رہی تھی کہ ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے نزدیک اس قسم کی تحریک کی اور کوئی "تاریخی مثال موجود نہیں تھی" محسن الملک اس سے قبل چسٹر (Chester) کے مقام پر گلیڈسٹون سے مل چکے تھے۔[92]

نواب صاحب نے اپنے مکتوب میں اس بات پر زور دیا کہ ہندستان جیسے ملک میں کسی ایک مرکزی تنظیم کے قیام کا تصور ناممکن العمل ہے کیونکہ اس تنظیم میں شامل ہونے والی مختلف اکائیوں کا تعلق مختلف النوع مذاہب اور قومیتوں کے ساتھ ہوگا۔[93]

گلیڈسٹن کا جواب مختصر تھا، جس میں انہوں نے کسی بھی فریق کی موافقت نہیں کی تھی تاہم بہ حیثیتِ مجموعی کانگریس ہی کی تائید کرتا تھا۔"

Hawarden Castle

Chester

10 دسمبر 1888ء

جنابِ عالی!

آپ کے دلچسپ مکتوب کا تفصیلی جواب دینے کے لیے یہ امر ضروری ہو جاتا ہے کہ ہندستان کے متعلق متعدد سوالات کا جائزہ بڑی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ لیا جائے جو میرے بس کی بات نہیں ہے۔ تاریخِ انسانی میں نمایندہ طرزِ حکومت (Representative System) نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور آج بھی کر سکتی ہے۔ اس طرزِ حکومت کی بنیاد مغرب کی آریائی اقوام نے ڈالی اور متعدد لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ عیسائی کلیسا کے اندرونی نظم و نسق کی بنیاد پر عالمِ وجود میں آیا۔ اس طرزِ حکومت میں غیر تر فواید پہنچانے کی صلاحیت مضمر ہے اس لیے میں چاہوں گا کہ اسے اور بھی مقبولیت حاصل ہوتی رہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں سنا کہ بلغاریہ کے عیسائی کے ساتھ مسلمانوں کے اشتراک کے کوئی ناخوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔ تاہم محض اس تجربے کی روشنی میں ہم اس طرزِ حکومت کو آناً فاناً اگر دوسرے ممالک میں بھی نافذ العمل کرنا چاہیں جہاں کے حالات انوکھے اور غیر یقینی ہوں تو ہمارا یہ فعل فاش قسم کی غلطی قرار دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں ہمیں کافی غور و خوض اور عارضی اقدامات کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سہارے آگے بڑھنا ہوگا۔ اصل موضوع کو مزید بحث وتمحیص کے لیے کھلا چھوڑتے ہوئے میں اس امر کو ضرور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اس طرز حکومت کی مخالفت پُرامن اور وفادارانہ طریقے سے کی جاسکتی ہو تو جارحانہ اظہار رائے کو ناپسندیدہ سمجھوں گا۔

بصد احترام

آپ کا خادم

دستخط W.E. Gladstone 94

اس خط سے سرسید کو بڑی مایوسی ہوئی ہوگی کیوں کہ انہوں نے اس بات کا اندازہ کر لیا ہوگا کہ انہیں کانگریس کی مخالفت کے معاملے میں برطانیہ کے لبرل اور ریڈیکل حلقوں سے کسی قسم کا تعاون حاصل نہیں ہو سکتا۔[95] کیوں کہ ان حلقوں پر پہلے ہی کانگریس اپنی لندن کی ایجنسی کے معرفت اثر انداز ہو چکی تھی۔ یہ ایجنسی ویسٹ منسٹر Westminister میں دادا بھائی نوروجی کی قیادت میں اچھا خاصا پروپیگنڈہ کرنے لگی تھی جنہوں نے 1886ء میں کلکتے میں دوسری کانگریس کی صدارت کے فرائض انجام دیئے تھے۔ اس پروپیگنڈے کی وجہ سے بڑی حد تک کانگریس کو برطانوی عوام کی حمایت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی جس کی بنا پر اس تحریک کے سربراہان کی خود اعتمادی اس حد تک بڑھ گئی کہ 1892ء میں ناگپور کے مقام پر کانگریس کے ساتویں سالانہ جلسے میں اس بات کا بھی عہد کیا گیا کہ جلد ہی کانگریس کا ایک اجلاس لندن میں بھی منعقد کیا جائے گا۔[96] لیکن افسوس کہ کانگریسیوں کا یہ عزم پورا نہ ہو سکا۔[97]

سرسید اُن "ہتھکنڈوں" سے سخت پریشان تھے جو کانگریس لندن میں اہل برطانیہ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اپنا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کا سیاسی ولولہ بڑی حد تک سرد پڑ چکا تھا۔ تاہم انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں قدامت پسند حلقوں سے تائید حاصل ہو سکتی ہے حالانکہ قدامت پسندوں کا رویہ اس بارے میں مثبت ہونے کی بجائے زیادہ تر منفی ہی رہا تھا۔ اس کے علاوہ انگلستان میں ایسے متعدد سابق سیویلین Civilians عہدیدار موجود تھے جو سرسید کے موقف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ہمدردی رکھتے تھے اور ٹوری (Tory) پریس بھی وقتاً فوقتاً ان کے موقف کی تائید کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ جماعت اس تائید کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی جو برطانیہ میں کانگریس کو حاصل ہو چکی تھی۔ یہ صورتِ حال سرسید کے لیے ناقابلِ برداشت تھی جس کی جانب سر ولیم گریگوری (Sir William Gregory) نے اپنے ایک طویل مقالے کے ذریعے جو Nineteenth Century میں شائع ہوا تھا۔ اپنے ہم وطنوں کی توجہ مبذول کروائی تھی۔[98]

سر ولیم نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ انگریز رائے عامہ اس نکتے کو ٹھیک طور پر سمجھنے سے قاصر رہی کہ ان گرما گرم تقریروں اور تحریروں کے سیلاب کے باوجود برطانوی راج کے ساتھ ہندستانی مسلمانوں کا رویہ ہمیشہ دوستانہ رہا۔ گو ابتداً انہوں نے برطانوی راج کی مخالفت کی تھی اور اُسے پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ "کیوں کہ ان کا قومی جذبہ افتخار انہیں ادنیٰ ذات کے ہندوؤں کی طرح خوشامد پرستانہ جی حضوری اور فروتنی اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔" پہلے پہل تو انگریز عہدیداروں نے مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کیا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ ہم خیال بن جانے پر ایک مسلمان کسی ہندو کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط اور قابلِ اعتماد ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے سر ولیم کا خیال تھا کہ اگر اس وقت اہلِ برطانیہ نے مسلمان قائدین کے موافقانہ اور وفادارانہ جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے ان سے بھرپور فایدہ نہ اُٹھایا تو سیاسی طور پر یہ ان کی حماقت کی انتہا ہوگی۔

اس مقصد کے حصول کے لیے سر ولیم کے پاس ایک جامع منصوبہ بھی تیار تھا۔ انہی کے الفاظ میں :-

"ہندستان جیسی وسیع و عریض مملکت پر حکمرانی کرتے ہوئے 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کے اصول کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔" لیکن اس مقولے کا اطلاق بھونڈے طریقے سے فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کے لیے نہیں کیا جانا ہے بلکہ اس اصول کو اس طرح استعمال کرنا چاہیے کہ سرکاری ملازمتوں (Public Service) کی کلید کسی ایک قوم ہی کے ہاتھ پڑ جانے سے محفوظ رہے "خواہ وہ قوم اپنی تعداد، استعداد، ذہانت اور اعلیٰ تعلیم میں دوسری قوموں سے کتنی ہی ممتاز کیوں نہ ہو۔" وہ نہیں چاہتے تھے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برطانوی حکومت ہند و مسلم تنازعات میں کسی خاص فریق کا ساتھ دے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ برائیٹ Bright کے کلاسیکی معاہدے کے مطابق حکومت مسلمانوں کے ساتھ "فیض رساں غیر جانبداری" (Benevolent neutrality) کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔

اس قسم کی تحریروں اور سر جان اسٹریچی (Sir John Strachey) کی ایک عام تقریر میں کہی گئی اس بات کا کہ "مسلمانوں کا ایک منتخب طبقہ ہندستان میں برطانوی راج کے لیے قوت کا ماخذ بن چکا ہے" کانگریسی رہنماؤں نے خوب خوب استحصال کیا اور سر عام اینگلو انڈین اعمال کو موردِ الزام گردانا کہ وہ ہندستان میں قومی منافرت اور مذہبی رقابت کے جذبے کو ہوا دے رہے ہیں۔ صوبجات متحدہ کے جانے مانے لیڈر پنڈت بشن نرائن دھر نے الزام لگایا کہ مسلمانوں کی جانب سے سیاسی اصلاحات کی مخالفت نتیجہ ہے محض اُس جانی بوجھی حکمت عملی کا جو حکمران طبقے کے بعض افراد نے اختیار کر رکھی ہے۔ دھر نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اگرچہ وہ حکومت کے اعمال پر سنگین الزام عاید کر رہے ہیں لیکن صوبجات متحدہ میں انہیں ایسے تجربات سے دوچار ہونا پڑا جن کی بنا پر وہ خود کو ایسا ماننے پر مجبور پاتے ہیں۔[99]

لیکن برطانوی صورتِ حال اس اندازے سے بڑی حد تک مختلف تھی کیوں کہ جن دنوں دھر صاحب حکومت کو اپنی الزام تراشیوں کا نشانہ بنا رہے تھے اُنہی دنوں نئے وائسرائے لینس ڈاون (Lansdowne) نے سر عام کانگریس کی تعریف کرتے ہوئے اُسے ہندستان کی ایک ایسی تحریک قرار دیا جسے یورپ والے بجا طور پر انتہائی ترقی یافتہ لبرل پارٹی قرار دیں گے۔ انہوں نے کانگریس کو مکمل طور پر ایک باقاعدہ تنظیم قرار دیا اور واضح کر دیا کہ وہ افراد جو سرکاری ملازمتوں سے وابستہ نہیں ہیں، اس تنظیم کو مستحکم کرنے کے مجاز ہیں۔[100] اس مابہ النزاع مسئلے کے بارے میں گریگوری اسٹریچی یا اس قبیل کے چند افراد خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں لیکن نئے وائسرائے کا مذکورہ بیان کانگریس کے تعلق سے سرکاری رویے کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ کانگریس کی مختلف کمیٹیوں کے معتمدین کے نام موسومہ اپنے خفیہ مراسلات میں ہیوم کانگریس کے بارے میں اس سرکاری رویے کی نشاندہی کرنے میں ہرگز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں چوکے۔[102]

یہاں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس تمام عرصے میں اگرچہ برطانوی حکام مسلمان رہنماؤں اور کانگریس کے مابین چلے آرہے سیاسی مناقشات کے بارے میں رائے قایم کرنے کے سلسلے میں دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ یہ تقسیم صرف انسانوں ہی کی تقسیم نہیں تھی بلکہ خیالات اور انداز فکر کی تقسیم تھی۔ اس موضوع پر میں اگلے ابواب میں تفصیلی روشنی ڈالوں گا۔ فی الوقت ہم صرف اس بات کو ذہن نشین کرلیں کہ لبرلوں (Liberals) نے کانگریس کی تائید اس وجہ سے کی کہ انہیں اس تحریک میں "ایک جمہوری اور لبرل ادارے" کا رنگ و روپ نظر آیا۔[103] جبکہ قدامت پسند (Conservatives) اپنے اشرافی (Aristocratic) پس منظر کی وجہ سے ہندستانیوں کے "مہذب اور شایستہ گروہ" یعنی مسلمانوں کی جانب کشش محسوس کرنے لگے۔[104]

ہندستانی سیاسی مسایل کے بارے میں برطانوی رویے کا تضاد کسی اور موقعے پر اتنا کھل کر سامنے نہیں آیا جتنا 1894ء کے عام انتخابات کے موقعے پر دکھائی دیا جبکہ بعض قدامت پسندوں (Conservatives) نے دادا بھائی نوروجی کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی جانب سے کسی ہندوستانی مسلمان کو برطانوی پارلیمانی نمایندے کی حیثیت سے کھڑا کرنے کی بھرپور کوشش کی حالانکہ ان کے لیڈر لارڈ سالسبری (Lord Salisbury) کے کھلے عام "انہیں" کالا آدمی[105] کہہ کر ان کی مذمت کرنے کے باوجود وہ لبرل ایم۔ پی کی حیثیت سے ایک مرتبہ پارلیمانی انتخاب جیت چکے تھے۔ قدامت پسندوں کو مسٹر (بعد ازاں سر) رفیع الدین احمد کی شکل میں اپنا پسندیدہ اُمیدوار مل بھی گیا۔[106] پونا کا یہ اولوالعزم نوجوان بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گیا ہوا تھا اور ان دنوں اس نے کانگریس کی مخالفت کرنے کی غرض سے مسلم پیٹریاٹک لیگ (Muslim Patriotic League) جیسی دو ایک انجمنیں بھی قائم کر رکھی تھیں۔ اس وجہ سے لندن کے سیاسی حلقوں میں اسے تھوڑا بہت پہچانا بھی جانے لگا تھا۔ چنانچہ رفیع احمد کے نام کو بڑھ چڑھ کر قدامت پسند حلقوں میں اُچھالا گیا اور علاوہ دیگر رعایا کے سر جان گورسٹ (Sir John Gorst) جیسی شخصیت نے بھی ان کی بھرپور تائید کی اور لندن کے جونیر کانسٹی ٹیوشنل کلب میں ترتیب دیے گئے عشائیے میں بھی رفیع احمد کا ذکر بڑے ہی شاندار الفاظ میں کیا۔[107]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دی پال مال گزٹ (The Pall Mall Gazette) نے اپنے کالموں میں مولوی محمد برکت اللہ ایم۔اے پروفیسر اورینٹل لنگویجز لیورپول کالج کے اس مراسلے کو نمایاں طور پر شائع کیا جس میں برطانوی عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ رفیع احمد کی حمایت کریں مراسلے میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ رفیع احمد کی کامیابی کو مسلمانِ ہند "پُر مسرت پسندیدگی" کے ساتھ دیکھیں گے۔[107] اسی طرح st. James Gazette نے اپنے اداریے میں لکھا کہ "بہتر ہوگا اگر انگریز عوام اس حقیقت کو پہچان لیں کہ ہندستان کے تعلیم یافتہ دیسی باشندوں سے مراد صرف بنگالی بابو یا کانگریس کے ارکان نہیں ہیں۔"[108]

اُس وقت جبکہ قدامت پسند پارٹی (جو اُن دنوں Unionist Party کہلاتی تھی) رفیع الدین احمد کے انتخاب پر بحث و تمحیص میں اُلجھی ہوئی تھی، Times of India نے اپنے صفحات میں ایک انتہائی مضرت رساں قسم کی تنقید شائع کر ڈالی۔ یہ اخبار اینگلو انڈین حلقوں میں خاصا اثر رکھتا تھا۔[109] اس اخبار نے جس بات پر سب سے زیادہ اعتراض کیا وہ یہ تھی کہ "اس کم اہمیت رکھنے والے نوجوان کی نمائندگی کی وکالت کے پیچھے ایک ایسا جانا بوجھا مقصد کارفرما نظر آتا ہے جس کے ذریعے برطانوی حلقہ ہائے انتخاب کے روبرو ان تمام اختلافات اور نزاعی امور کو منظرِ عام پر لایا جائے جنہیں ختم کرنے کے لیے ہندستان کے حکمرانوں کی بہترین سیاسی حکمت عملی کوشاں ہے۔ ہندستان کے عدم اتحاد کے پرچم کو انگلستان میں سربلند ہونے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے اور خاص طور پر ایسے وقت میں جبکہ ہم خود اسے یہاں سرنگوں کرنے کی انتھک کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔" "برہمن زیادہ تیزی سے ترقی کر رہے ہیں" یا "مسلم مفادات کے لیے" تحفظات" کی ضرورت ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جنہیں پارٹی بازی کی اس گرما گرم رسہ کشی کے دوران انگلستان میں زیرِ بحث نہیں لایا جانا چاہیے۔ اخبار کا خیال تھا کہ رفیع الدین احمد اس لحاظ سے پارلیمنٹ میں کوئی قابلِ قدر خدمات انجام دینے کے اہل نہیں تھے کہ اس سے قبل کسی اور اُمیدوار نے اُن کی طرح اپنے ملک میں پائی جانے والی قومی رقابتوں اور دشمنیوں کی بنا پر عوام سے نمائندگی نہیں چاہی تھی جنہیں وہ اپنے پیچھے ہندستان میں چھوڑ کر انگلستان آ گئے تھے۔ اسی وجہ سے "انجمن آف انڈیا" نے فوری "عظیم انگریز پارٹی" سے اپیل کی کہ

محکم آباد سے ہر اہم موضوع پر مستند مفہم آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ ہندستان سے متعلق اپنے فرض سے غفلت نہ برتتے ہوئے کسی ایک فریق کی طرف داری کرنے سے باز رہے ورنہ Unionist Party پر یہ الزام عائد کیا جاسکے گا کہ وہ اندرونِ ملک اتحاد کے اصول پر اتنی سنجیدگی سے کاربند نہیں ہے جتنی اس کی دلچسپیاں ہندستان میں عدم اتحاد کے پیدا کرنے سے ہیں۔"

یہ سخت انتباہ ایک ایسے گوشے سے نمودار ہوا تھا جس کے خیالات و نظریات کی وہ سبھی انگریز سیاست داں قدر کیا کرتے تھے جنہیں ہندستانی معاملات سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس انتباہ سے متاثر ہوکر قدامت پسندوں نے چپکے سے رفیع الدین احمد کی نامزدگی کو نظر انداز کرتے ہوئے نوروجی ہی کی قوم یعنی پارسیوں میں سے اپنا ایک نمایندہ منتخب کرلیا جس کا نام ایم بھاونگری (M. Bhownagree) تھا جسے بعدازاں سر کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ اگرچہ بھاونگری انتخاب جیت گئے تاہم قدامت پسندوں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی کیوں کہ وہ تو یہ چاہتے تھے کسی ایسے ہندستانی کو منتخب کریں جو پارلیمنٹ میں نوروجی کو نیچا دکھا سکے۔ لیکن ان عام انتخابات میں لبرل پارٹی کو جہاں اور کئی ہزیمتیں اٹھانی پڑیں۔ نوروجی کی شکست بھی انہیں میں سے ایک ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں کانگریس کے حامی بھاونگری کو قدامت پسندوں سے گٹھ جوڑ کی بنا پر بڑی حقارت دیا کرتے تھے۔"[10]

اس دوران اندرونِ ہند کانگریس کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ 1889ء میں بمبئی میں منعقدہ کانگریس کا پانچواں سالانہ اجلاس بے انتہا کامیاب رہا تھا کیوں کہ اس میں شرکت کے لیے بطور خاص لندن سے چارلس برڈلا Charles Bradlaugh ہندوستان آئے تھے۔ اس اجلاس میں دو ہزار کے قریب نمایندے شریک ہوئے تھے۔ جن میں سے 254 مسلمان تھے۔ اس سے پہلے کبھی کانگریس کے کسی اجلاس میں اتنے زیادہ مسلمان شریک نہیں ہوئے تھے۔"[11]

اس وقت تک کانگریس کے منتظمین وفود کے موزوں انتخاب اور مختلف صوبوں کی مناسب نمایندگی کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دیا کرتے تھے لیکن 1891ء تک جب کہ ناگپور میں کانگریس کا ساتواں اجلاس منعقد کیا گیا ہیوم یہ کہنے کے موقف میں پہونچ چکے تھے کہ کانگریس کے وفود کا انتخاب باضابطہ طور پر کیا گیا ہے اور منتخبہ افراد اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے علاقوں کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو بھی واضح کیا تھا کہ بعض ایسے نمایندوں کو جن کا چال چلن مشتبہ دکھائی دیا۔ کانگریس کی رکنیت سے محروم کر دیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت تک مختلف قوموں کو مناسب نمایندگی دلانے کے لیے کوئی خاص اقدامات نہیں کیے گئے تھے لیکن اس بارے میں ہیوم کا خیال تھا کہ "مطلوبہ صورتِ حال خود بخود پیدا ہو جائے گی۔"[2] لیکن یہ ایک ایسا خیال تھا جسے اعداد و شمار کے ذریعے کبھی بھی صحیح ثابت نہ کیا جا سکا کیونکہ جب 1894ء میں مدراس کے مقام پر کانگریس کا دسواں اجلاس منعقد کیا گیا اس میں من جملہ (1200) وفود کے مسلمانوں کی تعداد صرف (24) تھی جس کی بنا پر مجلس استقبالیہ کے صدر کو برملا اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمانوں کے ایک اہم طبقے نے "ہماری تحریک" سے علیحدگی اختیار کر رکھی ہے اور وہ اپنے طور پر تعلیمی کانفرنسیں اور سیاسی انجمنیں قایم کرنے میں مصروف ہیں۔"[3] مذکورہ بالا (24) نمایندوں میں سے بھی (18) نمایندے مدراس ہی کے آس پاس کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے جبکہ بمبئی، ساتارا، برار اور علی گڑھ سے صرف ایک ایک نمایندہ اجلاس میں شریک ہوا تھا اور باقی دو نمایندے حیدر آباد دکن سے شریک ہوئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے ان میں سے بیشتر نمایندے تاجر طبقے سے تعلق رکھتے تھے جنہیں مسلمان سوسائٹی میں کسی خاص عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اگلے سال پونا میں منعقد ہونے والے کانگریس کے گیارہویں اجلاس میں تو صورتِ حال مزید ابتر ہو گئی جبکہ من جملہ (584) نمایندوں کے صرف (9) نمایندے مسلمان قوم سے تعلق رکھتے تھے اور ان (9) میں سے بھی (7) کا تعلق پونا یا اسی کے آس پاس کے علاقے سے تھا۔ لیکن اِن منہ بولتے اعداد و شمار کے باوجود اس اجلاس کے صدر سر میدر ناتھ بنرجی نے اس اجتماع کو "متحدہ ہندوستان کے ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، پارسیوں اور سکھوں کا نمایندہ اجتماع" قرار دیا۔[4]

آیئے اب کانگریس کے مسلمان مخالفین کی جانب پھر سے توجہ مبذول کریں۔ اُس وقت تک سر سیّد نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو غیر فرقہ وارانہ خطوط پر جاری رکھا تھا اور کانگریس کی مخالفت کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کو منظم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اُن کی یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن [illegible]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Indian Patriotic Association) اپنی ساخت کے اعتبار سے تو ایک مسلم تنظیم دکھائی پڑتی تھی لیکن کردار کے اعتبار سے یہ ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم تھی جس میں ہندو زمیندار اور تعلقدار بڑی سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ لیکن ہندو مسلم فسادات اور ہندی اُردو مناقشہ جیسے واقعات کی بنا پر سرسید کو یقین ہوگیا کہ کسی بھی بنیاد پر ہندوؤں کے ساتھ تعاون اور اشتراک ممکن نہیں رہا۔[3] اسی لیے انہوں نے 30 ڈسمبر 1884ء کو علی گڑھ میں اپنے مکان پر چند با اثر مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی میٹنگ طلب کی تاکہ ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا جاسکے۔ اس محفل میں شریک ہونے والے عمایدین میں سرسید کے علاوہ نواب محسن الملک، سیّد محمود، خان بہادر برکت علی، خواجہ یوسف شاہ، شمس العلماء ذکاء اللہ، مولوی کرامت حسین اور آنریبل اسماعیل خاں شامل تھے۔

سرسیّد کی درخواست پر بیک Beck نے حاضرین کو مخاطب کیا جس میں اس نے ملک کے سیاسی مسایل پر اسی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی جو کہ ایک وفادار مسلمان کا نقطہ نظر اُن دنوں ہوا کرتا تھا۔[4] یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ برٹش راج دوامی طور پر قایم رہے گا، مقرر نے سوال اُٹھایا کہ اِن حالات میں کس طرح مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کیا جائے اور کس طرح اُن کی سیاسی خوشحالی کا بندوبست کیا جائے؟ ہندوستان میں گزشتہ چند برسوں سے چلائی جانے والی دو تحریکوں کی وجہ سے اس مسئلے نے اچانک شدت اختیار کرلی ہے۔ پہلی تحریک تو کانگریس کی تھی اور دوسری تحریک گاؤکشی پر امتناع عاید کرنے کے سلسلے میں چلائی جارہی تھی۔ پہلی تحریک انگریز مخالف تھی تو دوسری مسلم مخالف۔ مسلمانوں کو کانگریس سے اس وجہ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ملازمتوں اور اقتدار کے بھوکے ہندوؤں کے مقابلے میں انگریزوں کا رویہ ان کے ساتھ بدرجہا بہتر ہے۔ گاؤکشی کے خلاف تحریک چلانے کا مقصد صرف مسلمانوں ہی کو ذبیحۂ گاؤ سے باز رکھنا نہیں ہے بلکہ انگریز کو بھی اس سلسلے میں ہونے والے فواید سے محروم رکھنا ہے۔ لہٰذا مجموعی طور پر یہ دونوں تحریکیں ایک ساتھ مل کر مسلمانوں اور انگریزوں دونوں ہی کے خلاف پڑتی ہیں۔ اس لیے بیک Beck نے اس بات پر زور دیا کہ حالات کا تقاضہ یہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اور انگریز ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو جائیں کیوں کہ اس ملک میں دونوں ہی تو میں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں جس کی وجہ سے جمہوری نظریات کی کاری ضرب دونوں ہی کے مفادات پر پڑتی ہے۔ اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ مسلمان عوام انگریزوں اور مسلمانوں کے ان مشترکہ جذبات کو سمجھیں اور اس اتحاد کو دل وجان سے قبول کریں۔

حاضرین کے رو برو حالیہ ہندو مسلم فسادات، مجالس قانون ساز میں انتخابی اُصولوں کی اجرائی اور انڈین سیول سروس کے لیے ایک ساتھ امتحانات منعقد کیے جانے سے متعلق دارالعلوم کی قرارداد کا ذکر کرتے ہوئے بیک نے حاضرین کو بتلایا کہ ان حالات میں مسلمان ایک عجیب قسم کی گوناگوں صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ایک جانب تو وہ ہندوؤں کی جانب سے چلائی جارہی سیاسی تحریکات کی زد میں ہیں تو دوسری جانب کسی موزوں سیاسی تنظیم کے عدم وجود کی بنا پر نقصانات برداشت کرتے چلے جارہے ہیں۔

اس لیے انہوں نے مشورہ دیا کہ بااثر مسلمان متحدہ طور پر ایک جماعت قایم کریں تاکہ نہ صرف حکومتِ ہند بلکہ برطانوی عوام کے رو برو بھی مسلمانوں کے مفادات کو پیش کرسکیں۔ اس جماعت کو چاہیے کہ وہ نہ تو سیاسی شورش میں کسی قسم کا حصہ لے اور نہ عوامی جلسوں کا انعقاد کرے اور نہ دوسری انجمنوں کا الحاق اپنے ساتھ کرے۔ یہ جماعت صرف تعلیم یافتہ مسلمانوں کی حد تک ہی محدود ہونی چاہیے اور طلبا کو اس سے دُور رکھا جانا چاہیے۔ اس جماعت کے ارکان میں احساسِ ذمہ داری پیدا کیا جانا چاہیے تاکہ وہ برطانوی پریس اور سرکاری اعمال کے رو برو مسلم مفادات کا موثر تحفظ کرسکیں۔ اس جماعت کی حکمتِ عملی کا تعین جماعت کے قائدین کریں نہ کہ معمولی ممبر۔ اس جماعت کا صدر مقام علی گڑھ میں رہنا چاہیے۔

بیک Beck کی تقریر کے بعد زوردار مباحثہ ہوا اور سرسیّد کے مشورے کے مطابق محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا (Mohammedan Anglo-Oriental Defence Association of Upper India) کے قیام کو باضابطہ طور پر منظوری دی گئی۔ لیکن اپنی پیش رو تنظیم یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (United

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی طرح یہ تنظیم بھی کوئی خاص کامیابی حاصل کرنے Indian Patriotic Association
میں ناکام رہی۔ اس جماعت کے عام اراکین کا کوئی جلسہ عام منعقد نہیں کیا جاتا تھا جبکہ اس کی مجلسِ عاملہ مختارِ کل ہوا کرتی تھی جو سال میں دو ایک مرتبہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں کے دوران اپنے جلسے بھی منعقد کر لیا کرتی تھی۔ اس ایسوسی ایشن نے مقابلے کے امتحانوں، قحط اور معاشی حالات کے بارے میں بعض اہم قراردادیں منظور کی تھیں جن میں عام طور پر اینگلو انڈین اخبارات میں شایع ہونے والے خیالات و نظریات ہی کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ ایک بار اس تنظیم نے مجالسِ قانون ساز ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کے تعلق سے ایک تفصیلی یادداشت بھی حکومت کو پیش کی تھی[۱۸] لیکن ایسے کوئی شواہد موجود نہیں ہیں جن سے پتہ چل سکے کہ یہ ادارہ کبھی طاقت ور اور بااثر تنظیم کی شکل اختیار کر سکا۔

اپنی حالیہ ناکامیوں کے باوجود کانگریسی منتظمین نے ابھی تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترک سیاسی پلیٹ فارم پر لانے کی جدوجہد ترک نہیں کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کانگریس ایک قومی تنظیم نہیں بن سکی ہے تو اس میں قصور سراسر مسلمانوں کا ہے کہ انہوں نے اس کے ساتھ عدم تعاون کا رویہ اپنائے رکھا۔ وہ پُر اُمید تھے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ترویج کے بعد اُنہیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ اتحاد ہی میں سب کی نجات مضمر ہے۔ کم از کم وہ لوگ بڑے ہی خلوص کے ساتھ اس قسم کی اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے لیکن سرسید اس خیال کے شدید مخالف تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ مسلمان خواہ کتنے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو جائیں، وہ ہرگز ہندو سیاست دانوں کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے کیونکہ "اقلیت میں ہونے کی وجہ سے" وہ اس قسم کے تعاون کی بدولت کوئی فایدہ حاصل نہیں کر سکتے اس کے برخلاف وہ قرآنی اصطلاح "خسر الدنیا و الآخرت" یعنی اس دنیا اور آخرت کا زیاں بن جائیں گے۔[۱۹]

مسلم قیادت کی اس متواتر دُھتکار کی وجہ سے کانگریسی رہنماؤں کے برطانوی عہدیدار کے روبرو خود کو ایک متحدہ سیاسی وحدت کی شکل میں پیش کرنے کے حوصلے بڑی حد تک پست ہو گئے۔ لیکن وہ بار بار اسی بات پر زور دیتے رہے اور اسی بات کا ادعا کرتے رہے کہ کانگریس ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم ہے۔ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہوں نے کلکتے میں منعقد ہونے والی اپنی بارہویں کانگریس کے اجلاس کی صدارت کرنے کے لیے 1896ء میں بمبئی کے مشہور سالسٹر Solicitor رحمت اللہ سایانی کو مدعو کیا۔ اس انتخاب کا ہندو پریس کی جانب سے یہ کہہ کر خیر مقدم کیا گیا کہ یہ اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ کانگریسی رہنما سیاسی معاملات میں مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کے خواہش مند ہیں۔

انہی دنوں سرسید کے خصوصی نائب (Chief Lieutenant) حاجی محمد اسمٰعیل خاں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین سیاسی نزاع کے تصفیے کے لیے ایک ٹھوس تجویز پیش کی۔[120] انہوں نے کانگریس کے نو منتخب صدر سایانی صاحب کے نام ایک مکتوب روانہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ اگر واقعی کانگریس اس ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی خواہاں ہے تو انہیں چاہیے کہ کانگریسی قائدین کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ دونوں قوموں کے مابین "مساویانہ سیاسی نمایندگی" کے اصول کو اتحاد کی اساس کے طور پر تسلیم کریں۔ خود اسمٰعیل خاں ہی کے الفاظ میں کانگریس کو اس قسم کی قرارداد منظور کرنی چاہیے کہ "حکومتی کونسلوں" میونسپلیٹیوں اور لوکل بورڈوں کے منتخب نمایندے مساوی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔"[121] مسلم اخباروں نے اسمٰعیل خاں کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور اس امر کا یقین دلایا کہ اگر ہندوؤں نے اس تجویز کو تسلیم کر لیا تو مسلمان کانگریس میں شامل ہو جائیں گے۔

تاہم سرسید نے اس تجویز پر کسی خاص جوش اور ولولے کا اظہار نہیں کیا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس تجویز پر اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ "ہندو سیاست دانوں کو چاہیے کہ وہ سرکار کو بھی اس تجویز سے اتفاق کرنے پر آمادہ کریں ورنہ اگر کانگریسی حلقوق نے رسمی طور پر اس تجویز کو قبول کر بھی لیا تو عملاً یہ فعل بے معنی بن کر رہ جائے گا۔"[122]

اپنے صدارتی خطبے میں سایانی نے اسمٰعیل خاں کے مکتوب کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی تجویز کو خام اور ناقابلِ عمل قرار دیا۔ انہوں نے کہا "اگرچہ یہ ایک اچھی تجویز ہے تاہم جب تک مسلمان کانگریس میں اسی ولولے کے ساتھ اور اسی تعداد میں شرکت نہیں کرتے جیسے کہ ہندو تب تک انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ کانگریس سے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قسم کی تجاویز کو اس طور اور اس حد تک منظور کرنے کے لیے نہیں کہا جا سکتا۔ اسمٰعیل خاں کے بموجب مسلمانوں کے کانگریس میں شمولیت کی اولین شرط یہ تھی کہ پچاس پچاس فیصد سیاسی نمایندگی کے اُصول کو کانگریس پیشگی طور پر تسلیم کرلے جبکہ سایانی اس کے بالکل برعکس عمل کے حامی تھے۔ اسی وجہ سے اس بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔

سایانی نے اپنے خطبے کے بڑے حصّے میں کانگریس کے تعلق سے مسلمانوں کے رویے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ انہوں نے اس بات سے قطعی انکار کیا کہ بہ حیثیت مجموعی مسلمان کانگریس کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے سوال کیا کہ تعلیم کے فقدان کی وجہ سے بیشتر مسلمانوں نے آج تک کانگریس تحریک کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سُنا ہے۔ اِن حالات میں ایسے لاعلم مسلمانوں سے کیوں کر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کانگریس کے تعلق سے کوئی مثبت رویہ اپنائیں۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ بعض ایسے تعلیم یافتہ مسلمان بھی موجود ہیں جنہوں نے انگریزی یا ہندستانی میں تعلیم حاصل کی ہے اور کانگریس کے خلاف ہیں اور جنہیں "کانگریس کو گالیاں دے کر" بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے برخلاف اس ملک میں ایسے بھی کئی مسلمان موجود ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو صحیح قسم کی تعلیم سے آراستہ کیا ہے اور جو کانگریس کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ آج اس قبیل کے مسلمان تعداد کے اعتبار سے بہت تھوڑے ہیں لیکن یقیناً ایسے لوگ جلد ہی منظرِ عام پر آجائیں گے۔

آخر وہ اعتراضات کون سے تھے جو کانگریس کی مخالفت کرنے والے مسلمان اکثر و بیشتر بیان کیا کرتے تھے؟ سایانی نے انہیں ایک ایک کر کے بیان کیا اور اُن پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انہوں نے اہم ترین اعتراضات کا خلاصہ یوں پیش کیا:۔

1 - ہندوؤں کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا مسلمانوں کے مذہب کے منافی ہے۔

2 - اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہو جائیں تو حکومت ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرے گی۔ جبکہ ان مشکل دنوں میں اپنی بقا کے لیے مسلمانوں کو حکومتی سرپرستی کی شدید ضرورت لاحق ہے۔

3 - کانگریس کی کامیابی بالآخر برطانوی راج کے خاتمے پر منتج ہوگی جس کے نتیجے میں یہاں ہندوؤں کی حکومت قایم ہو جائے گی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

4۔ کانگریس نہ تو ہندستان کی تمام قوموں کی نمایندگی کرتی ہے اور نہ اس کی نیت نیک ہے اسی طرح اس تنظیم کے اغراض ومقاصد بھی ناممکن العمل ہیں۔

5۔ مغرب میں حکومت نے مسابقتی امتحانوں، انتخابات اور نمایندگی کے جو طریقے رائج کر رکھے ہیں۔ وہ ہندستان کے لیے موزوں نہیں ہیں اور اُن طریقوں کو یہاں نافذ کیا گیا تو تمام سرکاری ملازمتوں پر ہندو قابض ہو جائیں گے اور مسلمانوں کو یکسر سرکاری ملازمتوں سے محروم ہو جانا پڑے گا۔

6۔ اس ملک میں ہندو چونکہ غالب اکثریت میں ہیں اس لیے وہ ہمیشہ کانگریس کی کارروائیوں پر اثرانداز ہوتے رہیں گے اور اسے اپنا آلہ کار بناتے ہوئے ہمیشہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسے استعمال کرتے رہیں گے۔

ان اعتراضات کے ساتھ ساتھ دوسرے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے سایانی نے کہا کہ گو بعض اعتراضات میں تھوڑی بہت صداقت پائی جاتی ہے تاہم مکمل طور پر ان میں کا کوئی اعتراض بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ پہلے اعتراض کو اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے رد کر دیا کہ "کانگریس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ یہ تنظیم کسی کو مذہب پر چلنے سے روکتی ہے"۔ دوسرا اعتراض اس لحاظ سے قابلِ اعتنا نہیں ہے کہ کانگریس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ "رعایا کی شکایات کو قانونی اور دستوری طریقے سے حکومت کے روبرو پیش کیا جا سکے" اور حکومت کی توجہ ان وعدوں کے ایفا کی جانب مبذول کروائی جا سکے جو اس سے قبل وہ عوام سے کر چکی ہے جہاں تک تیسرے اعتراض کا سوال ہے سایانی نے کہا کہ اُنہیں اس بات کا یقین ہے کہ کانگریس کی کامیابی اس ملک میں برطانوی راج کے خاتمے کا نہیں بلکہ مستقل استحکام کا باعث بنے گی۔ اس لیے انہوں نے ہندستانی مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ "وہ وہم کے تخلیق کردہ خیالی ہیولوں سے خوف زدہ نہ ہوں کیونکہ خیالی پیکروں کا حقیقت کی دنیا سے کوئی رشتہ نہیں ہوا کرتا"۔ جہاں تک چوتھے اعتراض کا سوال ہے سایانی کے بقول اس اعتراض سے مسلمانوں پر حرف آتا ہے نہ کہ کانگریس پر۔ کیونکہ مسلمانوں کی جانب سے تعاون نہ ملنے کی وجہ سے کانگریس صحیح معنوں میں ایک نمایندہ تحریک نہیں بن سکی۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ کانگریس نے تو ہمیشہ اپنی دوستی کے دستِ تعاون کو مسلمانوں کی جانب دراز کیا ہے۔ جہاں تک یہ کہا جا رہا ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کانگریس کی نیت نیک نہیں ہے تو انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ یا تو وہ اس الزام کو ثابت کر دکھائیں یا پھر ایسی بے سروپا باتیں کرنے سے احتراز کریں۔ جہاں تک کانگریس کے اغراض و مقاصد کا سوال ہے اس سلسلے میں سایانی نے یہ بات واضح کی کہ حالیہ دستوری اور انتظامی تبدیلیاں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ یہ اغراض و مقاصد ممکن العمل ہیں۔ پانچویں اعتراض پر بحث کرتے ہوئے سایانی نے بتلایا کہ اسلام ایک جمہوری مذہب ہے اور انتخابات، نمایندگی اور عالمی اخوت کے تصورات تو اسلام کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اس لیے یہ بات کسی مسلمان کو زیبا نہیں دیتی کہ وہ انہی باتوں کی مخالفت کرنے لگے۔ جہاں تک مسابقتی امتحانات کا مسئلہ ہے۔ سایانی نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اگر آپ کسی اعلیٰ عہدے کے حصول کی تمنا دل میں رکھتے ہیں تو اس کے لیے انتھک کوشش کیجیے اور خود کو مطلوبہ منصب کا اہل بنا لیجیے۔ آخری اعتراض کا جواب دیتے ہوئے سایانی نے کانگریس کے مسلمان مخالفین پر واضح کیا کہ کانگریس کسی جوائنٹ اسٹاک کمپنی کے حصہ داروں (Share holders) کی میٹنگ نہیں ہے اور نہ کسی ایسے ادارے کی جو محض نفع و نقصان کے اصولوں پر قایم کیا گیا ہو۔ انہوں نے اپنے اس یقین کا اعادہ کیا کہ لوگوں کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اپنے نجی، جماعتی یا فرقہ وارانہ مفادات کے حصول کے لیے کانگریس کو استعمال کر سکیں۔

اس طرح سایانی نے اپنے ہم مذہبوں کو نصیحت کی کہ وہ دُور کھڑے رہ کر کانگریس پر من گھڑت قسم کی رکیک الزام تراشی کرنے کی بجائے کانگریس کے قریب آ کر اس کے اجلاسوں میں شریک ہو کر دیکھیں کہ اس کے کاروبار کس طرح انجام پاتے ہیں تب کہیں جا کر انہیں اس بات کا پتہ چلے گا کہ کانگریس کے اجلاسوں میں ہر معقول تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے۔

لیکن سایانی کی بات پر کسی نے کان نہیں دھرا۔ اُن کے خطبے سے متاثر ہونے کی بجائے کئی بااثر مسلمان اس سے سخت مشتعل ہو گئے اور کانگریس کے صدر پر ہندستان کی صورتِ حال سے انحراف کرنے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا الزام عاید کیا۔ دی مسلم کرانیکل (The Moslem Chronicle) نے اپنے مسلسل اداریوں میں سایانی کے خطبے کی منطقی اور استدلالی خامیوں کی نشاندہی کی اور الزام عاید کیا کہ وہ "اپنے آقاؤں کی صدائے بازگشت"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بن گئے ہیں۔[124] اس خطبے کو غیر معقول اور لغو قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ اس میں سایانی نے اپنے ہم مذہبوں کے خلاف "گالی گلوچ، طعن و تشنیع اور سب و شتم" کے ہتھیار محض اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اُن میں کے ننانوے فیصد افراد نے اُن کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ اخبار نے سوال کیا کہ "اگر وہ سچ مچ مسلمانوں کا تعاون چاہتے تھے تو اُنہوں نے اسمٰعیل خاں کے چیلنج کو نظر انداز کیوں کیا؟" محض اپنی مقبولیت اور اُس صدارتی کرسی کے لیے جس پر رونق افروز ہونے کی انہیں دعوت دی گئی تھی اور اپنے اُن کانگریسی احباب کی خوشنودی کے لیے جنہوں نے اُنہیں جلسے کا صدر بنا دیا تھا کاش کہ اپنی زبان کھولنے سے پہلے سایانی صاحب جیسی شخصیت نے کئی بار سوچا ہوتا کیونکہ ان کی تقریر نے اُسی مقصد کو ایسا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے جس کے حصول کے لیے وہ بڑے خلوص کے ساتھ کوشاں تھے۔"[125]

تاہم سایانی کے خطبے سے اتنا تو ضرور ہوا کہ چند مسلمان سنجیدگی کے ساتھ کانگریس کے بارے میں سوچنے لگے جیسا کہ اُنہیں میں کے ایک مسلمان نے سوال کیا "ہم کانگریس میں شریک نہ ہو کر ہم نے کیا حاصل کیا؟" اُس تنظیم کے خلاف ہمارا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ یہ جماعت اس ملک میں نمایندگی کے اُصول کو رائج کروانا چاہتی ہے۔ لیکن کیا ہم اس اُصول کی ترویج کو روک سکتے ہیں؟ مسلمانوں کی مزاحمت کے علی الرغم حکومت نے بالواسطہ جاتی اداروں، لوکل بورڈوں اور قانون ساز مجالس میں ترویج دینے کے لیے نمایندگی کے نظریے کو اُصولی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ انگلستان چونکہ خود ایک جمہوری ملک ہے اس لیے وہ کب تک کانگریس کے مطالبات کو تسلیم کرنے سے گریز کر سکتا ہے؟ آزاد نامی ایک صاحب کے بقول "امراء (Patricians) اور عوام (Plebeians) کی اس رسہ کشی میں آخری جیت عوام ہی کی ہوگی کیونکہ وقت کا فطری تقاضہ ہی یہی ہے کہ عائلہ الناس کا نمائندگانہ طرزِ حکومت شخصی جابرانہ Despotic طرزِ حکومت پر غالب آجائے۔"[126] آخر میں مسلمان ہی خسارے میں رہیں گے کیونکہ انگریز اُن کا ساتھ صرف اسی وقت تک دینگے جب تک اُن کا مفاد اس امر کا متقاضی ہو بعد ازاں وہ مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کر دیں گے اسی طرح لازم ہے کہ ہندو بھی مسلمانوں سے اس بناء پر نفرت کرنے لگیں کہ اُنہوں نے سیاسی جدوجہد کے دونوں میں کانگریس سے دُوری اختیار کر رکھی تھی۔" اس لیے آزاد نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشورہ دیا کہ انہی دنوں جبکہ وقت ابھی ہاتھ سے نہیں نکلا ہے ہندو اور مسلمان باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے قریب ہونے کی کوشش شروع کر دیں۔[127]

اس نزاعی مسئلے میں جسے مسلم کرانیکل نے چھیڑ رکھا تھا اور جس کے مضامین کو دوسرے مسلم اخبارات اور بطورِ خاص اُردو پریس میں نقل کیا جاتا تھا، مسلمانوں کی اکثریت نے آزاد کے خیالات سے جارحانہ طور پر اختلاف کیا اور اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ کانگریس کے ساتھ عدم تعاون کی پالیسی ہی ملّت کے بہترین مفاد میں ہے۔ صلاح الدین نامی ایک صاحب نے آزاد سے دریافت کیا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندو آپ کو اپنا ہم رتبہ (مساوی) تسلیم کرنے کے موڈ میں ہیں؟" تب یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر مسلمان کو کرنا کیا چاہیے؟ جس کا سادہ سا جواب صلاح الدین کے پاس یہ تھا "اپنے قلعے میں خود کو مضبوط اور تحکم پسند (Imperious) بناؤ اور پھر دشمنوں کو ٹھینگا بتاؤ"[128] اس بحث کے شرکاء میں بیک Beck بھی شامل تھے جن کا خیال تھا کہ "مہمل بکواس کرنے والوں"[129] کے ساتھ عدم تعاون کر کے مسلمانوں نے نہ صرف اپنے وقار کو حکومت کی نظروں میں بلند کیا ہے، بلکہ ملازمتوں وغیرہ کے حصول کے معاملے میں بھی حکومت سے مستفید ہوئے ہیں۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ حکومت نے سیاسی نمائندگی Political Representation کے اُصول کو تسلیم کر لیا ہے، کانگریس نے تو کاؤنسلوں میں نشستوں کی اکثریت کا مطالبہ کیا تھا جبکہ اقلیت ہی اس کے ہاتھ لگ سکی اور تمام اقتدار Power حکومت ہی کے قبضے میں رہا۔" اسی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ صحیح معنوں میں "نمائندگی" کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔

اس مباحثے کے معائب و محاسن سے قطع نظر یہ ماننا پڑے گا کہ اس قسم کی بحثوں سے اُن تلخیوں کا ہرگز اندازہ نہیں ہو سکتا جو اُن دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین گاؤکشی کے ضمن میں ہونے والے فسادات، سرکاری ملازمتوں کے لیے ہونے والے جھگڑوں اور انتظامیہ میں فرقہ وارانہ بنیاد پر کی جانے والی اقربا پروری کی بنیاد پر اُبھر آتی تھیں۔ ان بگڑتے ہوئے حالات میں مزید ابتری اس وقت پیدا ہوئی جب ہندو پریس نے ترک یونان جنگ کے معاملے میں مسلمانوں کی کھل کر مخالفت کرنا شروع کر دی۔ ہندو پریس نے ایسا رویہ غالباً اس لیے اپنایا تھا کہ گلیڈسٹون اس جنگ میں یونان کے حامی تھے۔ جب اس جنگ میں مسلمانوں نے کریٹ Crete کے مقام پر فتح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل کی تب مسلمانانِ ہند نے اس ملک کے سبھی بڑے شہروں میں اس فتح کے جشن بڑی دھوم دھام اور جوش و خروش کے ساتھ منائے۔ ترکی کے سلطان کو مبارکبادیاں بھیجیں اور شکرانے کی نمازیں ادا کیں۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے اخبار The Advocate نے چراغ پا ہو کر حکومت پر الزام لگایا کہ "ایسے جلسے اور جلوس منعقد کرنے کی اجازت دے کر حکومت نے اپنی کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔" اس نے حکومت سے دریافت کیا:۔

"کیا حکومت اس قسم کے جلسے اور جلوسوں کی اجازت اس وقت بھی دیتی جب فتح روس یا جرمنی کے خلاف حاصل کی جاتی؟ ایک جانب تو حکومت غیر جانب داری کا ادعا کرتے ہوئے یونان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ اگر اس ملک کی آزادی کو سنگین خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ اُن طاقتوں کا ساتھ دے گی جو یونان کی آزادی کو بچانے کے لیے جدوجہد کریں گی۔ دوسری جانب حکومت اس بات کو بھی برداشت کر رہی ہے کہ اس کی رعایا جھگڑے کے ایک فریق کے ساتھ ایسے وقت میں اپنی ہمدردیوں کا اظہار کر رہی ہے جبکہ جنگ ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ عارضی طور پر روکی گئی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کی جانب سے منعقدہ اس قسم کے جلسے جلوسوں کو ہم انتہائی غیر شریفانہ اور غدارانہ فعل قرار دینے پر مجبور ہیں۔"[130]

اس موقعے پر چونکہ بنگال کے مسلمانوں نے اس جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا جیسا کہ ان کے ہم مذہبوں نے دوسرے صوبوں میں کیا تھا۔ اسی لیے (Indian Nation) نے انہیں اس "شریفانہ ضبط و تحمل" پر مبارکباد پیش کی۔[131] مسلم کرانیکل کے بموجب یہ تمام مسلم مخالف پروپیگنڈہ محض اس لیے کیا جا رہا تھا کہ حکومت پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ اب تک جن مسلمانوں کو وفادار سمجھا جاتا تھا ہندو اُن سے کہیں زیادہ اس ملک کے وفادار ہیں۔[132]

اپنی وفاداری کے باوجود مسلمانانِ ہند نے برطانیہ کی جانب سے یونان کی جانبداری پر اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ اُن کے جذبات اس بارے میں اتنے شدید تھے کہ The Times کو مجبور ہو کر برطانوی حکومت اور پریس کو شدید تنبیہ کرنی پڑی کہ وہ ترکی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر تنقید کرتے ہوئے شدت سے کام نہ لیں کیونکہ "ہندستانی مسلمانوں میں یہ ایقان جڑ پکڑ چکا ہے کہ انگریز قوم نے سلطان کو نیست و نابود کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔" ان حالات میں بعض ہندو اخبارات کی جارحانہ تنقید سے کئی مسلمان مشتعل ہو گئے کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ اسلام جہاں کہیں شکست سے دوچار ہوگا، ہندو خوشی سے بغلیں بجانے لگیں گے۔

سیاسی اعتبار سے اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بگاڑ کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ لارڈ ایلگن Lord Elgin نے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی سخت گیر رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ جس وقت انہوں نے وائسرائے کے منصب کو خیرباد کہا۔ اس وقت مسلمانوں کے سب سے موثر نمائندہ اخبار نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے لکھا تھا کہ ہز لارڈ شپ کے دورِ حکومت میں "مسلمانوں پر شدید ترین مصائب کا نزول ہوا جن کی وجہ سے مسلمان تباہی و بربادی اور غم و اندوہ کا شکار ہوئے جن کے انتہائی مضر اثرات ملتِ اسلامیہ پر مترتب ہوئے۔[139]" یہ انتہائی سخت الفاظ تھے جن کا کوئی جواز موجود نہیں تھا۔[140] ایلگن کے دورِ حکومت میں کئی بدبختانہ واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے۔ قحط پلیگ اور سرحدی جھڑپوں نے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن وائسرائے کے طرزِ عمل میں کوئی شے بجز اس بات کے مسلم، مخالف نظر نہیں آتی کہ اس نے اپنی مجالسِ قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ایلگن نے مسلمانوں کے اس مطالبے پر بھی کوئی خاص دھیان نہیں دیا جس میں کہا گیا تھا کہ انتظامی معاملات میں اُن کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے اور ان کے لیے آسامیاں مختص کی جایا کریں۔ اسی وجہ سے مسلم کرانیکل نے وائسرائے کی روانگی پر اطمینان کا سانس لیا تھا۔

ایلگن کے جانشین لارڈ کرزن Lord Curzon نے 6 جنوری 1899ء کو جمعہ کے روز ہندستان میں قدم رکھا۔ یہ دن مسلمانوں کے لیے نہایت ہی مبارک اور مسعود دن ہوا کرتا ہے۔ اُن کی آمد کو مسلم پریس نے اس ملک کے "غریب اور دھتکارے ہوئے مسلمانوں" کے لیے فالِ نیک قرار دیا۔ ان کی آمد کو اس وجہ سے بھی خوش آیند سمجھا گیا کہ شخصی طور پر دورہ کر کے اُنہوں نے متعدد اسلامی ممالک سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی جانب سے پیش کیے گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خطبۂ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے اُنہوں نے کہا تھا: "میرا دل اگر آپ کی آواز پر لبیک نہ کہے تو اِسے مردہ قرار دیجئے۔" اور اُمید ظاہر کی تھی کہ "ہمارا خالق جس کا ہم ایک جیسا ہی احترام کرتے ہیں۔ ضرور ہماری سعی کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے ہمیں اپنے فضل و عنایات سے سرفراز فرمائے گا۔" [137]

اِن شاندار جذبات کے اظہار کے باوجود لارڈ کرزن مسلمانوں کو "اس معرکۂ حیات میں کوئی استثنائی مراعات Exceptional Advantage دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تاہم اس نے یہ بات واضح کردی کہ لارڈ مایو Lord Mayo کے زمانے سے مسلمانوں کی جو ضروری حوصلہ افزائی حکومت کی جانب سے کی جاتی رہی ہے۔ وہ آئندہ اس کے دورِ حکومت میں بھی کی جاتی رہے گی۔" میں سمجھتا ہوں کہ ریاست نے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں جس قدر حصہ دیا ہے۔ وہ کافی قیافانہ اور مبنی بر انصاف ہے۔" کرزن نے مسلمانوں کے ایک وفد کو واضح الفاظ میں بتلا دیا تھا کہ "اگرچہ حکومت آپ کی مساعی کو دوستانہ نظروں سے دیکھتی رہے گی تاہم بڑی حد تک آپ کا مستقبل خود آپ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔" اس پر مسلم قیادت کو مایوسی تو ضرور ہوئی تھی تاہم انہوں نے محسوس کیا تھا کہ جوں جوں ہز ایکسلنسی کو ہندستانی اُمور کا گہرا تجربہ ہوتا جائے گا توں توں وہ کم از کم اپنے بعض نظریات میں تبدیلی لانے پر مجبور ہو جائیں گے۔" [138]

اِن حالات میں سیاسی شعور رکھنے والے مسلمان احساسِ محرومی اور مایوسیت کے بُری طرح شکار ہو گئے۔ عین اُنہی دنوں سرسیّد رحلت فرما گئے اور ملّت اسلامیہ کو داغِ یتیمی دے گئے۔ ملّت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اب وہ کیا کرے اور کس راہ کو اپنائے کیونکہ گذشتہ بیس برسوں تک سرسیّد تنہا مسلمانوں کی کشتی کے کھیون ہار بنے ہوئے تھے۔ اُس وقت تک سرسیّد نہ صرف مسلمانوں کے سب سے بڑے سرپرست تھے بلکہ اُن کے حقوق و مراعات کے سب سے عظیم محافظ بھی تھے۔ اُنہیں حکومت میں اس قدر رسوخ حاصل تھا کہ اپنے ہم مذہبوں کے مفادات کے تحفظ میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ اُن کی موت نے ایک ایسا خلاء پیدا کر دیا جسے پُر کرپانا اُن کے ساتھیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے اپنے پیچھے کوئی ایسا مناسب سیاسی ادارہ بھی نہیں چھوڑا جو اُن کے کام کو آگے بڑھا سکتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالات کے اس طرح پلٹا کھانے سے شاید اور کوئی اتنا متفکر نہیں تھا جتنا کہ بیک Beck۔ وہ جانتے تھے کہ حالات ان کے قابو سے باہر نکل سکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے حالات کو سنبھالے رکھنے کے لیے آگے بڑھ کر اقدامات کرنے شروع کر دیئے اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ محنت کرنے لگے۔ انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ سرسیّد کے لیے ایک یادگاری فنڈ قایم کریں اور اپنے اس نظریئے کی پُر زور وکالت کرنے میں مصروف ہو گئے کہ ایم۔ اے۔ او کالج کو مکمل یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے[139]۔ بیک کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو اس رُخ پر موڑا نہیں گیا تو یقیناً وہ سیاسی شورش میں ملوث ہو جائیں گے۔ وہ بڑے خلوص سے اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ سیاست میں حصّہ لینے کی وجہ سے مسلمانوں کا وقار حکومت کی نگاہوں میں گھٹ جائے گا۔

بیک نے اتنی شدّت کے ساتھ محنت کرنا شروع کر دی کہ جلد ہی ان کی صحت بگڑ گئی اور ایک سال سے بھی کم عرصے میں وہ اپنے آقا سرسیّد سے جا ملے۔ سرسیّد کی وفات کے بعد اتنی جلدی بیک کی موت نے ان کے ساتھیوں اور طالبِ علموں کو سخت صدمہ پہنچایا۔ وایسرائے سے لے کر علی گڑھ کے معمولی پڑھے لکھے مسلمانوں تک نے بیک کی موت کا سوگ منایا۔[140] دوسرے مقامات کے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اس ناقابلِ تلافی نقصان کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔[141] ایک تعزیتی جلسے میں محسن الملک نے سرِ عام اس امر کا اعتراف کیا کہ سرسیّد کی وفات کے بعد یہ تنہا بیک کی ذات تھی جس پر مسلمانوں نے اپنی نگاہیں مرکوز کر دی تھیں۔ کیونکہ سرسیّد کے علاوہ کسی اور شخص نے بیک کی طرح اس قدر جوش و ولولے اور انتہائی بے غرضی کے ساتھ ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے کام نہیں کیا تھا۔[142] نواب صاحب نے یہ بات بھی واضح کی کہ سرسیّد کو چھوڑ کر اور کسی شخص کی موت پر اُمّت مسلمہ نے آج تک اتنے آنسو نہیں بہائے جتنے کہ بیک کی موت پر عالمِ اسلام میں بہائے گئے۔

اسی تعزیتی جلسے میں مورِیسن نے اس بات پر زور دیا کہ سرسیّد کے علاوہ کسی اور شخص نے مسلمانوں کی اتنی غم گساری نہیں کی جتنی کہ بیک نے "جو خود مسلمان نہیں تھے اور نہ جن کی دوستی اور وفا شعاری پر مسلمانانِ ہند کا کوئی حق پیدائشی یا مذہبی بنیادوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر نکلتا تھا۔" بیک کے یادگاری فنڈ کے لیے فوری طور پر وہیں آٹھ ہزار روپے (Rs. 8000/-) جمع کیے گئے اور اتنے شدید رنج وغم کا اظہار کیا گیا کہ شمالی مغربی صوبے کے چیف آف جسٹس سر آرتھر اسٹریچی Sir Arthur Stracey جو جلسے کی صدارت فرما رہے تھے، بیحد متاثر ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے "مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقتوں میں مسلمان جب کبھی جذبۂ تشکر کے ساتھ اپنے محسنوں کو یاد کریں گے تب اُنہیں ہمیشہ تھیوڈور بیک سرسید کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوئے ملیں گے کیونکہ یہی دو بزرگ تھے جنہوں نے مشترکہ طور پر مسلمانوں میں قومی تعمیرِ نو کی ولولہ انگیز روح کو پھونکا تھا۔"[195]

بیسویں صدی کی ابتدا کے ساتھ ہی ہندستان میں کئی سیاسی اور معاشی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اضطراب میں اضافہ ہونے لگا اور وہ سنجیدگی کے ساتھ کانگریس ہی کی قسم کی، ایک ایسی تنظیم کے قیام کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگے جو اُن کے مقاصد کی تکمیل کا بیڑا اُٹھا سکے۔ وہ اپنے مقدر کو اُن معدودے چند قائدین کے ہاتھ سونپ دینے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ جن میں اتنی صلاحیت موجود نہیں تھی کہ وہ اُن کی نوخیز اُمنگوں اور حوصلوں کی عملی تکمیل کر سکیں بعض نوجوان مسلمانوں نے تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا راستہ یہی رہ گیا ہے کہ وہ بڑی تعداد میں کانگریس میں شریک ہوں اور اس تنظیم کے کاموں میں اپنا ہاتھ بٹاتے ہوئے اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کی سبیل پیدا کریں۔"[196]

اُن لوگوں کے خیالات میں مزید پختگی مسلمانوں کے اس استحصال سے بھی پیدا ہوئی جو متحدہ صوبجات آگرہ و اودھ کے لیفٹیننٹ گورنر سر انتھونی میکڈونل (Sir Anthony MacDonnel) کے ہاتھوں ہوا۔ ہندی اُردو قضیے کے دوران سر انتھونی نے مسلمانوں کے رہنماؤں کو ایک ہلکی سی دھمکی دی تو وہ اس قدر حواس باختہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے موقف سے انحراف کرتے ہوئے کھلے عام اُردو کے کاز (Cause) کو نقصان پہنچایا اس واقعے کے بعد تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ جب تک وہ خود کو اچھی طرح منظم نہیں کر لیتے۔ اُن کے رہنما وقت آنے پر آیندہ بھی انہیں اسی قسم کی سبکی سے دوچار کر دیں گے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری بات جس نے مسلمانوں کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ یہ حقیقت تھی کہ کانگریس کے بعض رہنماؤں کے سرکشانہ و باغیانہ طور طریقوں کے باوجود سیاست کے میدان میں ہندو بڑی تیز گامی کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرتے چلے جا رہے تھے۔

الفریڈ نندی (Alfred Nundy) نے معاصر Pioneer کے صفحات میں کانگریس کی موافقت میں لکھتے ہوئے واضح کیا: "ہندو نہ صرف یہ کہ بغیر اُن کی مدد کے ترقی کر رہے ہیں بلکہ خورد حکومت ہی کے تعاون سے اُن کے خلاف جارحیت بھی اختیار کرتے جا رہے ہیں" حالانکہ اس وقت تک حکومت مسلمانوں کی سرپرستی کرتی آئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق کئی مسلم رہنما اس بات کو محسوس کرنے لگے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سیاسی ترقی ممکن نہیں ہے اور صرف کانگریس ہی اس قسم کا اتحاد پیدا کر سکتی ہے۔ اس قسم کے رہنماؤں میں نندی نے نواب محسن الملک، فتح نواز جنگ اور عماد الملک کو شامل کیا۔

ان مسلم رہنماؤں کے بارے میں نندی کا یہ تجزیہ صحیح نہیں تھا۔ چنانچہ نواب عماد الملک اور نواب محسن الملک نے فوراً اس بیان کو چیلنج کیا۔ اوّل الذکر نے صاف کہا کہ مسلمان ہرگز "کالی چمڑی والے اسٹیڈس (Steads) اور پارنیلس (Parnells) کی صفوں میں شامل نہیں ہوں گے۔"

نواب عماد الملک نے کہا کہ مسلمان اپنے گھر کی درستی کے کام میں مناسب طریقے سے لگے ہوئے ہوئے ہیں۔" ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ اپنے سیاسی فلسفے کی تدریس کا کام علی گڑھ میں انجام دیں تاکہ آنے والی نسلیں انہی اُصولوں کے مطابق اپنی فکر کو پروان چڑھائیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے سیاسی فلسفے کے یہ اُصول کانگریس کے اُصولوں کے مقابلے میں زیادہ جامع اور حب الوطنی پیدا کرنے والے ہیں۔ ہم نے اپنے اس فلسفے کی تبلیغ کی ذمہ داری مسٹر مورلیسن کو بالکل اسی طرح سونپی ہے جس طرح اُن سے پہلے آنجہانی مسٹر بیک کو سونپی تھی۔ اُنہیں نہ صرف ملت کے اکابرین کا مکمل اعتماد ہی حاصل ہے بلکہ اُنہیں اس بات کا اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ ان کی نمائندگی کے فرائض بھی تو انجام دیں۔[199]

فوراً ہی علی گڑھ سے نندی کا جواب دیتے ہوئے محسن الملک نے لکھا کہ حالیہ واقعات کے رونما ہونے کے باوجود کانگریس کے تعلق سے مسلمانوں کے رویہ میں سرمو فرق نہیں آیا ہے۔[200]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محسن الملک نے اس بات پر بطورِ خاص زور دیا کہ گو سرسید اس دنیا میں اب باقی نہیں رہے ہیں لیکن ان کی قوم کے پاس اب بھی سرسید کی فکر و خیالات کا سرمایہ زندہ و پائندہ ہے لہٰذا مسلمان ہرگز اس جادۂ حق سے منحرف نہیں ہوں گے جس پر ان کے رہنما نے انہیں گامزن کر دیا تھا۔ لیکن اس پُرزور بیان بازی کے باوجود مسلمانوں کے سب سے موثر اور اہم ترجمان مسلم کرانیکل نے کسی حد تک نندی کے تجزیئے سے اتفاق کیا اور کانگریس کے تعلق سے موجود مسلم رویئے کو "مجہول لاتعلقی" کا رویہ قرار دیا۔ نندی یہ سوچ کر بڑا چراغ پا ہوا کہ اس نے نواب صاحبین کے تعلق سے انتہائی غلط رائے قایم کر لی تھی۔ اس نے لکھا: "یہ لوگ اپنی وفاداری کا دھنڈورا پیٹنے میں حد سے آگے بڑھنے لگے ہیں اور اب وقت آ گیا ہے کہ اس تماشے کو ختم کیا جائے کیوں کہ اس پروپیگنڈے کی وجہ سے یہ لوگ فائدہ حاصل کر رہے ہیں جب کہ دوسری قوموں کو نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔"[۲۲]

اس وقت تک حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ چاہے سیاسی صورتِ حال میں کیسی ہی تبدیلی واقع ہو جائے، مسلمانوں کی کانگریس میں شمولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ہاں اتنی بات ضرور تھی کہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی تھی اور آئے دن اس قسم کے مطالبات قوم کے باشعور افراد کی جانب کئے جانے لگے تھے۔ ان متواتر مطالبات نے مورلیسن کو اتنا پریشان کر دیا تھا کہ انہیں مسلمانوں کو اس بات پر متنبہ کرنا پڑا کہ وہ عملاً اس زبردست سیاسی پروگرام کو چلا نہیں پائیں گے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت کا بنانا تو ایک آسان کام ہے جس میں ابتداً صرف یہ کرنا پڑے گا کہ چند افراد کو مجوزہ جماعت کا رکن بنا کر انہی میں سے کسی ایک کو معتمدی کے فرائض انجام دینے کے لیے منتخب کر لیا جائے لیکن جس وقت صحیح معنوں میں کام کی ابتدا کی جائے گی۔ تب بے شمار مشکلات درپیش آئینگی انہوں نے سوال کیا: "کیا مسلمانوں کے پاس اس سیاسی پروگرام کو روبہ عمل لانے کے لیے کافی سرمایہ موجود ہے؟" کیا ان کے پاس ہمہ وقتی طور پر کام کرنے والی افسرادی قوت موجود ہے؟" ان چیزوں کے بغیر مسلمان کیوں کر اپنی سیاسی تنظیم محمڈن پولیٹکل ایسوسی ایشن قائم کر سکتے ہیں؟"[۲۳]

اور اگر بالفرض مسلمان اپنی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم قایم کر بھی لیں تو یہ خطرہ بدستور برقرار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۔ رہے گا کہ ایسی صورت میں حکومت مسلمانوں کے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کر دے گی اور ان کے مطالبات کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگے گا۔ ایسی صورت میں حکومت "ایک ایسی تنظیم کے مطالبات کو آخر کیوں درخور اعتنا سمجھے گی جو متواتر اس کی عیب جوئی اور دشنام طرازی میں مشغول رہتی ہو۔" اس کے باعث مسلمان بیشتر انگریز عہدیداروں کی ہمدردیوں سے محروم ہو جائیں گے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سرسید نے برسوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد وفاداری کا جو قصرِ عالیشان تعمیر کیا تھا۔ وہ آن کی آن میں منہدم ہو جائے گا اور مسلمانوں کو مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس لیے مورلینڈ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ سرسید نے انھیں جس راستے پر چلنے سے منع کیا تھا۔ اب اگر وہ اسی راہ پر چلنا چاہتے ہیں تو راستے کے خطرات کا بھی طرح اندازہ کر لیں۔

مورلینڈ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ مسلمانوں میں ایسی کسی سیاسی تحریک کے لیے اس قدر شدید ولولہ پایا جاتا ہے کہ اُسے بہ آسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ انھوں نے "قایدین کی ایک چھوٹی سی کونسل" کے قیام کا مشورہ دیا جس کا ایک تنخواہ دار معتمد ہو جو مسلمانوں کے سیاسی مفادات کی نگرانی کرتا رہے۔ اس کونسل کے دفاتر دو کمروں میں رکھے جائیں جن میں سے ایک میں لائبریری ہو۔ اور دوسرے میں اشاعتی بیورو جہاں سے پمفلٹ جاری کیے جاتے رہیں اور اُن اردو اور انگریزی اخبارات کو مضامین بھجوائے جاتے رہیں جنھیں مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی ہو۔ مورلینڈ کے تخمینے کے مطابق ان تمام کاموں کے لیے "کونسل" کو پانچ سو روپیہ ماہانہ خرچ کرنا ہوگا۔[۱۵۴]

"کونسل" وقتاً فوقتاً سیاسی حالات کا جائزہ لیتی رہے گی لیکن کسی بھی قسم کی سیاسی ہلچل کو سختی سے کچل دے گی۔ اسی طرح "کونسل" کا ہر رکن نہ صرف یہ کہ سرکاری اقدامات پر نکتہ چینی سے احتراز کرے گا بلکہ نکتہ چینی کرنے سے پہلے اپنے آپ سے سوال کرے گا "اگر میں لیفٹیننٹ گورنر ہوتا تو ان حالات میں میں نے کیا کیا ہوتا؟" مورلینڈ کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اگر "کونسل" نے ان خطوط پر کام کرنا شروع کر دیا تو یقیناً اس کے ارکان کو "وائسرائے کی کونسل" میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا جائے گا۔[۱۵۵]

لیکن مورلینڈ کی تنبیہہ اور علی گڑھ کے قائدین کی بے اعتنائی کے باوجود مسلمانوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک سیاسی مرکز پر منظم کرنے کی تحریک زور پکڑتی رہی۔ جوں جوں ہندستانی انتظامیہ میں تبدیلیاں واقع ہونے لگیں توں توں محسوس کیا جانے لگا کہ مسلمانوں کی موجودہ تنظیمیں یعنی سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن اور محمڈن لٹریری سوسائٹی اُن تبدیلیوں سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ ۱۹۰۰ء کے اوایل تک تو سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ حکومت کی نگاہوں میں بھی اپنا وقار کھو چکی تھی اس وقت تک حکومت اس تنظیم کی خاص سرپرستی کرتی آئی تھی لیکن اب حالت یہ تھی کہ مسلم کرانیکل نے اپنے ایک جذبات کو برانگیختہ کر دینے والے اداریئے میں تحریر کیا تھا کہ اگر صحیح معنوں میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ادارے کی مکمل طور پر تطہیر کی جائے[156]۔ محمڈن لٹریری سوسائٹی کی حالت تو اس سے بدرجہا ابتر تھی۔ کلکتے کے اخبار Englishman نے تو سرعام اس تنظیم کے معتمد پر الزام لگایا تھا کہ اس نے سوسائٹی کی لائبریری کو، حکومت کی جانب سے ملنے والی عطیے کی کتابوں اور اہم دستاویزات کو نیلام کے ذریعے فروخت کروا دیا ہے[157]۔ جس وقت کسی معاملے میں سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندستان نے اس سوسائٹی کے نظریات کو نقل کیا تو مسلم کرانیکل نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ "پارلیمنٹ کے کسی متجسس رکن نے لارڈ جارج ہیملٹن سے یہ کیوں نہیں دریافت کیا کہ یہ لٹریری سوسائٹی کیوں کر مسلمانوں کے سیاسی افکار و نظریات کی ترجمان بن گئی"[158]۔ ویسے یہ سوسائٹی تیس برسوں سے اپنا کام انجام دے رہی تھی لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ یہ ادارہ غیر موثر اور مہمل ہو گیا تھا۔

ان تمام حالات نے مسلمانوں کے سنجیدہ طبقے کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ ایک ایسا ادارہ قایم کریں جو Panjab Observer میں منقول میاں محمد شفیع کے قول کے مطابق "ہندستانی مسلمانوں کی ایک باقاعدہ سیاسی تنظیم" ہو۔ ابتداً تو چند مسلم رہنماؤں نے بشمول محسن الملک، اس خیال کی مخالفت اس بنا پر کی کہ کسی بھی قسم کی سیاسی ہلچل مسلمانوں کی خوشحالی کے لیے مضر ثابت ہوگی۔ لیکن مسلمانوں میں اس وسیع پیمانے پر "بے چینی" پیدا ہو چکی تھی کہ اُسے روکنا محال ہو گیا اور اُنہیں بھی اس کا سامنا کرنا پڑا جو اسے پسند نہیں کرتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر اس مجوزہ تنظیم کی نوعیت کیا ہو؟ اس مسئلے پر اچھی خاصی اختلافی صورت پیدا ہوگئی[163]۔ لکھنؤ کے نواب مہدی حسین[164] جیسے کچھ لوگ ہندوؤں کے ساتھ اشتراک کر لینے کے حق میں تھے جبکہ مورلینڈ اور محسن الملک جیسے چند افراد مسلمانوں کے مفادات کی دیکھ بھال کے لیے منتخب اکابرین کی "گرینڈ کونسل (Grand Council) کے قیام کے مطالبے کا احیاء کر رہے تھے[165]۔ جبکہ ایسے لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی جو یہ چاہتے تھے کہ کم و بیش کانگریس ہی کے خطوط پر مسلمان بھی اپنی ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کر ڈالیں۔ لیکن اُن کی یہ جماعت کانگریس کے مقابلے میں انگریزوں کی زیادہ وفادار ہوتی[166]۔ یہ آخر الذکر گروہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں دن بدن مقبولیت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نومبر 1901ء میں لکھنؤ کے مقام پر بعض سربرآوردہ مسلمانوں کے ایک اجتماع میں "محمڈن پولیٹیکل ایسوسی ایشن" کے قیام کا مسئلہ زور و شور سے معرضِ بحث میں آیا[167]۔

یہ مسئلہ جولائی 1903ء تک کوئی ٹھوس شکل اختیار نہ کر سکا۔ بالآخر اس تاریخ کو سہارنپور (یو۔پی) کے مقام پر مسلمانوں کے ایک عوامی جلسے میں محمڈن پولیٹیکل اسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس جلسے کی دعوت وقار الملک کی جانب سے دی گئی تھی[168]۔ جنہوں نے Pioneer کے نام موسومہ اپنے مراسلے میں واضح کیا تھا کہ اس تنظیم کا کانگریس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ نواب صاحب نے لکھا: "بنیادی طور پر دونوں تنظیمیں نہ صرف اپنے اہم اغراض و مقاصد میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ طریقہ کار کے اعتبار سے بھی ان میں کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی"۔ محمڈن پولیٹیکل ایسوسی ایشن نے اپنے اغراض و مقاصد کا تعین اس طرح کیا:۔

(1) مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح کرنا کہ اُن کی فلاح و بہبود کا انحصار بالکلیہ ہندستان میں انگریزی راج کے بقا اور استحکام پر ہے۔

(2) مسلمانوں کی شکایات کو معتدل اور مؤدبانہ انداز میں حکومت کے روبرو پیش کرنا

(3) دوسری قوموں کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کرنے سے احتراز کرنا۔

(4) نمائندہ حکومت اور مسابقتی امتحانات جیسے کانگریس کے اہم مطالبات کی مخالفت کرنا[169]۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن اس ایسوسی ایشن کی پیدائش ہی مُردہ حالت میں ہوئی۔ اس کی زمام کار غلط ہاتھوں میں سونپ دی گئی جس کی وجہ سے اسے مطلوبہ حمایت حاصل نہ ہو سکی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ اِسے مقبولیت ہی حاصل ہو سکی اور نہ ہی اس نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام دیا۔

دوسرا اہم واقعہ جس نے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو جھنجھوڑا۔ بنگال کی تقسیم تھی۔ کئی مسلم رہنما اور سرکاری عہدیدار اس تقسیم کو مسلمانوں کے لیے فالِ نیک قرار دے رہے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا نئے صوبے مشرقی بنگال میں مسلمان ساٹھ فیصد کی اکثریت میں ہوں گے جس کے باعث صوبے کے نظم ونسق اور انتظامی امور میں انہیں زیادہ حصہ ملے گا۔ متحدہ بنگال کی صورت میں وہ اس بڑی ہوئی حصہ داری کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے[164]۔ لیکن پورے کے پورے مسلمان ان باتوں سے متاثر نہیں ہوئے اور مسلم کرانیکل نے تقسیم کے اس منصوبے کی شدید مذمت کی[165]۔ لیکن سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن اور محمڈن لٹریری سوسائٹی نے نئے صوبے مشرقی بنگال اور آسام کی تخلیق کا خیر مقدم کیا اور بنگال کے مختلف اضلاع کے قائدین سے اپیل کی کہ "آپ اپنا پورا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے اپنے علاقے کے گمراہ مسلمانوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ تقسیم کے اس منصوبے کی مخالفت کرنے سے باز رکھیں"[166]۔ لیکن بعض مسلم رہنماؤں کی کوشش کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت سودیشی تحریک میں شامل ہوگئی جس نے تقسیم کی مخالفت کا علم بلند کر رکھا تھا۔ سر ہیبرناتھ بینرجی کے کہنے کے مطابق تقسیم کی مخالفت میں کیے گئے جملہ (259) مظاہروں میں سے (157) مظاہرے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر ترتیب دیئے تھے۔ مزید یہ کہ کلکتہ ڈھاکہ، فرید پور اور یمن سنگھ جیسے مقامات پر تقسیم کی مخالفت میں جو اہم جلسے منعقد کیے گئے تھے ان سبھی کی صدارت بنگال کے نامی گرامی مسلمان رہنماؤں نے انجام دی تھی[167]۔

بنگالی مسلمانوں کا "وفادار طبقہ" (Loyalist) البتہ ان باتوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہات کو نئے صوبے میں خود کے موقف کو مستحکم کرنے پر مرکوز کر دیا۔ جہاں کے پہلے لیفٹننٹ گورنر سر بمپفلیڈ فلر (Sir Bampfylde Fuller) نے اُن کی جی کھول کر سرپرستی کی۔ متحدہ بنگال کی تحریک کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے محمڈن یونین کے نام سے ایک متوازی تحریک کے قیام کی مساعی شروع کر دی گئیں۔ بالآخر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۷ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ڈھاکے کے نواب سلیم اللہ بہادر کی زیر سرپرستی اس یونین کا پہلا افتتاحی اجلاس منعقد کیا گیا۔ لیکن یہ حربہ بھی موثر ثابت نہیں ہوا کیوں کہ اس تحریک کو تعلیم یافتہ بنگالی مسلمانوں کا عملی تعاون حاصل نہیں ہوا۔[170]

اس اثنا میں مخالف تقسیم تحریک نے اس قدر زور پکڑ لیا کہ سر بمپفیلیڈ فلر کو مستعفی ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔[171] اس صورتِ حال کے پیشِ نظر فطری طور پر ڈھاکے کے نواب خواجہ سمیع اللہ اور اُن کے رفقاء اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ڈھاکے میں شاہ باغ کے مقام پر تیس ہزار مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا تاکہ "مسلمانوں کے مفادات کو نظر انداز کر کے حکومتِ ہند نے سر بمپفیلڈ فلر کے استعفے کو منظور کرتے ہوئے جس کمزوری کا اظہار کیا ہے اس کے خلاف احتجاج کیا جا سکے اور اُن جیسے ہر دلعزیز منتظم (Administrator) کی رخصتی پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا جا سکے۔"[172] جلسے کے صدر نے اس واقعے کو مسلمانوں کے لیے ایک "قومی سانحۂ عظیم" قرار دیا۔ اس جلسے میں مقررین نے "یکساں پالیسی پر قائم نہ رہنے کے حکومتی طریقے" پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا۔

صوبجات متحدہ میں اُٹھنے والے ہندی، اُردو قضیے کے بعد یہ دوسرا صدمہ تھا جس سے مسلمان دوچار ہوئے تھے۔ اس وجہ سے حکومت کی جانب ان کی بے اعتمادی دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مزید برآں تلک نے ہندو ازم میں عسکریت کی روح پھونکنی شروع کر دی تھی جسے اُن کے مخالفین نے تلک کا انگریز دشمن اور مسلم دشمن اقدام قرار دیا۔ مسلمان تلک کے اس عمل سے خوف زدہ ہو گئے اور اُنہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر اُنہوں نے خود اپنے طور پر اپنے مفادات کے تحفظ کا مناسب بندوبست نہیں کیا تو اُن کی تباہی یقینی ہے۔ اسی وجہ سے کسی ایسی سیاسی جماعت کے قیام کا مطالبہ زور پکڑنے لگا جو اُن کے مسائل کا حل نکال سکے۔ بعض مسلمانوں نے کانگریس سے الحاق کر لینے ہی کو مسئلے کا بہترین حل قرار دیا جبکہ اکثریت اُن مسلمانوں کی تھی جو یہ چاہتے تھے کہ اُن کی ایک علیحدہ سیاسی جماعت ہو جو اُن کے سیاسی حقوق اور مفادات کی نگہبانی کرے کیوں کہ اُن کے حقوق اور مفادات ہندوؤں سے قطعی مختلف تھے۔

اس اثنا میں کانگریسی رہنماؤں نے جان توڑ کوشش کی کہ ہندستان کو ایک قوم کی شکل میں پیش کر سکیں۔[173] اُن کا کہنا تھا کہ سیاسی اعتبار سے ہندو اور مسلمان ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واحد اکائی ہیں اور کانگریس دونوں ہی کی نمایندگی کرتی ہے۔ کئی سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں نے کانگریس کے ان دعوں کی تردید کی اور اس تنظیم کے خلاف مصروف پیکار رہے۔ مثال کے طور پر 1903ء میں منعقدہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے والے (853) وفود میں سے مسلمان نمایندوں کی تعداد دس سے بھی کم تھی[116] 1904ء میں من جملہ (1015) کے صرف (30) مسلمان نمایندے شریک ہوئے تھے[117] جبکہ 1905ء میں بنارس کے سالانہ اجلاس میں جملہ (757) نمایندوں میں صرف (20) مسلمان شامل تھے[118] لیکن کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں شریک کرنے والے مسلمانوں کی اس قلیل تعداد سے قطع نظر، جس کی ممکن ہے کچھ اور وجوہات بھی ہوں، یہ ماننا پڑے گا کہ سرسید کی وفات کے بعد کانگریس کے خلاف مسلمانوں میں کھلی جارحیت کا میلان بڑی حد تک کم ہوگیا۔ مسلم پریس نے بھی اپنے ابتدائی کانگریس مخالف رویہ میں بڑی حد تک نرمی پیدا کرلی تھی اور اب تو وقتاً فوقتاً بعض مسلم رہنما ہندو مسلم اتحاد اور "کانگریس مسلم تعاون" کا مطالبہ بھی کرنے لگے تھے[119] انتہا یہ کہ بعض کٹر قسم کے مسلمان بھی اس بنیاد پر کانگریس کے ساتھ اتحاد چاہنے لگے تھے کہ ہندستان میں مسلمانوں کو دو قسم کا جہاد درپیش ہے (۱) جہاد اصغر جو مذہبی حقوق اور آزادی کے لیے درپیش ہے اور (۲) جہاد اکبر جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ فرمانروا کو رعایا کی شکایتوں، پریشانیوں اور مصیبتوں سے آگاہ کیا جائے تاکہ اُن کا ازالہ ہوسکے۔ بعض علماء نے اس بات کا فتویٰ دیا کہ اس جہاد اکبر کے معاملے میں کانگریس تمام مسلمانوں سے تعاون طلب کرسکتی ہے۔[120]

مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد کے جذبات و احساسات کی تبدیلی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کلکتہ میں منعقد ہونے والے کانگریس کے بائیسویں سالانہ اجلاس میں پچاس کی تعداد میں مسلمان نمائندے شریک ہوئے جن میں وزیر حسن، ایم۔ اے۔ جناح اور عباس طیب جی جیسے ہونہار نوجوان شامل تھے[121] اسی اجلاس میں کانگریس نے وقف علی الاولاد[122] کے بارے میں دیئے گئے پریوی کونسل کے فیصلوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اس طرح اُسے مسلمانوں کی مزید ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ سریندر ناتھ بنرجی کے تخمینے کے مطابق دو سو سے زیادہ مسلمان مہمانوں (مندوبین) نے اس اجلاس میں شرکت کی جبکہ جملہ (300) رضا کاروں میں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمان رضاکاروں کی تعداد (۱۰۵) تھی۔

جناح نے آتے ہی کانگریس کے اس اجلاس میں پیش کی جانے والی "سلف گورنمنٹ یا سوراج" سے متعلقہ قرارداد میں ایک ترمیم پیش کردی اور مطالبہ کیا کہ مجوزہ قرارداد میں سے اس دفعہ کو حذف کردیا جائے جس میں یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ "ہندستان کے تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ طبقات کے لیے" مجالسِ قانون ساز میں نشستیں محفوظ رکھی جائیں اور ان کے لیے ملازمتیں بھی مختص کی جائیں۔ اپنی ترمیم کی وضاحت کرتے ہوئے جناح نے اعلان کیا:

"میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ مسلمان قوم کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جانا چاہیے جو آپ ہندو قوم کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ وہ اساس جس پر انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہی ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ اس لیے کسی طبقے یا قوم کے لیے کسی قسم کی تخصیص Reservation نہیں کی جانی چاہیے۔"[۱۵۲]

اس ترمیم کو بھی نے متفقہ طور پر منظور کرلیا اور اسے اصل قرارداد کے متن میں شامل کرلیا گیا۔

لیکن یہ تمام باتیں اس وقت کے مسلم رہنماؤں اور خاص طور پر علی گڑھ کے قائدین میں پائے جانے والے رجحانات کی ہرگز غمازی نہیں کرتیں جو اب بھی ہندوؤں کے ساتھ سیاسی گٹھ جوڑ کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ یہ درست ہے کہ کسی نہ کسی طرح کے سیاسی ادارے کا فوری قیام ناگزیر ہوگیا تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ یہ ادارہ تنہا مسلمانوں ہی کے لیے مختص ہو۔ اس سلسلے میں ڈھاکے کے نواب اور نوجوان آغا خان نے اُن کی کافی ہمت افزائی فرمائی۔ اوّل الذکر کی تحریک اور آخر الذکر کی رہنمائی نے مسلم رہنماؤں کو فوری طور پر کارروائی کرنے پر اُکسایا۔ لندن سے امیر علی نے Nineteenth Century میں شائع ہونے والے پُرجوش مقالے میں لکھا:

"... ہندستانی مسلمان بڑی شدت سے سیاسی لاغری کا شکار ہیں۔ مادی انحطاط اور فکرِ جدید سے اُن کی عام بے بہرہ وری نے انہیں انتشار کی افسوس ناک حالت سے دوچار کردیا ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں جو تنظیمیں کام کر رہی ہیں اُن میں استحکام کا فقدان ہے۔ یہ جماعتیں اتنا بھی نہیں جانتیں کہ ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی قوم کی بنیادی ضروریات کیا ہیں۔ کوئی تنظیم اس بات کی پُرخلوص کوشش کرتی ہوئی بھی دکھائی نہیں دیتی کہ قوم کو مزید انحطاط سے بچایا جائے، اُسے ترقی کی راہ پر گامزن کیا جائے، عوامی معاملات کے بارے میں حکومت کو اپنے قومی نظریات سے آگاہ کرایا جائے اور ان کے رواجوں اور قوانین کے تعلق سے پائی جانے والی غلط فہمیوں کی وجہ سے ملت کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اُس کے شر سے محفوظ رہنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔"

اس لیے امیر علی نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر خود کو ایک علیحدہ سیاسی گروہ کی شکل میں منظم کرلیں "ورنہ ممکن ہے کہ عوام کے احساسات غلط روپ دھارلیں اور اپنے اظہار کے غیر اُصولی ذرائع کو استعمال کرنے لگیں۔"[183]

آنے والی اصلاحات کے بارے میں ملک کے طول و عرض میں چھڑ جانے والی بحث نے بھی اس قسم کے اقدام کے لیے ایک بہترین موقع فراہم کردیا۔ اس کے علاوہ نئے وائسرائے لارڈ منٹو Lord Minto کی شکل میں مسلمانوں کا ایک ہمدرد دوست بھی مل گیا "جسے" بقول اس کے سوانح نگار کے "مسلمان سے بڑی اُنسیت تھی۔"[184] نئے سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ مورلے Lord Morley بھی مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اپنے ایک دلچسپ خط میں انہوں نے لیڈی منٹو کو بتلایا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ مجھے مسلمانوں سے محبت ہے لیکن میں مشرقی سمت میں اس سے زیادہ آگے جا نہیں سکتا۔"[185]

ان باتوں سے تقویت پاکر مسلم رہنما ایک وفد کی شکل میں وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ اپنے مخصوص مطالبات پیش کرسکیں۔ اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ شملہ میں جس قدر ممکن ہو زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہوں۔ انتہائی محتاط الفاظ میں یادداشت کا مسودہ تیار کیا گیا۔[186] اس صورتِ حال کی وجہ سے کانگریسی لیڈروں کا بوکھلا جانا لازمی امر تھا۔ انہیں شبہ ہوا کہ شاید ایک بار پھر مسلمانوں کو سیاسی اصلاحات کی مخالفت پر کمربستہ کیا جارہا ہے۔ لہٰذا اپنے اخبار Bengalee میں سریندر ناتھ بنرجی نے مسلم رہنماؤں سے اپیل کی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے حکومت کے روبرو ایک متحدہ محاذ کی شکل میں پیش ہوں۔ انہوں نے لکھا:۔

"نہ صرف اس مسئلے پر بلکہ دیگر مسائل کے سلسلے میں بھی ہم اپنے مسلمان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھائیوں سے آدھی راہ کے فاصلے پر ملنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ سوال کہ مسلمان ممبروں کی کتنی تعداد کو کافی سمجھا جائے۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بے تکلف باہمی مذاکرات کے ذریعے طے پا سکتا ہے۔ ہم اُن کا تعاون حسبِ ذیل امور میں چاہتے ہیں:۔

(۱) ہندو اور مسلم کونسلروں کا انتخاب ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ ووٹ سے عمل میں آئے۔

(۲) ہندو اس بات پر آمادہ ہوں گے کہ مسلمانوں کو نمائندگی کے معاملے میں مناسب حصّہ دیا جائے۔

(3) قوم اور مذہب کا فرق ہندستان کے عظیم اور وسیع مفادات پر اثر انداز نہ ہونے پائے۔

(4) اس برصغیر کی دونوں عظیم قوموں میں باہمی اعتماد اور پُرخلوص اشتراک کی فضا ہموار کی جائے جس کے بغیر موجودہ حالات میں دیرپا ترقی کا تصوّر کرنا محال ہے۔

(5) دونوں قوموں میں سے کوئی جابر اور ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے والی حکومت کا آلہ کار نہ بنے۔

(6) جب کبھی حکومت کسی ایک قوم کی جانب ضرورت سے زیادہ الطاف کا رویہ اپنائے تو کسی حالت میں بھی دوسری قوم واویلا مچانے سے احتراز کرے۔

(٦) حسبِ ذیل مقاصد کے حصول کے لیے ہندو اور مسلمان مل جل کر باہمی اخوت کے ساتھ جدوجہد جاری رکھیں:۔

ا۔ تحتانوی تعلیم۔ لازمی اور مفت۔

ب۔ تکنیکی اور سائنسی تعلیم میں توسیع۔

ج۔ ہندستان کی معاشی یعنی زرعی، صنعتی اور کاروباری ترقی۔

د۔ ذرائع آبرسانی کی دانشمندانہ اور سوچی سمجھی توسیع۔

ھ۔ سودیشی تحریک کی مقبولیت۔

و۔ ملک کے قدرتی وسائل سے مستفید ہونے کے لیے جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کا قیام اور تجارت کی ترقی کو بڑھاوا دینا۔

ز۔ موجودہ تیس سالہ مالگزاری پٹے Revenue Settlement کی جگہ ساٹھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سالہ مالگزاری پٹے کی اجرائی۔

ح۔ مجالسِ قانون ساز کے اختیارات اور دائرہ کار کے ساتھ ساتھ اُنکی نمائندگی کے اُصولوں میں توسیع۔

ط۔ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں پر ہندستانیوں کے تقررات میں توسیع۔

ی۔ شرفاء کے نوجوان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ملٹری کالج کا قیام۔[187]

بنرجی کی اپیل کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور مسلم رہنما اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں منہمک رہے۔ بالآخر یکم اکتوبر 1906ء کو ہندستان بھر کے تقریباً پچاس مسلمان رہنماؤں نے ایک وفد کی شکل میں منٹو سے ملاقات کی اور انہیں اپنے مخصوص مطالبات کی ایک یادداشت پیش کی۔ اپنے جواب میں وائسرائے نے انہیں یقین دلایا کہ ۔۔۔۔ "آپ ہی کی طرح مجھے بھی اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اس برصغیر میں بسنے والی قوموں کے عقائد اور رواجوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر ہندستان میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابی نمائندگی (Electoral Representation) کا طریقہ رائج کر دیا گیا تو اس کا بُری طرح ناکام ہو جانا یقینی امر ہے۔"[188]

یہ بڑے اچھے جذبات تھے جن کا وائسرائے نے اظہار کیا تھا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ مسلم رہنماؤں نے ان سے بہت ہی زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ اگرچہ اِن الفاظ کے ذریعے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ لیکن ان میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر نمائندگی دینے کا کوئی تیقن نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے اخباری مسلم پیٹریٹ (The Muslim Patriot) نے اس وفد کو "ناکام" قرار دیا اور مسلمانوں کو تاوقتیکہ ان متحدہ عرضداستوں پر پوری طرح دھیان نہیں دیا جاتا اور ان کے معتدل مطالبات کو پوری طرح تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔ "احتجاج، احتجاج، احتجاج" کا مشورہ دیا۔[189]

تاہم حالات کے اس طرح پلٹا کھانے پر برطانوی عہدیدار بہت مسرور ہوئے جیسا کہ اُن میں سے ایک عہدے دار نے مسلمانوں کے وفد کی واپسی کے فوری بعد لیڈی منٹو کو لکھا تھا:۔

"میں آپ کی خدمتِ اقدس میں ان سطور کے ذریعے یہ عرض کرنا چاہتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں کہ آج ایک بہت اہم واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ تدبر اور سیاست دانی statesmanship کا ایک ایسا کارنامہ جو آنے والے کئی برسوں تک ہندستان اور ہندستانی تاریخ کو متاثر کرتا رہے گا۔ یہ کارنامہ باسٹھ ملین 62,000000 افراد کو باغیانہ حزب اختلاف میں شریک ہونے سے باز رکھنے کے مترادف ہے۔"[192]

اس واقعے کی اہمیت کو نہ تو وہائٹ ہال نے گھٹانے کی کوشش کی اور نہ برطانوی پریس نے۔ اخبار The Times نے تو یہاں تک لکھا کہ یہ یادداشت "اس اچھوتی سیاسی فکر کا واحد نمونہ ہے جو جدید ہندستان سے ابھری ہے۔" جبکہ مورلے نے منٹو کو لکھا:-

"آپ نے مجھے اپنے مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ بڑا ہی دلچسپ ہے اور مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں آپ کی گارڈن پارٹی کے وقت وہاں موجود نہیں تھا تاکہ چھپ کر انہیں بچشم خود دیکھ سکتا۔ سبھی باتیں بالکل ویسی ہوئیں جیسی کہ ہونی چاہیے تھیں۔ ان کی وجہ سے آپ کے موقف اور اختیار کو استحکام حاصل ہوا ہے۔ آپ کے فیصلے (deliverance) کے دیگر خوشگوار اثرات کے ساتھ ہی ساتھ یہ اچھی بات بھی ہوئی کہ اس کی وجہ سے یہاں کے نکتہ چینوں کے منصوبے اور ہتھکنڈے بیکار محض ہو کر رہ گئے یعنی اب ان میں یہ جرأت باقی نہیں رہی کہ آئندہ ہندستانی حکومت کا خاکہ اس طرح کھینچیں کہ گویا وہاں دفتر شاہی (bureaucracy) اور عوام کے مابین مستقل رسہ کشی کی کیفیت جاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب میرے مضبوط سے مضبوط انقلابی دوست بھی یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ وہ سمجھتے ہیں۔"[193]

مسلمان رہنماؤں پر اس واقعہ کا زبردست اثر پڑا۔ اس واقعہ نے ان میں عمل کی اس قدر روح پھونک دی کہ اس سے قبل کسی اور چیز نے ان میں اتنی مستعدی پیدا نہیں کی تھی۔ وائسرائے سے شرف باریابی حاصل کرنے کے تین دنوں کے اندر ہی انہوں نے اپنی ایک مرکزی سیاسی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کر لیا۔[194] ڈھاکے کے نواب صاحب نے مختلف مسلم تنظیموں میں اپنی آل انڈیا محمڈن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کنفیڈریسی (All India Muhammadan Confederacy) کی اسکیم گشت کرائی جس کے دوسرے مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ مسلمانوں کے مفادات کے ساتھ ساتھ برطانوی راج کا تحفظ بھی کیا جائے۔ نئی تحریک کو موزوں طریقے سے شروع کرنے کی تیاریوں میں آغاز کر دیا گیا۔ بالآخر 31 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اختتام پر کانفرنس کے تمام وفود نے ایک خصوصی میٹنگ میں شرکت کی جس میں دیگر اہم مسلمان بھی شریک ہوئے تاکہ ایک سیاسی ایسوسی ایشن کے قیام کا اعلان کیا جا سکے۔

نواب وقار الملک نے، جنہوں نے اس جلسے کی صدارت کی تھی، اس بات پر زور دیا کہ "ان کے مفادات اس حد تک برطانوی راج کے ساتھ منسلک ہیں کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو ہمیں حکومت کی خاطر لڑنے اور جان قربان کر دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" ہمارا نصب العین ہونا چاہیے "دفاع نہ کہ سرکشی" وقار الملک نے بڑے ہی پُرجوش انداز میں شملہ کے وفد کا تذکرہ کیا اور بتلایا کہ موجودہ جلسہ اسی کا منطقی نتیجہ ہے۔[195]

نواب صاحب ڈھاکہ نے جو کہ اس اجلاس کے خاص موسس تھے، واضح کیا کہ مسلمانوں نے یہ کیوں طے کیا ہے کہ ایک نئی تنظیم قائم کی جائے۔[196] "اگر وہ پارٹی جو اس وقت برطانیہ میں اقتدار پر قابض ہے، مسلمانوں کے موقف سے واقف ہوتی اور اگر ہندستان کے عوامی نمایندوں نے مسلمانوں کے مطالبات کو مناسب ڈھنگ سے پیش کیا ہوتا تو شاید اسی تنظیم کے بارے میں کسی نے کچھ سنا ہی ہوتا لیکن آج کل کے زمانے میں تو خاموش اور پُرسکون کام کرنے والوں کی کوئی سنوائی ہی نہیں ہوتی اور صرف گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے چلانے والوں ہی کی بات پر دھیان دیا جاتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو ان کی مرضی کے خلاف اپنی مروجہ پالیسی کو ترک کرنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے تاکہ ان کی شکایات کا ازالہ ہو سکے اور ان کے مفادات کے نظر انداز کر دیئے جانے کا جو خطرہ پیدا ہو گیا ہے اسے ٹالا جا سکے جبکہ ہندستان کی دوسری قومیں اپنے لیے فوائد کے حصول میں کامیاب ہو چکی ہیں۔[197]"

چند اور تقاریر کے بعد حاضرین نے بالاتفاق آراء حسب ذیل قرار داد منظور کی:۔

ہندستان کے مختلف علاقوں سے آکر ڈھاکہ میں مجتمع ہونے والے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کا یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ حسب ذیل مقاصد کی تکمیل کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کی جائے:۔

ا۔ ہندستانی مسلمانوں کے دلوں میں برطانوی حکومت کے لیے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا اور حکومتی اقدامات کی وجہ سے اگر کوئی غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو ان کا ازالہ کرنا۔

ب۔ ہندستانی مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کرنا اور حکومت کو ادب اور احترام کے ساتھ ان کی ضروریات اور اُمنگوں سے واقف کرانا۔

ج۔ لیگ کے مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر ہندستانی مسلمانوں میں دوسری قوموں کے خلاف جارحیت کے رجحان کو پیدا ہونے سے روکنا۔[198]

یہ قرارداد ڈھاکے کے نواب صاحب نے پیش کی جس کی توثیق حکیم اجمل خاں نے کی۔[199] اسی جلسے میں نواب وقار الملک اور محسن الملک کو عارضی کمیٹی کے جوائنٹ سکریٹری کے طور پر منتخب کیا گیا۔ اس کمیٹی کو لیگ کی آئندہ کارکردگی کے انتظامات کی تکمیل کرنے اور اس کے لیے ایک موزوں دستور کا مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

اس طرح ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

عین اسی وقت جبکہ مشرقی بنگال کے صدر مقام پر یہ اہتمام بالشان واقعہ ظہور پذیر ہو رہا تھا کلکتے میں مسلمانوں کے ایک اور اجتماع کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس اجتماع کا انعقاد بھی اسی مقصد سے کیا گیا تھا جو اس کے منتظمین کے قول کے مطابق یہ تھا کہ "اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ آج کی سیاسی اور معاشی تحریکات کے تعلق سے مسلمان کیسا رویہ اپنائیں"۔[200] اس جلسے کی صدارت برار کے ایک زمیندار مولوی غلام احمد خاں نے سنبھالی۔ اس جلسے میں بمبئی، بڑودہ، یو۔پی، مدراس، سی۔پی، پنجاب، بہار اور بنگال سے کئی وفود نے شرکت کی۔ اگرچہ کانگریسی اخبارات نے اس جلسے کی کچھ تشہیر بھی کی۔ لیکن لوگوں نے اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متعلق کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اس آخرالذکر اجتماع میں جو قراردادیں منظور کی گئیں اُن میں ایک قرارداد وہ بھی تھی جس میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ "وہ معاشی اور سیاسی میدانوں میں دوسری قوموں کے ساتھ مل جل کر کام کریں کیونکہ مسلمانوں کے مفادات دوسری قوموں کے مفادات سے قطعی مختلف نہیں ہیں[25]۔" یہ نقطہ نظر لیگ کے بنیادی نقطہ نظر سے یکسر مختلف تھا۔ لہٰذا اس کی تشہیر کے لیے ایک علیحدہ سیاسی تنظیم انڈین مسلمان ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کی گئی۔ اس تنظیم کے دیگر اغراض و مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ "مسلمانوں کی خاص شکایات کو منظرِ عام پر لایا جائے۔" لیکن یہ طے کیا گیا کہ اس پروگرام پر دوسری قوموں کے تعاون کے ساتھ عمل کیا جائے۔(26) مہران پر مشتمل ایک عارضی کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ ابتدائی انتظامات مکمل کیے جا سکیں اور آئندہ کسی مناسب تاریخ کو ایک زیادہ نمائندہ قسم کا اجلاس منعقد کر کے منصوبے کو قطعیت دی جا سکے۔ نواب سید محمد کو اس کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا اور قاضی کبیرالدین، عباس طیب جی اور ایم۔اے۔جناح کو اس کمیٹی کے نائب صدور کے طور پر منتخب کیا گیا۔ اے۔رسول کو اس کمیٹی کا معتمد نامزد کیا گیا۔

بظاہر یہ سب کچھ نو تشکیل شدہ مسلم لیگ کے جوابی اقدام کے طور پر کیا گیا اور اردو پریس کے بعض حلقوں نے کانگریس پر الزام لگایا کہ یہ اسی کی سازش ہے۔ ایک مسلم اخبار نے لکھا کہ "مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں ناکام ہو چکنے کے بعد اب کانگریس اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ بعض مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر دیا جائے۔" لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ Statesman جیسے بعض بااثر اخبارات نے نئی لیگ کے قیام کی سخت مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ ڈھاکے کے نواب صاحب نے "تعلیم یافتہ جیکل (Jekyll) کو" سیاسی ہائڈ (Hyde)" میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس اخبار نے اپنے اسی ادارے میں اس بات کی بھی مذمت کی کہ گذشتہ چند دنوں سے بعض خود غرض پارٹیاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اخبار نے واضح کیا کہ اس قسم کی کوششیں پہلے بھی کئی بار کی جا چکی ہیں۔ لیکن ہر بار یہ کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اخبار نے اُمید ظاہر کی "ہم سمجھتے ہیں کہ دونوں قوموں کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر اُکسانے والی اس آخری کوشش کا انجام بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بجز ناکامی اور کچھ نہیں ہوگا۔"[202]

برطانوی پریس نے بھی نوزائیدہ مسلم لیگ کا کوئی پُرجوش خیر مقدم نہیں کیا The Times نے اگرچہ کانگریس کے "دُور از کار اور احمقانہ مطالبات" کے تدارک کے طور پر لیگ کے قیام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تاہم اسے اس امر میں شک تھا کہ یہ تنظیم "امن و آشتی" کا باعث بن سکے گی۔[203] لیکن تعجب تو اس بات پر ہے کہ لیگ کے قیام کی سب سے زیادہ مخالفت Morning Post نے کی جو برطانیہ کا سب سے زیادہ قدامت پسند اخبار تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس نے لیگ کو متنبہ کیا کہ "اس کا کام خالصتاً دفاعی اور تحفظاتی" نوعیت کا ہونا چاہیے۔ "اگر وہ ایک بار اپنے نصب العین سے منحرف ہوگئی اور کھلے عام ہندوؤں یا کسی اور قوم کی دشمنی اس نے مول لے لی یا اپنے فکر و عمل سے ہندستان میں اندرونی پھوٹ اور نزاع پیدا کر دی تو برطانوی حکمرانوں کو فوراً اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جانا پڑے گا۔"[204]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

(NOTES and REFERENCES)

دوسرا باب (سیاسی سرگرمیاں)

1 - The Times, London, Feb. 6, 1886

2 - ملاحظہ ہو بی۔پی۔رامیّا (B. P. Ramayya) کی کتاب History of the Indian National Congress صفحات (17 - 22)

اے۔سی۔مجمدار (A. C. Mazumdar) کی کتاب Indian National Evolution صفحات (4 - 8)

وی۔چرول (V. Chirol) کی کتاب Indian Unrest صفحات (24 - 28) اور

اینی بیسنٹ (Annie Besant) کی کتاب How India Wrought for Freedom صفحہ (iii)

3 - اخبار انڈین مِرر (Indian Mirror) نے اے۔سی۔مجمدار کی تحریر سے ایک اقتباس اپنی ۲۰ دسمبر 1887ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے جس میں انھوں نے کانگریس کو "ہندو کانگریس" کہہ کر مذمت کیے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "..... گویا کہ ہندو اس ملک میں ایک ناقابلِ اعتنا عنصر کی حیثیت رکھتے ہوں اور اس قسم کا نقص اس تحریک کو عوام کے روبرو بدنام کرنے اور اس کی قدر و قیمت کو حکومت کی نگاہوں میں گرانے کے لیے کافی ہو۔" ملاحظہ ہو ان کی کتاب Indian National Evolution صفحہ 141

4 - ان دو مسلمانوں میں ایک ایم۔آر۔سایانی تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

5 ۔ جیسا کہ دو سال بعد محمڈن آبزرور (Muhammadan Observer) نے لکھا "ایسے میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ کانگریس ہندستان کے عوام کی نمایندگی کرتی ہے؟ یقیناً کانگریس سوائے خود ان کے ہمارے ہم مذہب لوگوں کی نمایندگی نہیں کر سکتی۔" اس اقتباس کو اخبار انگلش مین (Englishman) نے اپنی 22 نومبر 1888ء کی اشاعت میں نقل کیا۔

6 ۔ دفتر شاہی کی جانب سے کوئی نئی مخالفت کے اسباب بتاتے ہوئے اے۔ او۔ ہیوم (A. O. Hume) نے 10 فروری 1889ء کے خط میں کانگریسی کارکنوں کو لکھا: "ہمارے یوروپین عہدیدار، جو خدمات، روایات اور دفتر شاہی کی حمایت کی وجہ سے یہاں کافی با اثر ہیں، ایک جماعتی شکل میں ہمارے دعووں کی صداقت کے منکر ہیں اور ہم چاہے جو کچھ کہیں وہ قایل ہونے والے نہیں ہیں۔ ہم اس بات کے لیے انھیں کوئی الزام بھی نہیں دیتے۔ یہ ایک فطری امر ہے کیونکہ ہم جن اصلاحات کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی وجہ سے لازماً ان کے آمرانہ اختیارات پر ضرب پڑتی ہے جنھیں یہ عہدیدار آج کل استعمال کرتے ہیں اور تاوقتیکہ وہ انسانی سطح سے بلند نہ ہو جائیں لازماً ہمارے پروگرام کی مخالفت کریں گے۔" ملاحظہ ہو ویڈبرن Wedderburn کی کتاب Life of A. O. Hume صفحات 85-86

7 ۔ The Times, London, February 1, 1886

8 ۔ حوالہ بالا (ibid) بعد ازاں کے۔ ٹی۔ شیلنگ نے اس دعوے کو چیلنج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اسٹیٹسمین Statesman کا 23 دسمبر 1886ء کا اداریہ۔

10 ۔ 'The Aligarh Institute Gazette' 23 نومبر 1884ء

11 ۔ ہیوم ایک اہم برطانوی سول عہدیدار تھا جو اس تمام مدت (1885-1906) میں کانگریس کا جنرل سکریٹری رہا۔ اس شخص کے بارے میں اس کے کٹر ترین مخالف اخبار پایونیر Pioneer تک نے اس بات کا اعتراف کیا ہے "آج ہندستان میں ہر شخص یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ ہیوم کی لگاتار جدوجہد اور بھرپور توانائیاں شامل حال نہ ہوتیں تو کانگریس کبھی کی اپنی طبعی موت آپ مر چکی ہوتی ..... اس نے مردہ دلوں میں نئی روح پھونک دی۔ وہ انحراف پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے تحریک سے علیحدگی کی دھمکی بھی دی اگر اس کی چندے کی درخواستوں سے بے اعتنائی برتی گئی اور اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے اس معرکے کو جاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھنے کے لیے اپنے ذاتی ذرائع آمدنی کو بے دریغ استعمال کیا "میں خود کانگریس ہوں" یا "میں یعنی کانگریس" یہی شروع سے لے کر آخر تک اُس کا نعرہ رہا.....

(۳۱ جنوری ۱۸۹۱ء) بیوم کے کام کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو اس کی "سوانح" (Life) مرتبہ ولیم ویڈر برن (William Wedderburn) -

12 - The Statesman, Dec. 18, 19, 21, 1886.

13 - حوالہ بالا (Ibid)

14 - اس کے چند ہی دنوں بعد Indian Mirror نے بیوم کے اس مراسلے کو اپنی 25 دسمبر 1886ء کی اشاعت کے ضمیمے کے طور پر شایع کیا۔

15 - The Statesman, Dec. 19, 1886.

16 - مزید ملاحظہ ہو امیر علی کے فعل کو چیلنج کرنے والے وہ مراسلات جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ کسی عبدالسلیم ایم۔اے نے مدیر کے نام لکھے تھے۔

(The Statesman, December 25 and 28, 1886) اپنے جواب میں امیر علی نے مراسلہ نگار پر جعل سازی کا الزام لگایا (The Statesman, Dec. 29, 1886) اگلے دن اخبار نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس سے ایک "ناقابلِ معافی فریب" کی تشہیر کا جرم سرزد ہوا۔ (The Statesman, Dec, 30, 1886)

17 - The Statesman, (Weekly) Dec. 25, 1886.

18 - اسٹیٹسمین کی 2 جنوری 1887ء کی اشاعت میں یہ الفاظ نقل ہوئے۔

19 - The Statesman, Dec. 23, 1886. البتہ مسلمانوں کے کانگریس میں شریک ہونے سے انکار کرنے پر سول اینڈ ملٹری گزٹ Civil and Military Gazette نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"معمولی سمجھ بوجھ والا شخص بھی ان کی اگلی چالوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ نیشنل کانگریس یہ بتلائے گی کہ کس طرح اینگلو انڈین ریشہ دوانیوں کے باعث پھوٹ ڈالی گئی کہ مسلمان ابن الوقت ہوتے ہیں جنھیں عزتِ نفس کا بھی پاس نہیں ہوتا اور بالآخر غداری کر کے کانگریس اس بات کا دعویٰ کرے گی کہ وہ پہلے سے زیادہ نیشنل بن گئی ہے اور سلطنت کے خلاف حکم لگانے لگے گی اور وائسرائے سے کہنے لگے گی کہ آئندہ اسے کیا کرنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہیے۔ پھر وہ تقریر بازی کا بازار گرم کریں گے اور دیسی اخبارات ان کی لمبی چوڑی تقریریں شایع کرنے لگیں گے اور ان کے خلاصے بذریعہ تار وطن (انگلستان) پہنچنے لگیں گے۔ پھر وہ منتشر ہو کر پانچ سال کی لڑکیوں کا بیاہ دس سال کے لڑکوں سے کرنے لگیں گے اور تین سال عمر کی بیواؤں کو بقیہ زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھانے میں مصروف ہو جائیں گے۔

The Civil and Military Gazette, Dec. 28, 1886 مزید ملاحظہ ہو ایک اداریہ بعنوان "مسلمان قوم اور کلکتے کی دو مسلم انجمنیں" مطبوعہ ٹریبیون (Tribune) مورخہ ۵ جنوری ۱۸۸۷ء؛ مزید ملاحظہ ہو اداریہ شذرات مطبوعہ ہندو پیٹریاٹ Hindoo Patriot مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۸۶ء۔

20۔ ملاحظہ ہو "کانگریس کی سالانہ رپورٹ" 1886 کا ضمیمہ جس میں وفود کی فہرست شامل کی گئی ہے۔

21۔ ملاحظہ ہو ٹریبیون Tribune کا اداریہ "نیشنل کانگریس اور اس کے نقاد" مورخہ ۹ نومبر 1887ء

22۔ کانگریس کی سالانہ رپورٹ 1887 صفحہ 72

23۔ مزید ملاحظہ ہو مدراس ٹائمز مورخہ 28 دسمبر 1887ء کا اداریہ "تیسری نیشنل کانگریس کا افتتاح"

24۔ 28 دسمبر 1887ء کو سرسید نے یہ تقریر اودھ کے تعلقدار، حکومت اور فوج کے اعلیٰ حکام وکلا، صحافیوں اور علماء کے روبرو کی۔ جلسے میں ہندستان کے اعلیٰ ترین خاندانوں کے سید، شیخ، مغل اور پٹھان شریک تھے۔ حاضرین میں مختلف مکاتب فکر کے لوگ شریک تھے جن میں کٹر شیعہ اور سُنّی علماء بھی تھے اور ہندستانی اور برطانوی کالجوں میں تربیت پائے ہوئے نوجوان بھی تھے۔ ("پایونیر" مورخہ ۱۱ جنوری ۱۸۸۸ء) 'دی ٹائمز' نے اسے ایک ایسی غیر معمولی سیاسی تقریر بتلایا جو آج تک کسی ملکی باشندے نے نہیں کی تھی (۱۶ جنوری 1888ء)

25۔ "دی پایونیر" ۱۱ جنوری ۱۸۸۸ء

26۔ "دی پایونیر" ۱۱ جنوری ۱۸۸۸ء۔ سیاسی مایہ النزاع مسایل میں سرسید ہمیشہ مسلمانوں کا ذکر ایک قوم کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ ہندو اخبارات نے ہمیشہ سرسید کے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دعوے کو چیلنج کیا۔ بقول "انڈین مرر" Indian Mirror "ہمارے مسلمان ہم وطن بھی اُسی طرح ہمارے بھائی بند ہیں جس طرح کہ دوسرے ہندو" Indian Mirror 20 دسمبر 1887ء

27. The Indian Mirror, January 15, 1888.

28. Ibid. - یہ اعزاز سرسید کو سرکار کی جانب سے اُسی سال عطا کیا گیا تھا۔ سال نو کے اعزازات کی فہرست میں اُن کا نام شامل تھا۔ ملاحظہ ہو 14 مئی 1888ء کے "پایونیر" میں شایع شدہ سرسید احمد خاں کو عطائے خطاب کی رپورٹ۔

29. پایونیر نے یہ الفاظ اپنی 2 فروری 1888ء کی اشاعت میں نقل کیے۔

30. Ibid.

31. دی ٹریبیون 21 جنوری 1888ء۔ مزید ملاحظہ ہو۔ اسی موضوع پر ایک اداریہ بعنوان "ایک قابلِ رحم مظاہرہ"۔ جو ٹریبیون کی 8 فروری 1888ء کی اشاعت میں شایع ہوا۔

32. پایونیر نے اپنی 2 فروری 1888ء کی اشاعت میں سرسید کی تقریر پر ان اخبارات کے اداریتی تبصروں کے طویل اقتباسات شایع کیے ہیں۔

33. پایونیر نے اپنی 2 فروری 1888ء کی اشاعت میں یہ اقتباس نقل کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ سبھی مسلم اخبارات نے سرسید کے موقف کی تائید نہیں کی بعض نے ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر بنگال کا اخبار "احمدی" لکھتا ہے: "کانگریس کے قیام کے وقت ہی سے سرسید احمد اس کے مخالف ہیں اور اس پر کڑی تنقیدوں کی بوچھار کر رہے ہیں۔ کئی سادہ لوح مسلمان بھائی ان کے نام کے جادو میں پھنس گئے ہیں اور اپنی ذاتی رائے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اندھا دھند ان کی پیروی کرنے لگے ہیں۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچتے کہ سرسید نے اب تک جو کچھ بھی کہا ہے اُس میں ذرہ برابر بھی معقولیت ہے یا نہیں۔ وہ کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ آخر یہ کانگریس ہے کیا چیز اور کون سے عظیم مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے"۔ Indian Mirror نے اپنی 7 اکتوبر 1888ء کی اشاعت میں یہ اقتباس شایع کیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

34 - ایسے جملہ چار کھلے خط "ٹریبیون" کی 27 اکتوبر، 17 نومبر، 5 اور 19 دسمبر 1888ء کی اشاعتوں میں شایع ہوئے جنھیں بعدازاں کتابی شکل میں شایع کر دیا گیا۔

35 - اس ریمارک کو بارہا نقل کیا جاتا رہا ہے۔ دراصل خود سرسید نے بھی انھی خیالات کو مختلف موقعوں پر دہرایا ہے۔ اسی بنیاد پر کئی ناقدین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حقیقت میں سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اتحاد اور اشتراک کے حامی تھے۔ مزید ملاحظہ ہو "سرسید کا سفرنامۂ پنجاب" صفحات 156 - 62۔ سرسید کے تفصیلی جوابی متن اور اُس پر بیک Beck کے تبصرے کے لیے ملاحظہ ہو "پایونیر" بابت فروری 1888ء۔

36 "اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں نے کانگریس کو بہت ہی کم اہمیت دی۔ مستعد اور مغرور بنگالی، جو مسلمانوں کے خلاف اپنی نفرت کو چھپا رکھنے کی پروا نہیں کرتا تھا، شروع ہی سے فرض کر چکا تھا کہ کانگریس کی تحریک دراصل "ہندستانی قوم" کی تحریک بن جائے گی اور یہ کہ مسلمان اپنا راگ الگ ہی الاپیں گے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وقت آنے پر وہ جاہل مسلمانوں کو انگلیوں پر نچا سکتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں مستقبل کے اُن دنوں کا خیال کر کے مسکراتا تھا جب اُس کا چوڑی چھاتی والا غرّانے والا شیر دوست خود اُس جیسی کمزور بلّی کے پنجوں میں بے بس پڑا ہوگا۔ لیکن اس جری بنگالی کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے کیونکہ مسلمانوں نے کانگریس کی بازی کو اسی پر اُلٹ دیا۔ مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اس تحریک سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھا بلکہ بڑھ چڑھ کر اس تحریک کے اصلی خدوخال اور عزایم کا پردہ فاش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ (Englishman کا اداریہ مورخہ 6 نومبر 1888ء)

37 - بیک Beck کے مضامین "پایونیر" کی 2 اور 3 نومبر 1887ء کی اشاعتوں میں شایع ہوئے۔

38 - ibid

39 - ہربرٹ گلیڈسٹون Herbert Gladstone جو اُن دنوں ہندستان آیا تھا، اُن انگریزوں میں شامل تھا جنھوں نے ابتدا ہی سے کانگریس کی حمایت شروع کر دی تھی؛ اسی وجہ سے Englishman نامی صحیفہ اُن لوگوں کو "آوارہ قماش کے غدار لوگ" قرار دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو 6 نومبر 1888ء کا Englishman۔ مزید ملاحظہ ہو ہربرٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گلیڈسٹون کا مضمون "ہندستان کا پہلا سفر" مطبوعہ Nineteenth Century بابتہ جولائی 1887ء صفحات 48 — 135

40۔ The Indian Mirror بابتہ 13، 16 اور 17 نومبر 1887ء

41۔ Ibid۔ مزید ملاحظہ ہو 3 نومبر 1887ء کا "ٹریبیون" کا اداریہ "نیشنل کانگریس اور اس کے نقاد" اسی طرح ملاحظہ ہو 14 نومبر 1887ء کا ٹریبیون کا دوسرا اداریہ بعنوان "کانگریس آخر کس کی نمایندگی کرتی ہے؟"

42۔ The Indian Mirror، 16 نومبر 1887ء۔

43۔ Ibid۔ اور تو اور خود Statesman نے بھی بیک Beck کے خیالات کی تنقیص کی اور اس سے کہا کہ انگلستان میں پارلیمانی جمہوریت کی ابتدا پر نظر ڈالے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ پارلیمانی نظام حکومت کا تصور کس طرح پروان چڑھا The Statesman 5 نومبر 1887ء

44۔ The Indian Mirror، 13 نومبر 1887ء

45۔ The Pioneer مورخہ 24 نومبر 1887ء۔ مزید ملاحظہ ہو ایس اقبال علی کا مراسلہ بعنوان "کیا سرسید احمد ایک قائد ہیں" جو 2 فروری 1888ء کے پاینیر میں شائع ہوا جس میں مراسلہ نگار نے سرسید کی عوامی خدمات کا جایزہ لیتے ہوئے اس بات کو واضح کیا ہے کہ سرسید احمد خاں کیوں کر ہندستان کے اتنے ہی عظیم رہنما ہیں جتنا کہ کوئی اور قاید۔ "تاہم معاصر" بنگالی" اور دیگر مقتدر کانگریسی اخبارات کی رائے اس سے مختلف تھی "سرسید نے کبھی سیاسیات کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ چونکہ وہ انگریزی یا کسی اور یورپی زبان سے کماحقہٗ واقف نہیں ہیں اس لیے وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ آزادی کے نعرے کی فتح نے کس طرح مختلف ریاستوں کو باہم مربوط کر دیا۔ سرسید احمد ایک عظیم ماہر تعلیم تو ہو سکتے ہیں لیکن انھیں اس اعتماد کے ساتھ سیاسی معاملات میں دخل اندازی کا حق ہرگز حاصل نہیں۔ انھوں نے کسی بھی قسم کی سیاسی تربیت حاصل نہیں کی ہے۔ سیاست سے عدم واقفیت نے اُن میں ایک عجیب قسم کا اعتماد پیدا کر دیا ہے جس کے بل بوتے پر وہ ایک سیاسی مبلغ بن بیٹھے ہیں" (بنگالی، 17 نومبر 1888ء)

46۔ The Pioneer، 10 اگست 1888ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

47 ۔ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قیام کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو لندن کا "دی ٹائمز" مورخہ 13 اگست 1888ء ۔ مزید ملاحظہ ہو ڈبلیو۔سی۔ بونرجی کا مقالہ بعنوان "دی انڈین نیشنل کانگریس اور دی انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" جو ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ایک اجلاس میں پیش کیا گیا اور بعد ازاں اس پر کافی بحث و تمحیص کی گئی The Journal of East India Association (1889ء) 29 — 95

48 ۔ سالانہ کانگریس رپورٹ 1886ء صفحہ 7 — 8

49 ۔ "دی ٹائمز" 28 دسمبر 1887ء

50 ۔ اس "ایڈریس" کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ ہو "انڈین میسنجر" 1888ء 88 — 173

51 ۔ ملاحظہ ہو "مسلم ہیرالڈ" بابتہ 15 اور 29 دسمبر 1887ء

52 ۔ شفیع کے بیان کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ ہو "پایونیر" بابتہ 13 جولائی 1888ء مزید برآں ملاحظہ ہو حسب ذیل اخبارات کے ادارتی تبصرے: "ہندو پیٹریاٹ" بابتہ 8 اکتوبر 1888ء "بنگالی" بابتہ 13 اکتوبر 1888ء اور "انڈین مرر" بابتہ 5 اور 7 اکتوبر 1888ء

53 ۔ شفیع نے حسب ذیل حضرات کو "اُمتِ مسلمہ" کے حقیقی نمایندے قرار دیا جس پر قوم فخر کرتی ہے اور مکمل اعتماد کا اظہار کرتی ہے۔

عزت مآب سرسید احمد خاں	K.C.S.I
عزت مآب سید امیر علی	C.S.I
عزت مآب سید حسین خاں بہادر	
عزت مآب راجہ امیر حسین خاں بہادر	
عزت مآب نواب بہادر عبداللطیف خاں	C.I.E
عزت مآب مولوی عبدالمختار	
عزت مآب محمد علی روگائی	
عزت مآب قاضی صاحب دین خاں بہادر	C.S.I
عزت مآب نواب سرفرازش علی خاں قزلباش	

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نواب عبدالمجید خاں

خان بہادر محمد برکت علی خاں

55 ۔ سرسید نے 15 مارچ 1888ء کو میرٹھ کے مقام پر بھی اپنی تقریر میں کانگریس میں نوابوں اور رئیسوں کی عدم موجودگی پر تنقید کی جس کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ ہو "پایونیر" بابتہ 28 مارچ 1888ء ۔ اس تنقید پر تبصرہ کرتے ہوئے Indian Mirror رقمطراز ہے: "سرسید کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اُن کی قوم "صرف ایسے اونچے طبقے کے افراد ہی سے نہیں بنی ہے اور اگر صرف نواب صاحبین ہی مسلمانوں کی کانگریس میں نمایندگی کرنے لگیں تو یہ بات کانگریس کے لیے بیکار محض ہوگی۔

(The Indian Mirror بابتہ 8 مئی 1888ء)

56 ۔ ملاحظہ ہو Indian Mirror بابتہ 2 ستمبر 1888ء جس نے اپنے ضمیمے میں نہ صرف سرسید اور طیب جی کے مابین اس موضوع پر ہونے والی مراسلت کو شایع کیا بلکہ طیب جی اور امیر علی و محسن الملک کے مابین مسلم پولیٹیکل کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں ہونے والی مراسلت کو بھی شایع کیا۔

57 ۔ مزید ملاحظہ ہو بیک Beck کے تین مقالات بعنوان "اس کا انجام کیا ہوگا"، "جو پایونیر" کی 14، 16 اور 19 مئی 1888ء کی اشاعتوں میں شایع ہوئے۔ اسی طرح 26 مئی 1888ء کے "بنگالی" کا اداریہ "مسٹر بیک پھر سے حمایت پر" (Mr. Beck to the Rescue again)

58 ۔ ملاحظہ ہو "پایونیر" بابتہ نومبر ء

دادا بھائی نوروجی کے نجی خطوط کے حسب ذیل اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کی مخالفت کانگریسی رہنماؤں کے لیے کتنا سنگین مسئلہ بنی ہوئی تھی۔

(ا) واچھا Wacha کے نام اپنے 9 فروری 1888ء کے مکتوب میں وہ لکھتے ہیں "مجھے کانگریس کے اگلے اجلاس کی فکر لاحق ہوگئی ہے۔ اسے ناکام بنانے کے لیے سرسید احمد زمین آسمان کے قلابے ملادیں گے"۔

(ب) مالاباری کے نام اپنے 2 مارچ 1888ء کے مکتوب میں وہ رقمطراز ہیں: "مسلم مخالفین کے ساتھ معقول بنیادوں پر افہام و تفہیم ہو ہی جائے تو بہتر ہے۔ موجودہ نااتفاقی ہماری ترقی کی رفتار سست پڑ جائے گی۔ ایسی کئی مشکلات ہیں جن کے بارے میں ہمیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابھی اینگلو انڈین لوگوں سے الجھنا ہے۔"

(ج) مالاباری ہی کو اپنے ایک اور مکتوب مورخہ 18 اپریل 1888ء میں لکھتے ہیں: "مجھے امید ہے ہیوم سرسید کو منانے میں کامیاب ہو جائیں گے تاکہ کانگریس کی مخالفت کا خاتمہ ہو سکے۔ ہماری نااتفاقی ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچائے گی۔"

ملاحظہ ہو مسانی Masani کی کتاب Dadabhai Naoroji صفحات 301-03

59۔ نذیر احمد، لیکچروں کا مجموعہ (اردو متن): 13

60۔ ء میں بقول ڈبلیو۔سی۔بونیرجی (W.C. Bonerjee) "جس طرح انڈین نیشنل کانگریس کی داغ بیل ڈالی گئی اور اس کے بعد سے جس طرح اس کے امور طے پاتے رہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ادارہ مارکوئیس آف ڈفرن (Marquis of Dufferin) اور ایوا (Ava) کا کارنامہ ہے....."

ملاحظہ ہو G.A. Nalesan کی کتاب Indian Politics پر بونیرجی کا تعارفی نوٹ۔ بقول مسانی Masani "اگر الن ہیوم (Allen Hume) کو بابائے کانگریس Father of the Congress کہا جا سکتا ہے تو مارکوئیس آف ڈفرن کو کانگریس کا "دینی باپ" Godfather تسلیم کرنا پڑے گا۔

61۔ اس اجلاس کی تفصیلی رپورٹ کے لیے ملاحظہ ہو Pioneer بابتہ 29 نومبر 1888ء

62۔ راجہ شیو پرشاد کی عرضداشت کے متعلقہ حصوں کو Indian Mirror نے مورخہ 27 نومبر 1888ء کے اداریے میں تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔

63۔ ملاحظہ ہو اس قضیے کے بارے میں اُن کا تفصیلی مکتوب مطبوعہ "پایونیر" Pioneer بابتہ 26 نومبر 1888ء

64۔ میکلین Maclean قبل ازیں بمبئی گزٹ Bombay Gazette کا مدیر رہ چکا تھا۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب Recollections of Westernised India

65۔ وائسرائے کی تقریر کے تفصیلی متن کے لیے ملاحظہ ہو Englishman بابتہ یکم دسمبر 1888ء۔ وائسرائے کی تقریر پر صحافتی تبصروں کے لیے ملاحظہ ہو Pioneer بابتہ 3 دسمبر 1888ء۔

66۔ ڈفرن Dufferin کے اُن الزامات کے جوابات جو ہیوم Hume نے دیئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو Indian Mirror بابتہ 2 دسمبر 1888ء

67 - ملاحظہ ہو Hansard (Debates on Indian Affairs) Session 1888

مزید ملاحظہ ہو میکلین کا مضمون "The Home Rule Movement in India" جنوری۔اپریل کے (Asiatic Quarterly Review) میں 37 - 424 صفحات پر شایع ہوا۔

68 - Hansard. Ibid. 1144 — 46

یہ صحیح ہے کہ اُس وقت تک کانگریس نے بعض اعتبارات سے انڈیا آفس کو شدید مسایل سے دوچار کر دیا تھا۔ ملاحظہ ہو سرجان گورسٹ کا مکتوب بنام لارڈ لینس ڈاون (Lord Lansdowne) مورخہ 23 نومبر 1888ء جو لارڈ نیوٹن کی کتاب Lord Lansdowne: A Biography میں صفحہ 60 پر نقل ہوا ہے۔

69 - Annual Congress Report (1888), 57

70 - Ibid۔ مزید ملاحظہ ہو "دو انگریز مہمانوں کے تاثرات"

71 - Ibid, 2 - 3

72 - Ibid, 4

73 - Ibid, 4

74 - Ibid, 5

75 - Ibid, 20

76 - Ibid, 85

77 - Ibid, 85 - 86

78 - Ibid, 86

78a - Ibid, 69

79 - کانگریس کے بارے میں Rudyard Kipling کا طنزیہ مضمون بعنوان "The Enlightenment of Pagett, M.P." مطبوعہ (Contemporary Review) بابتہ ستمبر 1890ء صفحات (333 — 55)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملاحظہ ہو۔ اسی طرح Bengalee بابتہ 27 ستمبر 1890ء میں شایع شدہ کانگریس پر تنقید ملاحظہ ہو۔

80 ۔ ملاحظہ ہو پایونیر بابتہ 30 جنوری 1891ء کا اداریہ بعنوان " وائسرائے کا پیغام کانگریس کے نام "

81 ۔ سریندر ناتھ بنرجی کی تقریر جو انھوں نے الہ آباد میں منعقدہ کانگریس کے چوتھے اجلاس میں کی۔ ملاحظہ ہو " کانگریس کی سالانہ رپورٹ " 1888 صفحات 18-19

82 - Ibid, 64

83 - Ibid, (1887), 68

84 ۔ ملاحظہ ہو آسٹن ریٹرے Austen Ratray کا مضمون بعنوان " National Congress " مطبوعہ Asiatic Quarterly Review بابتہ Jan-April 1889 صفحات 40 — 202

85 - The Times, London, Dec 27, 1887

86 ۔ یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن سے الحاق کرنے والی بادن 52 تنظیموں کی مکمل فہرست ضمیمے میں پیش کی گئی ہے۔ سرسید کو نظام کی سرکار سے بھی مبلغ چار ہزار روپے کی مالی امداد حاصل ہوئی۔ انھیں البتہ اُس اپیل میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی جو انھوں نے ہندو مہاراجوں کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ملاحظہ ہو اداریہ " Hyderabad and the National Congress " مطبوعہ Indian Mirror بابتہ 16 اکتوبر 1888ء۔ سرسید نے مہاراجوں کو جو خط لکھا تھا اُس کے متن کے لیے ملاحظہ ہو Indian Mirror بابتہ 19 ستمبر 1888ء

87 - The Pioneer, Nov. 7, 1888

88 - Ibid

89 - Ibid

90 ۔ اپنی تقریر میں چونکہ سرسید نے میکالے Macaulay کے اُن مشہور الزامات کی جانب اشارہ کیا تھا جو میکالے نے بنگالیوں پر عاید کیے تھے اس کے جواب میں معاصر Bengalee رقمطراز ہے " سرسید احمد یہ بھول جاتے ہیں کہ جب میکالے یہ کہتا ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دروغ گوئی بنگالیوں کی سرشت میں داخل ہے اُس وقت اس کے ذہن میں مکمل بنگالی قوم موجود تھی جس میں مسلمان بھی اسی طرح شامل ہیں جس طرح کہ ہندو' ہمارے قومی کردار پر حرف گیری کرتے وقت میکالے نے ہندو یا مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی ہے"۔

(The Bengalee, Nov. 17, 1888) 91

متن کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو Pioneer بابتہ ۱۰ نومبر ۱۸۸۸ء

92 ۔ محسن الملک کی گلیڈسٹون کے ساتھ (Hawarden Castle) میں ہوئی ملاقات کی رپورٹ کے لیے ملاحظہ ہو The Time مورخہ 21 ستمبر 1888ء ۔ مزید اس رپورٹ پر Bombay Gazette مورخہ 24 ستمبر 1888 اور Tribune مورخہ 8 اکتوبر 1888ء کے ادارتی تبصرے بھی ملاحظہ ہوں۔

93 ۔ محسن الملک نے یہ مکتوب اوایل نومبر 1888ء میں تحریر کیا تھا۔

The Pioneer, Feb. 16, 1889 94

95 ۔ محسن الملک کے مکتوب کا جواب دینے کے پانچ روز بعد گلیڈسٹون نے لائم ہاؤس Lime House کے مقام پر تقریر کرتے ہوئے کانگریس کے بارے میں کہا تھا: "ہمیں چاہیے بانیانِ کانگریس کے جذبات کی قدر کریں اور جو دلچسپ کام انھوں نے شروع کر رکھا ہے نہ صرف یہ کہ اس سے اغماض نہ برتیں بلکہ اس امر کا پاس بھی ملحوظ رکھیں کہ ہمارے کسی عمل سے ان کے جذبات مجروح نہ ہونے پائیں"۔ اس تقریر کے پورے متن کے لیے ملاحظہ ہو Indian Mirror بابتہ 19 دسمبر 1888ء اور Bengalee بابتہ 22 دسمبر 1888ء ۔ مزید ملاحظہ ہو معاصر Bengalee مورخہ 29 ستمبر 1888ء کا اداریہ بعنوان MR Gladstone on Indian Affairs مزید ملاحظہ ہو گلیڈسٹون کے ساتھ ڈگبی کا انٹرویو جو معاصر Hindoo Patriot کی 27 مئی 1889ء کی اشاعت میں شایع ہوا۔

96 ۔ کانگریس کی سالانہ رپورٹ بابتہ (1892)

97 ۔ ملکہ کی جوبلی کے سال کے دوران بمبئی کے معاصر Champion نے پھر ایک بار پرزور مطالبہ کیا کہ لندن میں کانگریس کا اجلاس منعقد کیا جانا چاہیے جس کی تائید Bengalee نے بھی کی تھی۔ ملاحظہ ہو Bengalee مورخہ 8 مئی 1897ء۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

98 - The Nineteenth Century' دسمبر 1886ء صفحہ 886 — 901
مزید ملاحظہ ہو 'Tribune' 8 جنوری 1888ء اور 'Hindoo Patriot'
27 دسمبر 1886ء اور 31 جنوری 1887ء کے اداریے۔ انتہا یہ کہ
Statesman نے بھی اس مقالے کی مذمت کرتے ہوئے اسے "گھٹیا اور شرارت آمیز" مقالہ قرار دیا
اور لکھا کہ "ہم سمجھتے ہیں کسی پڑھے لکھے شخص نے اس سے زیادہ گھٹیا مقالہ شاید کبھی تحریر ہی
نہیں کیا ہوگا" (The Statesman (weekly) 25 دسمبر 1886ء)۔

99 - سالانہ کانگریس رپورٹ (1890) 20 - 21

100 - وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کرنل جے۔ سی۔ اروِنگ Col. J. C. Arbuthnot نے
اپنے مکتوب مورخہ 19 جنوری 1891ء کے ذریعے بیوم کو وائسرائے کے ان خیالات
سے واقف کروایا۔ ملاحظہ ہو ہفتہ وار Statesman بابتہ 24 جنوری 1891ء

101 - ملاحظہ ہو Pioneer بابتہ 4 فروری 1891۔ کانگریس کے لیے سرکاری حمایت کا
صحیح اندازہ لگانے کے لیے ملاحظہ ہو۔

The Indian National Congress: Its origin, History, Constitution
and objects. 18 (footnote)

102 - لبرل اور انقلاب پسند Radical ممبران پارلیمان کی جانب سے کانگریس کو جو حمایت
حاصل ہوئی اس کا اندازہ قایم کرنے کے لیے انڈیا پارلیمنٹری پارٹی کے ارکان کی وہ متعدد
فہرستیں ملاحظہ ہو جو ہر سال Indian میں شایع ہوتی رہیں۔

103 - یہ مسلمان زمینداروں کی نفاست پسندی اور رکھ رکھاؤ کے امتیاز کے بارے میں رُڈیارڈ
کپلنگ Rudyard Kipling نے بھی اپنے ایک مضمون میں اشارہ کیا ہے جو
Contemporary Review بابتہ ستمبر 1890ء کے صفحہ 341 پر شایع ہوا۔

104 - سالسبری کے اُن الفاظ کے خلاف ہندستان میں جو ردعمل ہوا اس کی تفصیل کے لیے
ملاحظہ ہو Reynolds' News paper بابتہ 7 دسمبر 1888ء۔ اس ضمن میں برطانوی پریس
کی حاشیہ آرائیوں کے خلاصے اور گلیڈسٹون کی جانب سے کی جانے والی مذمت کی تفصیل
کے لیے ملاحظہ ہو Bombay Gazette مورخہ 8 جنوری 1889ء

105 - رفیع احمد کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو Bombay Gazette

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بابتہ 23 نومبر 1894ء

106 - ملاحظہ ہو Bombay Gazette کے نامہ نگار مقیم لندن کا تحریر کردہ English "Political and Social Letter" جو 10 دسمبر 1894ء کی اشاعت میں شایع ہوا۔ اس نامہ نگار کے بقول محض گورسٹ کے افسوسناک ریمارکس کی وجہ سے اس واقعے نے اینگلو انڈین حلقوں میں اس قدر چہ می گوئیوں کا بازار گرم کر دیا۔ جونیر کانسٹی ٹیوشنل کلب میں کی گئی رفیع الدین احمد کی تقریر کے اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو Bengalee بابتہ 8 اور 22 دسمبر 1894ء

107 - ماخوذ از Moslem chronicle بابتہ 18 اپریل 1895ء - مزید ملاحظہ ہو 12 دسمبر 1894ء کے Bombay Gazette میں شایع شدہ "انصاف پسند" کا مراسلہ بعنوان "Mohammedan Unionist Candidate".

108 - ST James Gazette, Nov 19, 1894

109 - جنوری 1895ء کے Indu میں منقول ہے The Bombay Gazette نے بھی رفیع الدین احمد کی امیدواری کی حمایت نہیں کی۔ ملاحظہ ہو اس اخبار کا 10 دسمبر 1894ء کا شمارہ۔ کانگریسی پریس نے "ٹائمز آف انڈیا کے رویے کو کافی سراہا۔ The Indian Spectator نے اس "مفید مشورے" کو "اینگلو انڈین صحافتی روایات" کے عین مطابق قرار دیا۔ ملاحظہ ہو Indian Spectator بابتہ 25 نومبر 1894ء

110 - ملاحظہ ہو کتاب The Indl Political Estimate of M. Bhownagree "M. P. or the Bhownagree Boom Exposed.

بمبئی سے شایع ہونے والی یہ کتاب 272 صفحات پر مشتمل تھی جس میں تقریباً سارے ہندستانی پریس کا وہ ردِّ عمل شامل تھا جو مسٹر بھاونگری کی اس جرأت کے خلاف ظاہر ہوا تھا جس میں انھوں نے خود کو ہندستانی عوام کے نمایندے کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی تھی اور متمنی تھے کہ ان کی ہندستانی سیاست پر عوام اپنی مہر تصدیق ثبت کر دیں

111 - ان وفود کے ناموں، پیشوں اور اُن مقامات کی تفصیل کے لیے جہاں سے کہ وہ آئے تھے ملاحظہ ہو کانگریس کی سالانہ رپورٹ 1889 کا ضمیمہ نمبر (1)، صفحات 115 - 39

112 - کانگریس کی سالانہ رپورٹ (1891) - V - IV

113 - Ibid (1894), 14

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

114 - Ibid (1895) 15 - دو سال بعد حالات میں مزید ابتری پیدا ہوئی اور Muslim Chronicle کے بموجب "کانگریس کے وجود کو مزید مستحکم اور موثر بنانے کے لیے اس تنظیم کے کرتا دھرتاؤں نے ہر قیمت پر مسلمانوں کو اپنی تنظیم سے وابستہ کرنے کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ملاحظہ ہو (The Moslem Chronicle, Feb 20, 1897)

115 - دراصل راجہ شیو پرساد سے سرسید کی علیحدگی کے فوری بعد Morning post نے اشارہ کیا تھا کہ "سرسید اب تک ہندوؤں کا تعاون حاصل کرتے آئے ہیں لیکن موجودہ اعتماد شکنی کے بعد شاید اب انھیں غیر مسلموں سے تعاون حاصل کرتے ہوئے جھجک محسوس ہونے لگے گی" (اس اقتباس کو Indian Mirror نے اپنی 30 نومبر 1888ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے)

116 - بیک Beck کی تقریر کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ Pioneer بابتہ 14 جنوری 1894ء۔ مزید ملاحظہ ہو 8 دسمبر 1894ء کے Bengalee کا اداریہ جس میں اخبار رقمطراز ہے، "اپنی ناکامیوں سے کوئی سبق نہ حاصل کرتے ہوئے ان لوگوں نے از سر نو اپنے آپ کو ایک جداگانہ بھاری بھرکم نام والی تنظیم کے تحت مجتمع کرنا شروع کر دیا ہے لیکن اپنے اصولوں سے انھوں نے سرمو بھی انحراف نہیں کیا ہے جن کے باعث انہیں ماضی میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا"

117 - اس ایسوسی ایشن کے قواعد اور ضوابط کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ (Appendix B) میاں محمد شفیع کے بقول جنھوں نے مسلم لیگ کی ابتدائی تاریخ میں کافی نمایاں کردار انجام دیا ہے "ہمارے مرحوم رہنما نے ہر قسم کے عوامی اجتماع کے تصور کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا"

ملاحظہ ہو Kayastha Samachar بابتہ نومبر 1901ء صفحہ 572

118 - اس یادداشت پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تیسرا باب۔

119 - ملاحظہ ہو علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شایع شدہ سرسید کا مضمون "اعلیٰ انگریزی تعلیم کے حصول کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے احساسات کیا ہوں گے"۔ اس مضمون کا انگریزی ترجمہ Moslem Chronicle نے اپنی 9 جنوری 1897ء کی اشاعت میں شایع کیا۔

120 - اُن کی زندگی کے مختصر حالات جاننے کے لیے ملاحظہ ہو محمد یحییٰ تنہا کی تصنیف "سیر المصنفین" (اردو) جلد دوم، صفحات 73 - 74

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

121 - ملاحظہ ہو Moslem Chronicle بابتہ 9 جنوری 1897ء

122 - Ibid

123 - کانگریس کی سالانہ رپورٹ 1896ء صفحات 1 — 39

124 - سایانی کی تقریر کے بارے میں "مسلم کرانیکل" نے 30 جنوری، 20 فروری اور 27 مارچ 1897ء کو تین اداریے سپرد قلم کیے۔

125 - Ibid. Feb. 6, 1897

126 - Ibid January 25, 1897

127 - Ibid

128 - Ibid. Feb 20, 1897

129 - ملاحظہ ہو مضمون بعنوان "The Congress and the Mohammedans" مطبوعہ The Moslem Chronicle بابتہ 13 فروری 1897ء

130 - Moslem Chronicle کی 12 جون 1897ء کی اشاعت میں نقل کیا گیا۔

131 - Ibid

132 - Ibid. ملاحظہ ہو مسلم کرانیکل مورخہ 7 اور 21 اگست 1897ء کے اداریے۔

133 - ملاحظہ ہو مضمون بعنوان "The Moslem Unrest" مطبوعہ The Times مورخہ 30 اگست 1897ء۔ مزید ملاحظہ ہو۔ 28 دسمبر 1895ء کا The Times اسی اخبار کے 21 اگست 1897ء کے شمارے میں اسی موضوع پر وہ مضمون بھی ملاحظہ فرمائیے جس میں متنبہ کرتے ہوئے اخبار نے لکھا ہے کہ "ملکہ معظمہ کی حکومت نے حالیہ دنوں میں مشرقی یورپ کے قیام امن کی بات چیت کے دوران جو روّیہ اپنایا ہے اس میں غالباً اُن اثرات کی فعالیت کو ختم کر دینے کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی جن کا کم و بیش راست تعلق ہندستان میں مسلمانوں کی حالیہ بے چینی سے ہے"۔ مزید ملاحظہ ہو غلام الثقلین کا مضمون بعنوان "The Moslem of India and the Armenian Question" مطبوعہ Nineteenth Century، بابتہ جون 1895ء، صفحات 925 — 39

134 - The Moslem Chronicle, Jan. 14, 1893

ایلگن Elgin کو خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ مسلمان اس کے دور میں اُس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کی حکومت سے خوش نہیں رہے۔ ۲۷ نومبر ۱۸۹۷ء کو ایم۔ اے۔ او کالج کی جانب سے پیش کیے گئے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے ایلگن نے کہا تھا: "گذشتہ چند مہینوں سے لے کر تا حال حکومتِ ہند کو بادلِ ناخواستہ بعض ایسے قبایل کے ساتھ کھلی نبرد آزمائی پر مجبور ہونا پڑا ہے جن کا تعلق آپ کی قوم سے ہے جس کی بنا پر ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو یہ کہنے لگے ہیں کہ ہندستان کی برطانوی حکومت اور مسلمان رعایا کے درمیان دشمنی پیدا ہو چکی ہے" ملاحظہ ہو Speeches by the Earl of Elgin صفحہ 370 - مزید ایکبار 31 دسمبر 1898ء کو کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی کے رخصتی خطبے کا جواب دیتے ہوئے وائسرائے نے کہا تھا "یہ میری احسان ناشناسی ہوگی اگر میں ان پرخلوص الفاظ کے لیے آپ کا شکریہ نہ ادا کروں جن سے آپ نے مجھے آج مخاطب کیا ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ کے الفاظ اس کی بالکل ضد ہوں گے۔ آپ نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں سے کم از کم دو موقعوں پر یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی کہ حکومت راست مسلمانوں کے جذبات سے ٹکرانے پر مجبور ہو جاتی" Ibid., 473

13. The Moslem Chronicle, Jan. 14, 1899

137 - اس خطبے اور وائسرائے کے جواب کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ ہو English بابتہ یکم فروری 1899ء

138 - The Moslem Chronicle, Jan 4, 1899

139 - ملاحظہ ہو بیک M.A.O College Magazine جس کی ادارت کے فرایض بیک اور شبلی نے مشترکہ طور پر انجام دیئے تھے۔ (اپریل 1898ء)

140 - ملاحظہ ہو بیک کی وہ تقریر جو انھوں نے لاہور میں 1898ء کی کرسمس کے ہفتے کے دوران منعقد ہونے والی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں کی تھی۔

141 - لارڈ اور لیڈی کرزن سوگواروں میں شامل تھے اور وائسرائے کے رکن قانون Law Member رالے Raleigh اُن لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے بیک کے جنازے پر چادر پکڑ رکھی تھی۔ ملاحظہ ہو The Pioneer بابتہ 6 ستمبر 1899ء۔

142 - ان کی وفات پر ہسلم کرانیکل کا 9 ستمبر 1899ء کا اداریہ ملاحظہ ہو۔ اسی طرح Pioneer کے 10، 13، 15، 16 اور 20 ستمبر کے شماروں میں وہ رپورٹیں بھی ملاحظہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں جو میرٹھ، شملہ، لاہور، شاہجہاں پور اور علیگڈھ کے مسلمانوں کی جانب سے بیک کی وفات پر تعزیتی جلسوں کے انعقاد سے تعلق رکھتی ہیں۔ ڈیرہ غازی خاں، لدھیانہ، دہلی اور بنگلور میں منعقدہ تعزیتی جلسوں کی رپورٹ Moslem Chronicle کے 23 ستمبر 1899ء کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

143. The Pioneer, Nov 29, 1899

144. Ibid

145. Ibid, Nov. 29, 1899

146. ملاحظہ ہو سید علی بلگرامی کی سکندر آباد والی وہ تقریر جو انھوں نے جسٹس راناڈے (Justice Ranade) کے تعزیتی جلسے میں کی تھی جسے معاصر Kayastha Samachar نے مارچ 1901ء کے شمارے میں صفحہ 194 پر شایع کیا۔

147. The Pioneer, Dec. 9, 1900 Bengalee نے خیال ظاہر کیا کہ حالیہ واقعات نے مسلمانوں کو ایک زبردست دھکا دے کر بیدار کر دیا ہے۔ (The Bengalee، 11 دسمبر 1900ء)

148. The Pioneer 25 جنوری 1901ء۔

149. اُس وقت نواب عماد الملک ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے انتہائی سربرآوردہ ٹرسٹیوں میں سے ایک تھے۔

150. The Pioneer, Jan 26, 1901

۔اس موضوع پر مسلم کرانیکل کا 15 دسمبر 1900ء کا اداریہ ملاحظہ فرمائیے۔

152. The Pioneer, Feb. 2, 1901

153. اس موضوع پر مورلینسن نے دو مضامین بعنوان Political Action by Mohammadans سپرد قلم کیے جو Pioneer کی 14 اور 21 ستمبر 1901ء کی اشاعتوں میں شایع ہوئے۔

154. The Pioneer, Sept. 21, 1901

155. Ibid

156. ملاحظہ ہو مسلم کرانیکل کا اداریہ بعنوان "Our Associations" 4 اگست 1900ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی اشاعت میں۔

157 ۔ ملاحظہ ہو یکم اگست 1900ء کے Englishman میں چارلس ڈبلیو میک مین Charles. W Mc Minn ۔ کا مراسلہ اور اے۔ ایف۔ ایم عبدالرحمٰن کی جانب سے اس کا جواب جو 2/ اگست کو اُسی اخبار میں شایع ہوا۔ ساتھ ہی 2/ اگست 1900ء کے Bengalee کا اداریٰ تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

158 ۔ مسلم کرانیکل، 14/ اگست 1900ء نے The Bengalee نے بھی اس سوسائٹی کا یہ کہتے ہوئے مذاق اڑایا کہ "اس ادارے کا کام صرف اتنا ہے کہ اعلیٰ عہدیداروں کی خدمت میں سپاس نامے پیش کرے اور ان کی تعریفیں کرتا رہے"۔ ملاحظہ ہو 9/ اپریل 1899ء کا The Bengalee ۔

159 ۔ یہ بات کہ شفیع کے خیالات نے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک ہلچل سی پیدا کردی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اُس منشور سے بھی واضح ہوتی ہے جو مسلمانوں میں سیاسی تنظیم کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

160 ۔ 14/ اپریل 1901ء کے Pioneer میں اُن کا مراسلہ ملاحظہ ہو۔

161 ۔ ملاحظہ ہو 14/ ستمبر 1901ء کا Pioneer

162 ۔ اس سلسلے میں میاں محمد شفیع (جنھیں بعد میں "سر" کے خطاب سے بھی نوازا گیا) نے پہل کی اور اس خیال کو Panjab Observer میں متعدد مضامین لکھ کر عام کیا۔

163 ۔ ملاحظہ ہو "مسلم لیگ کے قواعد وضوابط" The rules and regulation of Muslim league مزید ملاحظہ ہو مضمون بعنوان Indian Muslman and Indian Politics جو Hindustan Review کے فروری 1909ء کے شمارے میں شایع ہوا۔ صفحات 143 — 5

164 ۔ ملاحظہ ہو اُن کا مراسلہ جو Pioneer کے 16/ اگست 1903ء کے شمارے میں شایع ہوا۔

165 ۔ The Pioneer, July 31, 1903

166 ۔ مجمدار اپنی تصنیف Indian National Evolution کے صفحہ 207 پر قمطراز ہیں "لارڈ کرزن نے عوام کو اپنے ہی خلاف منقسم کرکے اس نئے ولولے کو مکمل طور پر کچل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈالنے کا تہیہ کر لیا اور مشرقی بنگال کی جانب روانہ ہو گئے جہاں خاص طور پر اس مقصد کے لیے منعقد کیے گئے مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے بتلایا کہ بنگال کی تقسیم کا مقصد نہ صرف بنگالی انتظامیہ کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے بلکہ انتظامیہ کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے بلکہ اس کا مقصد ایک ایسا مسلم صوبہ تخلیق کرنا بھی ہے جہاں اسلام کو غلبہ حاصل ہو۔ اور اس کے پیروؤں کو بالادستی حاصل ہو سکے۔" مزید ملاحظہ ہو نیومن سن (Newmson) کی کتاب The New spirit in India صفحہ 11 اور 168 اسی طرح ملاحظہ ہو بنرجی کی کتاب A Nation in Making صفحات 185، 188 اور 191۔

167۔ The Moslem Chronicle, Nov 11, 1905

168۔ Ibid

169۔ کانگریس کی سالانہ رپورٹ 76 — 77

170۔ The Pioneer, Oct - 18, 1905

171۔ ملاحظہ ہو مضمون بعنوان The unrest in Bengal مطبوعہ The Times لندن مورخہ 3 اکتوبر 1905ء

172۔ The Pioneer, Aug 8, 1906

173۔ سالانہ کانگریس رپورٹ 1895 کے صفحہ 15 پر سریندر ناتھ بنرجی کا صدارتی خطبہ ملاحظہ ہو۔

174۔ Ibid (1903) App. (I)

175۔ Ibid (1904) App. (A)

176۔ Ibid (1905) App. (A)

177۔ مسلم کرانیکل نے اس حقیقت کا اعتراف اپنے 15 دسمبر 1900 کے اداریہ میں کیا ہے

178۔ ملاحظہ ہو Bengalee بابتہ 16 دسمبر 1900ء

179۔ بعد ازاں ان تینوں نے ہندستانی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وزیر حسن اور ایم۔اے جناح آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بنے۔

180۔ اس مسئلے کو مسلمانوں کے نقطہ نظر سے سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو امیر علی کا مضمون بعنوان "An Indian Retrospect" مطبوعہ Nineteenth Century کے اکتو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

618 — 20 ۱۹۰۵ء کے شمارہ میں شایع ہوا۔ صفحات

181 ۔ کانگریس کی سالانہ رپورٹ 1905ء۔ صفحات 7 — 76

182 ۔ Ibid . 120

183 ۔ ملاحظہ ہو امیر علی کا مضمون بعنوان "India and the new Parliament" مطبوعہ Nineteenth Century بابتہ اگست 1906ء صفحات (257 — 58)

184 ۔ Lord Minto کی تحریر کردہ سوانح 243

185 ۔ Ibid . 223

186 ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے منشور کے مطابق "وائسرائے سے شرف ملاقات حاصل کرنے سے پہلے کئی ہفتوں تک اُن کی خانگی دوڑ دھوپ جاری رہی۔ ہندستان بھر کے سربرآوردہ مسلمانوں کے علاوہ تمام مسلم جماعتوں اور انجمنوں سے مشورہ کیا گیا۔ پشاور سے مدراس تک مسلمانوں کے تمام اہم مراکز پر یادداشت کا مسودہ پیش کیا گیا جس پر کافی بحث وتمحیص کی گئی اور اسے آخری شکل دینے کے لیے اس پر کافی خط وکتابت اور غور وخوض کیا گیا۔ انتظامات کو قطعیت دینے سے ایک یا دو ہفتے قبل لکھنؤ میں سربرآوردہ مسلمانوں کی ایک میٹنگ طلب کی گئی۔"

ملاحظہ ہو "Rules and regulations of the All India Muslim League" (1907)

187 ۔ The Bengalee, Sep 13, 1906

188 ۔ یادداشت کے مکمل متن اور وائسرائے کے جواب کے لیے ملاحظہ ہو Appendix E

189 ۔ The Muslim Patriot 5 اکتوبر 1906ء مزید ملاحظہ ہو اسی اخبار کا اداریہ مورخہ 30 ستمبر 1906ء۔ اس وفد کے بارے میں کانگریس کے ردِعمل کے لیے ملاحظہ ہو اخبار Bengalee کے 3، 4، 5 اور 6 اکتوبر 1906ء کے اداریے تشذرات۔

190 ۔ لیڈی منٹو کی کتاب India, Minto, and Morley 47 - 48

191 ۔ The Times, Oct. 2, 1906

192 ۔ مصنفہ لیڈی منٹو صفحہ 48 India Minto and Morley

193 ۔ وفد کی ملاقات کے پانچ روز بعد The Times کے ہندستانی نامہ نگار نے رپورٹ بھجوائی کہ "یہاں آنے والے مسلمان وفود نے غیر رسمی طور پر ایک ایسی تنظیم کے قیام پر تبادلۂ خیال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا جو ہندستان بھر میں ان کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ پہلے مرحلے میں تو یہ طے کیا گیا کہ مختلف صوبوں میں صوبجاتی سطح پر تنظیمیں قایم کی جائیں جو اپنے نمایندے مرکزی تنظیم کے پاس بھجوائیں"۔ (The Times, October 6, 1906)

اسی قسم کی ایک رپورٹ English کے 6 اکتوبر 1906ء کے شمارے میں بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں اس اخبار کے نامہ نگار نے رپورٹ بھجوائی کہ "جن مسلمانوں نے وائسرائے سے ملاقات کی تھی اب انھوں نے طے کر لیا ہے کہ مزید کسی قسم کی تاخیر کو روا نہ رکھا جائے"۔

194۔ مسلم لیگ نے اپنے قیام کے بعد جو صورت اختیار کر لی اُس کے بنانے میں ڈھاکے کے نواب صاحب کی اس اسکیم نے کلیدی رول ادا کیا۔ ملاحظہ ہو ضمیمے میں اس اسکیم کا خلاصہ اس مجوزہ (All India Mohammedan Confederacy) کے بارے میں اخبار Indian Spectator کے 22 دسمبر 1906ء اور اخبار Bengalee کے 14 دسمبر 1906ء کے اداریے شذرات بھی ملاحظہ فرمائیے۔

195 The Times, Jan. 2, 1907 مزید ملاحظہ ہو The Pioneer, Jan 2, 1907

196۔ اس تمام کارروائی میں نواب صاحب نے جو کردار انجام دیا اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو وہ انٹرویو جو مولوی رفیع الدین احمد نے لیگ کے قیام کے سلسلے میں Englishman کو دیا اور جو اُس اخبار کے 4 جنوری 1907ء کے شمارے میں شایع ہوا۔ معاصر Bengalee نے لیگ کو "نواب سمیع اللہ کا نیا خبط" قرار دیا (ملاحظہ ہو The Bengalee مورخہ 10 جنوری 1907ء)

197۔ The Pioneer Jan. 2, 1907۔ اس کے فوری بعد نواب صاحب نے ایک مرکزی سیاسی تنظیم کے قیام سے متعلق تجاویز مسلم اکابرین میں گشت کروائیں اور واضح کیا کہ کس طرح بعض غیر ذمہ دار افراد اور چھوٹی موٹی غیر اہم انجمنوں نے حکومت اور عوام کے روبرو غلط سلط باتیں رکھ کر مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچایا ہے کیوں کہ عوام اور حکومت کے پاس ایسا کوئی معیار ہی نہیں تھا جس کی بنیاد پر وہ پرکھ سکتے کہ اس قسم کی باتیں کسی حد تک مسلمانوں کی فکر کے غالب رجحان سے مطابقت رکھتی ہیں (The Times Jan. 8, 1906) مزید ملاحظہ ہو نواب صاحب کی منٹو گنج والی تقریر کی رپورٹ۔ جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

19 جنوری 1907ء کے The Times میں شایع ہوئی۔

199۔ بعد ازاں حکیم اجمل خاں لیگ سے علیحدہ ہو کر کانگریس میں شامل ہو گئے اور اس تنظیم کے صدر بھی منتخب کیے گئے۔

200۔ ملاحظہ ہو 9 جنوری 1907ء کا Bengalee۔ انڈین مسلمان اسوسی ایشن کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار نے لکھا کہ "یہ نئی تنظیم جلد ہی مسلمان قوم کی فلاح و بہبود اور ترقی کے کاموں کا اہتمام کروانے کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دینے لگے گی اور جلد ہی مقبولیت حاصل کر کے مسلمانوں میں ترقی پسند تحریکات کی ابتدا کا باعث بنے گی۔

201۔ Ibid

202۔ The Statesman (Weekly) بابتہ 24 جنوری 1907ء۔ لیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے Bengalee نے لکھا: "یہ بات بڑی خاص ہے کہ لیگ کو اور اس کی شاخوں کو ایسے افراد نے قایم کیا ہے جو یا تو حکومت کے وظیفہ خوار ہیں یا سابقہ عہدیدار ہیں یا وہ لوگ ہیں جو اپنے خاندانی یا معاشی مسایل کے سلسلے میں حکومت کی امداد حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔" The Bengalee, Jan. 18, 1907

203۔ Englishman تاہم اخبار The Times. Jan. 2, 1907 نے Statesman کو یقین دلایا کہ "تاوقتیکہ لیگ خود پر کانگریس کو غالب آجانے دے یہ نئی تنظیم ایک ایسی چیز ہے جس کا نہ صرف یہ کہ تہ دل سے استقبال کیا جانا چاہیے بلکہ اسے پروان بھی چڑھایا جانا چاہیے کیونکہ اپنے جوہر کے اعتبار سے یہ کوئی جھنونانہ تنظیم نہیں بلکہ بلکہ عاقلانہ تخلیق ہے۔ جھاگدار نہیں ٹھوس شئے ہے، مہمل نہیں معقول ہے مصنوعی نہیں نمایندہ تحریک ہے۔" (The Englishman, Jan 5, 1907)

204۔ The Morning Post, Jan 19, 1907

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا باب

دستوری ارتقا

لارڈ رپن Lord Ripon کے ہندستان میں گورنر جنرل بننے سے پہلے یہاں کی حکومتی مشنری میں عوامی نمائندگی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ برطانوی راج عملاً گورے انگریزوں کی ایک محفوظ شکارگاہ Close Preserve بنا ہوا تھا۔ نہ صرف مرکزی بلکہ صوبائی اور ضلعی انتظامیہ بھی خالصتاً برطانوی اور اینگلو انڈین دفتر شاہی Bureaucracy کے زیر تصرف تھا۔ جو دور دراز کے دیہاتوں تک اپنی مضبوط گرفت برقرار رکھتی تھی۔ رپن کے فوری پیش رو لارڈ لیٹن Lord Lytton نے اپنے سرداروں اور دوستوں کے نام موسومہ اپنے دلکش خطوط میں دفتریت کے ان اعلیٰ اور طاقت ور اقدامات کا دلچسپ احوال ہمارے مطالعے کے لیے پیچھے چھوڑا ہے جو "دیسی باشندوں" کے ساتھ اختیار کیے جاتے تھے۔

ان دنوں کہیں کہیں خال خال بلدیاتی ادارے پائے جاتے تھے۔ اگرچہ 1687ء ہی میں کورٹ آف ڈائریکٹرس Court of Directors نے اپنے حکم Order کے ذریعے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ شہر مدراس کے لیے یوروپین اور ہندستانی ممبروں پر مشتمل ایک کارپوریشن بنائی جائے۔ اس کے بعد 1773ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ Regulating Act منظور کیا گیا جس کے ذریعے جسٹس آف پیس Justices of Peace کے تقرر کا طریقہ رائج کیا گیا، جس کے تقریباً ایک صدی بعد 1856ء میں پریسیڈنسی شہروں Presidency Towns میں میونسپل کمشنروں کا تقرر کیا جانے لگا۔ اس کے پانچ سال بعد مقامی حالات کے پیشِ نظر کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی میونسپلٹیوں کی تشکیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدید کی گئی۔

لیکن یہ تمام اقدامات صرف پریسیڈنسی شہروں کی حد تک ہی محدود تھے۔ ان کے علاوہ بلدیاتی سرگرمی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی اور 1850ء کا میونسپل قانون Municipal Act ایک بے جان کاغذی پرزہ بنا ہوا تھا۔ بعد ازاں 1871ء اور 1874ء کی درمیانی مدت میں بعض صوبائی میونسپل اداروں کے قوانین منظور کیے گئے جنہیں لارڈ مایو (Lord Mayo) کی شروع کردہ مالیاتی لامرکزیت (Financial decentralisation) کی اسکیم کی وجہ سے مزید تقویت حاصل ہوئی۔ ان تمام اقدامات کا مقصد مقامی حکومت خود اختیاری (Local Self Government) کو تقویت پہنچانا تھا۔

لیکن عملاً مقامی حکومتِ خود اختیاری کو زیادہ اُبھرنے کا موقع نہیں ملا جو عملی اقدامات اس ضمن میں اختیار کیے گئے، ان کی وجہ سے ممبروں کو بہت کم اختیارات اور ذمہ داریاں حاصل ہوئیں، کیوں کہ تمام ہی ممبر تقریباً سرکاری عہدیداروں کے منتخب کردہ ہوا کرتے تھے۔ لارڈ ہوبارٹ Lord Hobart نے اس تمام کاروبار کو بڑے ہی مناسب ڈھنگ سے پیش کرتے ہوئے اسے ایک ایسی چند سری حکومت (Oligarchy) قرار دیا جس کا انحصار خود ایک ایسی اعلیٰ قوت پر موقوف ہو جو راست یا بلاواسطہ طور پر اس کے افعال کو کسی بھی قابلِ تصور حد تک اپنے کنٹرول اور اختیار میں رکھ سکتی ہو۔" موصوف نے عوامی معاملات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اس امر کو لازمی قرار دیا کہ :" عوامی انتخابات کے ذریعے بلدیاتی اداروں کے ارکان کو منتخب کیا جانا چاہیے۔" لیکن ہز لارڈ شپ کی آواز صدائے صحرا ثابت ہوئی کیوں کہ کئی اعلیٰ عہدیداروں نے ان خیالات کی سختی سے مخالفت کی اور حکومت کو متنبہ کیا کہ اس حالتِ طفلگی میں بلدیاتی اداروں کو اُس وقت تک عوامی تحویل میں دینے کی غیر یقینی صورتِ حال کا خطرہ مول نہ لیا جائے جب تک کہ عوام ان اداروں کی کارکردگی کو اُس معیار پر چلانے کی صلاحیت نہ پیدا کرلیں جو اُن کا حق ہے۔"

یہ پس منظر تھا رپن کی 18 مئی 1882ء کی اُس تاریخی قرارداد کا جو ہندستان کے دستوری ارتقا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قرارداد کے کئی پہلو ہیں۔ اس کا دائرۂ کار محض عوامی نمائندگی ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ مالیہ (Finance) محصولات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم، صفائی، صحتِ عامہ اور قرضوں کی فراہمی وغیرہ جیسے مسائل کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ ہم اپنے اس مطالعے کو اس کے صرف ایک ہی پہلو یعنی اصولِ انتخابات کی حد تک محدود رکھیں گے، جس کی اہمیت کو خود قرار داد میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

"یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس اقدام کا نفاذ محض انتظامیہ میں بہتری پیدا کرنے کی غرض سے عمل میں لایا جا رہا ہے بلکہ اس کی بنیادی غرض و غایت یہ ہے کہ یہ سیاسی اور عوامی تعلیم کا ذریعہ بن سکے۔" ایسے قوانین نافذ کیے گئے جن کے ذریعہ مختلف صوبوں میں دیہی اور شہری علاقے کے لوکل بورڈوں میں انتخابات کا انعقاد لازمی قرار دیا گیا۔ گورنر جنرل نے یہ شرط لازمی قرار دے دی کہ "کسی بھی صورت میں نامزد کردہ سرکاری ارکان کی تعداد جملہ تعداد کی ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوگی۔" چیرمین یا صدر کو بھی منتخب کیا جائے گا اور منتخب دیسی ارکان کو "رائے بہادر" یا "راؤ بہادر" یا "خان بہادر" کے اعزازی القاب سے اس وقت تک یاد کیا جاتا رہے گا جب تک کہ ان کی رکنیت برقرار ہے۔

انتخابات کس صورت سے منعقد کروائے جائیں اس کا فیصلہ خالصتاً مقامی حکومتوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کیوں کہ قرار داد میں کہا گیا تھا کہ "تجربہ ابھی یہ نہیں بتلاتا کہ مختلف صوبوں میں انتخابات کا کون سا طریقہ سب سے زیادہ موثر قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ حسبِ سہولت مختلف صوبوں میں مختلف طریقے اپنائے جائیں تاکہ بعد میں سب کا تقابلی جائزہ لیا جا سکے۔" انتخابات کے لیے مختلف طریقے تجویز کیے گئے۔ سادہ ووٹ Simple Vote حقِ تعداد آرا Cumulative Vote شہر کے مختلف وارڈوں میں انتخابات Election by wards تمام شہر میں ایک ساتھ انتخاب Election by the whole town by tract) کسی نہ کسی کم و بیش معیارِ قابلیت کی بنیاد پر انتخابات (Castes) ذاتوں suffrage on more or less extended qualifications اور پیشوں Occupations کی بنیاد پر انتخاب۔ اس بات کی بھی سفارش کی گئی کہ "ایسے بھی انتخابی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں جن کا آج تک یورپ میں تصور تک نہ کیا جا سکا ہو۔" تاکہ مناسب وقت گزرنے پر یہ طے کرنا ممکن ہو سکے گا کہ مختلف جگہوں کے مقامی حالات اور وہاں کے باشندوں کے خاص طور طریقوں اور پسند یا ناپسند کے مطابق انتخابات کا کون سا طریقہ سب سے زیادہ موزوں قرار پاتا ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن مقامی حکومتوں کو ان اختیارات کے دیئے جانے کے باوجود اس بات پر زور دیا گیا کہ "سرکاری کنٹرول کو خارجی طور پر بروئے کار لایا جائے نہ کہ داخلی طور پر۔ متعلقہ حکومت کو چاہیے کہ وہ صرف مقامی اداروں سے متعلق قوانین پر نظر ثانی کرے اور اس کی جانچ پڑتال کرتی رہے لیکن اُسے قوانین مسلط کرنے کا اختیار بالکل نہیں ہے قرارداد میں جیسا کہ کہا گیا ہے۔ "غیر سرکاری ارکان کو اس بات کا یقین دلایا جائے کہ حقیقی اقتدار اُنہی کے ہاتھوں سونپ دیا گیا ہے اور اب اُنہی کو تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے۔"

رپن کے اس منصوبے کو قدرتی طور پر تعلیم یافتہ حلقوں میں کافی پسند کیا گیا اور اسے نمائندہ حکومت کی جانب پہلا قدم قرار دیا گیا۔ اس کی تعریف کرنے والے امرت بازار پتریکا نے لکھا:۔ "ہندستان میں برطانوی عمل داری کے قیام کے بعد سے یہ پہلا اقدام ہے جس کے ذریعے عوام کے دلوں سے غلامی کے احساس کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"[10] لیکن اس قرارداد پر اینگلو انڈین لوگوں نے کسی قدر تلخ ردِ عمل کا اظہار کیا۔ اُنہوں نے خاص طور پر اس بات پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا کہ رپن بعض ایسے لوگوں کی بے جا ناز برداری کرنے لگے ہیں جنہیں وہ "عوامی جذبہ رکھنے والے ذہین افراد" قرار دیتے ہیں۔"

Friend of India جیسے ہمدردی رکھنے والے اخبار نے بھی اس قرارداد کو "فاتحانہ کامیابی" قرار دے کر اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہز لارڈ شپ کو متنبہ کیا کہ "لوگوں کو دوڑنا شروع کرنے سے پہلے پیروں کے بل چلنا سیکھنا چاہیے۔"[12]

بعض بااثر مالدار ہندوؤں میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو اس صورتِ حال سے خوش نہیں تھے۔ انہوں نے کھلے بندوں گورنر جنرل پر یہ الزام عاید کیا کہ وہ "مقامی زمینداروں مہاجنوں، مختاروں اور نو دولتیوں (nouveau riches) کے ہاتھوں میں ظلم و زیادتی کا ایک نیا ہتھیار دے رہے ہیں اور چھوٹے موٹے جابروں کو مزید طاقت ور بنا رہے ہیں تاکہ وہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچائیں اور حاجت مندوں کا استحصال کر کے اپنی تجوریاں بھرتے رہیں۔"[13]

ایک اہم رسالے نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کس طرح نمائندہ ادارے ہندستان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے موجودہ روایات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ حسبِ ذیل قصہ اپنے صفحات میں شائع کیا۔[14]

ایک روز ایک برہمن صبح کے وقت کلکتہ سے اُلوبار یا (Uluberia)[15] جارہا تھا۔ وہ ندی کے کنارے غسل کی نیت سے ٹھہر گیا۔ جوں ہی وہ صبح کی عبادات سے فارغ ہوا اس نے دریا کے پاس پڑی ہوئی مٹی سے شیوجی کی مورتی بنانا شروع کردی۔ غسل کے گھاٹ کی طرف جاتی ہوئی ایک نوجوان لڑکی نے اس برہمن کو مورتی بناتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب وہ غسل سے فارغ ہوکر اپنے گھر واپس لوٹنے لگی تو اُس نے دیکھا کہ وہ برہمن اب بھی مورتی بنانے میں مشغول ہے۔ اس نے برہمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔ مہاراج! سورج سر پر آچکا ہے۔ آپ نے صبح کا پورا سہانا وقت شیوجی کی مورتی بنانے میں صرف کرڈالا۔ اب آپ ان کی پوجا کب کریں گے؟ اور آپ اپنی پیاز Piyaj کب ختم کریں گے؟ برہمن نے جواب دیا:۔" بیٹی! اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں تو اتنی دیر سے یہی کوشش کررہا ہوں کہ شیوجی کی مورتی تیار ہوجائے لیکن کیا کروں اُلوبار کی مٹی ہی کچھ ایسی ہے کہ ہر بار شیوجی کی جگہ بندر کی مورتی بن جاتی ہے۔"[16]

لیکن ہر جانب سے اس قرارداد کی مکمل مخالفت نہیں کی گئی۔ بعض ناقدین ایسے بھی تھے جنہیں اس بات پر تو کوئی اعتراض نہیں تھا کہ یہاں نمائندگانہ طرزِ حکومت کو رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ البتہ اُنہیں انتخابات کے برطانوی طریقوں کو اپنانے پر اعتراض تھا۔ اس قسم کے ناقدین میں سرفہرست اے۔ پی۔ ویب A. P. Webb نامی ایک شخص تھا جس کے مضامین پابندی کے ساتھ اینگلو انڈین اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ رپن کی اسکیم نافذ ہوتے ہی اس شخص نے میرٹھ سے ایک کتابچہ بعنوان لوکل سلف گورنمنٹ Local Self Government شائع کیا جس میں چند مشورے دیئے گئے تاکہ اس اسکیم کو ہندستان کے مخصوص حالات کے مطابق بنایا جاسکے۔ اس کا بنیادی مقصد برطانوی عہدے داروں کو یہ یاد دلانا تھا کہ "ہندستان میں کسی بھی قسم کی حکومتِ خود اختیاری کے تصور کو نافذ کرتے وقت یہاں پائے جانے والے مذہبی اور قومی امتیازات کو ملحوظِ خاطر رکھنا ازبس ضروری ہے۔" بقول اس کے "کامیابی کا راز اسی نکتے میں پوشیدہ ہے۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ویب نے جو وجوہات بیان کیں وہ مشہور اور عام قسم کی نہیں لیکن اُن کا تجزیہ ضرور دعوتِ فکر دیتا تھا۔ مثلاً ایک مقام پر یہ بتلاتے ہوئے کہ کس طرح ہندستان کے مسلمان خاص طور پر دیہی علاقوں میں آج بھی اس خیال میں مگن ہیں کہ وہ ماضی میں اس ملک کے فاتح رہے ہیں۔ اس نے لکھا:۔

"ہندستان کے کئی حصوں میں جہاں مسلمانوں کو موثر غلبہ حاصل رہا تھا، آج بھی پولیس در تحصیل کے ماتحت عہدیدار زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ وہاں مسلمان غیر معمولی مقامی ساکھ کے ساتھ بلا خوفِ سزا نہایت اعتماد کے ساتھ اپنے کاروبار انجام دیتا ہے۔" لیکن آج کا ہندو چونکہ کبھی مسلمانوں کے زیرِ تسلط نہیں رہا ہے اس لیے مقامی حکومتِ خود اختیاری کا تصور اُسے اس بات پر آمادہ کرے گا کہ وہ آزادی کے ساتھ نئے حاصل شدہ اختیارات کو استعمال کر ڈالے جس کی وجہ سے اس کے قدیم اور مستقل قسم کے غنیم کے جذبات و احساسات پر ضرب بھی پڑے گی اور وہ اس عمل سے سخت برہم بھی ہوگا۔ جہاں جہاں ممکن ہوگا وہاں وہاں مسلمان دراز دستی سے کام لیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امن و قانون کی سلامتی کے لیے ہر جگہ یہ "ناگریز خطرہ" موجود رہے گا۔ لہٰذا ویب نے مشورہ دیا کہ "عام انتخاب" اور "نامزدگی" کے طریقوں کو یکسر ترک کر دیا جائے اور اس کی بجائے "ہندوؤں کی ہر ذات Caste اور مسلمانوں کے ہر طبقے Section کے لیے نمائندوں کی ایک تعداد مختص کر دی جائے جسے وہ لوگ خود منتخب کریں۔ اس طرح طریق انتخاب کو ذات اور طبقے کی حدود میں مکمل طور پر کھلا چھوڑا جانا چاہیے۔ ہندو اپنے آپ کو ذاتوں کی بنا پر منقسم کر لیں گے جبکہ مسلمان "اجتماعی" طور پر اپنے نمائندے منتخب کریں گے۔

یوں لگتا ہے جیسے اسی قسم کے خیالات کی تشہیر معاصر Pioneer نے بھی کی تھی۔ 18 مئی 1882ء کی قرارداد پر اپنے پہلے ہی اداریے میں اس اخبار نے نشاندہی کی تھی کہ کس طرح یورپ کے مختلف طریقہ ہائے انتخاب ہندستان میں پائے جانے والے حالاتِ زندگی سے قطعی مناسبت نہیں رکھتے۔" اس لیے دوسرے طریقے اپنائے جانے چاہئیں۔ بعض غیر معمولی قسم کے مشورے بھی اس ضمن میں پیش کیے گئے جس کا تجزیہ کرتے ہوئے مذکورہ جرنل لکھتا ہے کہ "ذات یا پیشے کی بنیاد پر انتخابات کا کروایا جانا اہلِ یورپ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے ناقابلِ تصور سہی لیکن یہاں کے حالات میں ایک اطمینان بخش طریقہ ہے۔"
ساتھ ہی ساتھ اس بات کا انتباہ بھی دیا گیا کہ "اگر موجودہ اسکیم کے نفاذ کے سلسلے میں خالصتاً یوروپین طریقے اپنا کر مختلف حلقہ ہائے انتخاب کی بنا پر الیکشن منعقد کئے گئے یا مخصوص معیارِ قابلیت کی بنا پر جس طرح وطن میں انتخابات ہوتے ہیں یا اسی قسم کے اور طریقے یہاں استعمال کرنے کی کوشش کی گئی تو موجودہ اسکیم کی کامیابی کے لیے سخت مضر ثابت ہوں گے۔ بہتر ہوگا کہ ان طریقوں کو آزمانے کے خیال کو شروع ہی میں ترک کر دیا جائے۔"[20]

لیکن اس قسم کی تجاویز اور انتباہوں کا حکومت پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور وہ مختلف صوبوں میں اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف رہی۔[21] مسلمان رہنماؤں نے بھی اس جانب کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ممکن ہے یہ صورتِ حال اس وجہ سے ہو کہ عملاً طریقِ انتخاب پر اتنا زور نہیں دیا جا رہا تھا جتنا کہ لوکل بورڈوں اور بلدیاتی اداروں کے اختیارات اور عاملہ کے عہدیداروں کے ساتھ ان کے تعلقات پر الیکشن بازی کو معرضِ بحث میں لانا بھی اس لیے قبل از وقت تھا کہ جب مختلف نشستوں کے لیے مناسب اُمیدوار ہی دستیاب نہ ہوتے تھے تو ان میں "مقابلہ آرائی" کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا؟[22]

تاہم جوں جوں ماہ و سال گزرتے رہے توں توں مسلمان رہنماؤں نے رپن کی اصلاحات پر اپنی ناراضی کا اظہار کرنا شروع کر دیا کیوں کہ اب وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ محض ہندوؤں کی عددی اکثریت کی وجہ سے مسلمان ان کے دستِ نگر بن جائیں گے۔ اگرچہ اس خطرے کا مکمل احساس ابھی تک مسلمانوں کو نہیں ہوا تھا تاہم دھندلا سا خوف انہیں ہمیشہ بے چین رکھنے لگا تھا۔ اسی وجہ سے سرسید نے "نامزدگی" کے اُصول کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور اسے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے حکومتِ ہند کی قرار داد کا سب سے اہم حصہ قرار دیا۔

درحقیقت مسئلہ کے اس پہلو پر سرسید نے گورنر جنرل آف انڈیا کی کونسل میں طویل بحث کی اور واضح کیا کہ مجوزہ بل کی اس شق کو جس میں حکومت کو لوکل بورڈوں اور ضلعی کونسلوں کے ایک تہائی ارکان کو نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا ہے ان کی غیر مشروط حمایت حاصل ہے۔ انہوں نے کہا: "بل کی اس شق کے بارے میں میں اپنے غیر مشروط

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اطمینان کا اظہار کرتا ہوں اور آج چونکہ پہلی بار مقامی حکومت خود اختیاری کا مسئلہ مجلس قانون ساز کے سامنے زیر بحث آیا ہے اس لیے میں اپنے اس ایقان کو دہرائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ابھی ابھی میں نے جس شق کا حوالہ دیا ہے وہ حکومت کی اس پالیسی کی جانب نشاندہی کرتی ہے جو وہ دیگر صوبہ جات کے لیے قانون سازی کرتے وقت بھی اپنانا چاہتی ہے۔ یقیناً یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا راست تعلق مقامی حکومت خود اختیاری کے منصوبے کی اساس سے وابستہ ہے۔"

سرسید نے یہ موقف جن وجوہات کی بنا پر اختیار کیا وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ہندستان جیسے ملک میں جہاں ذات پات کی تفریق ہر طرف عام ہو، جہاں مختلف نسلیں اب تک ایک دوسرے میں مدغم نہ ہو پائی ہوں۔ جہاں ہر جانب مذہبی امتیازات کی جارحیت کا دور دورہ ہو، جہاں تعلیم جدید اپنے مفہوم میں آبادی کے مختلف گروہوں میں مساوی یا متناسب طور پر نہ پہنچ پائی ہو، وہاں اصولِ انتخاب کو اپنی خالص اور سادہ شکل میں نافذ کرنا کوئی ایسا اقدام قرار نہیں دیا جا سکتا جو خالصتاً معاشی وجوہات کی بنا پر عمل میں لایا جا رہا ہو بلکہ ایسا کرنا گویا سنگین نوعیت کے خطرات اور برائیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔" سرسید نے واضح کیا کہ کس طرح یہ خطرات در پیش آسکتے ہیں:۔ "بڑی یا اکثریتی قوم بہ آسانی چھوٹی یا اقلیتی قوم کے مفادات کو غصب کر لے گی اور جاہل عوام حکومت پر الزام تراشی کرنے لگیں گے کہ اس نے ایسے طریقے اپنائے جن کی بنا پر نسلی اور مذہبی منافرتیں اور زیادہ شدید ہو گئیں۔"[24] اسی لیے سرسید کے خیال کے بموجب حکومت کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ لوکل بورڈوں اور ضلعی کونسلوں کے نمایندوں کی خاصی بڑی تعداد کو نامزد کرنے کے اختیارات کو اپنے پاس محفوظ رکھے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہندستانی آبادی کے مختلف گروہوں کی نمایندگی میں واجبی اور منصفانہ توازن قائم رکھا جا سکتا ہے جس کا حصول خالص اور سادہ الیکشن کے ذریعے ناممکن الحصول ہے۔"[25]

عملاً دیکھا گیا کہ رپن کی اصلاحات اُتنے دُور رس نتائج کی حامل ثابت نہیں ہوئیں جتنی کہ ابتداً اُن سے توقع وابستہ کی گئی تھی۔ عملی نفاذ کے وقت مختلف صوبائی حکومتوں نے اُن اصلاحات کو بڑی حد تک ہلکا پھلکا بنا دیا تھا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایک قوم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے دوسری قوم پر غالب آجانے یا غیر سرکاری اکثریت کا عاملہ کے صدر پر چھا جانے کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ عوام نے بھی انتخابات کے معاملے میں نیم گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ ابتدائی برسوں میں گورنر جنرل کی خاص ہدایات کے مطابق عہدے داروں نے عوام میں جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن رائے دہندگان کی محض ایک قلیل تعداد ہی نے حق رائے دہی کا استعمال کیا۔[۵] کئی نمائندے بلا مقابلہ منتخب کر لئے جاتے تھے اور ان نشستوں پر جہاں مقابلہ ہوتا تھا اس کی کامیابی کا سہرا بھی ضلع یا تعلقہ کے متعلقہ عہدے دار کی ذاتی دلچسپیوں کے سر بندھتا تھا نہ کہ رائے دہندگان کی دلچسپیوں کے۔[۶] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں درست ہی لکھا ہے: "انیسویں صدی کے آخر میں عام تاثر یہی تھا کہ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ رپن کی حکومتِ خود اختیاری کی پالیسی کامیاب رہی ہے۔"[۷]

چوں کہ یہ انتخابات عام طور پر غیر موثر اور بے رنگ قسم کے ہوا کرتے تھے اس لیے مختلف قوموں کے مفادات میں تصادم کا کوئی موقع ہی نہیں پیدا ہوا۔ صرف صدر (چیرمین) کے انتخاب کے وقت جس کا ان اصلاحات کی رو سے غیر سرکاری ہونا لازمی تھا۔ تھوڑی بہت فرقہ وارانہ تلخی پیدا ہو جایا کرتی تھی اور وہ بھی تمام صورتوں میں پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس معاملے پر لوشین وولف Lucien Wolf نے اپنی کتاب Life of Lord Ripon میں بڑی دلچسپ روشنی ڈالی ہے جس میں اس نے ہارولڈ کاکس Harold Cox کی حسبِ ذیل سرگزشت کو اپنی اظہارِ پسندیدگی کے ساتھ درج کیا ہے:

> 1886ء یا 1887ء میں پنجاب میں ریل کے سفر کے دوران میں نے اس معاملے پر ایک قابلِ احترام بزرگ سکھ سے تبادلہ خیال کیا۔ آہستگی سے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا: "میں تو یہ نہیں جانتا کہ اس بارے میں خود کیا رائے قایم کروں تاہم میرا ایک دوست جو سیاسی معاملات کی خاصی بصیرت رکھتا ہے اس خیال کا حامل ہے کہ لارڈ رپن کی حکومتِ خود اختیاری ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف پہلے سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ متنفر کیا جا سکے۔" اُس نے واضح کرنا شروع کر دیا کہ جب تک بہ لحاظ عہدہ کوئی انگریزی عہدے دار صدارت کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ اس وقت تک وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں توازن قائم رکھنے میں کامیاب رہتا تھا لیکن اب تو وہ صدر کے انتخاب کے معاملے میں جس کی غیر جانبداری خود مشکوک ہو چکی ہے، کتے بلیوں کی طرح لڑنے لگے ہیں

اس سکہ بزرگ کے خیالات کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ ان کے ذریعے اس مخصوص رجحان کا پتہ چلتا ہے جو ہندستان کی سیاست میں ہمارے عہد سے کچھ ہی پہلے بڑے زور و شور سے رواج پا چکا تھا۔ ہندستان کی دس سالہ اخلاقی اور مادی ترقی کی رپورٹ Decennial Report on the Moral and Material Progress of India کے مطابق 1891-92ء میں ختم ہونے والے دس برس کے عرصے میں عملاً تمام ہی ضلع بورڈوں نے وہاں کے کلکٹر کو صدر کے طور پر منتخب کیا اور کم و بیش یہی حال میونسپلٹیوں کا بھی رہا۔[30]

لہٰذا بنگال کے بعض مقامات کو چھوڑ کر ملک کے دیگر علاقوں میں بلدیاتی معاملات میں بہت کم فرقہ وارانہ منافرت کو سر اُبھارنے کا موقع ملا۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی مقامی حکومتِ خود اختیاری کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا کیوں کہ ان میں ایک تو تعلیمی پسماندگی عام تھی دوسرے بڑے پیمانے پر ان میں غربت پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اُنہیں سیاست میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بمبئی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں مسلمانوں کی حالت اس معاملے میں زیادہ خراب نہیں تھی تاہم یورو پین لوگوں کی طرح وہ بھی انتخابات کی جھنجٹ میں پڑے بغیر "نامزد" کیا جانا زیادہ پسند کرتے تھے جیسا کہ 1891-92ء کے دہے پر ختم ہونے والی دس سالہ رپورٹ سے ظاہر ہے:۔

ہندستان میں سماجی اثر Social influence اکثر عقلی تہذیب Intellectual culture اور دولت Wealth کے اثرات سے علیحدہ ہی رہتا ہے۔ لیکن اب انتخابی استحقاق [illegible] نے ان فاصلوں کو بڑی حد تک پاٹ دیا ہے۔ اونچے طبقے کے لوگ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آج بھی انتخاب لڑکر جیتنے کی بجائے اس بات میں اپنے لیے بہت زیادہ بڑائی محسوس کرتے ہیں کہ حکومت میں ان کے مُربّی انہیں کسی میونسپل بورڈ کی نشست کے لیے نامزد کردیں ....."[31]

یہ صورتِ حال مسلمانوں پر صادق آتی تھی اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں پر زیادہ صادق آتی تھی۔

اگر اس اقدام کو خالصتاً ایک ایسے اقدام کی صورت میں دیکھا جائے کہ جس کا مقصد عوام میں سیاسی شعور کو بیدار کرنا ہو تو کہنا پڑے گا کہ رپن کا یہ قدم بہت زیادہ موثر ثابت نہیں ہوا۔ کیوں کہ اس سے صرف اتنا ہوا کہ اُن سربرآوردہ ہندستانیوں کی قدرے تشفی ہوگئی جو شہری معاملات (Civic Matters) میں اپنا دخل رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن انتظامی معاملات پر اس اقدام کے خاطرخواہ نتائج مترتب ہوئے۔ پہلی بار یہ محسوس کیا جانے لگا کہ انتظامی امور کی ادائی سے قطع نظر "دیسی" ارکان اپنی تمام تر کمیوں اور کوتاہیوں کے باوجود کھلے بندوں خود کو ان اُمور سے وابستہ ظاہر کرکے اپنے بلند ارادوں کو تقویت بخش رہے ہیں۔[32] اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ گورنروں اور گورنر جنرل کی کونسلوں میں نمائندگی دیئے جانے کا دیسی مطالبہ زور پکڑ گیا۔ دیسی رہنماؤں کی اس مہم کو یوروپینوں کی اس چیخ پکار کی وجہ سے مزید تقویت حاصل ہوگئی جو انہوں نے البرٹ بل Ilbert Bill اور اسی قسم کے موافقِ ہند Pro-Indian اقدامات کے خلاف مچا رکھی تھی۔[33]

یکے بعد دیگرے ان واقعات نے ہندستان کی سیاسی تحریک کو کافی بڑھاوا دیا جس میں کانگریس کے ہر سالانہ اجلاس کے بعد مزید تیز گامی پیدا ہوتی رہی۔ دراصل کانگریس نے اپنے افتتاحی اجلاس ہی میں مطالبہ پیش کردیا تھا کہ "موجودہ سپریم کونسل اور لوکل لیجسلیٹو کونسلوں میں اصلاحات کے ذریعے کافی تعداد میں منتخب نمائندوں کو شامل کیا جائے۔ (اور اسی قسم کی کونسلیں شمال مغربی صوبے اودھ اور پنجاب کے لیے بھی تشکیل دی جائیں)۔" کانگریس نے یہ سفارش بھی کی کہ ہر قسم کے بجٹ کو کونسلوں کے غور و خوض کے لیے اُن کے روبرو پیش کیا جائے اور یہ کہ ان ارکان کو حق استیضاح یا بالفرض التوائے بحث وزیر متعلقہ سے طلبِ تفصیل Interpellation کا حق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل ہونا چاہیے۔ مزید یہ بھی سفارش پیش کی گئی کہ دارالعوام کی ایک اسٹینڈنگ کمیٹی تشکیل دی جائے جو ان احتجاجات پر غور و خوض کرے جو اُن کونسلوں کی اکثریت درج کروائے جن کے اکثریتی فیصلوں کو عاملہ نے اپنے اختیارات حاصلہ کی بنا پر مسترد یا منسوخ کر دیا ہو۔[34]

بمبئی کے کے۔ ٹی۔ تیلنگ K.T. Telang اور مدراس کے ایس۔ سبرامنی ایر S. Subramani Aiyer نے اس قرارداد کے بارے میں بتلاتے ہوئے اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں یہ واضح کیا کہ کس طرح ان کونسلوں کے ممبر کی حیثیت سے انہیں اچھا یا بُرا کچھ بھی کر پانے کا قطعی کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا تھا۔[35] جبکہ دادا بھائی نوروجی نے واضح کیا تھا کہ یہ بات ہم نے انگریزوں ہی سے سیکھی تھی کہ "اچھی حکومت چلانے کے لیے نمائندگی کا اصول کس قدر ضروری ہوتا ہے۔[36] ورنہ برطانیہ کے زیرِ تسلّط رہنے کا فائدہ ہی کیا؟ یہ ایک دوسری قسم کی جبری حکومت بن جائے گی۔[37]

1886ء میں نہ صرف کانگریس نے "دیسی" نمائندگی کے اپنے سابقہ مطالبے کو دہرایا بلکہ یہ مطالبہ بھی کیا کہ بعض اُصولوں کی بنیاد پر اس طریقِ نمائندگی میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں جیسے کہ منتخب اور نامزد کردہ ارکان کی نمائندگیوں میں توازن، مخصوص اور محدود حق رائے دہی (جو عام طور پر بلدیہ جات، ضلعی بورڈوں، یونیورسٹیوں اور چیمبر آف کامرس کے ارکان تک محدود ہو) اور تمام مالی امور کا کونسلوں کے روبرو پیش کیا جانا وغیرہ۔ کانگریس نے اپنی قرارداد کے ذریعہ مطالبہ کیا کہ 'ہندستان' کا ہر شہری بلا لحاظِ مذہب، عقیدہ، رنگ و نسل اس بات کا اہل ہونا چاہیے کہ اُسے کونسل کی نشست کے لیے منتخب یا نامزد کیا جا سکے۔[38]

اُن نقادوں کا جو اس قسم کے مطالبات کو خام خیالی تصوّر کرتے تھے۔ سر مدیر ناتھ بنرجی نے جواب دیا: "ہمارا پنچایتی نظام اتنا ہی قدیم ہے جتنے ہمارے یہ پہاڑ۔ یہ تمام لوگوں کے دلوں اور جبلتوں پر نقش ہے۔ لہٰذا حکومتِ خود اختیاری کا تصوّر ہندستانی عوام کی عادات اور طرزِ فکر کے لیے کوئی نیا نہیں ہے۔[39]

کئی برسوں تک کانگریس اپنے ہر اگلے اجلاس میں انہی مطالبات کو کم و بیش انہی الفاظ میں دہراتی رہی لیکن ان کے بارے میں کوئی سرکاری ردِ عمل ظاہر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں کیا گیا۔ اگرچہ رازدارانہ طور پر حکومت ایسے ذرائع و وسایل تلاش کرنے میں مصروف تھی جن کے ذریعے ان مطالبات کی تکمیل کی جا سکے۔ مثلاً ہندستان سے اپنی واپسی سے پہلے لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) نے خفیہ طور پر ایک کمیٹی تشکیل دی تھی تاکہ وہ "دیسی" نمائندگی کے پورے مسئلے کا جائزہ لے سکے۔ دارالامرا میں کھلے بندوں الزام لگایا گیا کہ مذکورہ کمیٹی نے ایک ایسی کونسل کی سفارش پیش کی جس کے دو حصے ہوں جن میں "ملک کے عوام اور امرا" کی نمائندگی کی جا سکے۔ پہلا حصہ تو اُن ارکان پر مشتمل ہونا چاہیے جنہیں معقول مادی حیثیت کی بنیاد پر راست منتخب کیا گیا ہو اور دوسرا حصہ وہ ہو جو بالواسطہ طور پر بلدیاتی اداروں اور مقامی ادارے (Local Bodies) منتخب کریں۔ اس سفارش کی منظوری کے لیے وائسرائے نے بہت اصرار کیا لیکن سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند لارڈ کراس (Lord Cross) نے مجوزہ سفارش کو اس بنا پر ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ حد سے زیادہ "بنیادی اور انقلابی" نوعیت کی تھیں۔[40]

دستوری اصلاحات کے لیے کانگریس کی یہ تحریک صرف ہندستان کی سرحدوں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اسی قسم کی تحریک انگلستان کے ارکانِ پارلیمنٹ اور دارالامرا کے ارکان کے مابین بھی کانگریس کی لندن والی ایجنسی نے جاری کر رکھی تھی جس کا ساتھ برطانوی پریس کا ایک مخصوص حلقہ بھی دے رہا تھا۔ خاص طور پر دادا بھائی نوروجی نے اپنے اطراف برطانوی احباب کا ایک بااثر حلقہ بنا رکھا تھا جس کے ذریعے دیگر مسائل کے علاوہ وہ عوام کی توجہ ہندستانی کونسلوں کی توسیع اور ان میں زیادہ سے زیادہ عوامی نمائندگی کے مسائل پر مرکوز کراتے میں مصروف تھے۔ لندن میں پیدا ہونے والی یہی صورتِ حال تھی جس نے سرسید کو کافی پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ہندو تحریک سے قطعی ہراساں نہیں تھے خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو لیکن بعض ممبرانِ پارلیمنٹ کی جانب سے ان ہندو احتجاجیوں کی حمایت کو سرسید نے ایسا خطرہ جانا جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سعادہ پس منظر جس میں ۱۸۸۹ء میں بمبئی کے مقام پر سر ولیم ویڈربرن (Sir William Wedderburn) کی زیرِ صدارت کانگریس نے اپنا پانچواں اجلاس منعقد کیا جس کی رونق چارلس بریڈلا (Charles Bradlaugh) کی موجودگی کی وجہ سے دوبالا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگئی تھی جو خاص طور پر انگلستان سے ہندوستان تک کا فاصلہ محض اس لیے طے کر کے گئے تھے کہ اس اجلاس کے وفود کے روبرو وہ پارلیمانی بل غور و خوض کے لیے پیش کر سکیں جس کا مقصد مجالس مقننہ کی ساخت اور نوعیت میں بہتری پیدا کرنا تھا۔ اس بل کی بنیاد پر مدراس کے مشہور ڈیلی گیٹ ارڈلی نارٹن Eardley Norton نے ایک قرار داد پیش کی جس میں "بعض اہم اصولوں" کی وضاحت کی گئی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ کانگریس کے اس اجلاس کی منظوری حاصل ہو جانے کے بعد اُسے برٹیڈلا کی خدمت میں پیش کیا جا سکے تاکہ وہ اُسے اپنے مجوزہ پارلیمانی بل میں شامل کر سکیں۔[41]

اس قرارداد کی اہم باتیں یہ تھیں:۔

(۱) امپیریل Imperial اور صوبائی مجالس مقننہ کے ارکان میں منتخب ارکان کی تعداد نصف سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ ایک چوتھائی سے زیادہ کو بلحاظ عہدہ (Ex-officio) رکنیت نہیں دی جانی چاہیے اور باقی چوتھائی ارکان حکومت کے نامزد کردہ ہونے چاہئیں۔

انتخابی مقاصد کے لیے محصولی اضلاع Revenue Districts کے حدود ہی کو علاقائی اکائیاں Territorial Units تسلیم کیا جانا چاہیے۔

برطانوی رعایا کے تمام ۲۱ سالہ مرد جو اہلیت کے مطلوبہ معیار پر پورے اُترتے ہوں اور جنہیں کسی وجہ سے نااہل نہ قرار دیا گیا ہو، حق رائے دہی کے حامل ہوں گے۔

ہر ضلع کے رائے دہندگان مقامی حالات کی مناسبت سے ایک یا ایک سے زیادہ انتخابی اداروں Electoral Bodies کے لیے نمائندوں کا انتخاب کریں گے۔ ان نمائندوں کی تعداد کا تناسب اس طرح ہوگا کہ ضلع کی کل آبادی میں ایک ملین کے لیے ۱۲ نمائندوں کے حساب سے اُمیدوار منتخب کیے جائیں گے۔ یہ نمائندے وہ لوگ ہوں گے جو اہلیت کے مطلوبہ معیار پر پورے اترتے ہوں اور جنہیں انتخابات کے لیے نااہل نہ قرار دیا گیا ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمام اضلاع سے ہر انتخابی ادارے Electoral Body کے لیے اس طرح منتخب ہونے والے سبھی نمائندے شاہی مجلس مقننہ Imperial Legislature کے لیے ہر پانچ ملین آبادی کے لیے ایک کے حساب سے اور اُن کی اپنی صوبائی مجلس مقننہ Provincial Legislature کے لیے ایک ملین آبادی میں ایک کے حساب سے نمائندے اس طور سے منتخب کریں گے کہ ان میں سے پارسی، عیسائی، مسلمان اور ہندو نمائندوں کی تعداد تناسب کے اعتبار سے اس تعداد سے کسی صورت میں کم نہیں ہوگی جتنی کہ اس حلقۂ انتخاب کی آبادی میں علی الترتیب پارسیوں، عیسائیوں، مسلمانوں اور ہندوؤں کو حاصل ہے، دونوں مجالس مقننہ کے لیے یہ نمائندے مطلوبہ اہلیت کے معیار پر پورے اُترتے ہوں اور نااہل قرار نہ دیئے گئے ہوں۔

تمام انتخابات پوشیدہ رائے دہندگی (ballot) کے ذریعے منعقد ہونے چاہئیں۔

یہ پہلی "دیسی" کاوش تھی جو دستور سازی کے ضمن میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ ان تجاویز کے بغور مطالعے سے ہمیں اس "دیسی" ذہن کو سمجھنے میں مدد ملے گی جس کی نمائندگی کانگریسی رہنما کر رہے تھے۔ کانگریس کے اس اجلاس میں ان تجاویز کے محرک نے دفعہ (5) پر کافی سیر حاصل بحث کی جس کے ذریعے خود اسی کے الفاظ میں "اس ملک کی اقلیتوں کو مکمل تحفظ" فراہم کیا گیا ہے۔[42]

لالہ لاجپت رائے نے تجاویز کے اس پہلو کو یوں اجاگر کیا:۔

ہمیں خوف ہے کہ کہیں اقلیتوں کے دلوں میں، جن میں ابھی ہندستانی اخوت کے جذبات اتنی اچھی طرح پروان نہیں چڑھے ہیں جتنے کہ آئندہ برسوں میں چڑھ جائیں گے، یہ شک جاگزیں نہ ہو جائے کہ کونسلوں میں ان کی قوم کے نمائندوں کی عدم موجودگی کے باعث ان کی کوئی نمائندگی نہیں ہو پا رہی ہے اس لیے ہم نے خاص طور پر اس دفعہ کو ان تجاویز میں شامل کیا ہے، حالانکہ دراصل اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ہم سب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک ہیں) تاکہ ایسی تمام اقلیتوں کی نمائندگی خود انہی کے فرقے کے لوگ کر سکیں۔[43]

اس وقت کانگریس یہ بتلانا چاہتی تھی کہ "ہمارے مسلمان بھائیوں کے نہ صرف حقیقی بلکہ امکانی خدشات" کو دور کرنے کے معاملے میں بھی وہ کس قدر مخلص ہے۔[44]

انہی خطوط پر چند تقاریر ہوئیں اور اس کے بعد کانگریس کے صدر نے ان تجاویز کو یکے بعد دیگرے رائے شماری کے لیے پیش کیا۔ اجلاس کی کارروائی خوشگوار ماحول میں آگے بڑھتی رہی لیکن جوں ہی فرقہ وارانہ نمائندگی والی دفعہ نمبر (5) رائے شماری کے لیے پیش کی گئی تو ہی ایک تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اودھ کے نمائندے منشی ہدایت رسول اپنی نشست سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مطالبہ کیا کہ ان کی بات کو غور سے سُنا جائے۔ "آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم چند لوگ جو یہاں موجود ہیں اور جو پانچ کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے ہیں دراصل کس مشکل سے دوچار ہیں (آواز آئی 'چند نہیں، 250 سے زیادہ) پہلے تو ضلعے کے چھوٹے موٹے حکام ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حکومت ہم سے طوطا چشمی اختیار کیے ہوئے ہے۔ تیسرے یہ کہ ہماری قوم کانگریس کے خلاف ہے (آوازیں: نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہے) اور چوتھے یہ کہ مسلمانوں کے ناموس و وقار اور حقوق کی نمائندگی کا مسئلہ ہمارے سروں پر سوار ہے۔ اس لیے" میں کانگریس کے اس اجلاس میں تماشائی بن کر خاموشی سے مخالفانہ تنقید کے کڑوے گھونٹ پینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" ان کا خیال تھا کہ حالات کا بہترین تقاضہ یہ ہے کہ اس بات کی سفارش کی جائے کہ مسلمان کونسلوں کی تعداد ہندو کونسلروں کی تعداد سے کم نہ ہو۔ انہوں نے اعلان کیا:-

> "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ نے میری اس تجویز کو قبول کر لیا تو نوے فیصد مسلمان کل ہی کانگریس میں شامل ہو جائیں گے اور باقی دس فیصد پرسوں۔"[46]

اس کے بعد بمبئی کے نمائندے علی محمد بھیم جی نے ایک ترمیم پیش کی جس میں کہا گیا کہ دفعہ (5) میں لفظ "مسلمان" کو حذف کرتے ہوئے حسب ذیل عبارت کو شامل کیا جائے:- "بشرطیکہ امپیریل اور صوبائی کونسلوں میں مسلمان ارکان کی تعداد ہندو ارکان کی تعداد کے مساوی ہو۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس ترمیم پر زوردار مباحثہ ہوا جس میں زیادہ تر مسلمان نمائندوں نے ہی حصہ لیا اور ان میں بیشتر نے اس کی شدید مخالفت کی۔ لکھنؤ کے حامد علی خاں نے کہا کہ یہ ترمیم اس "غلط اور بے جا خوف" پر مبنی ہے کہ محض اپنی اکثریت کی وجہ سے ہندو قوم مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچائے گی۔ بہار کے سید میر الدین احمد بلخی نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ:۔ اگر آپ لوگ اسی طرح مذہبی اختلافات اور تفرقہ پردازیوں کو ہوا دیتے رہے تو کبھی اُن آزاد برطانوی اداروں سے متمع ہونے کے اہل قرار نہ دیئے جاسکیں گے جن کے لیے آپ اتنی جدّوجہد کر رہے ہیں[49]۔ بنارس کے نصیر الدین احمد نے محرک کو یہ کہہ کر مطعون کیا کہ "کھو کھلے تفاخر اور بلند بانگ طراری کے ذریعے ہم اپنی عزّت وناموس کی حفاظت نہیں کر سکتے بلکہ اس کے لیے ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ کم ازکم ہم بھی دوسروں ہی کی طرح معقول، مخلص اور دوسروں کا لحاظ رکھنے والے ہیں[50]۔"

اس ترمیم کے حق میں بعض تقریریں کی گئیں اور اس کے بعد بمبئی کے سید قمر الدین فرخی نے صدر سے دریافت کیا کہ آیا اس ترمیم پر مباحثہ اس وقت تک ملتوی کیا جاسکتا ہے جب تک کہ مسلمان نمائندے اپنی ایک خانگی میٹنگ میں اس مسئلے پر اچھی طرح بحث و تمحیص نہ کرلیں؟ صدر نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ مسلمانوں نے اپنی علیحدہ میٹنگ میں اس مسئلے پر غور کیا اور دوبارہ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے لوٹ آئے۔ اس ترمیم کو پہلے تو صرف مسلمانوں کی رائے شماری کے لیے پیش کیا گیا اور اس کے بعد تمام ایوان کی رائے شماری کے لئے مسلمانوں کی رائے شماری کے مطابق اس ترمیم کے حق میں (16) اور مخالفت میں 23 ووٹ ڈالے گئے جبکہ باقی (تقریباً دوسو) ممبران نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ عام رائے شماری اس کے فوری بعد کروائی گئی جس کے بعد کانگریس واقعہ نگار Recorder کے بموجب اعلان کیا گیا کہ "مسلمانوں کی اکثریت نے اس ترمیم کے خلاف ووٹ دیا[51]۔"

سرسید ان حالات پر چونک پڑے۔ انہیں یقین ہوگیا کہ کانگریسی رہنما نہ صرف برطانوی سیاست دانوں کی آنکھ میں دھول جھونک رہے ہیں بلکہ جان بوجھ کر مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ کانگریس کے اجلاس میں مسلمان وفود کی جانب سے دستوری تجاویز کی حمایت پارلیمنٹ میں یہ غلط تاثر قائم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرے گی کہ مسلمان من حیث القوم ان تجاویز کی تائید میں ہیں اور اگر واقعی ایسا ہوتا ہے تو یہ بات مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی۔ اس لیے فوری طور پر کچھ کیا جانا چاہیے تاکہ ایسی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔ سرسید کئی دنوں تک مختلف اقدامات کے بارے میں سوچتے رہے۔ بالآخر انہوں نے بیک (Beck) کے حسبِ مشورہ طے کیا کہ پارلیمنٹ کے روبرو اس گمبھیر مسئلے کے بارے میں ایک "دیو پیکر عرضداشت Monster Petition پیش کریں۔ چنانچہ اوایل اپریل ۱۸۹۰ء میں ہندستان کے ۷۰ مختلف شہروں اور قصبوں کے مسلمانوں کے لگ بھگ ۴۰۰۰۰ دستخطوں پر مشتمل ایک عرضداشت سر رچرڈ ٹمپل Sir Richard Temple کی معرفت دارالعوام میں پیش کی گئی جس میں عرضی گذاران نے درخواست کی کہ "معزز دارالعوام انڈین نیشنل کانگریس کے مطالبے کے مطابق ہندستانی کونسلوں کے دستور میں اصول انتخاب کو شامل نہ کرے۔" کیونکہ اس قسم کے اقدام سے نہ صرف وہ بلا رو رعایت انصاف جو اب تک برطانوی حکومت کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ مجروح ہوگا بلکہ عرضی گذاران اور دیگر اقلیتوں کو اُن طبقات کی ناقابلِ برداشت غلامی کا طوق پہننا پڑے گا جن کا نقطہ نظر ان کی فلاح و بہبود کے تعلق سے انتہائی جارحانہ ہے۔[52]

دادخواہوں نے مزید یہ معروضہ پیش کیا کہ دارالعوام پچاس ملین مسلمانوں کے مفادات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا لہٰذا کسی بھی قسم کی نیابت یا نمائندگی حتیٰ کہ متناسب نمائندگی کے طریقے کو بھی ہندستان میں رائج نہ کیا جائے کیونکہ یہ اُن کے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتا۔

جوں ہی اس عرضداشت کی اطلاع عامۃ الناس تک پہنچی۔ ہندو پریس نے سرسید کے خلاف حسبِ معمول تنقید اور ملامت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ حتیٰ کہ Statesman جیسے اینگلو انڈین اخبار نے بھی اس عرضداشت کو ایسے "بے بنیاد فرضی خدشات[53]" پر مبنی قرار دیا جن میں شاید اس وقت کچھ وزن محسوس ہوتا۔ اگر کانگریس اپنے منصوبے میں ان کی پیش بینی کرتے ہوئے ان کے تدارک کا کوئی لحاظ نہیں رکھتی۔ سرسید کو البتہ The Times کی شکل میں ایک زبردست حمایتی مل گیا جس نے کانگریس کے منصوبے کی یہ کہتے ہوئے مذمت کی کہ یہ "بابوؤں کے ایک چھوٹے سے منظم گروہ" کا چالاک ہتھکنڈہ ہے جس کے ذریعہ وہ سیاسی اقتدار پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کانگریسی محرکین کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہندستانی عوام کی وکالت کرنے لگیں کیونکہ کاشت کاروں، محنت کش طبقوں اور دیسی امراء، مسلمانوں اور پارسیوں کے ساتھ اُن کے کوئی مراسم نہیں ہیں۔ اخبار آگے چل کر سوال کرتا ہے" پھر باقی کون رہ جاتا ہے جس کی نمائندگی کا کانگریسی دعویٰ کرتی ہے؟" کانگریس کی اصلیت کے بارے میں آگے چل کر اخبار رقمطراز ہے:" یہ ایک ہندو تحریک رہی ہے جسے ہندوؤں کے ایک ترقی یافتہ طبقے نے شروع کیا جو ان کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ضرورت سے زیادہ تعداد میں فارغ ہوگیا جنہیں ہم نے گذشتہ تیس برسوں میں قائم کیا ہے۔[54] اُن کی دستوری تجاویز کے بارے میں اخبار نے لکھا:" اگر کانگریسی محرکین مطمئن ہوجاتے ہیں تو سمجھنا چاہیئے کہ عطا کی جانے والی چیز بڑی ہے اور اگر وہ مطمئن نہیں ہوتے ہیں تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ شے اپنے مطلوبہ مقصد کے لیے موزوں نہیں ہے۔"

لیکن ان تمام احتجاجات کے باوجود لارڈ لینس ڈاؤن (Lord Lansdowne) جیسے لبرل خیالات رکھنے والے وایسرائے کے زبردست دباؤ کی وجہ سے جس نے صرف ایک ہی سال قبل اس عہدۂ جلیلہ کو سنبھالا تھا، حکومتِ برطانیہ نے 21 فروری 1890ء کو پارلیمنٹ میں ایک انڈین کونسلس بل Indian Councils Bill پیش کیا۔ اس بل میں اصولِ انتخاب کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی کیونکہ بقول وزیراعظم لارڈ سالسبری Lord Salisbury ہمیں ایسی رعایا سے سابقہ ہے جو بُری طرح آپس میں بٹی ہوئی ہے۔[55]" اس نکتے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:" اُصولِ انتخاب یا نمائندہ حکومت کا تصور قطعاً مشرقی نہیں ہے۔ یہ نہ تو مشرقی رواجوں سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ مشرقی ذہن سے۔[56]" لارڈ کمبرلے Lord Kimberley جیسا شخص جو کسی نہ کسی قسم کی عوامی نمائندگی دیئے جانے کے حق میں تھا، یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ" ایک ایسے وسیع ملک کے لیے، جو اتنا ہی بڑا ہے جتنا کہ یورپ، اور جس میں اتنی بڑی تعداد میں مختلف قومیں رہتی بستی ہیں، پارلیمانی نمائندگی کا تصور ایک ایسا وحشی تخیل ہے جو شاید آج تک ذہنِ انسانی میں پیدا نہ ہوا ہوگا۔[57]"

مجوزہ اصلاحات کی اس محدودیت پر پارلیمنٹ کے بعض حلقوں میں افسوس کا اظہار کیا گیا۔ لارڈ اسٹنلے آف آلڈرلی Lord Stanley of Alderley نے کہا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"ای لارڈس، اگر یہ بل اسی حالت میں ہندستان جاتا ہے تو اس سے وہاں کے عوام بُری طرح مایوس ہو جائیں گے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیں کہ ہندستانی عوام نام کی کسی شئے کا وجود بھی ہے کیوں کہ اُن کے خیال میں ہندستانی رعایا تو ایک مجموعہ ہے مختلف قوموں، زبانوں، مذہبوں، طور طریقوں اور رسم و رواج کا" لیکن ان محتوں میں، اسٹینلے نے دریافت کیا: "یورپ میں بھی کسی ایک قوم کا وجود کب رہا ہے؟" خود برطانیہ میں بھی ایک قوم کہاں ہے جس کے بارے میں والٹیر نے کہا تھا: "یہ ملک ہے ایک سو مذہبوں لیکن ایک ہی چٹنی Sauce کا۔" ہندستانیوں کی بھی ایک ہی چٹنی ہے جو ملک کے ایک سے دوسرے سرے تک پائی جاتی ہے اور وہ کڑھی Curry" انہوں نے حکومت پر زور دیا کہ وہ ہندستان کی اس عظیم ترقی کو نظر انداز نہ کرے جو انگریزی زبان، تعزیرات ہند Indian Penal Code اور ریلوں وغیرہ کے ذریعے اتحاد Unity کی منزل کی جانب کی جا رہی ہے بلکہ اس رجحان کو" فوجوں کے اختلاط" اور ایسے ہی دیگر طریقوں سے بڑھاوا دے۔

سالسبری کی حکومت کم از کم ان دستوری تجاویز کے بارے میں کبھی سنجیدہ نہیں تھی۔ یہ بات اس وقت ظاہر ہو گئی جب مہینوں تک اس مسئلے کو معرض التوا میں ڈال دیا گیا اور بعد میں یہ بل واپس لے لیا گیا اور کئی ممبران پارلیمنٹ کے احتجاج کے باوجود اسے 1892ء کی ابتدا تک دوبارہ ایوان میں پیش نہیں کیا گیا۔[59] کونسلروں کے انتخاب کے موضوع پر تو بحث ہوتی رہی لیکن حسب سابق حکومت اصول انتخاب کی سختی سے مخالفت کرتی رہی۔ بالآخر کئی امرار کے سمجھانے پر جنہیں ہندستانی امور کا راست تجربہ حاصل تھا، حکومت لارڈ نارتھ بروک Lord Northbrook کی ایک ترمیم قبول کرنے پر آمادہ ہوئی جس کے ذریعے گورنر جنرل ان کونسل Governor General-in-Council کو بمنظوری سکریٹری آف اسٹیٹ ان کونسل Secretary of State-in-council یہ اختیار دیا گیا کہ وہ زائد ارکان کی نامزدگی کے قواعد و ضوابط کو کس طرح بروئے کار لایا جائے۔"[60]

لیکن بعض ممبران پارلیمنٹ ایسے بھی تھے جو اس سمجھوتے سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہی پرانی شراب نئے شیشوں میں دی جا رہی ہے۔ اُن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا زیادہ تر تعلق لبرل اور ریڈیکل گروپ سے تھا۔ وہ مصر تھے کہ "ہندستانی کونسلوں کی ایسی کوئی بھی اِصلاح جس میں اصولِ انتخاب کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ نہ تو ہندستانی عوام کے لیے اطمینان بخش ثابت ہوگی اور نہ ایک اچھی حکومت ہند کے شایانِ شان ہوگی۔" ملکہ عالیہ کی حکومت کی جانب سے لارڈ کرزن کے اس یقین دلانے کے باوجود کہ "ہمارے بل سے اِس قسم کے کسی اُصول کو خارج نہیں کیا گیا ہے۔ جسے آپ طریقہ انتخاب (Election) کہہ لیجیے یا چناو (Selection) کہہ لیجیے یا نمائندگی (delegation) یا چاہیں تو اور کچھ کہہ لیجیے۔" یہ ممبرانِ پارلیمنٹ اپنے موقف پر اٹل رہے۔ اپنے موقف کو واضح کرنے کے لیے لارڈ کرزن نے کمبرلے (Kimberley) کا حوالہ دیا جس نے کہا تھا کہ "اس دفعہ (یعنی نارتھ بروک کی ترمیم) کے تحت گورنر جنرل کے لیے یہ ممکن ہو جائیگا کہ وہ ایسے انتظامات کر سکے جن کے ذریعے الیکشن کے ذریعے چند افراد کو منتخب کر کے اس کے روبرو پیش کیا جا سکے بشرطیکہ گورنر جنرل کو یہ اطمینان ہو جائے کہ ایسا انتخابی نظام مناسب طریقے سے نافذ کیا جا سکتا ہے۔" عین ممکن تھا کہ اس مسئلے پر ایوان میں پھوٹ پڑ جاتی لیکن گلیڈسٹون نے بروقت مداخلت کرتے ہوئے ایوان کے اراکین سے التماس کیا کہ وہ حکومت کی نیک نیتی پر شک نہ کریں کیونکہ "معزز نائب معتمد صاحب (Under Secretary) نے اپنی تقریر میں جس چیز کا حوالہ دیا ہے وہ انتخابی نظام ہی ہے کیونکہ اس کے علاوہ کسی اور مفہوم میں اس چیز کا ذکر کرنے کی توقع اُن سے کی ہی نہیں جا سکتی۔"[63] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایوان میں اس مسئلے پر کوئی پھوٹ نہیں پڑی۔ البتہ اگلے مرحلے پر، خصوصاً کمیٹی میں بعض لبرل ممبران نے کوشش کی کہ اس بل کی بعض دفعات میں تبدیلی کی جائے لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

لیکن تمام تر خامیوں کے باوجود انڈین کونسلس ایکٹ آف 1892ء کو کانگریس کی فتح قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے کونسلوں کی توسیع، مالی اُمور پر بحث و مباحثہ اور حق طلب تفصیل بفرض التوائے بحث (Interpellation) جیسے مطالبات کی تکمیل ہوگئی۔ اگرچہ اس بل نے انتخابات کے دروازے کو یکسر بند کر دیا تاہم نارتھ بروک کی تجویز کے مطابق اس ایکٹ میں مغالطے میں ڈالنے والی جس دفعہ کو شامل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا گیا تھا اس کی وجہ سے کئی سربرآوردہ کانگریسی رہنماؤں کو امپیریل اور صوبائی کونسلوں پر نامزد کر دیا گیا۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں کو اب صرف اس بات کا اطمینان رہ گیا کہ ملکہ عالیہ کی حکومت نے ہندستان میں کسی بھی قسم کے پارلیمانی نظام کے نفاذ کے بارے میں سختی سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن جلد ہی انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ قانون کی لسانی نزاکتوں کے باوجود گورنر جنرل اور دیگر صوبائی گورنر کانگریس کے دباؤ کے آگے جھکتے چلے جا رہے ہیں اور عملاً اپنی کونسلوں پر انہی رہنماؤں کو نامزد کر رہے ہیں جن کی سرسید اور ان کے رفقاء دیگر کئی سرکاری عمال کی طرح "بغاوت فروش" کہہ کر مذمت کیا کرتے تھے۔

اس ایکٹ کی منظوری سے قبل سرسید گورنر جنرل کی کونسل کے ایک سرگرم رکن ہوا کرتے تھے۔ لیکن جدید اقدامات کی وجہ سے انہیں علیحدہ ہو جانا پڑا۔ غالباً انہوں نے سوچا ہو گا کہ اب ایوان میں انہی لوگوں کے ساتھ مل بیٹھنے سے کیا حاصل، جن پر ماضی میں انہوں نے سخت تنقیدیں کی تھیں۔

حالات کے اس طرح پلٹا کھانے پر سرسید تلملا اٹھے اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ اس امر کا احساس کرنے لگے کہ اگر حکومت مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہ کرے تو کانگریس تحریک کا اٹھتا ہوا طوفان مسلمانوں کے بیڑے کو غرق کر دے گا۔ گذشتہ چند برسوں سے سرسید نے عوامی پلیٹ فارم سے کبھی بھی سیاسی مسئلے پر لب کشائی نہیں کی تھی لیکن نئی دستوری صورتِ حال اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس قدر دُور رس نتائج کی حامل تھی کہ مجبوراً انہیں اپنے کروڑوں ہم مذہبوں کے روبرو لب کشائی کرنی پڑی:۔ "جو اگرچہ شخصی طور پر مجھ سے واقف نہیں ہیں لیکن عوامی معاملات کے بارے میں میرے خیالات اور حکمتِ عملی سے واقفیت حاصل کرنے کے متمنی ہیں جنہیں وہ قدر و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"[66]

انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ بعض کانگریسی رہنماؤں کے اس بیان میں قطعی کوئی صداقت نہیں ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ میری گذشتہ چند برسوں کی "سیاسی خاموشی" کانگریس تحریک کے ساتھ میری رضامندی کے مترادف ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ ان کے خیالات میں اس دوران کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے اور وہ آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ہندستان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے دستوری مسئلے کا حل نمائندہ حکومت نہیں ہے۔ بعد کے واقعات نے تو انہیں اور بھی اس بات کا قائل کر دیا تھا کہ جہاں "رائے دہندگان کے مابین قوم، مذہب، سماجی طریقوں معاشی حالات اور سیاسی روایات کے معاملے میں واضح یک رنگی موجود نہیں ہوگی" وہاں طریق نمائندگی سے "کوئی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔"[67]

لہٰذا انہوں نے پُر جوش انداز میں اس توقع کا اظہار کیا کہ خواہ برطانیہ میں قدامت پسند برسر اقتدار ہوں یا لبرل یا ریڈیکل وہ یقیناً اس بات کو فراموش نہیں کریں گے کہ "ہندستان کوئی چھوٹا سا ملک نہیں بلکہ کم و بیش ایک برّ اعظم ہے اور یہ کہ اس میں ایک ایسی کثیر آبادی بستی ہے جس کے معاشی، اخلاقی، سماجی، مذہبی، طبعی اور تاریخی حالات ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں اور اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد سے جس میں کبھی ہم خیالی کی فضا دوبارہ بحال نہ ہو سکی۔" انہوں نے برطانوی عوام کو متنبہ کیا کہ وہ کانگریس کے غلط پروپگنڈے سے متاثر نہ ہوں جو سب کچھ جانتے پوچھتے ہوئے ماضی اور حال کے زندہ و جاوید حقائق سے چشم کر رہی ہے اور اس معروضے پر کاربند ہے کہ "مسلمانوں اور مراٹھوں، برہمنوں اور چھتریوں، نبیبوں اور شودروں، سکھوں اور بنگالیوں اور مدراسیوں اور پشاوریوں کو ایک ہی قوم کی لڑی میں پرویا جا سکتا ہے۔"

سرسید نے جمہوریت کے بارے میں ناپسندیدگی کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے کہا: "میں اسے ایک توہم سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔" مشہور برطانوی مورخ کارلائل کے ساتھ اپنی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کارلایل نے اُن کے اس خیال سے اتفاق کیا تھا کہ "وہ بیشتر لوگ جو جمہوریت میں اقتدار پر غالب آجاتے ہیں، دراصل" عقلمندی کی حدود سے کوسوں دُور ہوا کرتے ہیں۔"[68]

سرسید نے مختلف ممالک میں مختلف صوبوں میں "حکومت" کے ارتقا کا تجزیہ کیا۔ انہوں نے یونان اور روم کی قدیم جمہوریتوں Republics سے لے کر اسلامی دولت مشترکہ "کی" نیم جمہوریہ Quasi Republic تک اور لاطینی اقوام کے سیاسی اداروں سے شروع کر کے موجودہ دور کے روسی اور دیگر یوروپین ملکوں میں حکومت کی مختلف شکلوں کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ممالک جمہوریت Democracy، سوشلزم Socialism اور مذہب (اشیئت)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Nihilism جیسی زاجیت Anarchy سے زیادہ اور کچھ پیدا نہ کر سکے۔ سرسید نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کی وہ واحد قوم جو نمائندہ طرزِ حکومت میں سُرخرو ہوئی وہ ہے اینگلو سیکسن Anglo-Saxon قوم۔ اب اگر انگریز قوم نے اپنے اس اکسیرِ اعظم Panacea کو دیگر اقوام کے امراض پر آزمانا شروع کر دیا تو یقین ہے کہ افاقے کی بجائے مریض کی حالت اور نازک ہو جائے گی۔

سیاسی فلسفے کے طور پر پیش کردہ یہ خیالات کافی فرسودہ Out of date تھے اور ممبرانِ پارلیمنٹ نے جنہیں مخاطب کر کے ان کا اظہار کیا تھا، انہیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ لیکن حالات کی تبدیلی کے باعث سرسید کے احساس محرومی Frustration نے ان میں جو غم و غصہ پیدا کر دیا تھا اس کی گہرائی کا اظہار البتہ ان الفاظ کے ذریعے بخوبی ہو جاتا ہے۔ یہ بات بیک کے اس مکتوب سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے جو انہوں نے چند ماہ بعد Pioneer کے نام لکھا تھا: "غداری کی سب سے بڑی وجہ حکومت کی وہ پالیسی ہے جس کے تحت وہ باغی شورش پسندوں کے مطالبات کے آگے جھکتی جا رہی ہے۔" اس کے معنی یہ ہوئے کہ "غداری کرو اور انعام پاؤ۔" انہوں نے حکومتِ ہند پر اور صوبائی حکومتوں پر الزام عائد کیا کہ وہ "مشہور شورش پسندوں کو مجالسِ مقننہ کی نشستوں پر نامزد کر رہی ہے" اور اس طرح کانگریس کی طاقت میں "دس گنا" اضافہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا کہ وہ لوگ جو شورش برپا کئے ہوئے ہیں انہیں یکے بعد دیگرے متعدد سہولتیں بخشی جا رہی ہیں اور اُن لوگوں کو جو شورش میں ملوث نہیں ہیں یکسر تمام سہولتوں سے محروم رکھا گیا ہے۔[63]

ان احتجاجات کا حکومت پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور حکومت مشہور کانگریسی رہنماؤں کو کونسلوں پر نامزد کرتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ سرسید اور دیگر مسلم رہنماؤں نے مجالسِ مقننہ میں نیابت یا نمائندگی کے اُصول کی ترویج کی مخالفت ترک کر دی اور ایسے ذرائع اور وسائل کو اپنانے لگے جن کے ذریعے مسلمانوں کو دستوری اصلاحات میں اُن کا واجبی حصّہ مل سکے۔ اس معاملے کی نزاکت کا احساس اُنہیں اس وقت ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ لینس ڈاؤن Lansdowne کے اس تیقن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے باوجود کہ مسلمانوں کو مختلف کونسلوں میں مناسب نمائندگی دی جائے گی۔[70] دراصل صورتِ حال یہ تھی کہ یا تو مسلمانوں کو نظر انداز کیا جانے لگا تھا یا انہیں مجالسِ مقننہ کے اراکین کی حیثیت سے بہت کم تعداد میں مقرر کیا جا رہا تھا۔ ذیل میں دیئے گئے اعداد و شمار سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے :-

گورنر جنرل کی مجلسِ مقننہ

(غیر سرکاری ارکان)

سال	ہندو	یورو پین	پارسی	مسلمان	جملہ
1895	6	2	1	2	11
1896	4	2	1	2	9
1897	5	3	–	2	10
1898	6	2	–	1	9
1899	3	2	1	1	7
1900	4	2	1	2	9
1901	5	3	1	–	9
1902	5	3	–	1	9
1903	6	2	–	2	10
1904	6	3	–	2	11
1905	4	1	–	2	7
1906	3	1	–	3	7

اگرچہ اس مدت کے آخری ایام میں مسلمانوں کا موقف خاصا مستحکم ہو گیا تھا تاہم ابتدائی دنوں میں ان کی حالت نمائندگی کے اعتبار سے اس قدر کمزور تھی کہ مسلمان بدستور اس صورتِ حال پر تلملا اُٹھے تھے۔ اگرچہ مسلمان دل سے اس نئے دستوری اقدام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو پسند نہیں کرتے تھے تاہم اُن کی عین خواہش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود کو حکومت سے وابستہ رکھیں۔

یہی صورتِ حال مختلف صوبائی کونسلوں کی بھی رہی[71]۔ مثلاً صوبہ بنگال کی مجلسِ مقننہ میں ہندو اراکین کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے تقریباً دُگنی تھی جب کہ اُس صوبے کی مسلمان آبادی تمام ہندستان کے صوبوں میں سب سے زیادہ تھی، اور پریسیڈنسی میں تو مسلمانوں کی اکثریت تھی:۔

بنگال کی مجلسِ مقننہ

(غیر سرکاری اراکین)

سال	ہندو	یورپین	مسلمان	جملہ
1895	6	10	3	19
1896	8	8	2	18
1897	8	10	2	20
1898	8	10	2	20
1899	7	8	2	17
1900	7	9	2	18
1901	8	10	2	20
1902	7	10	2	19
1903	8	8	3	19
1904	8	10	2	20
1905	8	10	1	19
1906	8	10	1	19

تعداد کے اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلے میں کم یہ مجالسِ مقننہ کے مسلمان اراکین سرسید اور ان کے گروہ کے نمائندے نہیں تھے۔ سرسید کے مقلدوں میں شمالی ہندستان کے بیشتر اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ شامل تھے لیکن سید محمود اور حاجی اسماعیل کو چھوڑ کر سرسید کے دوسرے کسی ساتھی کو صوبائی کونسل میں جگہ نہیں مل سکی حالانکہ ان میں کئی سربرآوردہ شخصیتیں شامل تھیں۔ اسی طرح سرسید کے ایک بھی ساتھی کو کبھی امپیریل کونسل میں نامزد نہیں کیا گیا۔ ایک مسلمان رہنما جو چند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برسوں کے لیے گورنر جنرل کی کونسل کے رکن رہے، وہ تھے رحمت اللہ سیانی جو سابق میں کانگریس کے صدر رہ چکے تھے اور جن کے بارے میں مسلم کرانیکل نے لکھا تھا: مسلمان قوم نے غیر مبہم اور واضح الفاظ میں پُرزور احتجاج کے ذریعہ حکومت کو اپنے اس نظریئے سے آگاہ کر دیا ہے کہ صاحب موقوف نہ کبھی مسلمانوں کے نمائندے رہے رہے ہیں نہ رہیں گے اور نہ رہ سکتے تھے۔"[73]

ان واقعات کے ہاتھوں زک اٹھا کر سرسید اور ان کے گروہ نے از سر نو اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی جانب توجہ مرکوز کر دی اور دسمبر 1896ء میں مجالس مقننہ اور بلدیہ جات (میونسپلٹیوں) میں مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں ایک منصوبے کا مسودہ تیار کر لیا جو بطور خاص کارنامہ تھا۔ تھیوڈور بیک اور سرسید کے صاحبزادے سید محمود کا۔ اس مسودے کو محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن نے حکومت کے سامنے پیش کیا۔

اس مسودے کے مصنفین نے "اصول انتخاب Elective Principle کے نفاذ پر اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا کہ اب اسے واپس لینے کا مطالبہ کرنا گو ایک "بے سود احمقانہ" اقدام ہوگا کیونکہ نہ صرف ہندو اس قسم کے مطالبے کی مخالفت کریں گے بلکہ برطانیہ میں بھی اس کی مذمت کی جائے گی اب مسلمان صرف اس بات کا مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اس نظام میں اس قسم کی مناسب تبدیلیاں کی جائیں جن کے ذریعے مسلمانوں کو اس میں "معقول اور واجبی نمائندگی حاصل ہو سکے۔"

اس محمود بیک منصوبے کے خاص خاص نکات یہ تھے:

(1) مجالسِ مقننہ Legislative Council میں نمائندگی

ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نشستیں دی جانی چاہئیں کیونکہ ہندو اگر "تعداد کے اعتبار سے فوقیت" رکھتے ہیں تو مسلمانوں کا "تاریخی موقف" بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

(2) بلدیہ جات میں نمائندگی

مصنفین نے یہ بات تسلیم کی کہ کوئی ایسا ضابطہ بنانا مشکل کام ہے جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا اطلاق ہندستان کے ہر شہر پر کیا جا سکے لیکن انہوں نے تجویز کیا کہ اُن شہروں میں جہاں کی مسلم آبادی کل آبادی کا ایک چوتھائی یا اس سے زیادہ ہو تو ایسی صورت میں انہیں ہندوؤں کے مساوی نشستیں دی جانی چاہئیں کیوں کہ "آبادی کے ایک مخصوص گروہ کی اہمیت کا دارومدار محض اُس کی تعداد پر نہیں بلکہ دیگر کئی عوامل پر ہوتا ہے۔" وہ مقامات جہاں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کے 25 فیصد سے کم ہو وہاں پر ان کی نمائندگی جہاں تک ممکن ہو سکے ان کی تعداد کی متناسب ہونی چاہیے۔

(3) ڈسٹرکٹ بورڈس (ضلع بورڈس) میں نمائندگی

جہاں تک ممکن ہو سکے انہی خطوط پر ہو جن کی صراحت بلدیہ جات کے ضمن میں کی جا چکی ہے۔

مصنفین کا سب سے بڑا کارنامہ "رائے دہندگان" Electors کی توضیح تھا۔ انہوں نے واضح کیا کہ چونکہ اس ملک میں رائے دہندگان کی اکثریت ہندو ہے اس لیے اگر کبھی انہوں نے انتخابات کے دوران کسی مسلمان اُمیدوار کے حق میں اپنے ووٹ ڈال کر اُسے منتخب کرلیا تو یقیناً وہ ایسا مسلمان ہوگا جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرنے کی بجائے ان ہندوؤں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرنے لگے گا جنہوں نے اُسے اپنے ووٹوں کے ذریعے منتخب کیا ہے۔ مصنفین نے اس بات کی نشاندہی کی کہ کس طرح مختلف موقعوں پر کانگریس کے جلسوں میں اس قسم کے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ کیوں کہ ان کا سب سے پسندیدہ ہتھکنڈہ یہ رہا ہے کہ "پوری جلسہ گاہ میں اگر ایک بھی مسلمان نظر پڑ جائے تو اسے پکڑ کر کرسیٔ صدارت پر لا بٹھایا جائے۔" یہ تو گویا نمائندگی کا بڑا بھونڈا مذاق ہے۔ اسے دراصل "غلط نمائندگی" Misrepresentation کہا جانا چاہیے۔ اگر مجالسِ مقننہ کے انتخابات کے وقت بھی یہی حکمتِ عملی اپنائی گئی تو یقین ہے کہ ہندو کسی "کانگریسی مسلمان" کو اسمبلی کا رکن بنانے میں کافی مدد کریں گے اور ایسے مسلمان ہندوؤں کے ہتھے چڑھ جائیں گے جنہیں اسمبلی کی نشست پر منتخب ہونے کے اعزاز کی ہوس ہو۔ ایسے لوگ اس پالیسی کو ترک کر دیں گے جو ملت کے عین مفاد میں ہو اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کی بجائے چار و نا چار ہندوؤں کا ساتھ دینے لگیں گے۔ لہٰذا مصنفین نے اس بحث کا منطقی نتیجہ یہ نکالا کہ "نمائندگی کے اصول کا ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ممبروں کا انتخاب مسلمان ووٹرس کریں اور ہندو ممبروں کا انتخاب ہندو ووٹرس"۔ یہی اصول بلدیہ جات اور ڈسٹرکٹ بورڈس کے ممبروں کا انتخاب کرتے وقت بھی اپنایا جانا چاہیے۔

مصنفین نے واضح کیا کہ مندرجہ بالا تجاویز سے یہ بنیادی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ سیاسی مقاصد کے تحت مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں جن کی روایات، مفادات، سیاسی معتقدات اور مذہب سب جدا ہیں۔ یہاں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ مسلمان صحیح ہیں یا غلط۔ یہاں غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان کے خیالات و نظریات دوسروں سے یکسر مختلف ہیں اور کسی بھی معقول نمائندہ نظام میں اس بات کی گنجائش مہیا کی جانی چاہیے کہ وہ ان کا برملا اظہار کر سکیں[74]۔"

جوں جوں دستوری اصلاحات مرتب ہوتی رہیں توں توں مسلمانوں میں علیحدگی پسندگی کا رجحان تقویت پاتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم تعلقات جو پہلے ہی فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے کافی بگڑ چکے تھے، مزید ابتر ہو گئے۔ انیسویں صدی کے آخر تک دونوں فرقوں میں کئی سیاسی جھگڑوں کے واقعات رونما ہوئے۔ خاص طور سے لوکل بورڈس اور بلدیہ جات کے انتخابات خالص مذہبی خطوط پر لڑے گئے حالانکہ رائے دہندگان کی تقسیم فرقہ وارانہ بنیادوں پر نہیں کی گئی تھی۔

بلدیہ جاتی تقررات میں اقربا پروری کا آزادانہ طور پر استعمال کیا گیا اور کونسل کے چیمبرس میں ہندو اور مسلمان ممبران ہمیشہ اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہے۔ اسی بات سے یقیناً اُن جمہوری اُمنگوں کو زبردست صدمہ پہنچا جو رپن کی اصلاحات کی وجہ سے پیدا ہو چلی تھیں۔ اس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ نمائندہ اداروں کی کارکردگی متاثر ہوئی بلکہ فرقہ وارانہ منافرت کے رجحان کو بھی تقویت حاصل ہوئی جس کا بعد ازاں دونوں مذاہب کے مفاد پرستوں نے کھل کر استحصال کیا تاکہ وہ خود اپنے سیاسی موقف کو مستحکم کر سکیں۔

مسلمان چونکہ اقلیت میں تھے اس لیے زیادہ نقصان انہی کا ہوا۔ کئی مقامات پر تو ہندوؤں نے لوکل کونسلوں اور بلدیہ جات میں مسلمانوں کے داخلے کو تقریباً ناممکن بنا دیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کی واضح مثالیں کلکتہ اور پونا ہیں۔ 2 مارچ 1895ء کو پونا شہر کی بلدیہ کے انتخابات منعقد ہوئے جن میں مسلمانوں کی اکثریت نے مقامی رہنماؤں کے حسبِ مشورہ اپنے حق رائے دہی کا استعمال نہیں کیا اور انتخاب سے الگ رہے کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اپنے تمام ووٹوں کا استعمال کر کے وہ ایک بھی مسلمان امیدوار کو کامیاب نہیں کروا سکتے کیونکہ چھ سو سے زیادہ مسلم رائے دہندگان کچھ اس طرح شہر کے مختلف حصوں میں منتشر تھے کہ ہر جگہ اُن کی حالت ایک مایوس کُن اقلیت ہی کی تھی۔[75]

پونا کے مسلمانوں نے جس طرح انتخابات کا مقاطعہ کیا اس کا ردِ عمل ملک بھر میں ظاہر ہوا۔ دی ٹائمز آف انڈیا نے اپنے ایک طویل اداریے میں لکھا: "اس صورتِ حال کی ہم چاہے جو بھی توضیح پیش کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح ایک طاقت ور اقلیت کو علیحدہ رکھا گیا جس کی وجہ سے وہ اکثریت کے غلبے پر سخت نالاں ہے اور تمام مقامی دلچسپیوں سے لاتعلقی اختیار کر چکی ہے کیوں کہ انہیں دلچسپی لینے سے محروم کر دیا گیا ہے۔" بعض ہندو رہنماؤں کے اس بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہ حکومت مسلمانوں کی مطلوبہ تعداد کو نامزدگی کے ذریعے نمائندہ نظام کی نابرابری کا علاج تو کیا جا سکتا ہے۔" لیکن یہ طریقہ ازخود نیابت یا طریقِ نمائندگی کا نعم البدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پونا شہر کی بلدیہ کے معاملے میں اخبار نے دو طریقے ایسے سجھائے جن کی مدد سے مسلمان مناسب نمائندگی حاصل کر سکتے ہیں:

(1) تمام 16 حلقہ ہائے انتخاب Wards کو ایک ساتھ ملا کر ایک ہی اکائی بنا دی جائے تاکہ مختلف حلقوں کے اُمیدواروں کے حلقہ واری انتخاب Scrutin d'arrondissement کے طریقے کی جگہ اجتماعی انتخاب Scrutin de liste کا طریقہ لے سکے۔

(2) تمام رائے دہندگان کو تین یا چار بڑے حلقہ ہائے انتخاب میں منقسم کر دیا جائے تاکہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمان ہر حلقے سے کم از کم ایک نمائندے کو منتخب کر سکیں۔[76]

پونا کے انتخابات کے نتائج نے The Statesman کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے "اقلیتوں کے حقوق" کے تعلق سے ایک عام اداریہ سپردِ قلم کیا جس کے تلخ تجزیے میں حکومت کو متنبہ کیا گیا کہ ہندستان میں نمائندہ اداروں کی ترویج کے وقت وہ اس بات کو ہرگز فراموش نہ کرے کہ "مستقبل میں شاید کبھی ملیں لیکن موجودہ حالات میں ہندوؤں کے ووٹ مسلمان اُمیدواروں کو ہرگز نہیں ملنے والے۔" تاہم کلکتے کے اس اخبار نے اُن ناقدین سے اختلاف کیا جو یہ کہتے تھے کہ یہ نتائج اس بات کا مزید ایک ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ہندستانی انتظامیہ میں نمائندہ نظام کی ترویج مناسب نہیں ہے اخبار نے مزید لکھا: اس سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر اس نظام کو ہندستان میں کامیابی سے نافذالعمل کرنا ہو تو خاص اقدامات کے ذریعے اہم اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ ناگزیر ہے۔" کیونکہ انگلستان کے برخلاف اس ملک میں یہ مفادات مستقل اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے جو خرابی پیدا ہوگئی تھی اُسے دُور کرنے کے لیے اخبار نے اُنہی طریقوں کو اپنانے کا مشورہ دیا جو حکومت پنجاب نے لاہور کے سلسلے میں اختیار کیے تھے۔ جہاں ہر حلقۂ انتخاب Ward میں چار مذہبی فرقوں یعنی ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کو مختص تعداد میں نشستیں عطا کی گئیں۔ اخبار کے خیال میں "تمام حریف جماعتوں کو مطمئن کرتے ہوئے منصفانہ نتائج کے حصول کا شاید یہ سب سے آسان اور مناسب طریقہ ہے۔" ظاہر ہے لاہور میں اپنائے گئے اس اقدام کو ہندستانی سیاست میں اقلیتوں کے لیے "نشستوں کی تخصیص" کا پہلا تجربہ کہا جاسکتا ہے۔

مجالسِ مقننہ Legislative Council کی حالت بھی کوئی خاص بہتر نہیں تھی خاص طور پر بنگال کی مجلسِ مقننہ کی حالت جسے ہند میں نمایاں مقام حاصل تھا، اور بھی زیادہ دگرگوں تھی۔ وہاں بھی ہندو اثرات غالب تھے جنہیں اکثر ہندو مفادات کو تقویت پہنچانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ لیکن وہاں کے مسلم رہنما بھی چوکنے تھے اور جب کبھی ہندو رہنماؤں نے جانب دارانہ رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ اس ضمن میں مسلم کرانیکل کے ایک طویل اداریے کا یہ دلچسپ اقتباس ملاحظہ ہو:-

"ہمارے ہندو ہم وطن اپنی حب الوطنی کے تعلق سے چاہے کتنے ہی بلند بانگ دعوے کیوں نہ کریں اور وہ کتنے ہی روشن خیال اور تعلیم یافتہ کہلاکر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کے کونسلر بننے کے اہل ہی کیوں نہ قرار دیئے جائیں لیکن یہ حقیقت ہم پر بخوبی واضح ہو چکی ہے کہ اُن کی حب الوطنی دوسرا نام ہے ذاتی مفادات میں توسیع self aggrandisement کا اور ان کی یہ تعلیم اور تہذیب دوسرا نام ہے۔ مہذب پیرائے میں گوشت خور مسلمانوں سے نفرت کرنے کا۔"[78]

اس خفگی کے اظہار کی اصل وجہ بنگال کی مجلس مقننہ کے بعض سربرآوردہ ہندو رہنماؤں کا مبینہ فرقہ پرستانہ رویہ تھا۔ مسلمانوں کا ترجمان اخبار بڑے ہی کڑوے خطیبانہ انداز میں الزام تراشی کرتے ہوئے رقمطراز ہے:-

"جب مسٹر لال موہن گھوش جیسے لوگ بنگال کی کونسل میں یہ سوال اُٹھائیں کہ کلکتہ کی سڑکوں سے محرم کے جلوس کو گزرنے کی اجازت دینا کہاں تک مناسب ہے، جب آنریبل سریندر ناتھ بنرجی گاؤکشی سے متعلق حکومت بنگال کی نامعقول گشتی Obnoxious Circular کا خوشی کے ساتھ استقبال کریں، جب ناٹور Nature کا راجہ سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کی تعلیم پر معترض ہو۔ جب عزت مآب مولوی سراج الاسلام برطانوی حکومت میں مسلمانوں کے حالات کے بارے میں واحد قانونی سوال دریافت کریں اور مسٹر کاٹن Mr Cotton انتہائی اوچھے طریقے سے اُن کی سرزنش کریں اور تمام کی تمام ہندو قوم فرد واحد کی طرح مسٹر کاٹن کی تکریم کے لیے اُٹھ کھڑی ہو تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جلد ہی ہمارے ہم مذہبوں کی حالت بہت خطرناک ہونے والی ہے۔"[79]

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں عام طور پر مسلمان اپنے ہم مذہب نمائندوں کے انتخاب سے مطمئن نہیں تھے کیونکہ اُن کے بعض رسالوں کی رو سے ایسے نمائندے یا تو سایانی اور نواب سید محمد کی طرح کانگریس کے حامی ہوتے تھے یا بنگال کے مولوی سید محمود یا مدراس کے غلام محمد کی طرح سیاسی طور پر گمنام اشخاص ہوتے تھے۔ جس وقت آخر الذکر کے تقرر کا اعلان 1898ء کے اوائل میں کیا گیا، مسلم پریس نے مدراس کے اخبار محمڈن Mohammedan[80] کی شہ پر اس نامزدگی کے خلاف اتنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زبردست طوفان کھڑا کر دیا کہ Standard اور Hindu جیسے ہندو اخبارات نے بھی حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ آئندہ سے وہ زیادہ موزوں اور بہتر نمائندہ مسلم امیدواروں کو نامزد کیا کرے۔

لیکن جوں جوں مسلمان سرپرستی اور خصوصی مراعات کے لیے حکومت پر زیادہ سے زیادہ تکیہ کرنے لگے توں توں حکومت انہیں "خود مکتفی ہونے" اور "اپنی مدد آپ کرنے" کی ترغیب دلانے لگی۔ کرزن نے اکثر انہیں یاد دلایا کہ انہی اصولوں کو اپنا کر وہ اپنی شکایتوں کا ازالہ کر سکتے ہیں اور یہی اصول ان کی ملی تعمیر نو میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ گورنر جنرل نے ان کی گوشمالی کرتے ہوئے نصیحت کی کہ "مصنوعی رسیوں اور چرخیوں پر تکیہ نہ کیا کرو۔" اس نصیحت پر طنز کرتے ہوئے ایک مسلم اخبار لکھتا ہے: "ایسی نصیحت کرنا تو بہت اچھی بات ہے" لیکن اس سے صورت حال میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوئی۔ دراصل کرزن کی اس تنقید سے متاثر ہو کر اخبار مذکور نے ایک قصہ سنا ڈالا: "ایک باپ نے دیکھا کہ اس کا لڑکا کنویں میں گر گیا ہے۔ باپ نے اسے ڈانٹ ڈپٹ سنانی شروع کر دی جس پر لڑکے نے جواب دیا: "میرے اچھے ابا جان! فوری جا کر کہیں سے رسی اور چرخی لے آیئے اور پہلے میری جان بچایئے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے بعد میں بھی بہت وقت ہے۔" لیکن کرزن اپنی انتظامی اصلاحات میں اتنا مصروف تھا کہ اسے مسلمانوں کے حق میں "اچھے ابا جان" کا کردار انجام دینے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اس کی پالیسی کا بنیادی اصول 'مستعدی' تھا نہ کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی جو اکثر مستعدی کی راہ کا روڑہ ثابت ہوتی رہی۔

ہم گذشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ حکومت کا ایسا رویہ اور تلک اور ان کے ساتھیوں کا جارح ہندو ازم جس کا مظاہرہ خاص طور پر گنپتی اور شیواجی کے سالانہ جلسوں میں ہوا کرتا تھا۔ کس طرح سیاسی طور پر باشعور مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے تعلق سے خدشات میں مبتلا کر دیتا تھا۔ پہلی بار انہوں نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے اپنے آپ کو سیاسی طور پر منضبط نہیں کیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ ایسا انضباط یا تو کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کر کے کیا جا سکتا ہے یا پھر مسلمان خود اپنے طور پر یہ کام کر سکتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے تو انہیں پس و پیش رہا لیکن بالآخر پانسا ایک علیحدہ مسلم تنظیم کے حق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پھینکا گیا۔ اس ضمن میں 1905-6ء کے دوران وقوع پذیر ہونے والی دستوری صورتِ حال نے "اِن" علیحدگی پسندوں" کو کافی تقویت پہنچائی۔ انہوں نے حکومت کو قائل کر دیا کہ جب تک مسلمانوں کے حسب منشا اُن کے مطالبات کی تکمیل نہیں ہو جاتی اس وقت تک فرقہ وارانہ منافرت میں اضافہ ہوتا ہی رہے گا جس کے نتیجے میں فسادات پھوٹ پڑیں گے۔ لارڈ منٹو نہ صرف اُن کے ہمدرد تھے بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوؤں کی جانب سے دستوری ترقی کے عاجلانہ مطالبات کی روک تھام کے لیے مسلمان ایک بہترین بریک Brake ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جس وقت مسلم وفد نے "علیحدہ رائے دہندگی" Separate Electorate کا مطالبہ پیش کیا تب گورنر جنرل اور سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند نے بہت زیادہ خوشی کے ساتھ نہ سہی، اپنے منٹو مورلے اصلاحات میں اس مطالبے کو تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔[84]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

تیسرا باب (دستوری ارتقا)

۱ - 1868ء میں ایک دلچسپ پارلیمانی کتاب Blue Book بعنوان "ہندستان میں برطانوی اور دیسی طرزِ حکومت کا تقابل" Correspondence respecting British and Native Systems of Government in India شایع ہوئی۔ کئی تجربہ کار اینگلو انڈین عہدیداروں نے اس کتاب میں مختلف جزئیات کا جائزہ لیا اور مختلف رائیں پیش کیں لیکن ایک مسئلے پر غیر معمولی اتفاقِ رائے پایا گیا اور وہ یہ کہ ہندستانیوں کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ دیسی باشندوں کو اعلیٰ انتظامی عہدوں سے محروم رکھا گیا ہے اور حکومت اور عوام کے درمیان روابط کا شدید فقدان ہے۔

2 - ملاحظہ ہو Personal and Literary Letters of Lord Lytton II, 1 مزید ملاحظہ ہو لیٹن کا وہ خطبۂ تقسیم اسناد جو انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی میں دیا تھا۔ Convocation Address, I 359-85) اور سر جیمز فٹز جیمز اسٹیفن (Sir James Fitz James Stephen کا مضمون بعنوان Foundation of Govt. of India مطبوعہ Nineteenth Century اکتوبر 1883ء صفحات 541 — 68

3 - تاہم برطانوی مدبرین پیہم اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ یہاں "بلدیاتی شعور" (Municipal feeling) پیدا ہوا اور پروان چڑھتا رہے۔ لارڈ لارنس Lord Lawrence کی حکومت نے تو اپنی ایک قرارداد کے ذریعے واضح کر دیا تھا کہ "ہمیں ہندستان میں جو اقتدار اور موقف حاصل ہے اس کی بنا پر ہر حکمت عملی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وضع کرتے وقت اور ہر فرض کی ادائیگی کے وقت ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس ملک کا کاروبار جہاں تک زیادہ سے زیادہ ممکن ہو سکے یہیں کے مقامی باشندوں کے ذریعے انجام پائے جس کے لیے ملیئے کی فراہمی بھی اُنھی لوگوں کی جانب سے کی جایا کرے۔ ہمیں اپنے کاروبار کو اسی حد تک محدود رکھنا چاہیے جتنے کہ حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے اور سماجی مشنری کو عام طور پر متحرک رکھنے کے لیے ضروری ہوں"

ملاحظہ ہو گورنمنٹ آف انڈیا کا غیر معمولی گزٹ مورخہ 14 ستمبر 1864ء

4 - اپنی 14 دسمبر 1870ء کی قرارداد میں حکومت نے اس بات پر زور دیا تھا کہ "تعلیم، صفائی، حفظانِ صحت اور مقامی تعمیراتی کاموں کے لیے جو رقوم مختص کی جاتی ہیں ان کے صحیح مصرف کے لیے مقامی باشندوں کی دلچسپی، نگرانی اور احتیاط کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اس قرارداد کو اس کے پورے تقاضوں اور مقاصد کے ساتھ جب نافذ کیا جائے گا تب یہ مقامی حکومت خود اختیاری کے ارتقا اور بلدیاتی اداروں کی تقویت کے ساتھ ہی ساتھ انتظامی امور میں یورپین باشندوں کے ساتھ دیسی باشندوں کے اس حد تک اشتراک کا باعث ہوگا جس کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی" ملاحظہ ہو گزٹ آف انڈیا مورخہ 31 دسمبر 1870ء

5 - مدراس کے اُس وقت کے گورنر لارڈ ہوبرٹ Lord Hobart کی وہ تجویز جو انھوں نے 1871ء کی سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر تحریر کی جسے Report of the Committee on Local Self. Govt in Madras (1882) 9-10 میں نقل کیا گیا ہے

6 - ملاحظہ ہو The Report of the Committee on Local Self government in Madras. (1882), 10.

7 - معاصر Hindu Patriot قرارداد کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے "پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ برطانیہ کی ہندستانی حکومت نے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ بات اُس کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ راست انتظامی اقدامات کے ذریعہ عوام کی "سیاسی تربیت و تعلیم" کا اہتمام کرے" The Hindoo Patriot June 5, 1882

8 - مجوزہ سرکاری اختیارات میں ڈھیل دیے جانے کی اس تجویز پر کئی صوبائی حکومتیں اور اینگلو انڈین اعلیٰ عہدیدار چراغ پا ہو گئے۔ ملاحظہ ہو پارلیمانی کتابچہ Blue Book بعنوان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"Copy of or extracts from Correspondence between the Secretary of the State for India in Council, the Govt of India, and the various local governments, on the proposed Measures for the extension of local government in India," Parts I & II

The Pioneer, May 23, 1882 - 9

۔اس حوالے کو ہفتہ وار Statesman نے اپنی 3 جون 1882ء کی اشاعت میں نقل کیا۔ The Indian Spectator نے اس سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ "یہ ایک جنبش قلم اس ملک کی مستقبل کی سیاسی تاریخ میں ایک خاموش تدریجی اور مہتم بالشان انقلاب لانے کی کوشش کی گئی ہے" ملاحظہ ہو اس قرارداد پر Indian Spectator کا 28 مئی 1882ء کا اداریہ

11۔ یہ فقرہ 18 مئی 1882ء کی قرارداد میں استعمال کیا گیا۔

12۔ The Statesman, May, 26, 1882 ۔ اسی اخبار کا اس کے بعد والا اداریہ مورخہ یکم جون 1882ء بھی ملاحظہ فرمائیے۔

13۔ Statesman صفحہ 16 ۔ The Indian Review, Oct 1886 مزید اسی موضوع پر کا اداریہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

14۔ اُس رسالے کا نام تھا بنگال میگزین

15۔ اُلوبریا نام ہے ایک چھوٹے سے شہر کا جو کلکتے کے قریب ہی واقع ہے۔

16۔ ملاحظہ ہو بنگال میگزین بابتہ دسمبر 1872ء

17۔ اس معاملے میں ویب تنہا نہیں تھا جو اس قسم کے اقدامات کی وکالت کر رہا تھا بلکہ دیگر اینگلو انڈین عہدیدار بھی اس معاملے میں اس کے ہمخیال تھے۔ مثال کے طور پر رپن کی قرارداد کے شایع ہوتے ہی ساگرہ Salara کے فرسٹ اسسٹنٹ کلکٹر مسٹر ڈبلیو۔ لی وارنر W. Lee. Warner نے لکھا: "میں طریق انتخاب کا موافق ہوں لیکن اگر اس اسکیم کو عوام کے عادات و اطوار اور جذبات سے ہم آہنگ کرنا ہو تو مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں ہم لوگ اس کے ذریعے یہاں غیر متعصب عہدیداروں کے ذمہ دارانہ کنٹرول کی جگہ غالب ذات Predominent Caste والے لوگوں کی غیر ذمہ دارانہ جابریت کو مسلط نہ کر بیٹھیں۔ ہر کثیر ذات Caste کو نمایندگی دی جانی چاہیے اور اگرچہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"لڑاؤ اور حکومت کرو" کا اصول لوگوں کی عادات سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا تاہم اس اصول کو سختی سے برتا جانا چاہیئے۔" Pioneer بابتہ 16 اگست 1883ء سے ماخوذ۔

18۔ سندھ کے کمشنر ایچ۔ این۔ بی۔ ارسکن H. N. B. Erskine نے بھی اپنے 2 ستمبر 1882ء کے مراسلے میں حکومتِ بمبئی کو اسی قسم کی وارننگ دی "اس وسیع و عریض ملک کے تقریباً ہر حصے میں بسنے والے مختلف مذاہب اور قومیتوں کے لوگوں کے جذبات کم و بیش مشتعل ہو چکے ہیں۔ اس ملک میں حالیہ وقوع پذیر ہونے والے فسادات پر نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں اس بارے میں ذرہ برابر بھی شبہ باقی نہیں رہے گا۔ موجودہ فرقہ وارانہ جھڑپوں میں کثیر جانی نقصانات بھی ہوئے ہیں۔ ان چھوٹے بڑے فرقہ وارانہ فسادات کی وقوع پذیری کا احساس دلانے کے لیے ملتان، بنگلور اور سالم Salem کے فسادات کا تذکرہ کرنا ہی کافی ہوگا۔ مجھے ایسے متعدد فسادات یاد ہیں اور ابھی چند روز پہلے ہی کراچی اور حیدر آباد سندھ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین دشمنی اور منافرت کے مظاہرے ہو چکے ہیں۔ کیا یہ مناسب رہے گا کہ اس قسم کے ووٹروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر الیکشن کا انعقاد کروایا جائے؟ اس طرح تو شاید یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین الیکشن بازی ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک انتہائی خطرناک قسم کا تجربہ ہے اور اگر اسے نظر انداز کرنے سے انصاف کے تقاضے مجروح نہ ہوتے ہوں تو میری رائے یہی ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایسا انتظام کر دیا جائے کہ مختلف فرقے علیحدہ علیحدہ حقِ رائے شماری کا استعمال کر سکیں تو یہ بات ان کی روایات اور مذاق کے عین مطابق بھی ہوگی اور اس طرح سے انصاف کے تقاضے بھی مجروح نہیں ہوں گے۔ اس لیے میں مختلف حلقوں Wards میں انتخاب کروانے کے طریقے کی جگہ مندرجہ بالا طریقے کی پرزور سفارش کرتا ہوں۔"

15 اگست 1883ء کے Pioneer نے نقل کیا۔ اس پر حوتنقید شائع ہوئی اس کے لیے ملاحظہ ہو Indian Spectator مؤرخہ 30 ستمبر 1883ء

19۔ The Pioneer, May 23, 1882

20۔ Ibid

21۔ رپن کی قرارداد کے فوری نتیجے کے طور پر حسبِ ذیل صوبائی قوانین معرضِ وجود میں آگئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Madras act IV of 1884	:	مدراس
Bombay act II of 1884	:	بمبئی
Act III of 1884 (B.C)	:	بنگال
Act XV of 1883	:	شمال مغربی صوبہ و اودھ
Act XIII of 1884	:	پنجاب
Act XVII of 1884	:	برما

22 - درحقیقت اس سلسلے میں کئی برس بعد تک بھی حالات میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوئی جیسا کہ "ہندستان کی اخلاقی اور مادّی ترقی" نامی بیان میں کہا گیا: "قوم کے ڈرپوک قسم کے شرمیلے پن کی وجہ سے نہ تو وہ اپنے نئے حاصل شدہ اختیارات کو استعمال کرنے کے بارے میں مستعد تھی اور نہ ہی انتخابات میں حصہ لینے والے امیدوار اپنے حق میں پروپیگنڈہ کرنے کے فن سے واقف تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سابق قوانین کے تحت منتخب کیے ہوئے نمایندوں ہی کو اکثر بلا مقابلہ منتخب کرنے کا رجحان عام ہوگیا۔

ملاحظہ ہو The Third Decennical Report صفحہ 95 (1881-92)

23 - مذکورہ بل کا نام تھا Central provinces Local self Government Bill

24 - سرسید کی تقریر کے مکمّل متن کے لیے ملاحظہ ہو۔
Proceedings of the Council of the Governer General of India 1883, 16-20

25 - Ibid - بعدازاں شمال مغربی صوبے اور اودھ کے لیے ت کی جانب سے ایسے ہی قانون کی سفارش کرتے ہوئے آنریبل جے۔ ڈبلیو کرشنن (Hon. J. W. Quinton) نے کہا تھا: "مائی لارڈ، اس اصول کو دیہی صوبجات کے لیے کونسل پہلے ہی منظور کرچکی ہے جس کی وجوہات کو آنریبل سیّد احمد خاں جیسے وسیع المشرب تجربہ کار محبِ وطن نے اپنی پُرزور بلاغت کے ذریعے پہلے ہی واضح کردیا ہے۔ یہ وہ مایہ ناز دیسی سپوت ہے جس کی کامیاب مساعی اور روشن خیالی کا زبردست اثر اس کے خیالات و افکار میں جھلکتا ہے۔

(Ibid 418-19)

26 - مثال کے طور پر بنگال میں واقع ہماری پورنیا کی بلدیہ کے انتخابات کے 1884ء اور 1887 سے متعلقہ اعداد و شمار حسب ذیل ہیں۔

1884ء میں فائنڈ I کے 137 رائے دہندگان میں سے صرف 32 نے حق رائے دہی کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استعمال کیا۔

1884ء میں وارڈ II کے 196 رائے دہندگان میں سے صرف 21 نے حق رائے دہی کا استعمال کیا۔

" " 16 " " 64 " III " "

" " 22 " " 152 " IV " "

1887 میں وارڈ I 245 " " 32 " "

" II 260 " " 7 " "

" III 99 " " 7 " "

" IV 178 " " 17 " "

یہ اعداد و شمار پورنیا کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایچ۔ سی۔ کُک H C Cooke نے اپنے مضمون بعنوان Practical Experiences of local Self Govt in Bengal میں شایع کیے ہیں جو Calcutta Review کے اکتوبر 1888ء کے شمارے میں شایع ہوا۔

2۔ جے۔ پی ہیویٹ J. P. Hewett کا Review of the Administration of Local Boards جو حکومتِ ہند کی وزارتِ داخلہ کی قرارداد کی شکل میں Gazette of India کے ضمیمے میں 21 اگست 1897ء کو شایع ہوا۔

2۔ ملاحظہ ہو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی چھٹی جلد (صفحہ 535)۔ گو ایچ۔ جے۔ سی۔ کاٹن H. J. Cotton نے اپنے Review of Municipal Administration میں جسے حکومتِ ہند نے اپنی قرارداد کے طور پر شایع کیا ہے "گزشتہ دس برسوں میں حکومتِ خود اختیاری کی نمایاں ترقی" کا ذکر کیا ہے تاہم اس نے اس "سیاسی اور عوامی تعلیم" کی ترقی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جو رپن کی قرارداد کی بنیاد تھی۔ ملاحظہ ہو Gazette of India بابتہ 31 اکتوبر 1896ء

Lucien Wolf: Life of Lord Ripon, II, 128 (fn). - 29

The Moral and Material Progress of India (30th Decennial Report) 1921-22 to 1930-31, 128. - 30

Dodd 79 - 31 " مسلمانوں کے انہماک اور دلچسپی" کا اندازہ حسب ذیل گوشوارے سے ہوجاتا ہے جس میں کلکتہ میونسپل کارپوریشن کے انتخابی نتائج درج کیے گئے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نسل اور مذہب	درج رجسٹر	کتنوں نے ووٹ دیا	کتنے منتخب ہوئے	کتنے نامزد کیے گئے	میزان
ہندو	7964	2308	35	3	38
[illegible]	2340	445	9	14	23
[illegible]	1286	608	6	5	11
پارسی	29	1	–	1	1
جینی	9	3	–	–	–
یہودی	36	4	–	2	2
-	11664	3369	50	25	75

Ibid. 102

32 - اس نقطہ نظر کی بہترین وکالت کے لیے ملاحظہ ہو سر جولین گولڈ سمڈ (Sir Julian Goldsmid) کا مضمون بعنوان Questions of the Day in India مشمولہ Nineteenth Century بابتہ مئی 1883ء (صفحات 740-58) اور فلورنس نائٹ انگل "Our Indian Stewardship" کا مضمون بعنوان (Florence Nightingale) جو اسی رسالے کے اگست 1883ء کے شمارے میں صفحات 329-38 پر شایع ہوا

33 - Ilbert Bill کو اگر من وعن نافذ کر دیا جاتا تو اُس میں اس قسم کی گنجائش رکھی گئی تھی کہ مضافاتی عدالتوں Mofussil Courts میں "دیسی" ججوں کو اُن مقدمات کا اختیارِ سماعت بھی حاصل ہو جاتا جن میں فریقین یورپین برادری سے تعلق رکھتے ہوں اس بات نے اینگلو انڈین لوگوں کو اس قدر برہم کر دیا تھا کہ کھلے بندوں کہا جانے لگا کہ "غیر مقبول وائسرائے کو کان پکڑ کر دھکے مارتے ہوئے زبردستی جہاز میں لاد کر آسٹریلیا بھجوا دو" ملاحظہ ہو ایس۔ کے۔ ریٹ کلف S. K Ratcliff کی کتاب Sir William Wedderburn and the Indian Reform Movement صفحات 55-56

اسی طرح ملاحظہ ہو اخبار Indian Mirror کا 19 جنوری 1884ء کا اداریہ بعنوان "The Ilbert Bill and our Future Course of Action" سرسید نے بھی یوروپینوں کے احتجاج پر افسوس ظاہر کیا۔ وائسرائے کی مجلس قانون ساز میں بولتے ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھوں نے کہا: "اپنی انتہائی خواہش کے باوجود کہ یوروپین اور یوریشین لوگوں کے خیالات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ مائی لارڈ' میں ان لوگوں نے موجودہ بل کے خلاف جو رویہ اپنا کر رکھا ہے اس کے بارے میں اپنے گہرے دکھ اور افسوس کا مظاہرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا!

ملاحظہ ہو Proceedings of the Council of the governor General of India (1883) P. 182

34۔ کانگریس کی سالانہ رپورٹ 1885 صفحہ 23

35۔ Ibid 25

36۔ Ibid 1/12 6

37۔ Ibid۔ اس نکتے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے نوروجی نے کہا کہ: "ہم نے یہ سبق انگلستان سے سیکھا ہے اور یہ بات بھی انگلستان سے سیکھی ہے کہ جن قوموں کو یہ حق بخشا گیا ہے اُن کے لیے یہ کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ انگریز قوم کی کیسی غیر انگریزیت ہے کہ اُس نے ہمیں اس نعمت سے محروم کر رکھا ہے اس لیے ہم پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اُن سے اس حق کو طلب کر سکتے ہیں۔"

38۔ قرارداد کے تفصیلی متن کے لیے ملاحظہ ہو صفحات (Ibid. 1884) اور اُس قرارداد پر کی جانے والی تقاریر کے لیے ملاحظہ ہو صفحات (98 - 110)

39۔ کانگریس کی سالانہ رپورٹ 1886 صفحہ 96۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لیٹز: Indigenous Elements of self government in India کا مضمون G. W. Leitner مطبوعہ Journal of the East India Association 1884 صفحات 211 - 56 اور اسی مصنف کا مضمون Memorandum on the Subject of Self Govt. in the Punjab (Ibid. 261 - 326)

40 Hansard (Indian Debates) Session 1890 PP 67-68 ملاحظہ ہو سر الفریڈ لائل کی کتاب The Life of the Marquess of Dufferin and Ava, II 149-157

41۔ اس قرارداد کے تفصیلی متن کے لیے ملاحظہ ہو کانگریس کی سالانہ رپورٹ (1887) 13 14

42۔ Ibid 15

Ibid 28

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

44 - Ibid . مزید ملاحظہ ہو ریونڈر آر۔ اے۔ ہیوم کی ترمیم (صفحہ 30) اور ارٹلی نارٹن کا جواب صفحہ (31)

45 - Ibid 32

46 - Ibid 33

47 - Ibid 33

48 - Ibid 34-35

49 - Ibid 36-37

50 - Ibid 37-38

51 - Ibid xxxviii ۔ اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے واقعہ نگار لکھتا ہے "یہ بات کانگریس میں پائی جانے والی رواداری کے جذبے کے عین مطابق تھی کہ جس وقت سے یہ ترمیم پیش کی گئی تب سے آخر تک مقررین کے جارحانہ لب و لہجے کے باوجود اس مسئلہ پر کسی پارسی، عیسائی یا ہندو نے لب کشائی نہیں کی اور بحث میں حصہ نہیں لیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ چونکہ اس معاملے کا راست تعلق مسلمانوں کی ذات سے ہے اس لیے انھیں ہی اس مسئلے پر اچھی طرح بحث و مباحثہ کر لینا چاہیے۔" Ibid xxxiii

52 - اس عرضداشت کے مکمل متن اور اس پر ہندستان کے مختلف علاقوں سے جو دستخطیں حاصل کی گئیں ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ ج (Appendix C) ۔ ممڈن لٹریری سوسائٹی نے بھی اسی قسم کی ایک یادداشت پارلیمنٹ کے روبرو پیش کی تھی۔ ملاحظہ ہو 12 مئی 1890ء کا Pioneer ۔ بعد ازاں 28 مارچ 1892ء کو پارلیمنٹ میں انڈین کونسلس ایکٹ 1861ء کے ترمیمی بل پر تقریر کرتے ہوئے سر رچرڈ ٹمپل نے ایوان کو یاد دلایا کہ "مسلمان اس قسم کے نظام کے سخت مخالف ہیں۔ میں نے خود اس بارے میں متعدد عرضداشتیں اُن کی جانب سے پیش کی ہیں اور وعدہ کیا ہے کہ اس بل پر بحث کے دوران اُن کے مفادات کا لحاظ رکھوں گا۔" Hansard (Indian Debates) Session 1892, 168

53 - Statesman (ہفتہ واری ایڈیشن) 12 اپریل 1890ء مزید ملاحظہ ہو 22 مئی 1890ء کے Pioneer کا اداریہ بعنوان A Mohammadan Protest

54 - The Times, London, June 22, 1890 ۔ مزید اسی اخبار کی 22 جون 1890ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والی اشاعت میں کانگریس پر بھی ایک مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

Hansard (Indian Debates) Session 1890, 85 - 55

Ibid 85 - 56

Ibid -79 - 57

Ibid 88 - 58

59 . ایک خاص بات جس کی وجہ سے حکومت اِس بل کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے میں پس و پیش کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ کانگریس کے حق میں لبرل پارٹی کی حمایت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی جیسا کہ وزیر اعظم لارڈ سالسبری نے وائسرائے لارڈ لینس ڈاون کو اپنے 27 جون 1890ء کے نجی خط میں لکھا ہے: "آپ کے ہمدردانہ جذبات کو اگر میری اس صاف گوئی سے ٹھیس پہنچتی ہو تو اس کے لیے معذرت چاہتے ہوئے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان حالات میں جب کہ مسٹر گلیڈسٹون آج بھی ایک سیاسی قوت بنے ہوئے ہیں اُن کی موجودگی میں بل کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کا خطرہ میں قطعی مول لینا نہیں چاہتا۔ میری نظر میں وہ اپنے تمام احساس ذمہ داری کو کھو چکے ہیں البتہ پرانی تحکیمت اور مبہم فراخدلانہ فقرہ بازی کی خصوصیات آج بھی اُن میں موجود ہیں اور یہ بات مملکتِ برطانیہ کے لیے سنگین خطرے کا باعث ہوگی اگر ہندستان کے بعض Innovators اُن کے الفاظ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنالیں جن کا گلیڈسٹون کے منہ سے نکلنا یقینی امر ہے۔ اُن جیسا دوسرا ایسا کوئی سیاست داں نظر میں نہیں ہے جو اپنے چند بھاری بھرکم جرأت مندانہ فقروں کے ذریعے اُن کے مقابلے میں شر کے دسویں حصے کو بھی ہوا دے سکے۔" لارڈ نیوٹن نے ان الفاظ کو لارڈ لینس ڈاون کی سوانح میں نقل کیا ہے (صفحہ 72)

PP 128-34 Hansard Indian Debates Session 1892. - 60

61 . ملاحظہ ہو اِس بل کے لیے شوان (Schwan) کی ترمیم مشمولہ Hansard (Indian Debates) Session 1892. (PP. 128-34)

62 . لندن کا اخبار The Times ناقدین پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے متنبہ کرتا ہے کہ ہندستان کے لیے کسی بھی قسم کا نمائندہ نظام "سلطنت کی رعایا کے کمزور ترین افراد کے حق میں انتہائی مضر ثابت ہوگا اور مضبوط ترین افراد کے لیے ہتک اور توہین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(The Times: March 8, 1890) کا باعث ہوگا۔

63 - گلیڈسٹون کی تقریر کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ ہو۔

Hansard (Indian Debates) Session 1892 (P.P. 144 - 50)

64 - ملاحظہ ہو اخبار Pioneer کا 12 مارچ 1892ء کا اداریہ بعنوان "The Legislative Councils" "صاف اور واضح الفاظ کی بجائے پُرپیچ فقروں کے استعمال ہی کو بعض اوقات سرکاری زبان کی خوبی تصور کیا جاتا ہے اور اس مروجہ نظریے کی سطح سے لارڈ کراس بھی خود کو اونچا نہ اٹھا پائے کیونکہ ابھی ابھی جس فقرے کا حوالہ دیا گیا اُس میں بھی وہ صاف لفظوں میں یہ کہنے سے کترا گئے کہ اس بل کے ذریعے دیسی نمائندہ حکومت کا تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے" Ibid - مزید دانسرائے کی مجلس مقننہ میں سرسید کی خدمات پر تبصرے کے لیے ملاحظہ ہو مولانا حالی کی حیات جاوید صفحات 186 - 193۔ مختلف بلوں پر کونسل میں سرسید کی تقاریر کے لیے ملاحظہ ہو۔

Proceedings of the Council of the governor General of India

(1879) 154 - 60, 230 - 34; (1880) 12, 13, 39 - 43,

(1882) 61 - 64, 104 - 107; (1883) 16, 20, 182, 87,

65 - ملاحظہ ہو حالی کی حیاتِ جاوید جلد اوّل 192

66 - The Pioneer, Sept. 29, 1892.

67 - مزید ملاحظہ ہو اداریہ بعنوان A Mohammedan Confession of Political Faith; Ibid.

68 - 1867 - 68ء میں اپنے قیام انگلستان کے دوران سرسید نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ کارلایل سے ملاقات کرلیں کیوں کہ اس نے اپنی مشہور تقاریر میں حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کو "پیغمبروں کے ہیرو" کی حیثیت دی تھی۔

69 - The Pioneer, Nov. 30, 1893

70 - 22 جنوری 1894ء کو کلکتہ کے مقام پر وداع ہوتے ہوئے مسلمانانِ ہند کے سپاس نامے کے جواب میں لارڈ لینس ڈاؤن نے کہا: "آپ نے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ توسیع شدہ کونسلوں میں آپ کے فرقے کے لوگوں کو مناسب نمایندگی دینے سے گریز نہیں کیا جائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گا۔ اس ضمن میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ شروع ہی سے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ آپ لوگوں کو مناسب تعداد میں نشستیں حاصل ہوتی رہیں۔ حال ہی میں مسٹر چنٹل راوپنٹلو Mr. Chentsal Rayپید کی علیحدگی کے باعث جو جگہ خالی ہوئی ہے مجھے امید ہے اس جگہ پر کسی مسلمان کا تقرر ہوگا اور تب کونسل میں جملہ آٹھ ہندستانی اراکین ہو جائیں گے، جن میں سے تین ہندو، دو سکھ، دو مسلمان اور ایک پارسی ہوگا۔" ملاحظہ ہو

Speeches by the Marquis of Lansdowne, 377.

71۔ ملاحظہ ہو پارلیمانی قرطاس بعنوان "Return showing the date of establishment, under Act XVII of 1861 (1) of the Viceroy's Legislative Councils of Madras, Bombay, Bengal and North-Western Provinces and Oudh giving particulars as to appointment, position, length of service and Nationality of the members of the Councils, also number of Sittings of, and acts passed at the Viceroy's Council each year (1890)

72۔ مجز مورلین کے، جو 1903-4 میں لارڈ کرزن کی مجلس مقننہ کے رکن رہے۔

73۔ The Moslem Chronicle, Jan 16, 1897

74۔ اس ایکم کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ ہو 22 دسمبر 1896ء کا Pioneer

75۔ The Times of India (Overland Weekly Edition) March 9, 1895

76۔ Ibid March 16, 1895

77۔ The Statesman (Weekly) March 27, 1895۔ اس ضمن میں (Statement) کے زیر عنوان جو گوشوارہ Moral and Material Progress of India شایع کیا گیا اس میں لکھا ہے: "پنجاب کے بلدیاتی انتظامات کا ایک انوکھا پہلو یہ ہے کہ جملے (Constituencies) کے صدر مقام کے لیے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ حلقہ ہائے انتخاب کی تشکیل مذہبی بنیادوں پر کی جائے اور ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ علی الترتیب ایک خاص تعداد میں اپنے نمائندے منتخب کریں۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امرتسر میں بھی" نئے اصول وضع کیے گئے جن کے (Third Decennial Report, P. 96
تحت دونوں فرقوں کے لوگوں کو ان کی تعداد کے اعتبار سے نمایندگی دی گئی۔ یہ اصول نہایت
کامیابی کے ساتھ بروئے کار لائے گئے اور اس طرح ان کے ذریعے جماعتی خدشات کا ازالہ
ہو پایا۔" (Annual Statement for 1892-93, P. 32) 4 اپریل 1895ء
کے مسلم کرانیکل نے بھی ان اصولوں کو کافی سراہا۔

78. مزید ملاحظہ ہو اداریہ بعنوان The Moslem Chronicle, May 9, 1895
Government Resolution on Nomination of Representatives to the Council.
مسلم کرانیکل بابتہ 16 مئی 1895ء۔

79. The Moslem Chronicle, May 9, 1895

ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی بداعتمادی کی ایک اور ٹھوس وجہ بلدیہ جات اور لوکل
بورڈس پر بہت تھوڑے مسلمانوں کا منتخب ہونا تھی۔ مثلاً کلکتے کی بلدیہ کے سہ سالہ انتخابات
جس وقت 1897ء میں منعقد کیے گئے اُس وقت نو منتخب کشنروں میں 36 ہندوؤں
کے مقابلے میں صرف 6 مسلمان تھے۔ ملاحظہ ہو Moral and Material Progress
of India Annual Statement for 1897-98, P. 6.

80۔ ملاحظہ ہو 13 فروری 1898ء کے مسلم کرانیکل کا اداریہ۔

81۔ لارڈ کرزن نے یہ بات اُس سپاس نامے کے جواب میں کہی جو سندھ کے مسلم زمینداروں
نے 27 اکتوبر 1900ء کو کراچی کے مقام پر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس تقریر کے
مکمل متن کے لیے ملاحظہ ہو The Times of India (Overland Weekly Ed.) Nov 3, 1900

82. The Moslem Chronicle, Nov. 3, 1900

83۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد بعض مراٹھا دانشوروں نے میرے اس
تجزیے پر اعتراض کیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ تلک ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان جلسوں
کے ذریعے مسلم دشمنی پھیلائی جائے۔ مزید تحقیق کے بعد مجھے تلک کا حسب ذیل بیان ملا
جس سے مراٹھا دانشوروں کے موقف کی تائید ہوتی ہے: "شیواجی کا جشن مسلمانوں کو
چھیڑنے یا اُنھیں اپنے سے دور کرنے کے لیے نہیں منایا جاتا۔ حالات بدل چکے ہیں اور
جہاں تک لوگوں کی سیاسی حالت کا سوال ہے ہندو اور مسلمان ایک ہی کشتی میں سوار ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ہیں۔ کیا ان حالات میں ہماری دونوں قومیں شیواجی کی زندگی سے کوئی جوش اور ولولہ حاصل نہیں کر سکتیں؟ وہ چیز جو شیواجی کو آج کے دور کا قومی ہیرو بناتی ہے وہ ان کے کارنامے نہیں ہیں بلکہ وہ جذبہ ہے جس نے انھیں شروع سے آخر تک سرشار رکھا۔ شیواجی کی زندگی صاف طور پر اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ ہندستانی نسلیں اتنی جلدی اُس قوتِ حیات کو کھو یا نہیں کرتیں جو انھیں نازک اوقات میں قابلِ رہنما فراہم کرتی ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس عظیم مرہٹہ سردار کی تاریخ سے حاصل کرنا چاہیے اور اسی سبق پر زور دینے کے لیے شیواجی کا سالانہ جشن منایا جاتا ہے۔ یہ کہنا گویا حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ یہ محض حُسنِ اتفاق ہے کہ اُس وقت ملک میں پائی جانے والی صورتِ حال کے عین مطابق شیواجی نے مہاراشٹر میں جنم لیا۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل کا رہنما ہندستان کے کسی اور مقام پر پیدا ہو اور کون جانتا ہے کہ شاید وہ رہنما ایک مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔" یہ الفاظ کرسٹین ڈوبن

Basic Documents in the Development of Modern India and Pakistan, 1835 – 1947: Van Nostrand Reinhold Company Ltd London, PP. 50 – 53

(Christine Dobbin) نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔

84۔ جیسا کہ جان بچان John Buchan نے اپنی کتاب Lord Minto: A Memoir میں لکھا ہے: "اصل وقت مسلمانوں کے بارے میں تھی جن کے تعلق سے تمام موسم گرما میں ہندوستان اور انگلستان دونوں ہی جگہوں پر نزاعی بحث و مباحث کا سلسلہ چلتا رہا۔ یکم اکتوبر 1906ء کو مسلمانوں کا جو وفد منٹو سے ملا تھا اُس سے کی گئی یقین دہانی کے بموجب حکومتِ ہند مسلمانوں کو علیحدہ حق رائے دہی Separate Electorate عطا کرنا چاہتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے جائز مطالبات کی تکمیل ملی جلی حق رائے دہی (Mixed Electorate) کے ذریعہ اور جہاں انھیں منتخبہ نشستوں میں مناسب حصہ نہ مل سکے وہاں نامزدگی کے ذریعہ کرانی مقصود تھی۔ منٹو نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان بقیہ ہندستانی زندگی سے کٹ کر ایک بے جان مملکتِ غیر سے گھرا ہوا علاقہ enclave بن جائیں۔ لیکن بدقسمتی سے پارلیمنٹ میں اس بل پر بحث کے دوران سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس تجویز کو مسئلے کا بہترین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حل قرار دیا کہ متناسب نمایندگی (Proptional Represalalin) کی بنیاد پر ملے جلے انتخابی کالج Mixed Electoral College قایم کیے جائیں۔ اس تجویز سے ظاہر تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے مفادات کو "ملے جلے رائے دہندوں" Mixed elatorate کے تفویض کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف "فرقہ وارانہ بنیادوں پر نمایندگی" Communal Represantation کے اصول کو ترک کیا جا رہا ہے۔ اس وجہ سے اس تجویز کی مسلمانانِ ہند نے اور لندن میں مسٹر امیر علی اور آغا خاں نے سخت مخالفت کی۔ مسلمان رہنماؤں نے تو بڑے زبردست مطالبات پیش کیے تھے تاہم انھیں وائسرائے کی اسکیم کو قبول کرنے پر آمادہ کر لیا گیا۔ یعنی وائسرائے کی کونسل میں انھیں چھ نشستیں دی جائیں گی جن میں سے پانچ نمایندوں کا انتخاب خالصتاً مسلمان رائے دہندگان کریں گے اور ایک کو نامزد کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ملے جلے انتخاب کے ذریعے بھی ان کی تعداد میں ممکنہ اضافے کی گنجائش تھی۔ وایٹ ہال اور شملہ میں کئی وفود کو خوش آمدید کہا گیا اور ان کے معروضات سنے گئے۔ اگرچہ لارڈ مورلے کے دل میں اسلام کے لیے نرم گوشہ پنہاں تھا تاہم یوں محسوس ہوا گویا وہ آلام کے ترجمانوں سے تنگ آ گئے ہیں۔ یہ ایک نازک مسئلہ تھا جیسا کہ انھوں نے خود لکھا، "ہمیں اس بات کی احتیاط برتنی ہوگی کہ مسلمانوں کو زمین سے چنتے ہوئے کہیں ہم ہندوؤں کو ہاتھ سے نیچے نہ گرا دیں"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھا باب

انتظامی اصلاحات

اس تمام عرصے میں انڈین نیشنل کانگریس اوسطاً ہر سال بیس کے لگ بھگ قراردادیں منظور کرتی رہی۔ یہ قراردادیں مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی تھیں جن میں "ہماری چہیتی ماں" ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ اظہارِ وفاداری سے لے کر پلیگ پر کئے جانے والے خرچ پر تردد اور عصمت فروشی کی برائیاں سبھی کچھ شامل ہوتا تھا۔ اکثر قراردادوں میں پچھلے مطالبات ہی کو دہرایا جاتا تھا اور انہیں "ہمہ گیر قراردادوں" Omnibus Resolutions کے طور پر پیش کیا جاتا تھا تمام قراردادوں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل وہ قراردادیں تھیں جن میں مجالسِ مقننہ کی توسیع اور انہیں ہندستانی رنگ عطا کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ہم اس موضوع پر پچھلے باب میں تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں۔ دوسرا مسئلہ ہندستانی ملازمتِ عامہ Indian Public Service کا تھا۔ دراصل اس موضوع پر کانگریس کے اجلاسوں میں گرما گرم بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا اور اس کے سلسلے میں جتنا جوش و خروش دیکھنے میں آتا تھا اتنا کسی اور موضوع کے بارے میں دکھائی نہ دیتا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ تعلیم یافتہ طبقہ کا گہرا تعلق انہی ملازمتوں کی اصلاح سے وابستہ تھا۔

اس کے علاوہ دیگر قراردادیں بھی تھیں جن کا تعلق قانون اسلحہ (Arms Act) کے ضوابط میں نرمی پیدا کرنے، فوجی اخراجات میں کمی کرنے، انتظامیہ کو عدلیہ سے علیحدہ کرنے اور ممبرانِ جیوری کو مزید اختیارات عطا کرنے، بندوبست دوامی Permanent Settlement اور زرعی بنک قایم کرنے، نمک کے محصول میں کمی کرنے، کپاس پر آبکاری محصول ختم کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سودیشی چیزوں کی ہمت افزائی کرنے سے تھا۔ زیر تبصرہ مدت کے آخری برسوں میں "غربت اور قحط" کے عام مسئلے نے بھی کافی اہمیت اختیار کر لی تھی۔

تمام ہی موضوعات پر ایک جیسی توجہ اور توانائی صرف نہیں کی گئی۔ بعض مسائل پر تو کوئی خاص ردِ عمل ظاہر ہی نہیں ہوا۔ اُن کا ذکر صرف قراردادوں میں کیا گیا جنہیں حکام کے پاس بھیجا گیا اور پھر بھلا دیا گیا۔ بعض مسائل البتہ ایسے ضرور تھے جن پر خلوصِ نیت کے ساتھ توجہ دی گئی اور ان پر بار بار اصرار کیا گیا۔ ایسے مسائل میں ملازمت عامہ میں اصلاح، عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی اور ملک میں پائی جانے والی عام غربت اور قحط کے مسائل شامل تھے۔ ان مسائل نے نہ صرف سرکاری اور غیر سرکاری عہدیداروں میں تلخ نزاع چھیڑ دیا بلکہ ہندو اور مسلمان رہنما بھی اس بارے میں ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے۔ خاص طور پر کسی اور مسئلے نے تمام ہی فریقین کو اس قدر برافروختہ نہیں کیا جتنا کہ ملازمتِ عامہ کی اصلاح اور تشکیل جدید کے مسئلے نے۔

1885ء میں کانگریس نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں بالاتفاق آرار" ملازمتِ عامہ کے سول Civil شعبوں میں ابتدائی تقررات کے لیے" ہندستان اور انگلستان میں بہ یک وقت امتحانات کے انعقاد کے تعلق سے ایک قرارداد منظور کی۔ جو 1860ء کی انڈیا آفس کمیٹی کے نقطہ نظر کے عین مطابق تھی۔[1] دادا بھائی نوروجی، جنہوں نے یہ قرارداد پیش کی تھی، نے اِسے" ہندستان کی اخلاقی اور مادی ترقی کی سب سے اہم کلید" قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس مطالبے کی تکمیل کے بغیر دیگر تمام سیاسی اصلاحات بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ اُنہوں نے واضح کیا کہ یہ" ہندستان کے لیے موت اور زیست کا مسئلہ ہے"۔[2]

ہندستان کی ملازمت عامہ کا جائزہ لینے اور" باشندگان ہند اعلیٰ ملازمتوں میں وسیع پیمانہ پر حصّہ پانے کا جو مطالبہ کر رہے ہیں اُن کے اس مطالبے کے ساتھ منصفانہ طور پر نپٹنے کے لیے حکومت کی اسکیم کو قطعیت دینے کی خاطر" 1886ء میں ایک رائل کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس بات کا اعلان بھی کیا گیا کہ اس کمیشن کی چھان بین دراصل ہندستانی معاملات کے بارے میں پارلیمانی تحقیقات کا ابتدائی مرحلہ ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ اس کمیشن کا قیام کانگریس کی کسی قرارداد کا نتیجہ نہیں تھا تاہم ملازمت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عامہ میں اصلاحات کا مطالبہ کئی برسوں سے کیا جا رہا تھا۔ متعدد ہندستانی تنظیمیں Indian Associations..... کئی برسوں سے ملازمت عامہ کے اُصول وضوابط میں تبدیلیوں کا مطالبہ کر رہی تھیں مثلاً 1878ء میں سریندر ناتھ بنرجی نے ملک کے طول و عرض کا کامیاب دورہ کیا اور مختلف صوبوں میں اپنی تقاریر کے ذریعے لارڈ سالسبری کے اس انحطاط پذیر اقدام کے خلاف رائے عامہ ہموار کی جس کے ذریعے انہوں نے سول سروس امتحانات کے لیے عمر کی حد کو گھٹا کر 19 برس کر دیا تھا۔ مزید برآں 1879ء میں اس مسئلے کے بارے میں ایک کل ہند یادداشت All India Memorial دارالعوام کے روبرو پیش کی گئی۔ اس طرح کانگریس قرارداد اس مسئلے کے بارے میں عوامی ردِّعمل کا مکمل اظہار بن گئی۔[3]

یہ رائل کمیشن 15 ارکان پر مشتمل تھا جس میں چار ہندو، دو مسلمان اور باقی یورپین اور اینگلو انڈین تھے جن میں اکثریت سرکاری عہدیداروں کی تھی۔ اس کمیشن کے سربراہ مدراس ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس سر سی۔ اے۔ ٹرنر Sir C.A. Turner تھے۔ کسی کانگریسی رہنما کو کمیشن میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ دو مسلمان اراکین میں سرسید اور بڑودہ کے سابق دیوان قاضی شہاب الدین شامل تھے۔ اس کمیشن کا پہلا اجلاس لاہور کے مقام پر 5/ دسمبر 1886ء کو منعقد ہوا جس میں عام لائحہ عمل ترتیب دیا گیا۔ بعد ازاں کمیشن مختلف ذیلی کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ مختلف صوبوں میں ابتدائی انتظامات کیے جا سکیں۔ کمیشن ہندستان کے مختلف اہم مراکز جیسے لاہور، الٰہ آباد، جبلپور، بمبئی، مدراس اور کلکتہ بھی گیا اور وہاں سیکڑوں گواہوں کے بیانات سُنے اور قلمبند کیے جن میں سرکاری اور غیر سرکاری سبھی لوگ شامل تھے۔

اپنا پہلا اجلاس منعقد کرنے سے پہلے کمیشن نے متعدد مشوروں اور اسکیموں پر مشتمل حکومتِ ہند کی جانب سے مہیا کی جانے والی سرکاری دستاویزات کی روشنی میں اپنی چھان بین کے لیے متعدد تفصیلی سوالنامے مرتب کیے جنہیں مقامی حکومتوں کے پاس بھیجا گیا تاکہ ایسے موزوں سرکاری اور غیر سرکاری افراد کے علاوہ مختلف تنظیموں، انجمنوں اور انگریزی اور ہندستانی زبانوں کے اخبارات کے مدیروں میں تقسیم کیے جائیں جنہیں مقامی حکام اس مقصد کے لیے منتخب کریں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کلکتہ میں منعقد ہونے والے کانگریس کے دوسرے اجلاس میں اُس گشتی Circular پر طویل اور گرما گرم بحث ہوئی جس میں یہ سوالنامے شامل کیے گئے تھے اور اُس کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی قایم کی گئی۔ اس کمیٹی نے حسب ذیل تجاویز پیش کیں:

1- ہندستان اور انگلستان میں بہ یک وقت مقابلے کے کھلے امتحانات منعقد کیے جانے چاہئیں۔

2- بہ یک وقت منعقد ہونے والے اُن امتحانات میں شرکت کے مساوی مواقع ملکہ عالیہ کی رعایا کے سبھی طبقوں کو حاصل ہونے چاہئیں۔

3- بلحاظ امتیاز (merit) کامیاب اُمیدواروں کی درجہ وار فہرست classified list مرتب کی جایا کرے۔

4- سول سروس کمشنروں کو چاہیے کہ امتحانی مضامین میں سنسکرت اور عربی کا مناسب لحاظ رکھیں۔

5- امتحان کے لیے اہل قرار دیئے جانے والے اُمیدواروں کی عمر 19 سال سے کم یا سر سی۔ آئی چی سن Sir. C. Aitchison کی سفارش کے مطابق 23 سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

6- بہ یک وقت امتحانات کے انعقاد کا مطالبہ تسلیم کیے جانے کے بعد دستوری سول سروس statutory Civil Service کے تحت ابتدائی تقررات کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔

7- موجودہ قوانین کے مطابق دستوری سول سروس Statutory Civil Service کے تقررات کو ملازمت غیر متعہدہ Uncovenanted Service کے ارکین اور پیشہ ورانہ مہارت اور صلاحیت رکھنے والے لوگوں کے لیے کھلا رکھا جائے۔

8- معہودہ ابتدائی تقررات Covenanted first appointments کے علاوہ ایسے تمام تقررات جن میں تعلیمی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے مختلف صوبوں میں مقابلے کے امتحانات کے ذریعے کروائے جائیں۔ یہ امتحانات ملکہ عالیہ کی فطری پیدائشی رعایا Natural Born Subjects

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ان تمام افراد کے لیے کھلے ہونے چاہئیں جو رہائشی
اعتبار سے اُن صوبوں کے باشندے ہوں۔

انہی مطالبات کو کسی نہ کسی شکل میں مقتدر ہندو رہنماؤں نے کمیشن کے روبرو پیش کیا۔ انہوں نے خاص طور پر (1) کھلے مقابلے کے امتحانوں (2) بیک وقت امتحانوں کے انعقاد اور (3) دستوری سروس Statutory Service کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ مسلمان گواہوں کی اکثریت نے البتہ ان تینوں مطالبات کی مخالفت کی۔ وہ مقابلے کے کھلے امتحانوں کے اس لیے مخالف تھے، جیسا کہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے، کہ "وہ محسوس کرتے تھے کہ ملک کے موجودہ حالات میں قوم کے اہم طبقوں کو عملاً ان امتحانات میں کامیابی سے محروم کر دیا گیا ہے جنہیں بطورِ خاص قابلیت کا پیمانہ تصور کر لیا گیا ہے"[6] بعض مسلمان گواہوں نے اس کی دیگر وجوہات بھی بیان کی ہیں مثلاً رفیق ہند جیسے مقتدر اسلامی اخبار کے مدیر منشی محرم علی چشتی کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ ان مقابلے کے امتحانات کی وجہ سے "نیچ ذات کے بداطوار لوگ" اقتدار پر قابض ہو جائیں گے اور "اعلیٰ خاندان کے شرفاء" اُن آسامیوں سے محروم ہو جائیں گے جن پر وہ "کئی پشتوں" سے فائز تھے۔[7] سید حسین بلگرامی نے جو بعدہٗ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن بھی گئے تھے، مسابقتی امتحانات کی نہ صرف اس لیے مخالفت کی کہ اس طرح مسلمان حکومت میں اپنے حصے سے محروم ہو جائیں گے بلکہ اس لیے بھی کہ "مسابقت" کے ذریعے اور کسی چیز کا امتحان نہیں ہوتا بجز "معلومات کو جذب کرنے کی استعداد کے۔ بلکہ معلومات کو اکٹھا کرنے کی استعداد کے تاکہ مناسب صحیح Proper Stimulus کا استعمال ہوتے ہی اُن معلومات کو واپس اُگل دیا جائے"۔ "جسمانی قوتِ برداشت، کھیل پٹھوں کا کس بل، اخلاقی برتری، نڈر اور بے باک کردار، یہ وہ صفات ہیں جنہیں تحریری امتحانات کے ذریعے ہرگز نہیں جانچا جا سکتا"۔[8]

دوسرے سربرآوردہ مسلمان گواہ نواب میر نواز جنگ بہادر Nawab Mir Nawaz Jung Bahadur نے کمیشن کو بتلایا کہ انہیں اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ "ہندستان میں رسوخ influence و منصب rank اور ثروت fortune کی جتنی عزت اور اطاعت کی جاتی ہے شاید دنیا میں کہیں نہیں"۔ انہوں نے زور دے کر یہ بات بھی کہی کہ "اس ملک کی گھریلو صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کسی وسیع تر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسکیم پر غور کرتے ہوئے خطرات مول لیے بغیر ان چیزوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہوں لیکن کیا وہ ایک عظیم الشان شاہانہ ماضی کے وارث نہیں ہیں؟ کیا وہ اکثریتی فرقے کے مقابلے میں برطانوی راج کے زیادہ وفادار نہیں ہیں؟ کیا وہ "نو دو لیتے ... ہندوؤں کے مقابلے میں حکومت کے پیچ و خم سے زیادہ واقف نہیں ہیں؟ مسابقتی امتحانات انتظامیہ میں مسلمانوں کو معدومیت ... کے مقام تک پہنچا دیں گے۔ اس لیے نواب صاحب نے مطالبہ کیا کہ "کسی بھی ملازمت کے لیے عام یا محدود کسی بھی سطح پر کوئی مسابقتی امتحانات منعقد نہیں کیے جانے چاہئیں۔"

جس وقت کمیشن کے سربراہ نے اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ مسلمان خود اپنی پسماندگی کے لیے ذمہ دار ہیں تو اس سے کہا گیا کہ وہ "سابقہ نسلوں" کے گناہوں کی سزا "موجودہ نسل" کو نہ دے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ خواہ کن ہی وجوہات کی بنیاد پر کیوں نہ ہو، ان "مراعات" "احسانات" اور "تحفظات" کا سلسلہ کب تک یوں ہی چلتا رہے؟

کمیشن کے ایک رکن کے۔ ایل۔ نولکر ... نے ایک مشہور مسلمان صدر مدرس سے دریافت کیا: "انسانی جدوجہد کے ہر شعبے میں کیا یہ ایک مسابقتی دور نہیں ہے؟"

"جی ہاں، ہے"

"اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اب یہ بتایئے کہ مسلمانوں کو دوسروں کے دوش بدوش آنے میں اور کتنا عرصہ درکار ہوگا؟"

"ویسے میں کسی خاص مدت کا تعین تو نہیں کر سکتا لیکن میرے خیال میں آئندہ پچیس برسوں میں وہ ضرور دوسروں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو سکیں گے۔ ویسے دوسروں کے لیے یہ ضروری تو نہیں ہے کہ کسی خاص مذہبی جماعت کو سہولتیں بہم پہنچائیں۔ تاہم یہ فعل قرینِ مصلحت ضرور ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ خصوصی مراعات حاصل ہوئے بغیر مسلمان تنہا اپنی سخت محنت کے بل بوتے پر اس دوڑ میں ہندوؤں تک پہنچ سکیں گے۔ ایسا نہ ہونے پر وہ دل شکستہ ہو کر یاسیت کا شکار ہو جائیں گے۔"[10]

مسلم گواہان صرف یہ چاہتے تھے کہ ملازمتوں میں انہیں ان کا جائز حق دیا جائے۔ وہ اس سے زیادہ کا کوئی مطالبہ نہیں کر رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اگر ان کو ان کی آبادی کے تناسب سے ملازمتیں دے دی جاتی ہیں تو وہ مطمئن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوجائیں گے۔ اس مطالبے کی تکمیل کے یہ معنی ہوئے کہ انہیں آج جتنی ملازمتیں حاصل ہیں اُس کی دوگنی ملازمتیں اُنہیں دینی پڑتیں اس طرح بعض ہندوؤں کو ان ملازمتوں سے ہاتھ دھونا پڑتا جن پر وہ اُس وقت فائز تھے۔ اسی وجہ سے ہندو گواہان ملازمتوں میں ہندو مسلم تناسب مقرر کرنے کی مخالفت کر رہے تھے۔ مثلاً کاشی ناتھ تیلنگ نے یہ کہتے ہوئے پُرزور طریقے سے تناسب کے مسئلے کو رد کر دیا کہ "میں نہیں سمجھتا کہ ایسے بندھے ٹکے اصول مناسب طور پر کارگر ہو سکتے ہیں"۔[11] اسی طرح بابو راش بہاری گھوش نے کمیشن سے کہا کہ مسابقتی امتحانات میں کسی قسم کی وسعت اندازی کی اجازت نہ دی جائے۔ جب کمیشن کے ایک رکن فٹز پیٹرک Fitz Patrick نے انہیں یاد دلایا کہ اگر مناسب سدِّباب check نہ کیا گیا تو مسلمان بالکل ہی معدوم Eliminate ہوجائیں گے۔ کیا یہ پریشان کن صورتِ حال نہیں ہوگی؟ گھوش نے جواب دیا: "جہاں تک ملازمتِ عامہ میں مستقری Efficiency کا سوال ہے اِس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور یہی وہ بنیادی اُصول ہے جس کی جانب ہمیں سب سے پہلے توجہ دینی چاہیے۔"[12]

اسی قسم کے ریمارکس سے مسلمان رہنما خوفزدہ تھے۔ ان کی عین خواہش یہ تھی کہ اُن کے تعلیم یافتہ نوجوان کو سرکاری ملازمتوں میں ضم کیا جائے۔ انہیں اس امر کا یقین ہوچکا تھا کہ جب تک ان کے لیے چند آسامیوں کی تخصیص نہیں ہوجاتی، ملازمتوں پر ہندوؤں کی اجارہ داری کو ختم نہیں کیا جا سکے گا۔

اس خوف سے کہ ہندو اکثریت کا دھارا انہیں بہالے جائے گا بعض مسلم رہنماؤں نے بہ یک وقت ہندستان اور انگلستان میں امتحانات کے انعقاد کی مخالفت کی۔ اگرچہ مسلم گواہوں کی اکثریت نے اس کی موافقت کی تھی۔ اس کے مخالفین میں سیّد امیر علی اور محسن الملک تھے جو بہ یک وقت سارے ہندستان میں امتحانات کے انعقاد سے سخت متوحش تھے۔

انہیں خوف تھا کہ ہندستانی جامعات، جو پہلے ہی بی۔ اے اور ایم۔ اے سازی کی مشینیں بن چکی تھیں، مساوی تعداد میں بےروزگار ملازمین پیدا کرنے لگیں گی اور اس طرح ملک بھر میں ان کی بھیڑ لگ جائے گی اور ایسی صورت میں مسلمانوں کو کامیابی کا کوئی موقع ہاتھ نہ لگے گا۔[13] جب کمیشن نے مسلمان گواہوں کو یاد دلایا کہ بہ یک وقت امتحانات کے انعقاد کے مطالبے کے پیچھے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پایا جانے والا وہ تعصب کارفرما

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جس کی رو سے کسی کو سمندر پار نہیں کرنا چاہیے، تو انہوں نے اس بات سے انکار کیا اور کمیشن کو بتلایا کہ ان کے پیغمبر نے تو یہ حکم دے رکھا ہے کہ علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین تک ہی کیوں نہ سفر کرنا پڑے[14] لیکن ان مباحث سے قطع نظر جیسا کہ سید محمود نے کمیشن کو بتلایا بیک وقت امتحانات کے انعقاد کے خلاف اُن کا اصل اعتراض خالصتاً سیاسی "قومیت" کا تھا۔[15]

مزید برآں دستوری سروس Statutory Service کی بدستور بحالی کے سلسلے میں وہ اپنے موقف پر اٹل رہے اور اس کے لیے جس مضبوطی اور استقلال کے ساتھ لڑتے رہے اس نے کمیشن کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ 1879ء میں شروع کی جانے والی یہ سروس دراصل ہندستانی امراء کے لیے ایک قسم کی بھرپائی Compensation تھی جو اس قدر خستہ حال hopeless ہو چکے تھے کہ کسی قسم کا امتحان کامیاب کرنا اُن کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس سروس کے قوانین کے تحت حکومت کو اس بات کا اختیار حاصل تھا کہ وہ "صاحب حیثیت، بااثر اور خاندانی لوگوں کو نامزد کر سکے"[16] کمشنر نے اپنی رپورٹ میں واضح کیا کہ "بجز بنگال کے کہیں بھی کسی شخص کو محض اس کی دانشورانہ قابلیت کی بنا پر دستوری سویلین Statutory Civilian کے طور پر مقرر نہیں کیا گیا۔"[17]

اگرچہ حکومت خود اسی سروس کے بارے میں کسی قسم کی گرمجوشی کا جذبہ نہیں رکھتی تھی تاہم تعلیم یافتہ ہندو اکثر اس کی مذمت کرتے رہتے تھے اور مسلسل اس کے خاتمے کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ لیکن کئی سربرآوردہ مسلم رہنما اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اسے ایک "دانشمندانہ فعل" تصور کرتے تھے کیونکہ اس کے ذریعے سبھی فرقوں کے مفادات کا یکساں تحفظ ہوتا تھا اور ان لوگوں کے لیے ترقی کی گنجائش نکلتی تھی جو امتحانات میں دوسروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے ذریعے انتظامی صلاحیتوں کی ہمت افزائی بھی ہوتی تھی[18] انہیں اس سے خصوصی رغبت اس لیے بھی تھی کہ اس کے لیے اہل قرار دیئے جانے کے لیے لازمی تھا کہ اُمیدوار کا تعلق "معزز گھرانے سے ہو" وہ "نسب کے اعتبار سے اونچے گھرانے سے تعلق ہو" اور "صاحب حیثیت" ہو۔ بقول بلگرامی:۔

"میں نیچ ذات کے لوگوں کو ہرگز اس میں شامل نہیں کروں گا۔ اصولاً میں ان تمام لوگوں کو مشکوک نظروں سے دیکھوں گا جو نچلی سطح سے ابھر کر آگے آئے ہوں۔"[20]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کمیشن کے روبرو اس طبقے کی سب سے عمدہ وکالت بیک Beck نے کی اور ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کیا جس میں اس طبقے کے افکار و نظریات کے ساتھ ساتھ مختلف تجاویز بھی پیش کی گئیں۔ اس لائحہ عمل کے مطابق حکومت سے کہا تھا کہ وہ معزز "دیسی" ذرائع سے مختلف اضلاع کے اُن نوجوانوں کے بارے میں تفصیلی معلومات اکٹھا کرے جن کا تعلق قدیم شرفاء کے گھرانوں سے ہو اور جو انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہوں۔ بیک نے "اچھے خاندان" یا "شرفا کے خاندان" کی تعریف کرتے ہوئے انہیں ایسے خاندانوں سے تعبیر کیا ہے "جو کئی پشتوں تک یا حالیہ دنوں تک معزز سماجی حیثیت کے حامل رہے ہوں؛ مخفی مبادا کہ مساوی قدامت کے حامل خاندانوں میں تفوق کا فیصلہ خالص نسب اور اعلیٰ نسل کی بنیاد پر کیا جائے گا۔"[21] انہوں نے "اچھے خاندانوں" کی درجہ بندی اُن کی اہمیت کے اُصول کی بنیاد پر بھی کی۔ اس سلسلے میں پہلے درجے میں وہ خاندان آتے ہیں جو نسب عالی Pure descent اور سماجی حیثیت Social Position دونوں ہی کے حامل رہے ہوں۔ جیسے کہ مسلمانوں میں قدیم نواب اور زمیندار، مشہور صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے ورثاء یا قدیم امراء اور حاکموں کی اولاد، ہندوؤں میں راجپوت سردار یا سربرآوردہ برہمن یا اعلیٰ طبقے کے بنیے، اس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کو پرکھنے کا معیار تھا "اس مدت کا تعین جس میں کوئی خاندان سماجی حیثیت کا حامل رہا ہو"۔ دوسرا درجہ اُن خاندانوں کا تھا جو اعلیٰ نسبی کے تو مدعی نہ ہوں بلکہ حیثیت کے حامل ہوں جیسے کائستھ، جاٹ اور کرمی Kurmi وغیرہ۔ تیسرا درجہ اُن خاندانوں کا تھا جن کے پاس کوئی حیثیت تو نہ تھی لیکن جو اعلیٰ نسبی کا دعویٰ رکھتے تھے جیسا کہ خالص عرب خون رکھنے والے مسلمان۔ آخری درجے میں وہ خاندان آتے تھے جن کے پاس کوئی نسب تو نہیں ہے البتہ جو ایک پشت سے حیثیت کے حامل ہیں۔ اس زمرے میں وہ لوگ شامل ہیں جنہیں 1857ء کے غدر کے دوران وفاداری کے انعام کے طور پر حکومتِ برطانیہ نے اعلیٰ عہدوں اور جاگیروں Estates سے سرفراز کیا تھا۔

بیک نے حکومت کو مشورہ دیا کہ مندرجہ بالا درجہ بندی کی روشنی میں وہ آئندہ سے سول سروس کے متمنی اُمیدواروں کے دعووں کا فیصلہ کرے۔ بیک کے بقول دستوری سروس Statutory Service کا خاتمہ "پاگل پن کے اقدام" سے کم نہیں ہوگا۔ انہوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سروس کے خاتمے کا نہیں بلکہ اس کی توسیع اور تقویت کا مشورہ دیا۔ انہوں نے اہم عہدوں پر "دیسی" لوگوں کے تقرر کے موجودہ طریقے پر حکومت سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جس کی وجہ سے تقریباً تمام ہی ایسے قدیم شرفاء کے خاندان ملازمتوں سے محروم ہو گئے جو اپنی روایات اور کردار کے اعتبار سے عوام کے دلوں پر خاصا اثر رکھتے تھے۔ بیک نے کمیشن کو متنبہ کیا کہ ان خاندانوں کو نظر انداز کرنا گویا سیاسی پریشانیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔[22]

رائل کمیشن کے ممبران سر برآوردہ مسلم رہنماؤں کے ان دلائل سے متاثر نہیں ہوئے۔ اپنی رپورٹ میں انہوں نے بجز ایک کے ان کے کسی اور مطالبے کی حمایت نہیں کی اور وہ حمایت بھی دفتر شاہی کی خواہشات کے احترام میں کی گئی۔

مثلاً انہوں نے مسابقتی نظام کو جاری رکھنے کی پُرزور سفارش کی کیونکہ گذشتہ تیس سالہ تجربہ ان کے خیال میں اسی بات کا متقاضی تھا۔

انہوں نے دستوری سروس statutory service کو ختم کر دینے کی سفارش کی اور واضح کیا کہ "متعدد معقول وجوہات کی بنا پر اسے نہ صرف دیسی لوگوں کے مخصوص فرقے ہی ہدف ملامت بنا رہے ہیں بلکہ بڑی تعداد میں دیسی اور یوروپین عہدیدار بھی اس سروس کی کارکردگی کے عملی تجربے کی روشنی میں اس کے بارے میں اظہار ناپسندیدگی کرتے ہیں۔"[24]

صرف بہ یک وقت امتحانات کے انعقاد کے مطالبے کے بارے میں انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ایسا کرنا "قرینِ مصلحت نہیں ہوگا۔"[25]

بہ حیثیت مجموعی یہ سفارشات مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کے لیے زیادہ سود مند تھیں تاہم تعلیم یافتہ ہندو حضرات بیک وقت مسابقتی امتحانات کے انعقاد کے مطالبے پر جمے رہے۔ رائل کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت کے فوری بعد الہ آباد میں منعقدہ کانگریس کے چوتھے سالانہ اجلاس میں مندوبین نے رائل کمیشن کے مجوزہ "کنجوسانہ" اقدامات پر اپنی خفگی کا اظہار کیا اور کہا کہ کانگریس اپنے اصل مطالبات سے انحراف نہیں کرے گی۔ ارڈلی نارٹن نے کہا: "کانگریس کی مجوزہ اصلاحات سے ہٹ کر کوئی اور شے اس ملک کے عوام کو مطمئن نہیں کر سکے گی۔"[26] نمائندوں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اکثریت نارٹن کے ساتھ تھی۔ لیکن چند ایسے بھی تھے مثلاً راماسوامی مدلیار، جو رائل کمیشن کے ممبر بھی رہ چکے تھے اور کے۔ٹی۔ تیلنگ جو یہ چاہتے تھے کہ کم از کم ایک سال کے لیے کانگریس ملازمتِ عامہ کے پورے مسئلے کو معرضِ التوا میں ڈال دے۔ تاوقتیکہ کمیشن کی سفارشات پر انڈیا آفس کے فیصلے کا علم نہ ہو جائے۔ مُدلیار نے وفود سے کہا کہ وہ اِس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ کمیشن کے روبرو بیان دیتے وقت خود ہندستانی اس مسئلے پر متحد نہیں تھے جس کا کہ وہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ "کافی شہادتیں قلم بند کر چکنے کے بعد ہم نے پایا کہ ایک جانب مسلمانوں کی اکثریت اور دوسری جانب ہندوؤں کی اکثریت ایک جیسا ذہن نہیں رکھتی۔"[27]

کافی بحث ومباحثے کے بعد سمجھوتے کے طور پر من موہن گھوش کی پیش کردہ قرارداد منظور کی گئی جس میں پبلک سروس کمیشن کی رپورٹ میں تجویز کردہ سہولتوں پر اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے یہ بات ریکارڈ پر رکھنے کے لیے کہا گیا کہ "اس ملک کے عوام کے ساتھ اس وقت تک پورا انصاف نہیں ہوگا جب تک ہندستان کی ملازمتِ عامہ کے لیے کھلے مسابقتی امتحانات بیک وقت انگلستان اور ہندستان میں منعقد نہ کیے جائیں۔"[28]

مسلم رہنماؤں نے اس صورتِ حال پر کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی اور نہ کمیشن کے دو مسلم ممبران نے بعض اہم ترین سفارشات سے اپنے شدید اختلاف کے باوجود رپورٹ کے ساتھ اپنا کوئی اختلافی نوٹ شامل کیا جیسا کہ تین ہندو ممبران نے امتحانات کے بیک وقت انعقاد کے بارے میں اپنا اختلافی نوٹ رپورٹ کے ساتھ شامل کیا تھا۔[29]

چند ماہ بعد سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، لارڈ کراس کا مراسلہ شائع ہوا جس سے تعلیم یافتہ ہندوؤں کو سخت مایوسی ہوئی۔ لارڈ کراس نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ کمیشن کی سفارشات انتہائی "وقیع اور موزوں" ہیں۔ اُن کے نفاذ کے لیے پارلیمنٹ میں کسی قانون کو پیش کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ انہوں نے دستوری سروس Statutory Service کے خاتمے کے تعلق سے کمیشن کی سفارش کو پسند نہیں کیا اور واضح کیا کہ بیک وقت امتحانات کا انعقاد "قطعی نامناسب" ہے۔[30] اگرچہ بہ حیثیت مجموعی حکومتِ ہند کمیشن کی سفارشات کو منظور کر چکی تھی تاہم لارڈ کراس کا رویہ ان کے تعلق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے قدرے مختلف تھا۔

کانگریس نے نڈر طریقے سے اور پہلے سے زیادہ زور و شور کے ساتھ بیک وقت امتحانات کے انعقاد اور عاملانہ خدمات Executive jobs میں مؤثر حصہ دیئے جانے کی مہم جاری رکھی۔ انگلستان میں کانگریس کی ایجنسی نے متعدد عوامی جلسے منعقد کیے اور کئی پمفلٹ شائع کیے تاکہ اہلِ برطانیہ کی حمایت حاصل کر سکے۔ کئی ممبرانِ پارلیمنٹ نے اس مسئلے میں دلچسپی لینی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 12 فروری 1892ء کو جے۔ ایس۔ میک نیل J. S. MacNeil نے ملکہ کے خطبے پر ایک ترمیم Amendment پیش کی جس میں اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا کہ ملکہ عالیہ کی تقریر میں "اُن وعدوں کی تکمیل کے لیے کوئی تجویز مذکور نہیں ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف حکومتیں عوام سے کرتی آئی ہیں اور جن کی رو سے برطانیہ کے باشندوں اور ہندستان کے باشندوں کو نہ صرف ملازمتِ عامہ میں ایک دوسرے کے مساوی مواقع دیئے جانے چاہئیں جبکہ ایسی ملازمتوں کے حصول کی مسابقت کے بھی مساوی مواقع دیئے جانے چاہئیں۔"[33]

میک نیل نے برائٹ Bright کے اس چٹکلے Epigram کے ساتھ اپنی ترمیم ایوان کے روبرو پیش کی کہ "ہندستان منچلے انگریز نوجوانوں کے لیے ایک مرغزار Pasture بن گیا ہے۔" انہوں نے واضح کیا کہ کس طرح ہندستانیوں کو "خود اُنہی کے ملک میں ہر میدان سے علیحدہ رکھا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ دھوکہ بازی کی جا رہی ہے۔" انہوں نے اُس طرزِ عمل کی بھی مذمت کی جس کے ذریعے "دُنیا کے اس غریب ترین ملک پر گراں ترین حکومت لادی جا رہی ہے۔"[34]

ان الزامات کا جواب دیتے ہوئے کرزن نے بہ حیثیت انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ کہا کہ میک نیل کو چاہیے کہ ایفائے عہد نہ کرنے کی بنا پر حکومت کو مطعون کرنے کی بجائے اس کے اچھے کاموں کے جو خوشگوار نتائج برآمد ہوئے ہیں ان کے لیے حکومت کو مبارکباد پیش کرے۔ سر رچرڈ ٹمپل نے بھی اسی انداز میں ایوان کو یاد دلایا کہ اگر "اہلِ برطانیہ کے مضبوط دست و بازو، مستحکم اعصاب اور ٹھنڈا دماغ"[35] موجود نہ ہوں تو ہندستانی مملکت Indian Empire کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہے گا۔ اس ترمیم پر رائے شماری کے لیے اصرار نہیں کیا گیا اور ترمیم واپس لے لی گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوگیا۔ 2 جون 1893ء کو دوبارہ یہ مسئلہ دارالعوام کے روبرو پیش کیا گیا جبکہ ایچ۔ ڈبلیو۔ پال H.W. Paul نے ایک قرارداد پیش کی کہ اب تک کھلے مسابقتی امتحانات جن کی بنا پر ہندستان کی سول سروس کے لیے تقررات عمل میں آتے ہیں۔ صرف انگلستان ہی میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ امتحانات ہندستان اور انگلستان میں بیک وقت منعقد کئے جائیں گے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دونوں ممالک میں منعقد ہونے والے یہ امتحانات بالکل ایک جیسے ہوں گے اور شرکا کو آخر میں بہ لحاظ امتیاز ایک ہی فہرست میں شامل کرلیا جائے گا۔"[36] یہ قرارداد پیش کرتے ہوئے پال نے کسی قسم کی اوّلیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ 1868ء میں بھی آنجہانی مسٹر فاسٹ Mr. Fawcett[37] نے اسی قسم کی تجویز ایوان کے روبرو رکھی تھی۔ اس تحریک کی تائید کرتے ہوئے نوروجی نے ایوان سے کہا کہ وہ ہندستانی مسائل کو جماعتی سیاست سے علیحدہ رکھے۔ انہوں نے کہا کہ ماضی میں ہندستانیوں نے قدامت پسندوں اور لبرل ارکان کے لیے ایک ہی جیسے اظہار مومنیت میں کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی ہے۔[38]

بحث کا جواب دیتے ہوئے انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا جارج رسل George Russell نے ناقدین کو متنبہ کیا کہ موجودہ پالیسی سے کسی قسم کا انحراف ہندستان کے امن و سلامتی کے لیے شدید خطرات کا موجب ہوگا۔ ملک کے مختلف النوع نسلی اور مذہبی کردار کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا: "ہم اپنے معزز دوست کی تجویز کو محض اس بنا پر رد کر رہے ہیں کہ اگر اسے منظور کرلیا جاتا ہے تو یہ رقابتیں، میہ رشک و حسد، یہ جارحیتیں جو ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان، ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان پائی جاتی ہیں، مزید بھڑک اٹھیں گی۔"[39]

لیکن حکومت کی توقع کے برخلاف قلیل اکثریت کے ساتھ یہ قرارداد منظور ہوگئی۔[40] جوں ہی کانگریسی رہنماؤں کو اس کی اطلاع ہوئی، انہوں نے لندن اور کلکتہ میں ایک زبردست مہم شروع کردی اور مطالبہ کیا کہ دارالعوام کے اس فیصلے کو فوری طور پر نافذ کیا جائے۔[41] دارالامراء میں البتہ ارکان نے اس بارے میں کافی ناک بھوں چڑھائی اور مارکوئیس آف سالسبری Marquis of Salisbury نے تو ہندستانی کے عاملانہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امور میں مداخلت کرنے کے دارالعوام کے اختیارات ہی کو چیلنج کر ڈالا۔[42]

برطانوی حکومت، جس کی سربراہی اُن دنوں گلیڈسٹون کر رہے تھے، ان واقعات کی وجہ سے کافی اُلجھن میں پڑ گئی۔ اگرچہ اسے یہ قرارداد پسند نہیں تھی تاہم بیشتر قدامت پسند ممبرانِ پارلیمنٹ اور امراء کے بموجب، اسے نظرانداز بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ کونسل میں ارکان نے اس کے خلاف ووٹ دیا تھا۔[43] تاہم لارڈ کمبرلے نے اس معاملے کو حکومتِ ہند کے پاس بھجوا دیا تاکہ حکومتِ ہند کافی غور و خوض کے بعد انہیں مطلع کر سکے کہ "کن حالات میں اس قرارداد کو نافذ العمل کیا جا سکتا ہے۔"[44]

حکومتِ ہند نے اپنا جواب بھجوانے میں چھ ماہ کا عرصہ لے لیا جس میں اس نے واضح کیا کہ اس قرارداد کو نافذ العمل کرنا کیوں کر ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حکومتِ ہند نے جن مختلف وجوہات کا تذکرہ کیا اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ محل نہیں ہے تاہم حکومت کے نزدیک سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ دارالعوام کی مجوزہ پالیسی کے نفاذ کی وجہ سے حکومت مسلمانوں اور سکھوں جیسی قوموں کی "انتہائی قیمتی اور وقیع اعانت سے محروم ہو جائے گی۔ یہ وہ قومیں ہیں جو حکمرانی کی عادی رہی ہیں اور کردار کی غیر معمولی قوت سے آراستہ ہیں۔ لیکن ادبی تعلیم کے معاملے میں پسماندہ ہیں۔" اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے حکومتِ ہند نے زیادہ تر پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس کراسٹھ ویٹ Sir Charles Crosthwaite اور شمال مغربی صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر سر ڈینس فٹز پیٹرک Dennis Fitzpatrick کی آراء پر انحصار کیا، کیوں کہ ان دونوں نے ہندستان کے مختلف صوبوں میں ذمہ دارانہ عہدوں پر 35 سال سے زیادہ مدت کا عرصہ گزارا تھا۔[45]

سر چارلس کا مسابقتی امتحانات کے بیک وقت انعقاد کے بارے میں بنیادی اعتراض یہ تھا کہ ان اقدامات سے نہ صرف مسلمانوں کے خلاف "زبردست ناانصافی" ہوگی بلکہ یہ دراصل ایک "مہیب سیاسی غلطی" ہوگی۔ اگر ملازمتوں کے لیے مقابلہ آرائی لازمی ہی قرار دی جاتی ہے تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے مخصوص تعداد میں ملازمتیں مختص کر دی جانی چاہئیں۔[46] سر ڈینس نے واضح کیا کہ تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوئی بلکہ کشیدگی میں اضافہ ہوا۔ انہوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ اگر انگریز عہدیدار موجود نہ ہوں تو انتظامیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں نہ تو غیر جانب داری باقی رہے گی اور نہ انصاف۔ ایک ہندستانی تا وقتیکہ مکمل طور پر اپنی قومی صفات سے دست بردار نہ ہو جائے۔ محود کو فرقہ واریت کے چنگل سے آزاد کر ہی نہیں سکتا۔ سر ڈینس نے ایسی ڈھیروں درخواستوں کا حوالہ دیا جو اُنہیں آئے دن وصول ہوا کرتی تھیں جن میں "دیسی" حکام کے خلاف بہتان طرازیوں اور شکایتوں کی بھرمار ہوا کرتی تھی اور یہ بھی شکایت کی جاتی تھی کہ فلاں ضلع میں ہندو عہدیداروں کی کثرت ہوگئی ہے اور فلاں ضلع میں مسلمان عہدیدار ہندوؤں کو تنگ کر رہے ہیں۔ یا یہ کہا جاتا تھا کہ فلاں شخص آریا سماجی ہے اس لیے جو لوگ آریا سماج سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس شخص سے انصاف پانے کی توقع ہرگز نہیں رکھ سکتے یا یہ کہ فلاں شخص چونکہ مسلمان ہے اس لیے وہ ہندوؤں کے کسی مقدس مقام کے معاملات میں اپنی سرکاری حیثیت میں لازماً دخل اندازی کرے گا۔[47]

اگرچہ سر ڈینس نے اعلیٰ "دیسی" حکام کو ان میں سے بیشتر الزامات سے بری قرار دیا تاہم انہوں نے واضح کیا کہ ایسے معاملات میں عوام کے دلوں میں اس قدر تعصب بھرا ہوا ہے کہ اکثر وہ اس قسم کی الزام تراشیاں "اس مستحکم ایقان کے ساتھ کرتے ہیں کہ گویا وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں سچائی اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی اور انتظامی نقطۂ نظر سے یہ بات ایک انتہائی سنجیدہ مسئلہ بن جاتی ہے۔"[48] اس کے علاوہ انہیں اس بات کا یقین نہیں تھا کہ بہترین قسم کے "دیسی" حکام بھی فرقہ وارانہ فسادات کے موقعے پر اپنے ہی فرقے کے لوگوں کے خلاف شدید کارروائی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے خواہ اُن کے فرائضِ منصبی اُن سے اس بات کا تقاضا کرتے ہوں؟۔

دیگر صوبائی گورنروں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا اور حکومتِ ہند نے اپنی بھاری بھرکم رپورٹ میں سکریٹری آف اسٹیٹ کو بیک وقت امتحانات کے انعقاد کے خلاف پُرزور مشورہ دیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ آئندہ ملازمتِ عامہ کا سوال کسی بھی شکل میں دوبارہ اُٹھایا نہ جائے۔ لیکن کمبرلے اس مشورہ پر بہ مشکل تمام غور کر ہی پائے تھے کہ 1894ء کے عام انتخابات میں لبرل پارٹی کی شکست کے باعث حکومت میں تبدیلی واقع ہوگئی اور انڈیا آفس میں ہنری فاولر Henry Fowler نے کمبرلے کی جگہ سنبھال لی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فاولر کو "دیسی" لوگوں کی اُمنگوں اور تمناؤں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ برطانوی حکام کی مستعدی کے بہت زیادہ قائل تھے۔ نتیجتاً اُنہوں نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی گورنر جنرل کو لکھا کہ "ملکہ عالیہ کی حکومت، ہندستان کی حکومت کے اس خیال سے متفق ہے کہ ملازمتِ عامہ کے نظام میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔"[49] اس ضمن میں انہوں نے سرڈینس فٹز پیٹرک کے الفاظ "دو عظیم حریف گروہ Two great Hostile Parties کا حوالہ دیا اور اس بات پر زور دیا کہ اعلیٰ عہدوں کی تعداد کا ایک معقول حصہ مسلمانوں کے لیے مختص کیا جانا چاہیے۔"

اس فیصلے پر نہ صرف کانگریس کے جوشیلے نوجوانوں کو تعجب ہوا بلکہ کئی ممبرانِ پارلیمنٹ اور برطانوی اخبار نویس بھی اس بات پر حیرت میں پڑ گئے کہ کس طرح ایک سکریٹری آف اسٹیٹ دارالعوام کی خواہشات سے "برملا انحراف" کا مرتکب ہو رہا ہے۔[50] ہندستان میں اس صورتِ حال پر اس قدر تلخ مایوسی محسوس کی گئی کہ کانگریس کے لندن کے ترجمان انڈیا India نے برطانوی حکومت کو متنبہ کیا کہ "کسی قوم کی اُمیدوں کو اس طرح چکنا چور کر دینا جبکہ ایسی اُمیدیں معقولیت کی بنا پر قائم کی گئی ہوں، کوئی دل لگی کی بات نہیں ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ آنے والے کافی عرصے تک ہندستان "برہم احتجاجات" کی صداؤں سے گونجتا رہے گا۔"[51]

اس کے برخلاف دی ٹائمز نے فاولر کو اس "استقلال" Firmness کے مظاہرے پر گرمجوشانہ مبارکباد پیش کی اور اُن کے اس اقدام کو سراہا جس کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں، سکھوں اور راجپوتوں پر بنگالیوں کے تفوق کو روکنے کی کوشش کی۔ کسی "بابو" کو ذمہ دارانہ عہدہ دینا گویا "اپنے آپ پر اعتماد نہ کرنے اور ضعیف العقلی کا مظاہرہ کرنے کے مترادف ہوگا۔"[52]

ہم جیسا کہ پہلے ہی دیکھ چکے ہیں بیک وقت امتحانات کے انعقاد کے مطالبے کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ مسلمان اس کی مخالفت کریں گے۔ لیکن ولیم ڈگبی William Digby نے اس ادعا کو چیلنج کیا اور اپنے ایک طویل بیان میں رائل کمیشن پر یہ الزام عائد کیا کہ اُس نے غلط unfair قسم کی شہادتیں قلم بند کیں اور بالآخر غلط نتیجے پر پہنچا۔[53] کسی نے بھی ڈگبی کے اعتراضات پر سنجیدگی سے کان نہیں دھرا کیونکہ وہ نہ صرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کمزور تھے بلکہ بے حد بھونڈے clumsy بھی تھے۔ ایسے معاملے میں مسلمان رہنمائی کے لیے سرسید کی جانب دیکھتے تھے اور سرسید بیک وقت امتحانات کے انعقاد کے ایسے مخالف تھے جو کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جوں ہی انڈیا آفس کے فیصلے کو مشتہر کیا گیا، اینگلو محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن نے اپنی کونسل کی متفقہ قرارداد کے ذریعے "دانشمندانہ" مربیانہ اور مدبرانہ" پالیسی اختیار کرنے کے سلسلے میں فاولر کی خدمت میں اپنے "جذبہ امتنان و تشکر" کا ہدیہ پیش کیا۔ اس کی رو سے بیک وقت امتحانات کا انعقاد "حکومتِ برطانیہ کے استحکام کے حق میں انتہائی مضر ثابت ہوتا" کیوں کہ اس کی وجہ سے غیر ضروری طور پر برطانوی حکام کی تعداد گھٹ جاتی اور اس طرح ہندستانی انتظامیہ کی "مستعدی اور کردار" میں بھی گھٹیا پن داخل ہو جاتا۔[54]

انڈین پارلیمنٹری پارٹی نے چند احتجاج کیے لیکن فاولر نے اُن کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی St James Gazette نے ناراض ممبرانِ پارلیمنٹ کو مشورہ دیا کہ اگر وہ اس مسئلے کے بارے میں اتنے ہی شدید احساسات رکھتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اپنے عدم اطمینان کا اظہار منقسم لابی[55] Divisia Lobby میں کریں لیکن اس قسم کے اقدام سے ان کا مقصد پورا ہونے والا نہیں تھا کیونکہ اس بات کا یقین تھا کہ اس نئے ایوان میں فاولر کو اپنے موقف کی حمایت میں اکثریت کی حمایت حاصل ہو جائیں گی۔ اس لیے اخبار The Statesman نے انڈین پارلیمنٹری پارٹی کو مشورہ دیا کہ "سیاسی مصلحت" کے پیشِ نظر وہ "اس مخصوص مسئلے سے دست بردار ہو جائے"[56]۔

آنے والے کئی برسوں تک حالات، جوں کے توں بنے رہے۔ پھر 1904ء میں کرزن Curzon نے ملازمتِ عامہ کے لیے مسابقتی امتحانات کے طریقے کو ختم کر دیا۔[57] اس اقدام پر نہ صرف ہندو پریس نے اپنی خفگی کا اظہار، کیا بلکہ Statesman نے بھی اس پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا۔ اس کے برخلاف مسلم رہنما اس اقدام سے بہت خوش ہوئے اور اسی طرح برطانیہ کے بعض ٹوری Tory حلقوں میں بھی خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اُن کے ترجمان The Pall Mall Gazette نے حکومتِ ہند کے اس فیصلے کو سراہتے ہوئے "بابوؤں" کے خلاف طنزیہ انداز میں لکھتے ہوئے کہا: "غالباً سبھی ملکوں میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں امتحانات کامیاب کرنے کے سوا اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ نہیں کہا لیکن یہ "بدکیش استعداد" Pernicious aptitude ہماری ساتھی ہندستانی رعایا کے بعض طبقوں میں ایک مستقل بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایسا "بناوٹی" تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کے بیشتر افراد صلاحیت سے معریٰ ہوتے ہیں اور جو موجودہ ملازمتوں کی تعداد کی بہ نسبت بہت زیادہ افراد پر مشتمل ہے اور یہ ایسے افراد ہیں جو عام قسم کے معمولی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ہمیشہ دیسی اخبارات میں باغیانہ مضامین لکھ کر بے چینی پھیلانے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔" اخبار[58] The Pall Mall Gazette نے سوڈان کے اینگلو انڈین منتظمین Administrators کے اقدام کو کافی سراہا جنہوں نے اس بات کو اپنی تعلیمی پالیسی کا بنیادی اصول بنا لیا کہ "دیسی مسابقت والوں" کی تعداد کو بڑھنے سے روکنے کے لیے انگریزی تعلیم صرف چند گنے چنے مخصوص لوگوں ہی کو دی جائے۔" حتیٰ کہ Lloyds Sunday Newspaper جیسے اخبار نے بھی جو اپنے خیالات و نظریات کی متانت کے لیے مشہور تھا۔ کرزن کے مسابقتی امتحانات کے انقطاع کے فیصلے کی حمایت کی اور کہا کہ "اس نئی تبدیلی کی وجہ سے ریاست کو کافی فائدہ پہنچے گا اور حصولِ تعلیم کے اصل مقصد کو پانے میں بھی یہ پالیسی بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوگی۔"[59]

لیکن لبرل پارٹی کے ترجمانوں نے اس اقدام کو بڑی تلخی کے ساتھ ہدفِ ملامت بنایا۔ اپنے ایک طویل اداریے میں اخبار Manchester Guardian نے وائسرائے کی آواز کے "دو متصادم لہجوں" کی جانب اشارہ کیا: "پہلا تو بابائے ہند Father India کا لہجہ ہے جس میں وہ اپنے بچے سے گھریلو صداقتیں بیان کرتا ہے۔ ایسے باپ کا لہجہ جو اس لیے سخت گیری کرتا ہے کہ اس کی رحمدلی کا تقاضا یہی ہے، جو اپنی اولاد کے بہترین مستقبل کے لیے وہ کچھ دیکھتا ہے جسے خود اولاد دیکھ نہیں سکتی۔ دوسرا لہجہ سہمے ہوئے اس اینگلو انڈین کا ہے جو اس بات سے خائف ہے کہ اگر یہ تعلیم یافتہ دیسی لوگ اسی طرح تمام شعبہ ہائے حیات میں سرایت کرتے گئے تو اس کے لیے حالات کیا سے کیا ہو جائینگے۔" کیا کرزن نے مسابقتی امتحانات اس وجہ سے ختم کیے کہ وہ دیسی لوگوں اور ان کی صلاحیتوں سے خوفزدہ تھے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اخبار لکھتا ہے: "ہم کرزن کی ذات سے کسی گھٹیا خوف یا شخصی خطرے کو منسوب نہیں کرتے۔ اگر اگلے ہفتے وائسرائے کی کونسل کے لیے کوئی امتحان مقرر کیا جاتا ہے تو ہمیں امید ہے کہ وہی اس میں کامیابی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل کریں گے ..... جبکہ اُن حالات میں "اخبار نے لکھا" وائسرائے کا اقدام نہ صرف ناقابلِ فہم ہے بلکہ غیر منصفانہ بھی ہے۔"

کانگریسی رہنماؤں کے لیے سرکاری مخالفت اس قدر ناقابلِ فہم نہیں تھی وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ دفتر شاہی کیوں اُن کی راہ میں روڑے اٹکانے کے درپے ہے۔ جس بات سے وہ حقیقی معنوں میں پریشان تھے وہ تھا مسلمانوں کا ردِّ عمل۔ حالانکہ ہر گذرا ہوا سال اس حقیقت کو زیادہ واضح کر رہا تھا کہ سول سروس کے مسابقتی امتحانات میں مسلم اُمیدواروں کی کارکردگی ہندو اُمیدواروں کے مقابلے میں بُری نہیں تھی۔ ۱۸۸۹ء کے انڈین سول سروس کے آخری امتحان میں تو غضنفر علی خاں نامی ایک مسلم اُمیدوار سرِفہرست رہا تھا۔[62] چند سال پہلے بھی طیب جی نامی ایک اور مسلم اُمیدوار اسی قسم کے مقابلے میں سرِفہرست رہا تھا۔[63] اِن کامیابیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کانگریس کا لندن کا ترجمان [illegible] رقمطراز ہے: "اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کسی بھی ہندو اُمیدوار نے حتیٰ کہ مسٹر آتول چندر چٹرجی نے بھی آج تک یہ امتیاز حاصل نہیں کیا۔ اس کے بعد کیوں ہماری ساتھی مسلم رعایا اپنے تعلیمی مستقبل کے بارے میں مایوسی کا شکار ہو یا کیوں وہ مسابقتی امتحانات سے نظریں چرائے؟"[64] مسلم رہنماؤں پر اپنی عظیم قوم کی ذہنی استعداد اور اخلاقی قوت کو نظرانداز کرنے کا الزام عائد کرتے ہوئے اخبار مذکور لکھتا ہے کہ انہوں نے اپنی اُبھرتی ہوئی نسلوں کو بگاڑ دیا ہے اور آج بھی "انہیں طریقوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جن کے ذریعے انہیں وہ مناصب حاصل ہوئے جن پر وہ عیش کر رہے ہیں۔"

ہماری مجوزہ تحقیق کے آخری دور میں اور خاص طور پر کرزن کے دورِ حکومت میں کئی اور بھی ایسے مسائل پیدا ہو گئے جنہوں نے حکومت کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کیے رکھا۔ اس وقت پائی جانے والی صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر گورنر جنرل نے حکومت کے مختلف محکموں جیسے کہ پولیس، ریلویز، تعمیراتِ عامہ اور جامعات میں تحقیقات کرنے کے لیے مختلف کمیشن اور تحقیقاتی بورڈ قایم کر دیئے۔ مختلف سرکاری محکموں میں مستعدی کو بڑھانے اور سرکاری خرچ میں کمی کرنے کے بارے میں مختلف اکسٹرز کی جانب سے موصول ہونے والی تجاویز کی بنا پر انقلابی تبدیلیوں کے نفاذ میں کرزن خود ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ قحط کی وجہ سے بھی انتظامیہ میں متعدد فوری اصلاحات ناگزیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو گئیں۔ کرزن نے ان اصلاحات کو جوش و خروش کے ساتھ نافذ کیا۔ بجز بنگال کی تقسیم کی مخالفت کرنے والوں کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے پھر کسی اور معاملے میں، جس کی ابتدا انہوں نے کی ہو، کرزن کو مستعدی کے اصول سے صرف نظر نہیں کرنا پڑا اور نہ فرقہ وارانہ مصالح کو پیش نظر رکھنا پڑا۔ انہوں نے کبھی گروہی جھگڑوں میں دلچسپی نہیں لی اور نہ خود کو سیاسی نزاعات میں الجھایا۔ اسی وجہ سے وہ نہ صرف ہندوں میں مقبول نہ ہو سکے بلکہ مسلمانوں میں بھی انہیں کوئی خاص ہر دلعزیزی حاصل نہ ہو سکی جن کے تعلق سے وہ کافی ہمدردی رکھتے تھے۔[64]

کرزن تعلیم یافتہ "دیسی" باشندوں کو کسی قسم کی سیاسی یا انتظامی سہولتیں دیئے جانے کے خلاف تھے۔ انہیں اُن کی "اہلیت" میں شک تھا ان کا خیال تھا کہ ہندستان کا موجودہ روپ اسی وجہ سے برقرار ہے کہ یہاں انگریز محنت کر رہا ہے اور ملک کے کروڑوں محنت کش، جو آبادی کے اسی فیصد افراد پر مشتمل ہیں، اس محنت سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ باقی بیس فیصد لوگوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ "یا تو وہ بالکل ناکارہ ہیں اور اگر کسی کام کے ہیں بھی تو انہیں بہ آسانی دریا برد کر دیا جا سکتا ہے۔"[65] انہیں ہندستان میں رائے عامہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کا احساس تھا لیکن وہ اس کے آگے سرنگوں ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک بار انہوں نے شیخی بگھارتے ہوئے اپنے دوست سر اے۔ گوڈلے Sir A. Godley سے کہا تھا: "شاید کسی اور نے اس تواتر کے ساتھ بعض معاملات میں رائے عامہ کو اتنا نظر انداز نہیں کیا ہوگا، جتنا میں نے کیا ہے۔"[66]

ہندستان میں اپنے قیام کے دوران کرزن نے اپنی تمام تر توجہات کو "انتظامیہ کی کارکردگی"[67] efficiency of administration پر صرف کیا۔ ان کے خیال میں یہی "رعایا کے اطمینان" Contentment کا مترادف ہے۔ "اسی وجہ سے ان کے دل میں سیاسی تحریک بازوں اور فرقہ وارانہ جھگڑا کرنے والوں کے لیے کوئی عزت نہیں تھی اور نہ وہ اُن کی آواز پر کان ہی دھرتے تھے۔ اُنہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ ہندستان کی متعدد قوموں اور مذہبوں کے درمیان رہ کر جن سے کہ ہندستان بنا ہے میں نے ہر ایک کی ضرورت کو سمجھنے اور اسے پوری کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سبھی کے مفادات کا خیال رکھا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ہمیشہ تصویر کے وسیع تر پردے پر مرکوز رہیں جس پر بے شمار انسانی چہروں کا جھرمٹ بنا ہوا تھا جو ہندستان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقیقی باشندے تھے جو نہ کسی طبقے سے متعلق تھے نہ فرقے سے۔" کرزن کے نزدیک عامۃ الناس تعلیم یافتہ انگریز طبقے سے قطعی مختلف چیز تھے۔ اُن کے نزدیک عوام میں سرکاری عہدوں کی تمنا رکھنے والے دیسی ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے کبھی اس بات پر یقین نہیں کیا کہ نام نہاد ہندستانی رہنماؤں نے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، کبھی اُن "کروڑوں افسردہ خاطر عوام" کی نمائندگی کی ہے یا کر سکتے ہیں۔[69]

کرزن کا خیال تھا کہ عوام کے مفادات برطانوی حکام کے ہاتھ میں زیادہ محفوظ ہیں بہ نسبت غیر تجربہ کار نیم تعلیم یافتہ "دیسی" حکام کے ہاتھوں کے۔ پھر انہیں کے قول کے مطابق: "ہندستان کی سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر اُصولاً انگریزوں ہی کو فایز ہونا چاہیے کیونکہ کچھ تو وراثتاً کچھ تربیتی اعتبار سے اور کچھ تعلیمی اعتبار سے اُنہیں اُصولِ حکمرانی، عاداتِ ذہنی اور قوتِ کردار کا علم ہوتا ہے جو اس قسم کے کاموں کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔"[70] ایک اور مقام پر انہوں نے ہندستانی کردار کو اور بھی حقارت آمیز نظروں سے دیکھا ہے۔ "بلاشبہ مغرب کے ضابطۂ اخلاق میں صداقت کو کافی بلند مقام حاصل ہے۔ مشرق نے بہت بعد میں صداقت کی اس طرح عزت افزائی کی کیونکہ یہاں تو عیاری craftiness اور سیاسی مکروفریب Diplomatic wile ہی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔" اس تجزیے میں کرزن نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین کسی قسم کا امتیاز نہیں کیا ہے۔

گورنر جنرل نے یہ بھی کہا کہ "دیسی باشندوں کی عدم صلاحیت" کے باوجود برطانوی حکومت بڑی فیاضی کے ساتھ اپنی رعایا کو ملازمتیں عطا کرتی رہی۔ اس دعوے کے ثبوت میں حکومت نے وہ اعداد و شمار شائع کیے جن میں دیسی باشندوں اور یورپینوں کو دی گئی ملازمتوں کی تفصیل بتلائی گئی تھی اور اس طرح انہوں نے یہ ثابت کیا کہ اوّل الذکر کی حالت اس معاملے میں 1867ء کے مقابلے میں کافی بہتر ہوئی ہے۔ گورنر جنرل نے سوال کیا: "کیا ان اعداد و شمار کی موجودگی میں بھی کوئی شخص یہ بات کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ ہماری حکومت یوروپینوں کی غیر ضروری ہمت افزائی کرتی ہے یا یہ کہ دیسی باشندوں سے کسی قسم کی پرخاش رکھتی ہے؟ اس کے برخلاف میں تو یہ کہوں گا کہ ہماری حکومت فیاضی کے معاملے میں دنیا بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ آپ پوری تاریخ کھنگال ڈالیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلطنت روما کے بعد سے آج تک رعایا پر حکمرانوں کے اس قدر بھرپور اعتماد کی مثال نہیں ملتی۔"[72]

ہندستانی پریس نے فوراً اس بیان کو چیلنج کیا۔ کرزن کو نہ صرف برا بھلا کہا گیا بلکہ گالیاں بھی دی گئیں۔ تلک کے جاری کردہ انگریزی ترجمان مراٹھا Maratha نے لکھا:۔ "اعداد و شمار کے ذریعے تو کوئی بھی بات ثابت کی جا سکتی ہے۔"[73] مختلف گوشوں سے یہ کہا جانے لگا کہ کرزن کے اعداد و شمار "حقائق" پر مبنی نہیں ہیں بلکہ "خیالی" نوعیت کے ہیں جن کا دارومدار اُن کے سامراجی تصورات" Imperialistic fancies پر ہے۔[74] امپیریل کونسل میں گوکھلے نے گورنر جنرل کے اس بیان کو چیلنج کیا اور انہی سرکاری ذرائع سے حاصل کردہ اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کرزن کا تجزیہ کس قدر گمراہ کن تھا۔[75] دیگر ہندستانیوں نے بھی اس قسم کی کوششیں کیں لیکن غالباً جی۔ سبرامنی ایئر نے Hindustan Review کے لیے سب سے مفصل تختے مرتب کیے جن کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ "ہمارے ساتھ جس قسم کے تقررات کے ضمن میں ناانصافی کی گئی وہ اعلیٰ عہدوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے عہدے جن کے ذریعے حکومت اپنے حکام کو ذمہ داری سونپتے ہوئے اُن پر بھرپور اعتماد کا اظہار کرتی ہے۔"[76]

کرزن نے اس قسم کی تنقیدوں پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن اُن کے جانشین لارڈ منٹو Lord Minto نے فوری اس بات کو محسوس کر لیا کہ "دیسی باشندوں کی اُمنگوں" Native aspirations کو بالکل نظرانداز کر دینا خطرے سے خالی نہیں۔ اس خصوص میں انہوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا:۔

"فرض کیجیے کہ انتہا پسندوں کے منصوبے اتنے ہی شرارت آمیز، ناقابلِ عمل اور گھناؤنے ہیں جتنے کہ لوگ کہتے ہیں تو ایسی صورت میں اُنہیں سازشی یا شورش پسند جو چاہے کہہ لیجیے۔ لیکن کیا محض اس وجہ سے ہم ہر اچھی یا بُری حالت میں، اور ہر صحیح اور غلط موقعے پر اپنے "عہدیدارانِ عالمہ" Executive authority ہی کی پشت پناہی کرتے رہیں گے؟ اگر ہم نے ایسا کیا تو گویا ہم بھی شورش پسندوں ہی کا کھیل کھیلنے لگ جائیں گے؟"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمیں یہاں منٹو اور ان کے عظیم ساتھی مورے کی جانب سے حکمتِ عملی اور انتظامیہ میں لائی گئی تبدیلیوں کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ موضوع اس کتاب کے دائرۂ وسعت سے باہر ہے۔

البتہ زیرِ تحقیق مدت کے دوران دیگر انتظامی اُمور کے تعلق سے جو سوالات اُٹھائے گئے تھے، چلتے چلتے ان کی جانب بھی اشارہ کر دینا مناسب ہے۔ ان میں سے اکثر سوالات کانگریس نے اُٹھائے جنہیں بعد میں انتظامی اصلاحات کے مطالبات کا رنگ دیا گیا۔ مثلاً اپنی ابتدا ہی سے کانگریس عدلیہ سے انتظامیہ کو الگ کرنے کا مطالبہ کرتی آئی تھی۔ اسی طرح "دیسی باشندوں" کو ممبرانِ جیوری کی حیثیت سے مقرر کیے جانے کا مطالبہ بھی کانگریس کرتی آئی تھی لیکن اس ضمن میں حکومت نے کوئی خاص اقدامات نہیں کیے تھے۔ کیوں کہ بقول ایک لیفٹیننٹ گورنر کے، اس قسم کی اصلاحات کے نتیجے میں "دُور رس بنیادی تبدیلیاں" واقع ہوں گی جو "جو تباہ کن نتائج پر منتج ہوں گی۔"[77] مسلم رہنما بھی اس بدعت Innovation کے دل سے خواہش مند نہیں تھے۔ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ اس قسم کے مطالبات کے پسِ پشت ہندوؤں کی "اقتدار کی ہوس" اور یہ خواہش پوشیدہ ہے کہ خود کو مسلمانوں کے مقابلے میں "اعلیٰ وارفع" بنالیں۔ لہٰذا مسلم کرانیکل کے بموجب ہندوؤں کے مطالبات پر مسلمانوں کی "بے اطمینانی اور ان کے دل کی کڑھن انسان میں پائے جانے والے انتہائی فطری جذبات کی پیداوار ہے۔"[78]

ہندوؤں کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونے کو مسلمانوں نے شکوک نگاہوں سے دیکھا اور ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کے شکوک و شبہات کو دُور کرنے کی کوئی ٹھوس ترکیب اختیار نہیں کی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریسی رہنماؤں نے ہندو مسلم اتحاد پر دھواں دھار تقریریں کیں لیکن وہ تیزی سے بگڑتے ہوئے حالات کو قابو میں نہ لا سکے۔ مزید براں سرکاری ملازمتوں اور رعایتوں کے تعلق سے کانگریس نے جو رویہ اختیار کر رکھا تھا وہ بھی مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں تھا۔ مثلاً امرت بازار پتریکا نے حکومت کو اس بات کا انتباہ دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ حکومت کی جانب سے برتی جانے والی "فیاضی" اس وجہ سے ایک انتہائی غلط اقدام ہے کہ یہ قوم "انتہائی گمنامی" نے قسم کے جرائم کے ارکاب کی عادی ہے۔"[79] دوسرے اخبار The Indian Nation نے تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُن جرائم کی فہرست بھی مرتب کر ڈالی" جن کا ارتکاب حالیہ برسوں میں مسلمانوں نے حکام کے خلاف کیا تھا۔"[80] اسی طرح Hindoo Patriot نے مسلمانوں کو حکام کی جانب سے دی جانے والی مراعات کو احمقانہ فعل قرار دیتے ہوئے لکھا: "جی ہاں، ہماری حکومت مسلمانوں کی سرپرستی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اس سے حاصل ہونے والے متوقع فوائد جیسا کہ ہم بار بار متنبہ کر چکے ہیں، افسوس ناک حد تک مایوس کن رہے ہیں۔"[81] اس قسم کے جملوں کا جواب مسلمانوں کی جانب سے بھی منہ توڑ طریقے سے دیا گیا۔ مسلم کرانیکل لکھتا ہے: ہمارے ہندو ہم وطن بھاری بھرکم تنخواہوں والی ملازمتوں پر قبضہ جما کر سرکاری خزانوں کو لوٹ رہے ہیں اور برہنہ پشت محنت کش مسلمان تپتی ہوئی دھوپ میں پسینہ بہا کر جو کمائی کرتا ہے اس سے حاصل کیے گئے محصولات سے خود کو روزانہ امیر سے امیر تر بناتے چلے جا رہے ہیں جبکہ ہماری قوم آئے دن اعتماد اور آمدنی کی حامل تمام اسامیوں سے ہاتھ دھوتی چلی جا رہی ہے اور وہ دن دُور نہیں ہے جب ہماری عزت و ناموس، زندگی اور آزادی ایک بیرونی قوم کے رحم و کرم پر ہوگی۔"[82]

ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے کانگریس کے ایسے مطالبات کی حمایت بھی نہیں کی جیسے کہ وزارت داخلہ کے اخراجات میں کمی[83] Reduction of home charges معاشی استحصال کی روک تھام[84] stoppage of the economic drain اور فوجی اور سرحدی اخراجات میں کمی[85]۔ مسلمانوں کو ان تمام مطالبات کے پس پشت کسی گھناؤنی سازش کا شبہ ہونے لگا۔ مزید براں معاشیات کے بارے میں نوروجی اور واچھا Wacha کی قابلِ تحسین تحقیقات کے باوجود بیک اور موریس، مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلاتے رہے کہ برطانیہ کے زیرِ سرپرستی ہندستان غربت کا شکار نہیں ہوا ہے بلکہ اتنا مالدار ہو گیا ہے جتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ ان دونوں انگریز پروفیسروں کے مطابق حکومت کی معاشی پالیسی کے کانگریسی نقاد "اُن احسان فراموش طفلانِ مکتب سے بڑھ کر نہیں ہیں جو ایسے موضوعات پر لب کشائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اُن کی فہم سے بالاتر ہوں۔" یا اس سے بھی بڑھ کر "اُس بگڑی ہوئی مخلوق کی مانند ہیں جو اُسی ہاتھ کو کاٹ کھاتی ہے جو اُن کے منہ میں نوالہ پہنچا رہا ہو۔"[87]

چونکہ سرسید اور ان کے ساتھیوں کو جدید اقتصادیات سے کما حقہ، واقفیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل نہیں تھی اس وجہ سے وہ حقیقت کو سلمیت سے جدا نہ کر سکے۔ اُنہوں نے خود کو اور اپنے اطراف رہنے والے احباب کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ برطانوی راج میں سبھی ہندستانی اُنہی کی طرح خوشحالی اور چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُنہیں برطانوی راج کی بالاتری کے بارے میں ایک مقدس عقیدہ سا ہو گیا تھا۔ موجودہ نظام میں کسی قسم کی تبدیلی کا تصور کرتے ہی وہ لرز اُٹھتے تھے کہ اس طرح اُن کے حالات ابتری کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس کے برخلاف ہندو اس بات پر کمربستہ تھے کہ انتظامیہ کو ہندوستانیت کے رنگ میں رنگ کر دفترِ شاہی کو مغلوب کیا جائے۔" اِسی کو اپنی تمناؤں کا مرکز مان کر" اس کے حصول کے لیے وہ بے جگری سے لڑتے رہے۔[۵۵]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات و حوالہ جات

چوتھا باب (انتظامی اصلاحات)

1۔ انڈیا آفس کمیٹی کے ارکان میں سر جے۔ پی۔ ولوبی Sir J. P. Willoughby سر اسکن پیری Sir Erskine Perry اور میسرز منگلس Mangles ارسٹ ناٹ Arbuthnot اور میک ناٹن Macnaughten شامل تھے۔ انہوں نے اپنی 20 جنوری 1860ء والی رپورٹ میں واضح کیا تھا کہ "ان سب کا مشترکہ خیال یہ ہے کہ ہندستانی باشندوں کو ہندستان کی انتظامیہ میں زیادہ سے زیادہ ملازمت کے مواقع فراہم کرنا نہ صرف مبنی بر انصاف ہے بلکہ برطانیہ کی بالادستی کے استحکام کے لیے قرینِ مصلحت بھی ہے۔ انہوں نے "دیسی" لوگوں کی "عدم مساوات" کو دُور کرنے کا مشورہ دیا تاکہ "آئندہ ہم پر یہ الزام عاید نہ کیا جا سکے کہ ہم لوگ کانوں سے وعدہ نباہتے ہیں لیکن دل سے اُسے توڑ دیتے ہیں۔"

2۔ کسی اور مقام پر نورجی نے اس مسئلے کو اور بھی زیادہ پُرزور طریقے پر یوں بیان کیا ہے، "ہزاروں نوجوان جو ہر سال جامعات سے فارغ ہو کر نکل رہے ہیں خود کو عجیب قسم کی خلافِ معمول صورتِ حال سے دوچار پا رہے ہیں۔ اُن کے لیے خود انہی کے مادرِ وطن میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نوجوان اپنے ہی ملک میں بھیک مانگنے یا سڑکوں پر پتھر پھوڑنے پر مجبور ہو جائیں تاوقتیکہ اس ملک کے حکمران اُن کے طبعی حقوق، موقف اور فرایض کی جانب توجہ نہ کریں۔ خواہ وہ تباہ ہو جائیں یا جو جی میں آئے وہ کریں یا جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کام کریں لیکن بیسیوں یورپینوں کو اس ملک سے چلا جانا چاہیے اور جو چیز ان کی ہے اسے سنبھال لینا چاہیے۔ ماضی کے کئی برسوں سے لے کر آج تک انگریز مدبرین جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بات کا دعویٰ کرتے آئے ہیں اس پر عمل کیا جانا چاہیے یعنی ہندستان پر ہندستان کی بھلائی کے لیے حکومت کی جانی چاہیے اور ایسی حکومت پارلیمنٹ میں کیے گئے سنجیدہ اعلانات اور وہاں منظور کیے گئے قوانین اور سب سے بڑھ کر محترم و معظم فرمانروا کی جانب سے کیے گئے وعدوں کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔"

ملاحظہ ہو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے ساتھ نوروجی کی مراسلت مشمولہ

Journal of East India Association, 1882, 171-72

مزید ملاحظہ ہو موضوع To what Extent are the public services open to the children of the soil? پر متعدد معلوماتی اور دستاویزی ثبوت کے حامل مضامین جو Indian spectator کی 12/اپریل 10/مئی، 24/مئی، 7/جون، 14/جون، 21/جون اور 26/جولائی 1885ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئے۔

3 دراصل 1878ء کے اوائل ہی میں Hindoo Patriot نے فخریہ انداز میں لکھا تھا: "سول سروس کے معاملے میں ہم نے مشترکہ احساسات کا عالیشان مظاہرہ کیا ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک ہندوؤں، مسلمانوں، جینیوں، بودھوں اور عیسائیوں میں کلکتہ سے ابھرنے والی اسی آواز کی صدائے بازگشت سنائی دی۔" Hindoo Patriot, Jan. 7, 1878

اسی مسئلہ پر مزید ملاحظہ ہو: 3/اکتوبر 1877ء کے Bengalee کا اداریہ۔ انگلستان میں اس قسم کی تحریک کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو Speaches of Lal Mohan Ghosh

4 1870ء کے ایکٹ کے ذریعہ Statutory Civil Service کی تخلیق کی گئی جس کے تحت مسلمہ قابلیت اور صلاحیت کے حامل ہندستانی نوجوان بغیر امتحان کامیاب کیے سول سروس میں تقرر کے اہل گردانے جاتے تھے۔ 1879ء میں مزید ایسے قوانین منظور کیے گئے جن کی رو سے اعلیٰ سماجی حیثیت اور وجاہت خاندانی کے خصوصی لحاظ کی بنا پر ان ملازمتوں میں نوجوانوں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ اُس وقت کے وائسرائے لارڈ لٹن Lord Lytton کے عین منشا کے مطابق یہ اقدامات کیے گئے کیوں کہ وہ "دیسی" طبقہ امرا کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ زمام کار سنبھالتے ہی انہوں نے اپنے مقتدر لارڈ سالسبری Lord Salisbury کو لکھا تھا: "اب ہمارے سامنے سب سے اہم سوال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے کہ کس طرح ہندستانی اُمرا کی مکمل ہمدردیاں حاصل کی جائیں اور اُن کا بہتر استعمال کیا جائے :" ملاحظہ ہو History of Lord Lytton's Indian Administration By Lady Betty Balfour P. 103.

5 غیر متعہدہ ملازمت میں ایسے کیڈر ملازمین سرکار شامل تھے جو اُن اسامیوں پر فائز تھے جو قانوناً متعہدہ سول ملازمت کے لیے مختص نہیں کی گئی تھیں۔ اِن تقررات کے لیے اُن باصلاحیت "دیسی" لوگوں کا انتخاب کیا جاتا تھا جو ہندستان میں مہیا ہو سکتے تھے۔ تاہم "غیر متعہدہ" کی اصطلاح خالص تکنکی نوعیت رکھتی تھی۔

6 Report of the public service commission, 48

7 Proceedings of the public Service Commission, 48.

8 Ibid, (Lower provinces of Bengal including Assam) IV, 79.

9 Ibid, (Madras, including Coorg) V 232-45

10 Ibid (Madras including Coorg) V 305-06

11 Ibid (Bombay including Sind) IV 242

12 Ibid (Lower Provinces of Bengal including Assam IV 242

13 Ibid Lower provinces of Bengal including Assam 1967 VI

14 اس مسئلے پر ملاحظہ ہو نواب عبداللطیف کی گواہی اور اس پر سرسید کی جرح Ibid IV 267

15 Ibid (North Western Provinces and Oudh) II, 132-33

16 اس موضوع پر حکومتِ ہند کی 24 دسمبر 1879ء قرارداد ملاحظہ ہو :-

17 Report of the public Service Commission, 28

18 1906ء تک اس سال کے تقررات کو شامل کر کے اس قانون کے تحت جملہ 48 تقررات عمل میں آئے جن کا اوسط سالانہ (6) تقررات ہوتا ہے جو مختلف فرقوں میں اس طرح تقسیم ہوئے :-

ہندو : 27 + مسلمان : 15 (جن میں سے 5 کا تعلق شمال مغربی صوبے سے تھا۔)

پارسی : 2 + سکھ : 2 + برمی : 2

19 مسلمان کیوں دستوری سروس Statutory Service کو پسند کرتے ہیں؟ اس سلسلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Proceedings of the Public Service Commission (Bombay, Madras) IV 54. میں ملاحظہ ہو مرزا عباس علی بیگ کی گواہی مشمولہ

Ibid VI, 76 ... -20

21 بیگ کی اس اسکیم کے تفصیلی متن کے لیے ملاحظہ ہو۔

Proceedings: "re public Service Commission (H.W. Primrose) II 334

Ibid II 34 — — -22

Report of the public Service Commission 48 — 52 -23

Ibid 66 — 7 -24

25- کمیشن کے تینوں ہندو ممبران نے بیک وقت امتحانات کے انعقاد کے سلسلے میں پائے جانے والے "خدشات" کے بارے میں اپنا اختلافی نوٹ لکھا ہے۔ (Ibid 52)

Annual Congress Report (1888) 39 -26

Ibid 49 -27

Ibid 52 -28

Report of the public Service commission 52 -29- ملاحظہ ہو:

30- ملاحظہ ہو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا ان کونسل کا مراسلہ نشان 104 Public مورخہ Indian Office, London, Sept 12, 1889 موسومہ حکومت ہند۔

31- مزید ملاحظہ ہو انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کا 24 جولائی 1889 کا مکتوب بنام سکریٹری، سول سروس کمیشن، انڈیا آفس اور اس کا جواب منجانب سول سروس کمشنرز بنام انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مورخہ 19 اگست 1889 ۔

32- ملاحظہ ہو حکومت ہند کا مراسلہ بنام رایٹ آنریبل وسکاونٹ کراس۔ جی۔ سی۔ بی ملکہ عالیہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، نشان 58 پبلک، مورخہ شملہ 7 اکتوبر 1888 ء

Hansard (Indian Debates) Session 1892, 16 -33

Ibid 16 - 18 34

Ibid 20 - 27 35

Ibid Session 1892, 338 - 46 36

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

37۔ فاسٹ نے اپنی ترمیم کے نکات کو اس کمیٹی کی رپورٹ سے اخذ کیا تھا جو 1858ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے قایم کی تھی جس کی صدارت سر جان ولیبی (Sir John Hobhouse) کے سپرد تھی اور جس کے ارکان میں مسٹر مینگلس Mr. Mangles، مسٹر ارتھ نائٹ Mr. Arbuthnot مسٹر میگناٹن Mr. Macnaghten اور سر اڈسکن پیری Sir Erskine Perry شامل تھے۔ 1868ء کی بحث کے دوران اس وقت کے سکریٹری فار انڈیا سر اسٹافورڈ نارتھ کوٹ نے فاسٹ کے مطالبات کو بہر دو انہ انکار کے ذریعے رد کر دیا۔ اپنی غیر معمولی پُر اثر اور زور دار تقریر کے ذریعے جس میں رنگین خوشبیانی سے کام لیا گیا تھا، سکریٹری فار اسکاٹ لینڈ رائٹ آنریبل (سر جی ٹریوی لین) نے بھی فاسٹ کی مخالفت کی۔ لیکن اس بات کا اعتراف کیا کہ نہ صرف انہوں نے مسابقتی امتحانات کی قرارداد کو قبلبند کیا بلکہ ہندستان کے دیسی باشندوں کے لیے اتنا کچھ کیا جتنی کہ معقول طور پر کسی سے توقع کی جا سکتی ہے۔ (Ibid 337-38)

Hansard (Indian Debates) Session 1893, pp 346-38

Mohammedan کے 1894ء 31 مئی Ibid 359-66-39 مزید ملاحظہ ہو

Observer کا اداریہ جو پال کی قرارداد کے بارے میں سپرد قلم کیا گیا۔

40۔ ایوان منقسم ہو گیا: موافقین (7) اور مخالفین (84)

Hansard (Indian Debates Session 1893, 374.

41۔ اس قرارداد کی منظوری کے چھے ماہ کے اندر سر سی۔ ڈبل رپل Sir C. Dalrymple صدر کمیٹی برائے معروضات عامہ Committee of public Petitions نے اعلان کیا کہ انہیں 20,232 ہندستانیوں کے دستخطوں پر مشتمل 44 عرضداشتیں بیک وقت امتحانات کے انعقاد کے حق میں وصول ہوئی ہیں جبکہ صرف ایک عرضداشت اس کے خلاف وصول ہوئی۔

(Ibid 774)

42۔ Ibid 389

43 سول سروس امتحانات کے بارے میں شائع ہونے والے پارلیمانی قرطاس نشان Memorials recorded by the Council of India میں ملاحظہ ہو C 7095

بقول سر جے اسٹریچی Sir J. Strachey: "گو اس مراسلے کو حکومتِ ہند کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاس بھیجا جائے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ روانگی اس کونسل کے اراکین کے شدید ترین احتجاجات کے ہمراہ عمل میں آئے گی۔" (P.P. 4-5)

44۔ گورنر جنرل آف انڈیا ان کونسل کے نام موسومہ مراسلہ نشان 61-Pakke مورخہ انڈیا آفس لندن 22/ جون 1893ء

45 حکومتِ ہند کا مراسلہ نشان 62-of 1893 مورخہ یکم نومبر 1893ء ملاحظہ ہو۔
Parliamentary papers relating to the question of holding Simultaneous examination in India and England for the Indian civil Service," c - 7378, 13.

Ibid 40 - 46

Ibid 50 - 47

Ibid - - 48

49۔ ملاحظہ ہو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا ان کونسل کا مراسلہ نشان 37 پبلک مورخہ انڈیا آفس، لندن، 19 اپریل 1894ء بنام ہز ایکسلنسی دی رایٹ آنریبل دی گورنر جنرل آف انڈیا ان کونسل۔

50 ملاحظہ ہو پروفیسر اے۔ ایف۔ یورسین A F. Murison کا مضمون بعنوان Inham مطبوعہ India to the Civil Service باتبہ نومبر 1893ء

51۔ مزید ملاحظہ ہو فاوٹر Fowler کے مراسلے کے بارے میں Bengalee بنگالی کے اداریئے جو ماہ جون کی 2/ 16/ اور 30/ تاریخ ماہ جولائی کی 7 اور 21 تاریخ، ماہ اگست کی 2/ 11/ اور 18/ تاریخ اور 7/ نومبر 1894ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئے۔ Inchcape, June 1894

52 The Times, London. May 24, 1894

53 جولائی 1894ء کے India میں Digby نے 1889ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، لارڈ کراس کے نام موسومہ اپنے دو خطوط میں لگائے جن مسلم شہادتوں کو کمیشن نے قلمبند کیا ان کی صوبہ واری تقسیم حسبِ ذیل ہے:۔

صوبہ	مدعو کردہ	رضا کارانہ
پنجاب	13	

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شمال مغربی صوبہ اور اودھ	9	2
سی۔ پی	4	—
بمبئی	10	1
مدراس	3	6
بنگال	14	2
	53	13

66 = 13 + 53

54- ملاحظہ ہو یکم فروری 1895ء کا M.A.O College Magazine یہ قرارداد سرسید نے پیش کی تھی اور محسن الملک نے اس کی تائید کی تھی۔ مزید ملاحظہ ہو اداریہ بعنوان The Mahammadan defence Association and Simultaneous Examination جس میں اخبار نے لکھا:۔ اس تمام کارروائی کے پیچھے ہمیں علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک کا روی ہاتھ صاف طور پر نظر آرہا ہے جنہوں نے کانگریس کے تعلق سے سرسید کی پالیسی مرتب کرنے میں نمایاں کردار انجام دیا ہے The Bengalee. Jan. 12 1895

55- 23/جون/1894ء کے Statesman نے نقل کیا۔

56- Ibid اس موضوع پر یکم جون 1894ء کے Over کے The Times of India کا اداریہ بھی ملاحظہ ہو۔ Law. weekly Gazette

57- ملاحظہ ہو حکومتِ ہند (وزارت داخلہ) کی اس موضوع پر قرارداد مورخہ کلکتہ 11 مارچ 1904ء

58- 18/مارچ/1904ء کے Indian نے نقل کیا۔

59- Ibid

60- The Manchester Guardian April 15, 1904

61- ملاحظہ ہو مسلم کرانیکل کا 18/نومبر 1889ء کا اداریہ بعنوان "مسٹر غضنفر علی خاں ایک مسلم اُمیدوار کا آئی۔ سی۔ ایس امتحانات میں سرفہرست رہنا Civil and Military Gazette کے لیے ایک "غیر معمولی" بات قرار پایا جس کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے Tribune کہتا ہے "ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اسے ایک "غیر معمولی" بات کیوں سمجھا جارہا ہے۔ ہم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں کہ مسلمان قوم کا ایک بڑا حصہ نسل اور خون کے اعتبار سے بالکل ہندوؤں جیسا ہی ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ دونوں کے جسمانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا عقلی خواص میں کسی قسم کا فرق ہو" 22/ دسمبر 1899ء کے Indian نے نقل کیا۔

62۔ طیب جی کی کامیابی پر Indian Spectator مورخہ 19/ جولائی 1885ء کا تبصرہ

63۔ Indian, December 15, 1899

64۔ اخبار St James Gazette کے حسب ذیل اداریہ شذرات سے مسئلے پر اور روشنی پڑے گی:۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ چند روز قبل ہم نے ایک ہندستانی جریدے کے چند اقتباسات نقل کیے تھے جن میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کے خیالات کی عکاسی کی گئی تھی جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہندستان کے مسلمان اگرچہ وائسرائے کی نیک نیتی کے قایل تھے تاہم ان کی "ترازو کے دونوں پلڑوں کو مساوی" رکھنے کی پالیسی سے مطمئن نہیں تھے۔ اس بات کی شکایت بھی اُن کی جانب سے کی جارہی تھی کہ وہ ہندوؤں کے خیالات پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں اور اس جانب بھی اشارہ کیا جانے لگا تھا کہ کانگریس سے علیحدگی کا روایتی مسلم ردِ عمل تبدیلی کے خطرناک موڑ پر پہنچ گیا ہے۔ اس نظریئے کی تائید صدر کانگریس کے اُس اظہار اطمینان سے بھی ہوجاتی ہے جو انہوں نے گورنر جنرل کی جانب سے ترازو کو منصفانہ طور پر تھامے رہنے پر کیا ہے۔ اگرچہ ہم ایک لمحے کے لیے بھی اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ لارڈ کرزن اقوام کے اس عظیم مجموعے میں سے شاہ ایڈورڈ کے نام سے حکومت کرتے ہیں کسی قوم کی جانب کوئی مخصوص جھکاؤ محسوس کرتے ہیں۔

(St James Gazette, Dec, 28, 1901) مزید ملاحظہ ہو اسی موضوع پر مسلم کرانیکل کے اداریئے بابتہ 4/ فروری 1899ء 3/ نومبر 1900ء 5/ اور 22/ دسمبر 1900ء 12/ جنوری 1901ء اور 15/ جون 1901ء مزید ملاحظہ ہو کتاب The Indian We saved by Sir Walter Roper Lawrence صفحہ 244

65۔ 19/ جنوری 1906ء کے Indian میں لارڈ کرزن کی تقریر کی رپورٹ ملاحظہ ہو۔

66۔ خط بنام Sir A Godley (جو بعد میں Lord Kilbracken کہلائے) مورخہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

27/جنوری 1904ء جسے رونالڈشے Ronald Shay نے اپنی کتاب Life of Lord Curzon حصہ دوم کے صفحہ 328 پر نقل کیا۔

65 Speeches of Lord Curzon, III, 409

66 Ibid. مزید ملاحظہ ہو عشائیہ کی وہ تقریر جو انہوں نے 30/دسمبر 1905ء کو یونائیٹڈ سروس کلب شملہ میں کی تھی۔

Lord Curzon in India edited by Sir Thomas Raleigh 564-65

67 ملاحظہ ہو ان کی گلڈ ہال والی وہ تقریر جو انہوں نے Freedom of the City of London کا اعزاز بخشے جانے کے موقعے پر کی تھی (Speeches of Lord Curzon, III, 1-21)

Lord Curzon نومبر 1905ء بمبئی کے بائیکلہ کلب میں اپنی آخری ہندستانی تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا: "جب مجھ پر وہ لوگ دشنام طرازی کرتے ہیں جو ہندستانی عوام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں تو مجھے نہ ان پر غصہ آتا ہے اور نہ تکلیف پہنچتی ہے کیونکہ میں اپنے ضمیر کو ٹٹولتا ہوں اور خود سے سوال کرتا ہوں کہ اصل ہندستانی باشندے کون ہیں اور کیا ہیں اور یہ سوچ کر خوشی ہوجاتا ہوں کہ میرے ذمہ یہ فرض عائد کیا گیا تھا کہ ان کے دکھوں کو ہلکا کروں اور مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ جاتے ہوئے میں انہیں اس حالت کے مقابلے میں کافی بہتر حالت میں چھوڑے جارہا ہوں جس میں انہیں میں نے یہاں آنے پر پایا تھا۔ (Ibid-237)

70 Proceedings of the Council of the Governor-General of India, 1904-560

71 11/فبروری 1905ء کو منعقدہ کلکتہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے خطبے میں ملاحظہ ہو Convocation Addresses, III, 978-95

72 ملاحظہ ہو Proceedings of the Council of Governor General of India, 1904-562 مزید ملاحظہ ہو۔ حکومت ہند کی وہ قرارداد جو انتظامیہ کے ہر شعبے میں اس بات کی خاص تحقیقات کرنے کے بعد مرتب کی گئی تھی کہ حکومت کی جانب سے یورپینوں اور یوریشیوں کی کس حد تک غیر متناسب سرپرستی کی گئی ہے۔ (تین گوشوارے Tables مرتب کئے گئے (ا) عام گوشوارہ General Table (ب) صوبائی گوشوارے Provincial Tables اور (ج) شعبہ جاتی تقسیم Departmental Distribution جن میں 1867ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(1887ء اور 1893ء) کے برسوں کے اعداد و شمار کا اندراج کیا گیا۔

(1904ء) The Gazette of India مورخہ 4/ جون 1904ء

73- 15 جولائی 1904ء کے India نے نقل کیا۔

74 The Hindustan Review oct 1904, 321

75- گوکھلے کے گوشواروں کے لیے ملاحظہ ہو: Proceedings of the Council of Governor general of India (1905) کا ضمیمہ "ج" (Appendix) صفحات 193 — 200۔

76- ملاحظہ ہو اُن کا مضمون بعنوان Employment of the Indians in public Service. Fiction and fact

جو گوشواروں کے ساتھ ہے جسے Hindustan Review نے اپنے اکتوبر 1904ء کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ اسی موضوع پر 7 مئی 1904ء کے Muslim Chronicle کا اداریہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

77- لیفٹیننٹ گورنر کے ان الفاظ کی توصیف میں 4/ اپریل 1896ء کے Muslim chronicle کا اداریہ ملاحظہ فرمائیے۔

78- Ibid .....

79 ملاحظہ ہو 25/ اگست 1897ء کے امرت بازار پتریکا کا اداریہ بعنوان Generous to the one and strict to the others.

80- 25 اگست 1897ء کے امرت بازار پتریکا میں نقل کیا گیا۔

81 The Hindoo patriot oct 24, 1895

82 The Muslim Chronicle May 9, 1895

83 ملاحظہ ہو M.A.O. College Magazine بابت یکم مارچ 1897ء جس میں کانگریس کے اس مطالبے کو بُری طرح ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔

84 ملاحظہ ہو تھیوڈور مورلیسن کی کتاب Economic transition in India 102-247

85 ملاحظہ ہو سرسید کی وہ تقریر جو انھوں نے 28/ دسمبر 1896ء کو میرٹھ کے مقام پر ایم۔اے۔او۔ ڈیفنس ایسوسی ایشن کے عام جلسے میں فوجی اخراجات میں کسی قسم کی کمی کرنے کے خلاف کی تھی۔ The Pioneer January 13, 1897 .....

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

86 ملاحظہ ہو یکم مارچ 1897ء کے M.A.O College magazine میں بیک کا اداریہ
اسی طرح اُن کا مضمون بعنوان Is India getting poorer? بھی Pioneer کی
27 مارچ، 2 اپریل اور 19 اپریل 1898ء کی اشاعتوں میں ملاحظہ فرمایئے۔

87 - Ibid مزید ملاحظہ ہو اسی موضوع پر مورلیسن کا مضمون مشمولہ Pioneer مورخہ 2
جون 1898ء

88 Administrative problems of British India by Lord
By Joseph Chailley P. 547

سر ہنری کاٹن نے انڈین نیشنل کانگریس کے بارہویں سالانہ اجلاس کی صدارتی تقریر میں
بھی کہا تھا: "انتظامی اصلاح کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ بتدریج یوروپین حکام کی جگہ ہندستانی
حکام کو مامور کیا جائے (واہ، واہ) اسی مقصد کے حصول پر آپ نے اپنی تمام تر توجہات مرکوز
کر رکھی ہیں اور اسی مطالبے کو تسلیم کر کے ہی آپ کی جائز اور معقول اُمنگوں کی تسکین کا سامان ہم
پہنچایا جاسکتا ہے۔"

ملاحظہ ہو۔ The Annual Congress Report (1904) p.41.

مزید ملاحظہ ہو ان کی کتاب New India صفحہ 119

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پانچواں باب

انگریزی تعلیم کے اثرات

اُن دنوں دولت اور سماجی مرتبہ حاصل کرنے کے لیے لازمی تھا کہ ہندستان کے دیسی باشندے کسی نہ کسی قسم کی انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ اس کے بغیر سرکار میں شامل ہونا تو کجا سرکار تک پہنچنا بھی ناممکن تھا۔ مسلمانوں نے ابھی ابھی انگریزی سیکھنی شروع کی تھی جبکہ ہندو جدیدیت کی دوڑ میں ان سے میلوں آگے نکل چکے تھے۔ مسلمانوں کو ایک طویل اور دقت طلب سفر طے کرنا تھا۔ سرسید اپنے ہم مذہبوں کو مسلسل انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اپنی تمام تر توجہات کو اسی مسئلے پر مرکوز کر دیں اور باقی تمام مسایل کو ثانوی حیثیت دیں۔ اس کے بغیر کسی قسم کی ملی یا قومی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اُس دَور میں حالات مسلسل مسلمانوں کے خلاف رُخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ اِس صورتِ حال کی بعض وجوہات پر پہلے ہی تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ حالات یکے بعد دیگرے بگڑتے ہی گئے۔ لیکن وہ بدلتے ہوئے حالات کا رُخ اپنی موافقت میں پھیرنے میں ناکام رہے۔ سر ولیم ہنٹر کی زیرِ صدارت جو تعلیمی رائل کمیشن مقرر کیا گیا تھا وہ بھی اُن کے دُکھوں کا صحیح مداوا تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ کمیشن نے جن متعدد شہادتوں کو سُنا وہ بھی اپنے بیانات میں کافی مبہم ہچکچاہٹ کا شکار رہے۔ بعض گواہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی کہ ان کی ترقی کا سب سے بڑا روڑا یہ ہے کہ اُن کی قوم میں اسلامی تعلیم مفقود ہو چکی ہے اور انگریزی تعلیم کی وجہ سے خود اپنے مذہب سے اُنھیں بدگمانی ہو چلی ہے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح اُن کے اخلاق اور طور طریقے بگڑنے لگے ہیں۔ اس کے برخلاف چند ایسے گواہ بھی تھے جن کا خیال تھا کہ اُن کی زوال آمادگی کی ذمہ داری اُن کے مذہب پر ہرگز عاید نہیں ہوتی[2]۔ رایل کمیشن کے ممبران نے تاثرات کا خلاصہ اس طرح پیش کیا۔

"مسلمانوں نے اپنی قوم میں انگریزی تعلیم کے تعلق سے پائی جانے والی بے اعتنائی کی جو وجوہات بیان کی ہیں وہ اس طرح ہیں: سرکاری مدارس میں مسلمان اساتذہ کا قلیل تناسب، مسلمانوں کے مشوروں اور تعاون کو قبول کرنے سے محکمۂ تعلیمات کے سرکاری حکام کا گریز، محکمہ جاتی کارکردگی کے متعدد چھوٹے موٹے نقائص، سرکاری مدارس کے طلبار کا حیثیتی تعلیم کے حصول میں بہت کم ترقی کرنا، متمول گھرانے کے مسلمانوں کا اپنی اولاد کو گھر پر تعلیم دلانے کا رجحان، ان میں آرام طلبی اور ناعاقبت اندیشی کی بہتات، پیشہ سپہ گری کی جانب اُن کا وراثتی میلان، انگریزوں اور مسلمانوں کے مابین دوستانہ تعلقات کی کمی، اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھنے والوں کا پست سماجی حیثیت کے لوگوں کے ساتھ اختلاط سے احتراز، مسلمانوں میں پائی جانے والی عام غربت، حکومت کی اس قوم کے ساتھ سرد مہری۔ سرکاری مدارس میں ایسی کتابوں کا شاملِ نصاب کیا جانا جو مسلمانوں کے مذہب کے تعلق سے جارحانہ یا تنفر پیدا کرنے والے مواد پر مشتمل ہوں اور اسی طرح کے دیگر اور عوامل[3]۔ تاہم رایل کمیشن کے ممبران نے بعض دیگر عوامل جیسے اپنی قوم پر ناز، عہد ماضی میں اپنے اعلیٰ وارفع موقف کی یاد، مذہبی خدشات اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ فطری لگاؤ پر زیادہ زور دیا[4]۔

اس کے علاوہ بعض وجوہات خصوصی نوعیت کی بھی تھیں، وہ وقت جو مسلمان بچے قرآن کو حفظ کرنے پر صرف کرتے تھے یا فارسی زبان کے سیکھنے میں صرف کرتے تھے۔ مزید برآں چند ہی مسلمان والدین معاشی طور پر اتنے مستحکم موقف میں ہوا کرتے تھے کہ اپنے لڑکوں کو انگریزی تعلیم کی "عیاشی" کروا سکیں۔ زیادہ تر والدین اپنے بچوں کو اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے ہی کو ترجیح دیا کرتے تھے کیونکہ اس میں خرچ بھی کم آتا تھا اور خدا پرستوں میں اُنھیں اس وجہ سے معزز مقام بھی حاصل ہوتا تھا۔

یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے مسلمان طلبا کو انگریزی ذریعہ تعلیم والے مدارس سے دور رکھا۔ وہ مٹھی بھر مسلمان طلبا جو کسی نہ کسی طرح ان اداروں میں شرکت پاتے اُن کی تعریف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندو طلبار کے مقابلے میں زیادہ ہوا کرتیں۔ مزید یہ کہ ہندو طلبار کو اُن کے عزیز و اقارب اپنا تمام وقت غیر مذہبی (سیکولر) تعلیم جیسے کہ انگریزی اور "ریاضی وغیرہ پر صرف کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے جبکہ مسلمان طالبعلموں کو اُن مضامین کے علاوہ مذہبی تعلیم پر کافی وقت صَرف کرنا پڑتا تھا۔ اُن میں سے بعض طلبار کی ہمتیں اس دُہرے بوجھ کی وجہ سے پست ہوگئیں اور اُن پر اس کے بُرے اثرات مترتب ہوئے [5]

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کسی ایک صوبے کی حد تک محدود نہیں تھی۔ ہندستان کے کم و بیش سبھی علاقوں میں یہی صورتِ حال پائی جاتی تھی۔ اپنے انتہائی محتاط طریقِ کار کے باوجود تعلیمی کمیشن کو بھی اس بات پر مجبور ہوجانا پڑا کہ وہ مسلمانوں کو پیش آمدہ تباہی کے طوفان میں غرق ہونے سے بچانے کے لیے حسبِ ذیل اقدامات کی سفارش حکومت سے کرے [6]

1 - مسلمانوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے اور اس خصوصی میں ہونے والے مقامی بلدیہ جاتی اور صوبائی خرچ کو جایز منظورہ خرچ تصور کیا جائے۔

2 - مسلمانوں کے دیسی مدارس کی فراخدلانہ ہمت افزائی کی جائے تاکہ وہ اپنے نصاب میں غیر مذہبی مضامین کو بھی شامل کرسکیں۔

3 - مسلمانوں کے تحتانوی مدارس کے لیے خصوصی معیارات مقرر کیے جائیں۔

4 - مسلمانوں کے لیے تحتانوی اور وسطانوی سطح تک ہندستانی کو ذریعہ تعلیم منتخب کیا جائے بجز اُن علاقوں کے جہاں قوم کے افراد از خود کسی اور زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ کریں۔

5 - دیسی سرکاری زبان اگر ملک کے حصے کی علاقائی زبان نہ ہو تو وہاں اُسے سرکاری خرچ پر بطور خاص مسلمانوں کے لیے چلائے جانے والے مدارس میں تحتانوی اور وسطانوی سطح تک مضمونِ اختیاری کے طور پر داخلِ نصاب کیا جائے اور اُسی زبان میں طلبا کو ریاضی اور حساب کتاب Accounts سکھایا جائے۔

6 - جن علاقوں میں مسلمان بڑی تعداد میں رہتے ہوں وہاں سرکاری خرچ سے چلنے والے مدارس میں ہندستانی اور فارسی زبانوں میں تعلیم دیے جانے کا بندوبست کیا جائے۔

7 - چونکہ اعلیٰ انگریزی تعلیم کے معاملے میں مسلمان قوم خصوصی سرکاری امداد کی مستحق ہے، اس لیے اس معاملے میں ان کی جی کھول کر مدد کی جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

8 - جہاں ضروری ہو وہاں مسلمان طلبار کے لیے بتدریج اضافہ پانے والے وظائف شروع کیے جائیں۔

9 - سرکاری خرچ پر چلنے والے ہر قسم کے مدارس میں مسلمان طلبار کے لیے ایک خاص تناسب میں فیس کی معافی کا بندوبست کیا جائے۔

10 - اُن مقامات پر جہاں مسلمانوں کے لیے تعلیمی وقف موجود ہوں' اور زیرِ نگرانی سرکار ہوں وہاں اُن اوقاف سے ہونے والی آمدنی کو خالصتاً مسلمانوں کی تعلیم ہی پر خرچ کیا جائے۔

11 جہاں کہیں مسلمانوں کے تعلیمی اوقات موجود ہوں جنھیں خانگی افراد یا ادارے چلا رہے ہوں ایسے اداروں کو فراخدلی کے ساتھ امدادی رقوم منظور کر کے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ سرکاری امداد کی بنیاد پر انگریزی تعلیم کے مدارس اور کالج کھولیں۔

12 جہاں ضروری ہو وہاں مسلم اساتذہ کی تربیت کے لیے نارمل اسکول یا کلاسیں کھولی جائیں۔

13 جن مسلم مدارس میں ہندستانی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں اس امر کی کوشش کی جانی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے اداروں میں مسلم اساتذہ ہی درس وتدریس کی ذمہ داری سنبھالیں۔

14 مسلمانوں کے تحتانوی مدارس کے معائنے کے لیے مسلمان ناظرینِ تعلیمات کو موجودہ کے مقابلے زیادہ تعداد میں مقرر کیا جائے۔

15 جو انجمنیں مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج عام کے لیے قایم ہوئی ہیں انھیں تسلیم کرتے ہوئے ان کی ہمت افزائی کی جائے۔

16 - سالانہ تعلیمی رپورٹ میں مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے لیے علیحدہ باب مختص کیا جائے۔

17 سرکاری امداد مسلمانوں اور دیگر لوگوں میں کس تناسب سے تقسیم کی جائے۔ اس بارے میں حکومت مقامی کی توجہ مبذول کروائی جائے۔

ظاہر ہے یہ سفارشات کافی تفصیلی نوعیت کی حامل ہیں جن سے مسلمانوں کی بیشتر شکایات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حکومتِ عالیہ اور ریاستی حکومتیں ان شکایات کے ازالے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے کسی فوری اقدام سے قاصر تھیں تاہم انھوں نے اِن سفارشات کی جانب سنجیدگی سے دھیان دینا شروع کر دیا۔ اُن دنوں بھی سرکاری حکام مسلمانوں کو خصوصی مراعات دیتے ہوئے خاص قسم کے ذہنی تردد کا شکار تھے۔ کیونکہ وہ اس خصوصی برتاؤ کو اپنی مذہبی غیر جانبدارانہ پالیسی کے مغائر سمجھتے تھے۔ لہٰذا مقامی حکومتیں صرف اس بات کا وعدہ کرتی تھیں کہ "انصاف کے تقاضے کے طور پر وہ مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کے حصول کی جدوجہد کے سلسلے میں جو کچھ مدد کر سکتی ہیں ضرور کریں گی"۔[7] جب کہ حکومتِ عالیہ Supreme govt اس بات پر زور دیتی تھی کہ "ملکہ عالیہ کی ہندستانی رعایا کے سبھی طبقات کے ساتھ انتہائی غیر جانبداری کا سلوک روا رکھا جائے اور اس امر کا بطورِ خاص خیال رکھا جائے کہ ریاستی تحفظ، سرپرستی اور امداد سے سبھی یکساں طور پر متمتع ہو سکیں"۔[8]

لیکن احتیاط کے ان مشوروں کے باوجود متعدد صوبائی حکومت نے تعلیمی کمیشن کی پیش کردہ بعض انتہائی اہم سفارشات کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ مثلاً ہندستان کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے دیسی مدارس کی موثر حوصلہ افزائی کی گئی۔ جہاں کہیں ممکن ہوا اردو کی تدریس کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ مسلم اساتذہ اور ناظرینِ تعلیمات کا فراخدلانہ تقرر کیا گیا، مسلمانوں کے لیے خصوصی وظائف جاری کیے گئے۔ کئی مدارس میں نادار مسلمان طلبا کی فیس معاف کر دی گئی۔ مسلمانوں کے تعلیمی اوقات کو ٹھیک طور پر چلانے کے مسئلے پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔ سرکاری حکام کی جانب سے مرتب کی جانے والی تعلیمی رپورٹوں میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر خصوصی تبصرے شامل کیے گئے۔[9]

اِن تمام اقدامات سے بلاشبہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو پھیلانے میں کافی مدد ملی لیکن اس کے نتائج دور رس ثابت نہیں ہوئے جیسا کہ پنج سالہ رپورٹ برائے (1902-7) سے صاف ظاہر ہے۔

> اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے تعلیم کے معاملے میں حکومت کے اُن خصوصی اقدامات کی وجہ سے جو اُس نے مناسب سہولتوں اور رقمی امداد کی منظوری کی شکل میں اختیار کیے ہیں، کافی بہتری ہو چلی ہے تاہم اُس بہتری کی بڑی وجہ خود تعلیمی امور کے بارے میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں عام تبدیلی ہے جو اُس قوم میں بتدریج پیدا ہو چلی ہے۔[10]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ویسے تو کئی عوامل تھے جن کی وجہ سے یہ تبدیلی واقع ہوئی لیکن اس کامیابی کا سہرا شمال مغربی صوبجات میں سرسید احمد خاں، بنگال میں نواب عبدالطیف اور سید امیر علی، بمبئی میں بدرالدین طیب جی اور عبداللہ دھرمسی، سندھ میں حسین علی آفندی اور پنجاب میں انجمن حمایت الاسلام کے بانیوں کی کوششوں کے سر بندھتا ہے۔ انھی بزرگوں کی کاوش کے نتیجے میں علی گڈھ میں ایم۔ اے۔ او کالج بمبئی میں انجمن اسلام اسکول، لاہور میں اسلامیہ کالج، کراچی میں سندھ مدرستہ الاسلام اور کلکتہ میں "مدرسہ" جیسے ادارے قایم ہوئے جن کی تقلید میں ہندستان کے دیگر حصّوں میں بھی ایسے ہی ادارے قایم کرنے کی تحریک نے زور پکڑا۔

لیکن مسلمانوں کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے میں جو بنیادی کردار ایم۔ اے۔ او کالج نے انجام دیا اتنا کسی اور ادارے نے نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس ادارے کی داستان کسی قدر تفصیل سے بیان کی جائے کیونکہ اس کا قیام مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مزید برآں اس ادارے کے رہنماؤں اور طالب علموں نے جلد ہی اپنے ہم مذہبوں کے سیاسی مستقبل کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ درحقیقت دس سال سے کم کے عرصے ہی میں[13] اس ادارے کے صاحبانِ فضل و کمال نے، جنھیں مجموعی طور پر "علی گڈھ اسکول" کہا جاتا تھا، مسلمانوں کے معاملات پر تقریباً اجارہ دارانہ کنٹرول حاصل کر لیا۔ یہی لوگ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی رہنمائی کیا کرتے تھے اور دس جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں سے کم از کم نو اس رہنمائی کو ضرور قبول کر لیا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیس برس سے زیادہ عرصے تک علیگڈھ مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔

وہ حالات جو علی گڈھ میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے قیام کا باعث بنے ان کی تفصیل خود سرسید نے شمال مغربی صوبے کے ناظم تعلیمات کے نام موسومہ اپنے خط میں بیان کی ہے۔ اس خط میں انھوں نے لکھا کہ "کس طرح چند با اثر مسلمانوں نے اپنی قوم کی پسماندگی کے اسباب کی تحقیق شروع کی جس کے باعث انھیں برطانوی حکومت کے زیر سایہ مسلمانوں کے تاریک مستقبل کے تعلق سے شدید خدشات محسوس ہوئے" اسی وجہ سے انھوں نے موجودہ کالج کے قیام کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تشکیل کر ڈالی[14]۔ ابتداً انھوں نے چاہا تھا کہ کالج کو خالصتاً مسلمانوں ہی کے لیے وقف کر دیا جائے لیکن "ہندو امراء اور شرفا نے اتنی فراخدلی کا ثبوت دیا" کہ بعد ازاں طے کیا گیا کہ کالج کے دروازے ہندوؤں پر بھی کھلے رکھے جائیں[15]۔

اس کمیٹی نے اوایل 1872ء میں با اثر مسلمانوں سے چندہ اور حمایت حاصل کرنے کا کام شروع کیا۔ 1873ء تک کمیٹی ایک انگریزی ذریعہ تعلیم کا مدرسہ شروع کرنے میں کامیاب ہوگئی جس کی صدر مدرسی کے فرایض ایک انگریز ایل۔ جی۔ آئی سنڈنس L.G.I. Sidons کے تفویض کیے گئے جو بعد میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے پہلے پرنسپل بنے۔ 8 جنوری 1877ء کو وایسرائے لارڈ لٹن نے کالج کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ہز ایکسلنسی کی خدمت میں پیش کیے جانے والے خطبۂ استقبالیہ میں ارکانِ کمیٹی نے اپنے اس ایقان کو دہراتے ہوئے کہ "ہندستان میں برطانوی راج ایک ایسا غیر معمولی مظہر ہے جس کی مثال دنیا نے اور کہیں نہیں دیکھی"۔ کالج کے اغراض و مقاصد اس طرح بیان کیے۔

> ان حقایق (برطانوی راج کے فواید) کو اپنے ہم وطنوں کے ذہن نشین کرانا، انھیں زیورِ علم سے آراستہ کرنا تاکہ وہ ان فواید کی قدر کر سکیں، ماضی کی اُن موہوم روایات سے چھٹکارا حاصل کرنا جو ہماری ترقی کی راہ کا روڑا ثابت ہوئی ہیں۔ اُن تعصبات کا قلع قمع کرنا جو ہماری قوم کے لیے اب تک نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں۔ مشرقی تعلیم کو مغربی ادب اور علوم کے ساتھ ہم آہنگ کرنا، اہلِ مشرق کے خوابیدہ اذہان کو اہلِ مغرب کی عملی توانائی سے معمور کرنا، مسلمانانِ ہند کو تاجِ برطانیہ کے نیک نام اور مفید شہری بنانا، اُن میں وہ جذبۂ وفاداری پیدا کرنا جو بیرونی حکومت کی غلامی قبول کر لینے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اچھی حکومت کے اچھے کاموں کی قدر افزائی کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقاصد ہیں جو اس کالج کے قیام کے وقت اس کے بانیان کے پیشِ نظر تھے[16]۔

اپنے جواب میں لٹن نے اس تقریب کو برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ ہندستان کی سماجی ترقی کا تاریخ ساز واقعہ قرار دیا" اور اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ وہ اس میں شریک ہو سکے۔ اُنھوں نے "ایک خاص وجہ" سے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے قیام پر خوشی کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اظہار کیا "حکومتِ ہند کسی اور بات کو اس قدر دل سے نہیں چاہتی جتنا یہ چاہتی ہے کہ رعایا کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کے لیے اُس کے سیدھے سادے اصولِ حکومت مکمل طور پر قابلِ فہم ہوں۔" اس مقصد کا حصول "تعلیم یافتہ دیسی باشندوں کی جماعت کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر ممکن ہے نہ کہ انگریز حکام کی تعداد کو دُگنا کرنے یا یورپین سپاہیوں کی تعداد میں بیس گُنا اضافہ کرنے سے۔"[17]

لٹن نے وعدہ کیا کہ وہ ہر ماہ اپنی جیبِ خاص سے کالج کے لیے پانچ سو روپیہ دیا کریں گے دوسرے اہم لوگ جو چندہ دینے میں سرفہرست تھے اُن میں حیدرآباد کے حضور نظام، پٹیالہ، بنارس اور وجیانگرم کے مہاراجہ، رامپور کے نواب، سرسالار جنگ، لارڈ فارتھ بروک، سر ولیم میور Sir William Muir سرجان اسٹریچی اور سر ولیم ہنٹر شامل تھے۔

تاہم سرسید اور ان کے رفقا کو جنھیں سرسید نے اپنے اطراف جمع کر لیا تھا، مسلم عوام کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں نہ صرف طنز اور استہزار کا شکار بننا پڑا بلکہ علما کی جانب سے انھیں دھمکیاں بھی دی گئیں جنھوں نے اپنے خطبوں اور فتاوی کے ذریعے کالج کے خلاف زوردار پروپیگنڈے کی مہم شروع کر رکھی تھی اور مسلسل اسے "اسلام دشمن"[18] ادارہ قرار دے رہے تھے۔ لیکن 1886ء میں مسلمانوں کی مخالفت کے دھارے کا رُخ پلٹنے لگا۔ کئی مسلمان کھلے بندوں کالج کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ اس کے علاوہ دیگر ایسے عوامل بھی تھے جن کی بنا پر کالج ترقی کرنے لگا جن میں سے ایک تو بلاشبہ بقول موریسن، سیاسی نوعیت کا تھا۔[19] سرسید کی کانگریس مخالف تقاریر کی وجہ سے نہ صرف انھیں دفترِ شاہی کی حمایت حاصل ہوئی بلکہ اُنھی کی وجہ سے مسلمان زمیندار اور تعلقہ دار بھی ان کے حلقۂ اثر میں آ گئے جو کسی نہ کسی طرح سے برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔

مزید برآں ہندوؤں نے ملک کے مختلف اہم شہروں اور قصبوں میں جو مخالف گاؤکشی تحریک شروع کر رکھی تھی اُس نے بھی مسلمانوں میں بے چینی پیدا کر دی تھی۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ انگریزی تعلیم کے بغیر انھیں ادنیٰ مقام پر دھکیل دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کی اس تحریک نے بھی انھیں مجبور کر دیا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی یکسانیت تلاش کریں۔" اس طرح" بقول موریسن' اس دور کا غالب رجحان ہی یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کو یکجا کر دیا جائے۔" اس مقصد کے حصول کے لیے سرسید نے انتھک جدوجہد کی۔[20]

اس کے علاوہ کالج کی تعلیمی ترقی نے بھی اس کے بانی کے حوصلوں کو بلند کیا۔ 1891ء میں کالج میں صرف 310 طلباء زیر تعلیم تھے جبکہ 1895ء تک یہ تعداد بڑھ کر 565 تک پہنچ گئی۔ بیک نے اپنی سالانہ رپورٹ میں واضح کیا۔

> یونیورسٹی کے نتائج اچھے رہے۔ کھانے پینے کے انتظامات میں بھی بہتری ہوئی۔ نماز کے اوقات کی بھی باضابطگی کے ساتھ پابندی کی جانے لگی۔ شہسواری سکھلانے والا مدرسہ بھی قایم کیا گیا۔ ڈرل بھی پابندی سے کروائی جانے لگی اور کالج میگزین کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا گیا۔[21]

لیکن 1896ء میں کالج کے ہندو ہیڈ کلرک نے ادارے کے فنڈ کے بڑے حصہ کا غبن کر ڈالا جس کی وجہ سے کالج کی انتظامیہ پر عوامی اعتماد کو دھکا لگا۔ سرسید پر اس صدمے کا گہرا اثر ہوا۔ اس واقعے کی وجہ سے طلباء کی تعداد بھی کم ہو گئی اور عین اسی وقت حکومت نے کالج کی فیس بھی دُگنی کر دی۔ ان تمام واقعات نے مل کر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر گویا عارضی روک سی لگا دی۔ علی گڑھ کے مسلم طلباء کی تعداد جو 1895ء میں 565 تھی گھٹ کر 1898ء میں 343 رہ گئی۔[22]

27 مارچ 1898ء کو سرسید کا انتقال ہو گیا۔ کالج کی ہر چیز ان کی ذات سے اس حد تک وابستہ تھی کہ یوں لگنے لگا گویا ان کے انتقال کے بعد کالج بند ہو جائے گا۔ تاہم بیک اور محسن الملک اس ادارے کے استحکام کے لیے دن رات انتہائی لگن کے ساتھ انتھک محنت کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ادارے کی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھ سکے۔ لیکن اگلے ہی سال بیک کا بھی انتقال ہو گیا۔ ادارے کے لیے یہ دوسرا شدید اور ناقابلِ برداشت صدمہ تھا۔[23] موریسن آگے آئے اور اُنھوں نے بیک کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور حالات کا چیلنج قبول کر لیا۔ اپنی محنت اور لگن کی وجہ سے وہ مشکلات پر قابو پا سکے۔ وہ 1905ء تک پرنسپل کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ اس کے بعد اُن کی جگہ ایک اور انگریز ڈبلیو اے۔ جے آرچ بولڈ (W A J Archbold) نے لے لی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان تینوں پرنسپلوں نے اُبھرتی ہوئی مسلمان نسل پر اپنے اثرات کی وجہ سے مسلم سیاست میں کافی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ اس کے علاوہ اُن میں سے ہر شخص نے ہندستان کے سیاسی نزاعی مسایل میں فعال طور پر دلچسپی لی اور متعدد بار علی گڑھ کی مسلم قیادت کی رہنمائی انھی خطوط پر کی جو اُن کی پسند خاطر تھے۔

۱۹۰۰ء تک علی گڈھ کے ایم۔ اے۔ او کالج کو کل ہند شہرت حاصل ہوگئی۔ نہ صرف ہندستان کے تمام صوبوں کے طلبا ہی شرکت کے لیے آنے لگے بلکہ مشرق بعید یعنی برما اور سنگاپور کے طلبا کی آمد بھی شروع ہوگئی۔ اس کالج کے طلبا اُس وقت ہندستان میں قایم پانچوں جامعات کے امتحانات میں شرکت کرنے لگے۔ حسبِ ذیل گوشوارے سے اس کردار کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا جو اس نے مسلمانوں کے تعلیمی میدان میں زیرِ تحقیق مدت کے دوران انجام دیا ہے: ذیل کے اعداد و شمار ہندستان کے مسلمان گریجویٹس کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں

سال	کلکتہ	مدراس	بمبئی	پنجاب	الہ آباد	جملہ	علی گڈھ
۱۸۸۲-۸۷	۸۰	۱۲	۷	۱۱	-	۱۱۰	۱۰
۱۸۸۸-۹۲	۹۰	۹	۱	۶۰	۵۳	۲۰۳	۱۶
۱۸۹۳-۹۷	۱۰۷	۲۱	۱۸	۲۱	۱۶۵	۲۹۸	۲۰
۱۸۹۸-۱۹۰۲	۱۲۱	۱۸	۲۶	۱۲۳	۱۳۲	۶۷۸	۱۱۷

ان اعداد و شمار کے تجزیے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۸۲ء میں ہندستان بھر کے مسلمان گریجویٹس کے مقابلے میں علی گڈھ کے گریجویٹس کی تعداد تناسب کے اعتبار سے صرف ۹۰ فی صد ہے جبکہ ۱۹۰۲ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۷۰ فی صد ہوگئی یعنی تقریباً تین گنا اضافہ ہوا۔

لیکن ایم۔ اے۔ او کالج صرف ایک تعلیمی مرکز ہی نہیں تھا بلکہ دیگر کئی سرگرمیوں کے لیے تربیتی مرکز بھی تھا۔ بیک اور موریسن نے ہمیشہ ہی "بابوؤں کے خبط" یعنی محض امتحان کامیاب کرنے کی دُھن کو ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا۔ انھوں نے ہمیشہ "کردار سازی" پر زور دیا[25] محض کلرک سازی یا ادنیٰ حکام سازی اُن کا مقصود کبھی نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان طلبا کی تربیت انگریزی پبلک اسکولس کے خطوط پر کی جائے، تاکہ اپنے سماجی افتخار Social Pride کو وہ برقرار رکھ سکیں[26]۔ اس مقصد کے لیے درجنوں انجمنیں اور کلب شروع کیے گئے۔ مثلاً سڈن کلب Sidon's club جو فنِ کتابت اور مباحثے کی استعداد کو اجاگر کرنے کی غرض سے قایم کیا گیا۔ کالج یونین جو طلبا کو پارلیمانی نظام کی تربیت دینے کی غرض سے قایم کی گئی۔ اخوان الصفا جو اسلامی روایات کی برقراری کے لیے قایم کی گئی۔ انجمن الفرض قوم کے لیے نوجوانوں کی ذمہ داریوں کو اجاگر کرنے کے لیے قایم کی گئی ویسے ان تمام انجمنوں کو طلبا ہی چلاتے تھے لیکن پس منظر میں ہر جگہ بیک، مورینسن یا اور کوئی انگریز پروفیسر ہوتا جو نہ صرف ان کی سرگرمیوں کا نگراں ہوتا بلکہ زود اثر پذیر مسلمان نوجوانوں کے ذہن میں برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری کی افادیت جتلانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا تھا اور اس بات کا کوشاں ہوتا تھا کہ مسلمان برطانیہ کے خلوص پر بھروسہ کرنے لگیں۔ مزید برآں ہندو مخالف جذبات کی اکثر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ جس وقت جے۔ سی چکرورتی J. C. Chakravarti ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے کالج میں لیے گئے ہندو مخالف جذبات اس شدت کے ساتھ فضا میں موجود تھے کہ مورینسن کو اپنی ایک رپورٹ میں تسلیم کرنا پڑا کہ "یہ سوچنا ممکن نہیں ہے کہ ایسی باتیں نہ کہی گئی ہوں گی جو اُن کے لیے تکلیف کا باعث ہوئی ہوں[27]"۔

علی گڈھ کا سماجی رجحان بلاشبہ فرقہ وارانہ Sectarian اور وفادارانہ Loyalist تھا اس لیے لازم تھا کہ طلبا کے نقطہ نظر پر بھی اس کی چھاپ پڑتی۔ مثال کے طور پر بیک کے نزدیک تعلیمی استعداد کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ انھیں تو اس بات میں دلچسپی تھی کہ ملکہ عالیہ کے لیے اچھی اور وفادار رعایا پیدا کی جائے۔ لہٰذا انھوں نے ہندستانی جامعات کے طریقِ عمل کی تنقیص کی جو بڑی تیزی سے "دیسی باغیوں" کا گڑھ بنتی جارہی تھیں۔ انھوں نے ان جامعات کو "درجہ اوّل کی سیاسی بُرائی" قرار دیا۔ اُن کے بقول ہندستانی یونیورسٹی "حاکم اور محکوم کو ہمدردی کے معاملے میں ایک دوسرے سے بیگانہ بنادیتی ہے۔ یہ ادارہ صحیح معنوں میں عالم وفاضل Scholar اشخاص پیدا کرنے میں بُری طرح ناکام رہا ہے نہ ہی اس کی چہار دیواری میں شرافت کا درس دیا گیا اور نہ ہی اُس نے طلبا میں جوش وخروش، عوامی جذبہ اور مردانگی کا جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی"۔ علی گڈھ میں بنیادی طور پر اُن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی دلچسپی مسلمانوں کو انگریزوں سے قریب لانے پر مرکوز رہی تاکہ انھیں "باغی" ہندوؤں سے الگ رکھا جا سکے[28]۔

بیک کے انتقال کے بعد موریسن نے اُنھی کی حکمتِ عملی کو بڑے ہی خلوص اور جوش و خروش کے ساتھ جاری رکھا۔ بیک کے مقابلے میں زیادہ دوستدار amiable ہونے کے باعث موریسن زیادہ کامیاب رہے۔ ہندوؤں کی جانب سے چلائی گئی مخالف گاؤکشی مہم نے انھیں انگریز مسلم مفاہمت پیدا کرنے کا بہترین موقع فراہم کر دیا۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ ہندوؤں کی یہ تحریک اتنی ہی انگریزوں کے خلاف بھی ہے جتنی کہ مسلمانوں کے خلاف کیونکہ دونوں ہی گوشت خور قومیں ہیں۔

علی گڈھ میں انگریز پروفیسر کس قدر بااثر تھے اس بات کا اندازہ اُس واقعے سے ہو جاتا ہے جس میں سرسید کے انتہائی قریبی ساتھی سمیع اللہ خاں کو کالج کے متولی کی حیثیت سے برخاست کر دیا گیا تھا کیونکہ سمیع اللہ خاں کالج کی ہر سرگرمی پر انگریز پروفیسروں کی بالادستی کے خلاف تھے بطور خاص وہ پالیسی کے معاملات میں ان کی دخل اندازی کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ مزید برآں اُنھیں یہ بات بھی پسند نہیں تھی کہ اُن انگریز پروفیسروں کو بھاری بھرکم تنخواہیں دی جائیں جبکہ کالج سخت مالی دشواریوں سے دوچار تھا۔ بیک اور اُن کے ساتھیوں نے بتدریج کالج کی مجلسِ انتظامیہ میں سمیع اللہ خاں کی مخالفت کا عنصر پیدا کر دیا اور ۱۸۷۶ء کے اختتام تک سرسید کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے صاحبزادے سید محمود کو کالج کمیٹی کا جوائنٹ سکریٹری نامزد کر دیں۔ انھوں نے سرسید کو اس اقدام پر اس وجہ سے مجبور کیا کہ انھیں اس بات کا خدشہ لاحق تھا کہ اگر بروقت کوئی قانونی انتظام نہ کر لیا گیا تو سرسید کی وفات کے بعد کالج کے قدیم ترین، بااعتماد اور فعال خادم ہونے کے باعث کہیں سمیع اللہ خاں ہی اس ادارے کے سکریٹری نہ بنا دیئے جائیں۔ یہ صدمہ سمیع اللہ خاں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا چنانچہ اُنھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اس کے بعد کالج کے معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنی تمام تر توجہات کو الہ آباد میں ایک مسلم ہوسٹل کے قیام پر مرکوز کر دیا[29]۔

سرسید نے اس کالج کے علاوہ دسمبر ۱۸۸۶ء میں ایک محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی داغ بیل بھی ڈالی تھی جو جلد ہی اُن کی عوامی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ غالباً اس کا خیال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی وجہ سے پیدا ہوا جیسے ایک سال قبل ملک کے سربرآوردہ ہندوؤں، پارسیوں اور یوروپین لیڈروں نے بمبئی میں قایم کیا تھا لیکن آخرالذکر کے برخلاف سرسید کی کانگریس میں کسی سیاسی مباحثے کی اجازت نہیں تھی۔ اس بات کو سرسید نے 1886ء کے کرسمس کے ہفتے میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس ہی میں واضح کر دیا جو علی گڈھ میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں 87 نمائندوں نے شرکت کی تھی اور صدارت سمیع اللہ خاں نے انجام دی تھی۔

"حضرات" سرسید نے وفود سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "میں اُن لوگوں سے متفق نہیں ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ سیاسی بحث و مباحثے کے بغیر کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ اس کے برخلاف میرا خیال تو یہ ہے کہ تعلیم اور صرف تعلیم کے ذریعے قوم کی تعمیرِ نو کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اس وقت ہمیں اپنی قوم میں تعلیم کی ترویج کے سوا کسی اور مسئلے پر توجہ مرکوز کرنی نہیں ہے۔"[30]

لہٰذا اس کانگریس نے اپنے تمام اجلاسوں کو اسی مقصد کے حصول کی خاطر درکار ذرائع اور وسایل تلاش کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ اپنے طور پر سرسید کا یہ خیال تھا کہ ایم۔ اے او کالج کی جتنی مدد کی جائے گی اُتنا ہی مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کو فروغ حاصل ہوگا۔[31]

ایجوکیشنل کانگریس کا دوسرا اجلاس دسمبر 1887ء کے آخری ہفتے میں لکھنؤ کے مقام پر منعقد ہوا۔ اس کی صدارت اودھ کے انتہائی با اثر اقتدار منشی محمد امتیاز علی خاں نے کی جس میں 130 وفد شریک ہوئے۔ اس کانگریس کی کارروائیوں پر ملک بھر میں اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی کہ سرسید کی کانگریس مخالف تقریروں پر دی گئی جو انھوں نے اس اجلاس کے فوری بعد لکھنو اور میرٹھ میں کی تھیں۔ اگرچہ سرسید نے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کو استعمال نہیں کیا اور اس طرح اس کے غیر سیاسی کردار کو داغدار ہونے نہیں دیا تاہم اُن کانگریس مخالف تقریروں میں لکھنؤ کے اجلاس میں شرکت کرنے والے بیشتر وفود موجود تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا تیسرا سالانہ اجلاس بے حد کامیاب رہا۔ یہ اجلاس دسمبر 1888ء کی 29، 30 اور 31 تاریخوں کو لاہور میں منعقد کیا گیا جس میں شمالی ہندستان کے اہم مراکز سے 258 وفود اور کئی سو ناظرین (Visitors) نے شرکت کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لفٹیننٹ گورنر نے بڑا درباری شامیانہ اجلاس کے لیے عنایت فرمایا۔ اس اجلاس کی صدارت گجرات کے ڈسٹرکٹ جج سردار محمد حیات خاں نے کی۔ اس اجلاس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں اُن کے ذریعے (1) حکومتِ ہند کی 15 جولائی 1885ء کی قرارداد پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا گیا (2) دوسری قرارداد کے ذریعے غریب طلبا کی امداد کے لیے مالیہ فراہم کرنے کا عزم کیا گیا (3) ایک اور قرارداد کے ذریعے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ شادی اور میت کے اخراجات میں کمی کریں[32]۔ ان قراردادوں پر موثر عمل آوری کرانے کے لیے طے کیا گیا کہ ہندستان بھر میں ضلعی اور صوبائی سطحوں پر اس کانگریس کی اسٹینڈنگ کمیٹیاں قایم کی جائیں۔

اُسی دنوں انڈین نیشنل کانگریس نے بھی الہ آباد کے مقام پر اپنا سالانہ اجلاس منعقد کیا۔ دونوں کانگرسوں کے فرق کو اخبار Pioneer کے نمائندۂ خصوصی نے اس طرح بیان کیا:

> ایک نے تو عالیشان سیاسی منصوبوں کے پرچم لہرادیئے اور ملک کے حکمرانوں کو ان کی خامیوں اور کوتاہیوں پر مطلع کیا اور خود کی صلاحیت اور استعداد پر فخر کیا جبکہ دوسری نے اپنی تمامتر توجہات کو تعلیم اور گھریلو معاملات کی درستگی اور تعلیمی میدان میں اپنے لوگوں کی پسماندگی پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے خود کوشی self help اور قربانیٔ نفس (self sacrifice) کے منصوبوں کو قطعیت دینے پر صرف کیا۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے تو یہ فرق اور بھی شدید ہوجاتا ہے۔ ایک کانگریس نے تو مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا دعویٰ کیا جبکہ دوسری کانگریس نے واقعتاً مسلمانوں کی نمائندگی کا فرض انجام دیا۔ اوّل الذکر تنظیم کے بیرونی افراد outsiders نے ہر مسلمان کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا خواہ وہ شخص غیر اہم اور غیر تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو جبکہ آخر الذکر تنظیم میں قوم کے مہذب قایدین نے ازخود شرکت کی۔ یہ ایسے افراد تھے جنھیں قوم کی ریڑھ کی ہڈی کہا جاسکتا ہے۔ یہ قوم کے حقیقی قایدین تھے جنھیں بالائی ہند کے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زبان کھولنے کا پورا اختیار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل ہے۔[33]

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا چوتھا سالانہ اجلاس 27 تا 30 دسمبر 1889ء کو علی گڈھ میں منعقد کیا گیا جس میں ایک خاص قرارداد نے وفود کے غم و غصہ کو کافی بھڑکا دیا۔ یہ قرارداد بعض مدارس میں چند ایسی کتابوں کے داخل نصاب کیے جانے سے متعلق تھی جن میں اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض مواد شامل تھا۔ اس اجلاس میں تعلیمات کے حکام سے مطالبہ کیا گیا کہ اُن کتابوں کو فوراً نصاب سے خارج کیا جائے اور آئندہ ایسی کوئی کتاب داخلِ نصاب نہ کی جائے جس میں اسلام یا بانی اسلام آنحضرت محمد صلعم کی شان میں معمولی سی بھی گستاخی کی گئی ہو۔[34]

لیکن اس کانگریس کی سب سے دلچسپ بات وہ مباحثہ تھا جس کا اہتمام ایم۔ اے او۔ کالج کی انجمن مباحثہ Debating Society نے کیا تھا اور جس میں وفود نے بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ مباحثے کا موضوع تھا "ایوان کی رائے میں مغل سلطنت کے زوال کی ذمہ داری اورنگ زیب کی پالیسی پر نہیں بلکہ اکبر کی پالیسی پر عاید ہوتی ہے۔" اس موقع پر دھواں دھار تقریریں کی گئیں جن میں اکبر پر کافی لعن طعن کی گئی۔ سامعین نے اورنگ زیب پر ہلکی سی تنقید پر بھی غم و غصے کا اظہار کیا۔ جس وقت اس موضوع پر رائے شماری کی گئی تو موضوع کے حق میں 119 ووٹ پڑے جبکہ اس کے مخالف 36 ووٹ ڈالے گئے۔[35]

کانگریس کا پانچواں اجلاس 1890ء کے کرسمس کے ہفتے میں الہ آباد کے مقام پر منعقد کیا گیا جس میں تقریباً ایک ہزار مندوبین نے شرکت کی۔ (اس اجلاس میں کانگریس کا نام تبدیل کر کے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا۔ ہم آئندہ اسی نام کا استعمال کریں گے) یہ اجلاس الہ آباد یونیورسٹی کے اُس فیصلے کے فوری بعد منعقد کیا گیا جس کی رُو سے فارسی زبان کو بہ حیثیت ایک کلاسیکی زبان کے یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کر دیا گیا۔ سرسید نے اس اقدام کے خلاف پُرزور آواز بلند کی اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ یونیورسٹی کی سینیٹ Senate پر ہندوؤں کی غالب اکثریت قابض ہے۔ انھوں نے اسے "ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کی تعلیم پر پہلا حملہ" قرار دیا۔ اس اجلاس میں کانفرنس نے ایک قرارداد بھی اس ضمن میں منظور کی۔[36]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک اور قرارداد پر بحث کرتے ہوئے سرسید نے ہندستانی جامعات میں تکنیکی تعلیم کی ترویج کی مخالفت کی۔ بیک نے بھی اُن کی حمایت کرتے ہوئے مندوبین پر واضح کیا کہ تعلیم کا مقصد طلبا کی تکنیکی تربیت فراہم کرنا نہیں ہوتا بلکہ عوام کے مطالعے کے ذریعے ذہن انسانی کی تعمیر ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یوں برآمد ہوا کہ کانفرنس نے متفقہ طور پر حکام سے خواہش ظاہر کی کہ "ہندستانی جامعات میں تکنیکی تعلیم کو رائج نہ کیا جائے اور ادبی تعلیم کے نصاب میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے"[37]

دسمبر 1891ء کے آخری ہفتے میں علی گڑھ کے مقام پر کانفرنس کا چھٹا اجلاس نواب محمد اسحاق خاں کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ جس میں 449 مندوبین اور 30 ناظرین visitors نے شرکت کی۔ اکثر مباحث معمول کے موضوعات پر ہی مشتمل تھے اور غیر معمولی اہمیت کی حامل کوئی قرارداد منظور نہیں کی گئی۔

کم و بیش یہی صورتِ حال کانفرنس کے ساتویں اجلاس کی بھی رہی (جو گذشتہ سال کی طرح اگلے دنوں میں منعقد کیا گیا) جس کی صدارت مولوی محمد حشمت اللہ نے کی۔ اس اجلاس میں شریک ہونے والے مندوبین کی تعداد 613 تھی جبکہ 128 ناظرین بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ چونکہ یہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تھا اس لیے شمالی ہند کے بیشتر سربرآوردہ مسلمانوں نے اس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں "مسلمانوں کے قدیم فنون" کے تحفظ اور اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے اجرا سے متعلق قراردادیں منظور کی گئیں۔

ایک اور قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی جس کا تعلق برطانیہ میں مقیم مسلم طلبا کی سرگرمیوں سے تھا۔ سرسید خود اس قرارداد کے محرک تھے جس میں کہا گیا تھا:

> "کہ اس کانفرنس نے اپنے متعدد جلسوں میں اس امر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے کہ طلبا اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان جایا کریں کانفرنس نے اس فعل کو قومی ترقی کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا کانفرنس اپنے اس خیال کے اظہار کو بھی ضروری سمجھتی ہے کہ اسے یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ طلبا انگلستان تو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مقصد سے جائیں اور وہاں دوسری قوموں کی خواتین سے رشتۂ ازدواج استوار کرنے لگیں"[38]

کانفرنس کا آٹھواں اجلاس دسمبر 1893ء کے آخری ہفتے میں علی گڑھ کے مقام پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منعقد ہوا جس کی صدارت محسن الملک نے کی اور جس میں 672 مندوبین اور 118 ناظرین شریک ہوئے جن کا زیادہ تر تعلق صوبہ جات متحدہ اور پنجاب سے تھا۔ اس اجلاس میں بجز اس کے اور کوئی اہم فیصلے نہیں کیے گئے کہ مسلمان طلباء کی ہمت افزائی کے لیے سرکاری مدارس اور کالجوں میں خصوصی وظیفے قایم کیے جائیں تاکہ وہ عربی کو ثانوی زبان کی حیثیت سے منتخب کر سکیں۔[39]

کانفرنس کا نواں اجلاس پھر ایک بار علی گڈھ ہی میں حسب سابق 1894ء کے آخر میں منعقد ہوا جس کی صدارت پنجاب کے مشہور بیرسٹر محمد شاہ دین نے انجام دی۔ اس اجلاس میں 400 مندوبین نے شرکت کی۔ کانفرنس نے محسوس کیا کہ انگریزی تعلیم کی عام ترویج پر بار بار زور دیتے رہنے کے باوجود اس سمت میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے کانفرنس نے مسلمانوں سے عام طور پر اور متمول لوگوں سے خاص طور پر التماس کی کہ آیندہ بیس برس کے دوران مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو ترقی دینے کی غرض سے کچھ رقم یا کچھ جائداد مختص کر دیں کیونکہ کانفرنس نے یہ بات محسوس کی کہ جب تک مناسب ذرایع اور وسایل مہیا نہیں کیے جاتے خاطر خواہ نتایج کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔[40]

کانفرنس کا دسواں اجلاس 1895ء کے کرسمس کے ہفتے میں شاہجہاں پور کے مقام پر منعقد ہوا جو صوبہ جات متحدہ میں واقع ہے۔ پھر ایک بار محسن الملک ہی کو صدارت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اپنے خطبے میں نواب صاحب نے زور دے کر یہ بات کہی کہ اسلام کسی تہذیب و تمدن کا دشمن نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس بنا پر انگریزی تعلیم کی مخالفت کرنا کہ یہ اسلام میں بگاڑ پیدا کر دے گی گویا اس بات کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے کہ اسلام صرف غیر مہذب اور جاہل قوموں ہی کے لیے موزوں تھا۔[41]

تنظیم کے نام میں پھر ایک بار ہلکی سی تبدیلی کی گئی یعنی "اینگلو اورنٹیل" کے الفاظ نام میں مزید شامل کیے گئے۔ تبدیلی کے بعد تنظیم کا نام دی محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس ہو گیا۔ ویسے اس تبدیلی کی کوئی وجہ تو ظاہر نہیں کی گئی تاہم غالباً ایسا اس لیے کیا گیا کہ دونوں اداروں یعنی کانفرنس اور محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ظاہر کیا جائے۔[42]

اس اجلاس میں جو مختلف قراردادیں منظور کی گئیں اُن میں سے ایک میں تعلیم یافتہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں انگریزی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں کریں تاکہ اُن کے وہ "بدقسمت بھائی" جو انگریزی سے نابلد ہیں۔ ان تراجم کے ذریعے انگریزی زبان میں پائی جانے والی "علم کی دولت" کا صحیح اندازہ لگا سکیں[43]

کانفرنس کا گیارھواں اجلاس 27 سے 30 دسمبر 1896ء تک میرٹھ کے مقام پر منعقد ہوا جس میں زیادہ تر کانفرنس کی تنظیم جدید، سالانہ اجلاسوں کا ایجنڈا اور مالیہ اور مختلف سالانہ کانفرنسوں میں منظور کی گئی قراردادوں پر عمل آوری کے لیے مقامی اسٹینڈنگ کمیٹیوں کا قیام[44] جیسے مسایل زیر بحث آئے۔ ویسے دیگر مسایل پر تو حسب معمول بحث ہوتی رہی لیکن اُس وقت کافی گرما گرمی پیدا ہوگئی جب بعض مندوبین نے بقول خود سرسید کے "تحکمانہ لب و لہجے" اور "مستبدانہ رویے"[45] کے خلاف آواز اُٹھائی۔

جب دونوں جانب گرما گرمی کم ہوئی تب بیک اور موریسن نے کانفرنس کے اصول وضوابط میں چند تبدیلیوں کا مشورہ دیا تاکہ اُس کی کارکردگی کو صحیح جہت عطا کی جا سکے۔ اس کانفرنس کی سب سے اہم چیز سید حسین بلگرامی جیسے مشہور مستشرق کا ممتاز Brunt خطبہ صدارت تھا لیکن اسے ایک "علمی مقالے" کی بجائے "ادبی ضیافت" قرار دیا جا سکتا ہے[46]

اگلے برس سرسید کی شدید علالت کے باعث کانفرنس کا کوئی اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ اس علالت کے باعث بالآخر سرسید نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ چنانچہ اُن کے انتقال کے بعد کانفرنس کا بارھواں اجلاس 1898ء کے کرسمس کے ہفتے میں لاہور میں منعقد ہوا غالباً اپنے مرحوم قایدکے کارناموں کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے اس اجلاس میں ایک ہزار سے زیادہ مندوبین اور چند سو ناظرین نے شرکت کی۔ اس اجلاس کی صدارت شمالی ہند کے بڑے زمینداروں میں سے ایک نواب فتح علی خاں قزلباش نے کی۔ شہر کے باشندوں میں اُس وقت اتنا زیادہ ولولہ موجود تھا کہ "وہ پُرجوش نعروں کے ساتھ مہمانوں کا شیر مقدم کر رہے تھے اور اُن پر پھول نچھاور کر رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر عوام کا جذبۂ خلوص اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انھوں نے گھوڑوں کو سواریوں سے الگ کر دیا اور خود ان کی سواریوں کو کھینچتے ہوئے ان کی رہائش گاہوں تک لے گئے"[47]

غالباً آج تک کانفرنس کی جانب سے منظور کی جانے والی قراردادوں میں سب سے اہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرارداد اس اجلاس میں منظور کی گئی ۔ اس قرارداد کے محرک تھے تھیوڈور موریسن اور موضوع تھا " ہندستان میں ایک مسلم یونیورسٹی کا قیام " اس قرارداد کی تائید کرتے ہوئے شاہ دین نے بعض بڑی اہم باتیں بیان کیں " ہم ایک مذہبی قوم ہیں نہ کہ ایک علاقائی " انھوں نے کہا " ہم ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ اخوت میں اس لیے منسلک نہیں ہیں کہ ہم ایک ہی ملک میں ایک ہی حکومت کے زیرِ سایہ رہتے ہیں بلکہ اس لیے کہ ہم ایک ہی خدا کی پرستش کرتے ہیں اور ایک ہی رسول کی اتباع کرتے ہیں ۔ خدا کرے کہ مسلمانانِ ہند کو یہ فخر اور اعزاز حاصل ہو کہ وہ عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کی عظیم عقلی نشاۃ ثانیہ کی قیادت کا فرض انجام دے سکیں "[48]

اس کانفرنس میں دوسرا اہم اعلان بیک کی جانب سے کیا گیا۔ سرسید کے انتقال کی وجہ سے کانفرنس کے کارناموں اور مستقبل کے بارے میں بولتے ہوئے اس پر زور دینا ضروری ہو گیا تھا ۔ انھوں نے کہا :

> محمڈن کانفرنس محض ایک تکنیکی انجمن ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک محب وطن سیاسی تنظیم ہے اس کا مقصد مسلمانوں کے دلوں میں اُن کی محبوب ملکہ کے لیے جذبۂ وفاداری پیدا کرنا اور مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین جذبۂ اخوت کو پروان چڑھانا ہے[49]

سرسید کے انتقال کے بعد محسن الملک کانفرنس کے جنرل سکریٹری بن گئے ۔ اپنے قاید کے طریقے کے برخلاف آخرالذکر نے یہ ضروری خیال نہیں کیا کہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس علی گڈھ کے قرب و جوار ہی میں منعقد کیے جائیں۔ انھوں نے اس کے دائرۂ کار کو وسیع کیا اور ہندستان بھر کے مسلمانوں کو اپنی جانب متوجہ کر کے اس کی طاقت میں اضافہ کیا مسلمان قوم کی سرگرمیوں کے ایک مرکز کے طور پر اس تنظیم کے تفاعل بالقوۃ Potential کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے طے کیا کہ سال بہ سال اس کانفرنس کے اجلاس ہندستان کے اہم شہروں میں منعقد کیے جائیں ۔ جس کے نتیجے میں اس کا تیرھواں اجلاس ۱۸۹۹ء کے کرسمس کے ہفتے میں کلکتہ میں منعقد کیا گیا ۔ کانفرنس کے مرکزی کمیٹی کے سکریٹری نے دعویٰ کیا کہ " یہ پہلا موقع ہے جب بنگال، بہار اور اڑیسہ کے مسلمانوں کو " کسی کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا[50] اس بات کو اُس صوبے کے لفٹیننٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گورنر نے بھی بے حد پسند کیا تھا[51] جس وقت مندوبین کا شاندار جلوس سڑکوں سے گذر رہا تھا اُس وقت شہر کے مسلمان اس جلوس کی "ایک جھلک" دیکھنے کے لیے بالکنیوں اور کھڑکیوں میں کھچا کھچ بھر گئے تھے[52]

اپنے افتتاحی خطبے میں شاہ دین نے مسلمانان بہار اور بنگال پر ایک نکتہ خصوصیت کے ساتھ واضح کر دیا جو ایم۔ اے۔ او کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے باہمی تعلق سے متعلق تھا "دونوں ادارے ایک ہی ذہن کی پیداوار ہیں اور اُنھی ہنرمند ہاتھوں نے دونوں کی شبیہہ بنائی ہے۔ متعدد مقاصد کے لیے ایک ہی ادارے کا تشخص دوسرے کے ذریعے ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے لیکن اس کے باوجود دونوں کے اغراض و مقاصد کو یکساں نہیں کہا جا سکتا" بعد ازاں اُنھوں نے کانفرنس کے وسیع قومی کردار کی وضاحت کی اور اس کا تقابل کالج سے کیا جس کا دائرہ قدرتاً اُس مخصوص تعلیم کی حد تک محدود ہے جو اس کی چہار دیواری کے اندر دی جاتی ہے جبکہ اول الذکر کے دروازے "ہر اُس شخص کے لیے کھلے ہیں جو اُس کے قریب آتا ہے جو ہر گوشے سے مشورے قبول کرتا ہے اور ہر قسم کی تجاویز پر بحث و مباحثہ کرتا ہے" چنانچہ مسلمانوں کی عقلی اور اخلاقی ترقی کے لیے دونوں ادارے لازمی ہیں۔ ایک ادارہ دوسرے کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا[53]

اپنے صدارتی خطبے میں امیر علی نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ترویج کے لیے کئی عملی مشورے دیئے۔ اُنھوں نے ہر ضلعے یا چند اضلاع کے مجموعے میں ایک ایک "اینگلو اورنٹیل محمڈن اسکول" کے قیام پر کافی زور دیا تاکہ یہ مدارس شمال مغرب کے مرکزی کالج کے معاون Feeder کا کردار ادا کر سکیں" اُنھوں نے اپنے ہم مذہبوں پر زور دیا کہ وہ اپنے اوقاف کی توثیق Validation اور اس کے مناسب بندوبست کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو ایسی تعلیم دلانے کی جد وجہد کریں جو "یورپ کے بہترین ضوابط Methods کو صحیح اسلامی تربیت کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے" انھوں نے تعلیم نسواں کی افادیت پر بھی زور دیا اور واضح کیا کہ مسلم نوجوان ہندستان میں اسلامی احیاء کے لیے کس قدر اہم کردار انجام دے سکتے ہیں[54]

کانفرنس نے کئی قراردادیں منظور کیں جن میں سے بعض بنگالی مسلمانوں کی خصوصی ضروریات سے متعلق تھیں۔ مثلاً محسن وقف Mohsin Endowment اور کلکتے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"مدرسے" کے اینگلو پرشین شعبے سے متعلقہ مباحث پر کافی وقت صرف کیا گیا۔ لیکن سب سے اہم قرارداد وہ تھی جس کے ذریعے کانفرنس نے ایک مسلم یونیورسٹی کے قیام کے مطالبے کو دہرایا تھا اور جس میں اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے چندوں کی اپیل کی گئی تھی اور اپنے اس ایقان کو دہرایا گیا تھا کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو ایک یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کر کے اس مطالبے کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ "جہاں کی آب و ہوا بقول نواب علی چودھری" انتہائی خوشگوار اور صحت بخش ہے، جہاں کافی ارزانی پائی جاتی ہے اور جس کے اطراف ایسی تاریخی نشانیوں کے انبار لگے ہیں جن سے اس ملک ہندستان میں مسلمانوں کی عظمت اور تہذیب کا سُراغ ملتا ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ علی گڑھ سے" زیادہ موزوں کسی اور جگہ" کا انتخاب اس وجہ سے نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی عمارات میں لگی اینٹوں کو ایک ایسے شخص کے لمس سے تقدس حاصل ہو گیا ہے جس سے زیادہ شریف اور جس سے بڑھ کر عظیم کوئی دوسرا شخص شاید ہی کبھی اس روئے زمین پر پیدا ہوا۔"[56]

ایک اور قرارداد کے ذریعے یہ طے کیا گیا کہ "یکم جنوری ۱۹۰۰ء سے لے کر تین سال کے عرصے میں" ہر صوبائی صدر مقام پر اسلامی قوانین اور اعلیٰ مسلم گھرانوں کی روایات کے مطابق نسوانی مدارس قایم کیے جائیں"۔ شوکت علی نے جو بعد کی ہندستانی مسلم سیاست میں "بڑے بھائی" کہلائے۔ اس موقع پر اس قرارداد کی تائید میں ایک دلچسپ تقریر کی اور مسلمانوں پر واضح کیا کہ وہ اپنی شریکِ حیات کو جہالت میں رکھ کر خود کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ اس اجلاس میں بہار کے علی امام اور آفتاب احمد خاں جیسے اور بھی کئی نوجوان مندوبین شریک تھے جنھوں نے اس کانفرنس میں اپنا کافی رنگ جمایا اور بعد ازاں اسلامی سیاست میں نمایاں کردار انجام دیا۔

کلکتے کے تجربے کی کامیابی سے محسن الملک کی ڈھارس بندھ گئی اور انھوں نے طے کیا کہ کانفرنس کا چودھواں اجلاس بہار کے صدر مقام پٹنہ میں منعقد کیا جائے۔ چنانچہ تمام تیاریاں مکمل کر لی گئیں لیکن عین وقت پر شہر میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی اس لیے مجبوراً اجلاس کو رامپور میں منعقد کرنا پڑا جہاں کے حکمران نے نہایت ہی اعلیٰ پیمانے پر مندوبین کی مہمان نوازی کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کانفرنس کے اس اجلاس کو ایک سے زیادہ حیثیتوں سے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس اجلاس میں کئی فرسودہ اور غلط زمانی فیصلوں کو کالعدم قرار دیا گیا اور روحِ عصر کے مطابق کئی دوسری قراردادیں منظور کی گئیں۔ مثلاً مسلم طلبا کے لیے تکنکی تربیت کے علاوہ قانون اور انجینیرنگ کی تعلیم پر بھی زور دیا گیا۔ اس اجلاس میں تعلیم نسواں کے مسئلے پر مضبوط موقف اختیار کیا گیا اور ثانوی مدارس میں اقامت خانوں کی اسکیم کی توسیع کا مطالبہ کیا گیا۔

مزید برآں کانفرنس کے صدر سید حسین بلگرامی نے مندوبین کو جدید اغراض و مقاصد سے روشناس کروا کر مسلمانوں کے تعلیمی مسئلے کو نئی جہت عطا کرنے کی کوشش کی انھوں نے یاد دلایا کہ "جس وقت ہندستان پر مغل حکومت کرتے تھے تب ہندو اور مسلمان دونوں بھی پُرشکوہ فارسی طرز کو سیکھنے کے لیے سخت محنت کیا کرتے تھے اور بعض تو اس حد سے آگے بڑھ کر "چغتائی ترکی" تک سیکھ لیتے تھے۔ وہ لوگ جو چاہتے تھے کہ انھیں پڑھا لکھا انسان سمجھا جائے وہ ہمارے عربی تعلیم کے مراکز جا کر برسوں تلک ہمارے مکتب کی دینیات Theology، قواعد، منطق، طبیعات اور مابعد الطبیعات کا علم سیکھتے تھے۔ لیکن اب روحِ عصر مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے۔ قانیہ پیمائی اور خطاطی کے فنون قطعاً منفعت بخش نہیں رہے۔ ارسطو اور بوعلی سینا کی طبیعات فرسودہ اور از کار رفتہ ہو گئی۔ طوسی کی "المعیشت" بیکار ہو کر رہ گئی۔ خیام کے الجبرا نے اپنی افادیت گنوا دی، جابر کا کیمیا صرف جادوگری بن کر رہ گیا۔ ابنِ رشد کی مابعد الطبیعات اب کسی کام کی نہیں رہی اور فارابی کی فلاطونیت کی اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی"[56] اس لیے صدر جلسہ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ اب اُن مضامین کے مطالعے میں تصنع اوقات نہ کرتے ہوئے مغرب سے لائے گئے جدید نظریات کا اکتساب کریں۔ مسلمانوں کے نمایندہ اجتماع کے روبرو اس سے قبل شاید ہی کسی ذمہ دار مسلم رہنما نے اس قسم کا غیر مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔

محسن الملک نے اپنی سخت محنت جاری رکھی اور کانفرنس کے دائرۂ کار کو وسعت دیتے ہوئے ملک بھر کو اس سے واقف کروا دیا۔ انھوں نے اس کا اگلا پندرھواں اجلاس انتہائی جنوب یعنی مدراس میں منعقد کرنا طے کیا۔ اُن کے احباب نے انھیں اس فیصلے کے خلاف یہ کہہ کر متنبہ کیا کہ مدراسی مسلمان شمالی ہند کے اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ کوئی قدر مشترک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں رکھتے تاہم وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ مدراس میں تھوڑی سی مقامی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ سفر کی طوالت نے شمالی ہند کے کئی مندوبین کو شرکت سے باز رکھا، لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود اور بڑی حد تک مجلس استقبالیہ کی کاوشوں کے باعث یہ اجلاس انتہائی کامیاب رہا جس میں دو ہزار سے زیادہ مندوبین اور ناظرین شریک ہوئے۔[57] مزید برآں محسن الملک اپنی شخصیت کے جادو اور پر زور خطابت کے ذریعے کئی مقامی مسلم رہنماؤں کو علی گڈھ تحریک کے پرجوش حامی بنانے اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کو "ہندستانی"[58] سیکھنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس بار اجلاس کی صدارت کسی مسلمان کو تفویض نہیں کی گئی تھی بلکہ یہ اعزاز مدراس ہائی کورٹ کے ایک انگریز جج مسٹر جسٹس بوڈم (Mr. Justice Boddam) کو بخشا گیا۔

اس "بدعت" کی وجہ مندوبین کے روبرو صدر جلسہ نے خود بیان کرتے ہوئے کہا کہ "بدقسمتی سے اس پریسیڈنسی میں مسلمانوں کی کوئی مسلّمہ قیادت موجود نہیں ہے۔ نہ اُن کی کوئی تنظیم ہے اور نہ اُن میں اتحاد موجود ہے یہ قوم چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹی ہوئی ہے جن کے کوئی واضح قومی اغراض و مقاصد نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے مدراس میں آپ کی قوم کا کوئی ایسا فرد نہ مل سکا جسے قوم کا اعتماد حاصل ہو اور جو اُن صفات سے متصف ہو جن کی بنا پر اُسے اس اجلاس کی صدارت کے لیے منتخب کیا جا سکتا۔ اِس صورتِ حال کی وجہ غالباً مسلمان قوم کے بڑے حصّے میں پایا جانے والا تشکک، حسد اور جہالت ہے۔"[59]

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ محسن الملک کی مساعی کی وجہ سے جنوبی ہند کے مسلمانوں میں بھی جذبۂ یگانگت پیدا ہوا اور وہ عمل پر کمربستہ ہو گئے۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں مقامی حکومت بھی اپنی مسلمان رعایا کی انگریزی تعلیم میں دلچسپی لینے لگی اور ان کی جایز شکایات کے ازالے پر آمادہ ہو گئی۔ علی گڈھ کے مسلم رہنماؤں کے لیے مدراس میں اس اجلاس کا انعقاد زبردست کامیابی ثابت ہوا۔ اس کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے مسلم کرانیکل رقمطراز ہے: "مدراس کانفرنس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی گڈھ تحریک اب مخصوص شہروں، قصبوں یا ضلعوں تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اس کی ترقی کی رفتار بتا رہی ہے کہ وقت آنے پر یہ تمام ہندستان کو اپنے احاطے میں لے لے گی اور مسلمان قوم میں بیداری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی لہر پیدا کر کے اُسے ایک عظیم قوت بنا دے گی۔" یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن اس سے اتنا تو ضرور ہوا کہ مدراس کے اجلاس کی وجہ سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہندستان کے شمال سے لے کر انتہائی جنوبی علاقوں کے مسلمانوں میں مقبول ہو گئی۔

پھر 1902ء کا عظیم دربار منعقد ہوا جس کے انعقاد پر کرزن نے بڑی فراخدلی کے روپیہ خرچ کیا تھا اور مشرقی تزک و احتشام کا پورا پورا لحاظ رکھا تھا۔ کرزن کے نزدیک اس دربار کا انعقاد گویا ہندستان میں برطانوی سامراج کی شان اور جلال کی علامت تھا علی گڈھ کے مسلم قایدین اس موقع سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس دربار کے ساتھ اپنی یگانگت اور وابستگی کے اظہار کی خاطر کانفرنس کا اگلا سولھواں اجلاس دہلی میں اُسی دنوں منعقد کیا۔ اس اجلاس کی صدارت کے لیے ہز ہائی نس آغا خان کا انتخاب عمل میں آیا۔ اُن سربرآوردہ اصحاب میں جنھوں نے اپنی موجودگی سے اس اجلاس کو رونق بخشی بمبئی کے گورنر صوبجات متحدہ کے لفٹیننٹ گورنر اور ریاست حیدرآباد کے ریذیڈنٹ سر ڈیوڈ کار Sir David Kar شامل تھے۔ لارڈ کچنر Lord Kitchener نے نہ صرف یہ کہ تھوڑے وقت کے لیے کانفرنس کی کارروائی میں شرکت کی بلکہ ایک مختصر سی تقریر بھی کی جس میں انھوں نے مندوبین کو یقین دلایا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود اور تعلیم کے مسئلے میں ہمیشہ "پُرخلوص دلچسپی" لیتے رہیں گے۔[۱۵]

آغا خاں نے اپنی انتہائی خطیبانہ انداز کی تقریر میں جس میں عہدِ گذشتہ میں اسلام کے تاریخی کردار اور شاندار کارناموں کی جانب انتہائی والہانہ انداز میں اشارے کیے گئے تھے، ایک مسلم یونیورسٹی کے فوری قیام پر زور دیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اس مقصد کے لیے کم از کم ایک کروڑ روپیہ جمع کریں۔ انھوں نے مندوبین سے دریافت کیا "حضرات کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک کروڑ روپیہ میں اسلام کی عظمت کی بحالی کا سودا مہنگا ہے؟" انھوں نے بیان رکھتے ہوئے کہا "اگر آپ کو اُس اعلیٰ و ارفع دین کی ذرہ برابر بھی پرواہ ہے جس پر کہ آپ عمل پیرا ہیں تو آپ یہ قیمت بہ آسانی ادا کر سکتے ہیں۔"[۱۶]

لیکن مسلمانانِ ہند کے اس مطالبے کا جایزہ لینے والے جامعاتی کمیشن نے اصولی طور پر اس مطالبے کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کے برخلاف اُس نے حکومت سے سفارش کی کہ وہ "یونیورسٹیوں کے غیر فرقہ وارانہ کردار" کو بحال رکھے۔[۱۷] مسلمانوں کا اس فیصلے کی وجہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے پریشان ہوجانا فطری امر تھا۔ اُنھیں ڈر تھا کہ اس سفارش کی وجہ سے کرزن ان کے مطالبے سے سرد مہری برتنے لگیں گے لیکن اینگلو انڈین پریس اور خصوصاً Pioneer کی شکل میں انھیں اس مطالبے کے پُرجوش حامی مل گئے۔ ایک اینگلو انڈین ترجمان نے دریافت کیا" مذہب سے خود کو لاتعلق کر کے کیا انگلستان کی جامعات خود کو قایم کروا پاتیں اور کیا ان کے پاس دولت اور علم کے اتنے بڑے خزانے جمع ہو پاتے؟" اور خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے Pioneer لکھتا ہے" ہرگز نہیں۔ اور اُن دنوں کا انگلستان کئی اعتبارات سے آج کے ہندستان کے مشابہ تھا"۔[69]

کانفرنس کا سترھواں سالانہ اجلاس دسمبر 1903ء کے آخری ہفتے میں بمبئی کے مقام پر منعقد کیا گیا جس کی صدارت کے لیے بدرالدین طیب جی کو مدعو کیا گیا۔ چونکہ وہ اس سے قبل انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رہ چکے تھے اور ہمیشہ ہندو مسلم تعاون کی بات کیا کرتے تھے اس لیے اُن کے اس انتخاب نے خاصی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ ویسے یہ انتخاب اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ کانفرنس کی پالیسی میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی تھی' بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اب کانگریس کی جانب کانفرنس کے قایدین کے رویّہ کی جارحیت میں کسی قدر کمی واقع ہوگئی تھی۔ دوسرے یہ کہ طیّب جی نے بھی اپنے صدارتی خطبے میں خود کے نقطۂ نظر پر زور دینے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کی۔

> نوجوانی اور فرصت کے دنوں میں جب موجودہ عہدے (ہائی کورٹ کی ججی) کی ذمہ داریاں[65] گلے میں نہیں پڑی تھیں میں نے کانگریس کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھا اور اُس کے مدراس میں منعقدہ اجلاس کی صدارت بھی کی۔ اب جب کہ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ کانفرنس ایک سیاسی تنظیم نہیں ہے بلکہ ایک تعلیمی اور سماجی ادارہ ہے اور اب دونوں اداروں میں کوئی جارحیت اور دشمنی کا شائبہ تک موجود نہیں ہے' میں نے ضمیر کے انتہائی اطمینان کے ساتھ اس جلسے کی صدارت کے اعزاز کو قبول کیا ہے[66]

طیّب جی نے اس امید کا اظہار کیا کہ مستقبل میں یہ دونوں ادارے باہم اشتراک کے ساتھ کام کرتے رہیں گے۔ ایک ادارہ سیاسی ترقی اور دوسرا تعلیمی ترقی کے لیے کام کرتا رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام نہ کر سکیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُنھوں نے اپنی قوم کے با اثر افراد سے اپیل کی کہ دوسری قوموں کی طرح وہ بھی انڈین نیشنل کانگریس کے کاموں میں فعال طریقے سے دلچسپی لیں۔

مدراس اور بمبئی کی کانفرنسوں کے نتیجے میں ضروری ہوگیا کہ ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی جائے جو بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر کانفرنس کے دستور میں مناسب تبدیلیوں کی سفارش پیش کر سکے۔ بمبئی کے اجلاس میں تعلیم نسواں کے مسئلے پر کافی بحث و مباحثہ کیا گیا۔ اگرچہ اس کی ترویج کے بارے میں کسی قسم کی مخالفت نہیں کی گئی۔ تاہم اس امر پر تمام اتفاق پایا گیا کہ ایسا کرتے ہوئے اُمت مسلمہ کے مروجہ رسم و رواج کا حتی الامکان احترام کیا جائے[67]

طیب جی کو صدارت کا دیا جانا اس بات کا مظہر تھا کہ اُن کی شخصی عزت افزائی کی گئی تھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کانفرنس کے کردار میں کس قسم کی بنیادی تبدیلی واقع ہوئی تھی یہ بات یوں بھی ثابت ہوگئی کہ اگلے سال کانفرنس کے اٹھارویں اجلاس کی صدارت کے لیے تھیوڈور موریسن کو منتخب کیا گیا۔ جو کانگریس کے کٹر مخالفین میں شمار کیے جاتے تھے۔ یہ اجلاس 27 / 28 / اور 29 دسمبر 1904ء کو لکھنؤ میں منعقد کیا گیا تھا۔

حسب توقع اس کانفرنس کا بیشتر وقت بھی اسی مسئلے پر غور و خوض کرنے میں صرف کیا گیا کہ کس طرح ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اجلاس میں تعلیم نسواں اور مسلمانوں میں تکنیکی تعلیم کی ضرورت پر کافی بحث و مباحثے ہوئے لیکن اس کانفرنس کی سب سے خاص بات یہ رہی کہ مسلمان شہزادے اور زمیندار اپنے ہم مذہبوں میں انگریزی تعلیم کو مزید مقبول بنانے کی غرض سے فراخدلانہ طور پر عطیات کا اعلان کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے[68]

اگلے برس پھر ایک بار علی گڈھ ہی میں کانفرنس کا انیسواں اجلاس منعقد کیا گیا جس کے لیے دسمبر کا دسمبر کا آخری ہفتہ منتخب کیا گیا۔ کثیر تعداد میں مندوبین اور ناظرین نے اجلاس میں شرکت کی۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی توسیع و ترقی دیکھ کر مسرت حاصل کرنے کے لیے کئی وفود بمبئی، بنگال اور مدراس سے آئے تھے۔ اس کانفرنس میں بھی مندوبین نے زیادہ تر وقت خصوصی مسایل پر غور و خوض کرنے میں ہی گزارا۔ مندوبین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوچھوٹے چھوٹے مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر گروہ نے مختلف میدانوں میں سال بھر کی کارکردگی کا جایزہ لیا۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ قدر کام شیخ عبداللہ نے کیا تھا جنھیں شعبۂ تعلیم نسواں کا سکریٹری بنایا گیا تھا۔ اس بلند حوصلہ اور پرجوش شخص نے اعلان کیا کہ آئندہ سال کے اوایل میں علی گڈھ کے مقام پر ایک مسلم گرلس اسکول کھولا جائے گا[69] انھوں نے ظاہر کیا کہ کانفرنس بھوپال کی بیگم صاحبہ کی "فیاضانہ سخاوت" کی بے حد ممنون ہے۔ اسی طرح آغا خان اور بہاولپور کے نواب صاحب کی "ہمت افزائی" پر بھی اظہارِ ممنونیت کیا گیا[70]۔ اس کانفرنس کے منتظمین نے خواتین کی ایک نمایش کا بھی اہتمام کیا جو نہایت کامیاب رہی۔

اسی طرح دیگر شعبہ جات جیسے، کہ شعبہ سماجی اصلاح، شعبہ ادب شعبہ مردم شماری اور پریس کے شعبے کی کارگزاری بھی کم اہمیت کی حامل نہیں رہی۔ خاص طور پر شعبۂ سماجی اصلاح میں خواجہ غلام الثقلین کی کوششوں کی وجہ سے مندوبین نے مسلمانوں میں پائی جانے والی متعدد سماجی برائیوں اور ناپسندیدہ رسم و رواج کو فی الفور دور کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ ان برائیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مقامی تحریکیں شروع کریں گے۔ اس کے علاوہ ہندستان کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والے مندوبین پر مشتمل ایک کمیٹی بھی قایم کی گئی جو اُن طریقوں کا جایزہ لے جن کے ذریعے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو مکمل یونیورسٹی کی شکل دی جا سکتی ہے[71]

اُنھی دنوں ہندو قوم بھی ایک غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہوئی۔ اِدھر یہ کانفرنس ایک مسلم یونیورسٹی کا مطالبہ کر رہی تھی اُدھر ہندو قایدین نے سر جوڑ کر ایک نیشنل ہندو یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ کر ڈالا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے کلکتہ میں کانگریس کے پنڈال میں ایک عظیم الشان عوامی جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت بزرگ کانگریس قاید سریندر ناتھ بنرجی نے انجام دی۔ اُنھوں نے ہندستان کی قومی زندگی میں اس قسم کی یونیورسٹی کے قیام کی اہمیت پر زور دیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کا مطالبہ کیا اور اعلان کیا کہ انھوں نے اور تلک نے طے کیا ہے کہ اپنی باقی زندگی کو اسی مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دیں گے۔ روزنامہ Pioneer نے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منصوبے کی "پُرخلوص ہمت افزائی" کی اور اسے ایک "دلیرانہ منصوبہ" قرار دیا[73]۔

کانفرنس کا بیسواں سالانہ اجلاس دسمبر 1906ء کے آخری تین دنوں میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا جو نئے تخلیق کردہ صوبے مشرقی بنگال کا صدر مقام تھا۔ اس اجلاس کی کارروائی پر دو حالیہ سیاسی واقعات کا بے حد اثر پڑا جن کی یاد ابھی تک عوام کے ذہنوں میں تازہ تھی۔ ایک واقعے کے ساتھ غمگین تصورات وابستہ تھے جبکہ دوسرے واقعے سے مندوبین کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ غم اور صدمہ اس بات کا تھا کہ سر بمپ فیلڈ Sir Bumpfylde نے اس نئے صوبے مشرقی بنگال کی لفٹیننٹ گورنری سے استعفیٰ دے دیا تھا جبکہ تین ہزار سے زیادہ مندوبین اور ناظرین[73] اس بات پر از حد مسرت محسوس کر رہے تھے کہ نئے وائسرائے لارڈ منٹو نے "مسلمانوں کے کل ہند وفد" کا بڑی خوشدلی اور ہمدردی کے ساتھ استقبال کیا جو اُن سے ملنے کے لیے اُسی سال یکم اکتوبر کو گیا تھا۔

نواب صاحب ڈھاکہ نے، جو اپنے مکمل لباسِ فاخرہ میں ملبوس تھے، جس پر متعدد اعزازی تمغے ٹکے ہوئے تھے ملبوس تھے، حاضرین کا استقبال کیا۔ ڈھاکے میں اِس کانفرنس کا انعقاد اُن کے لیے ایک شخصی کامیابی کے مترادف تھا۔ یہ نہ صرف اِس بات کا ثبوت تھا کہ انھیں اب بھی مسلمانانِ مشرقی بنگال پر زور حاصل ہے بلکہ ہندوؤں نے اُن کے خلاف جو تحریک چلا رکھی تھی یہ اُس کا موثر جواب بھی تھا۔

اپنے صدارتی خطبے میں جسٹس شرف الدین نے ہندستان میں ایک مسلم یونیورسٹی کے قیام کا تذکرہ بطورِ خاص کیا اور کہا کہ مخالفین چاہے کچھ کہیں حکومت اِس منصوبے کی تکمیل میں ہماری مدد کرنے پر مجبور ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ یہ مطالبہ اُس جذبۂ وفاداری کا حاصل ہے جس سے مسلمانانِ ہند کی زندگی سرشار ہے۔ دوسرے منصوبوں کی جانب رُخ کرتے ہوئے اُنھوں نے سب سے پہلے اس بات کو ضروری قرار دیا کہ یورپ کی مشہورِ زمانہ تصنیفات کو ہندستانی زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ انھوں نے بعد ازاں تجویز پیش کی کہ جگہ جگہ مقامی کمیٹیاں تشکیل دے کر کانفرنس کے کام کی مقبولیت میں اضافہ کیا جائے۔ اُنھوں نے کہا کہ جہاں تک تعلیم نسواں کا سوال ہے اِس بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ تعلیم کس طرح دی جائے؟ اپنے طور پر انھوں نے مشورہ دیا کہ یتیم لڑکیوں کو تربیت دی جائے کہ وہ عورتوں میں جا کر تعلیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیا کریں[74] کانفرنس میں منظور کی جانے والی متعدد قراردادوں میں ایک قرارداد ایسی بھی تھی جس کے ذریعے کانفرنس نے سر۔ بی۔ فلر کے لیے اپنے جذبۂ احسان مندی کا اظہار کیا تھا کیونکہ انھوں نے بنگال میں مسلمانوں کی تعلیم کے معاملے میں کافی زیادہ دلچسپی لیتے ہوئے اس بارے میں معقول مدد دی تھی۔ کانفرنس کے آخری دن ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ Mr. Arch bold نے جلسے کی صدارت کی۔ اُن کے خطبے کے موضوع کو اُنھی کے اس جملے میں سمویا جا سکتا ہے "ہندستان سیاسی اصلاح نہیں بلکہ سماجی اصلاح چاہتا ہے"۔[75]

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی زندگی کے ابتدائی بیس برسوں میں اس کی سرگرمیوں کا جایزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اپنی خامیوں اور محدود نقطۂ نظر کے باوجود اس تنظیم نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو پھیلانے میں زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ کامیابی ان قراردادوں کے ذریعے حاصل نہیں ہوئی جو متعدد اجلاسوں میں منظور کی گئیں بلکہ یہ نتیجہ تھی نذیر احمد اور محسن الملک جیسے اسکالروں کی شعلہ نوائی کا اور حالی و شبلی جیسے شعراء کی دل کو چھو لینے والی شعری تخلیقات کا۔ دراصل نذیر احمد کی تقاریر، جو ہمیشہ جلسے کے بالکل آخر میں رکھی جاتی تھیں تاکہ مندوبین جلسہ گاہ سے درمیان ہی میں اُٹھ کر نہ چلے جائیں، اور حالی کی نظمیں، جو ادبی نگینوں کی حیثیت رکھتی تھیں، ہر سالانہ کانفرنس کا ایک مستقل جز ہوا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ چونکہ مسلمانوں کی کوئی علیحدہ سیاسی تنظیم موجود نہیں تھی اس لیے اسی کانفرنس نے ایک قسم کی پارلیمانی سرگرمیوں کے سلسلے میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کے نوزائیدہ جوش کے اظہار کا وسیلہ بھی فراہم کیا تھا۔ جیسا کہ آغا خاں نے انتہائی مبالغے کے ساتھ کہا ہے:

> "یہ اجتماع آج کے مسلم ہندستان میں سب سے عمدہ حصے کی نمائندگی کرتا ہے۔ انتہائی شاندار ماضی گزارنے کے بعد ہم پر جو پستی اور نکبت طاری ہو گئی تھی اُسی سے بیداری کا اظہار اس اجتماع کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ اجتماع ہماری موجودہ عقلی، اخلاقی اور سماجی حالت پر عدم اطمینان کا اظہار کرتا ہے اور اُس عقلی و فکری آزادی کے حصول کا طالب ہے جو ہم مسلمانوں نے اپنے عہد کی انتہائی دو صدیوں میں حاصل کی تھی۔[76]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرسید کی مقناطیسی شخصیت کے بعد اس کانفرنس کی دوسری جاذبیت اس امر میں پوشیدہ تھی کہ اس کے اجلاسوں میں اسلام اور اس کی کامرانیوں پر ہمیشہ زور دیا جاتا تھا اور مندوبین کے ذہنوں میں عہد رفتہ کے عظیم واقعات کو کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا تھا ایسی تقاریر کا اہتمام کیا جاتا تھا جن میں اسلام کی خوبیاں جی کھول کر بیان کی جائیں شعرائے کرام بھی اپنے متاثر کن اشعار کے ذریعے عربستان میں پیدا ہونے والے اس دین کی تاریخی عظمت کی خوبصورت تصویر کشی کیا کرتے تھے بعض اوقات یہ تقاریر اور نظمیں اس قدر طویل ہو جائیں کہ بعض سنجیدہ مسایل پر بحث کی خاطر وقت نکالنے کے لیے انھیں مختصر کر دینا پڑتا[77] اس کے علاوہ ہر اجلاس میں مذہبی تعلیم کے بارے میں ایک نہ ایک قرارداد متفقہ طور پر ضرور منظور کی جاتی[78]۔ بعض اوقات اس بات کی شکایت کی جاتی کہ قرآن کے مطالعے کا اتنا ذوق وشوق باقی نہیں رہا جتنا کہ ہونا چاہیے یا یہ شکایت کی جاتی کہ حفاظ کی تعداد میں کمی ہو چلی ہے[79]۔ مسلمان طلبا کو ان یورپین مصنفین سے خبردار کیا جاتا جن کا رویہ اسلام کے خلاف معاندانہ ہوتا[80]۔ اہل علم حضرات سے خواہش کی جاتی کہ وہ اسلامی تاریخ اور ادب پر تحقیقی کام کریں۔ اس کے علاوہ مختلف کتابیں اور رسالے شایع کیے جاتے تاکہ اسلام کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے اور حکومت سے خواہش ظاہر کی جاتی کہ وہ مدارس اور کالجوں میں مذہبی تربیت کا انتظام کرے[82]۔

اپنے کردار اور مقبولیت سے قطع نظر کانفرنس نے بڑا ہی ٹھوس کارنامہ انجام دیا ہندستانی تعلیمی ریویو کے سرکاری مرتبین نے لکھا کہ "اسی کی مساعی کی وجہ سے ہندستان میں دور دراز کے مقامات پر رہنے والے مسلمانوں کو اپنے ہم مذہبوں کی تعلیم کے بارے میں اپنا فرض یاد آیا۔ اس ادارے نے تعصب کو ختم کرنے اور قوم میں علم اور ترقی کی خواہش کو بیدار کر کے بیش قیمت خدمت انجام دی ہے"[83]۔

تاہم ایم۔ اے۔ او کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دائرۂ کار زیادہ تر شمالی ہندستان کی حد تک ہی محدود رہا۔ دیگر صوبجات میں کیے جانے والے اسی قسم کے کام سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دیگر اداروں کی سرگرمیوں کا جایزہ لیا جائے۔ ان میں سے بعض اداروں کو مسلمانوں کی زندگی میں بڑا اہم مقام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل تھا۔ اُن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ مسلمانوں نے ہماری زیرِ تبصرہ مدت میں کس حد تک تعلیمی میدان میں ترقی کی تھی۔

اِن اداروں میں سب سے قدیم تھا کلکتہ کا "مدرسہ" جسے وارن ہیسٹنگز نے قایم کیا تھا۔ اس ادارے کو حکومت خود چلاتی تھی۔ اس مدرسے کے دو شعبے ہوا کرتے تھے۔ پہلا شعبہ' اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ تھا جہاں طلباء کو کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے درجہ تک تعلیم دی جاتی تھی۔ دوسرا شعبہ' عربی ڈپارٹمنٹ تھا جس میں گیارہ سالہ نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۰۷ء کو اس مدرسے میں ۴۲ طلباً زیرِ تعلیم تھے[84]

انجمن حمایتِ اسلام' لاہور میں اسلامیہ کالج چلا رہی تھی۔ یہ انجمن مسلمان نوجوانوں کو تہذیبِ نفس کے لیے دی جانے والی انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینیات کی تعلیم دینے کی قایل تھی۔ اس کالج میں طلباء کو پنجاب یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ' بی۔ اے' اور ایم۔ اے کے امتحانات کی تیاری کرائی جاتی تھی اور عربی فارسی اور اسلامی مضامین کی تدریس پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ مثلاً ایم۔ اے کی جماعتوں میں صرف عربی اور اسلامی مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس کالج سے ملحقہ ایک اسکول اور ایک اقامت خانہ بھی تھا جس میں پچاس طلباء کے قیام کا انتظام تھا۔ ۱۹۰۷ء میں طلباء کی تعداد ۸۹ تھی[85]

اِس موقعے پر بمبئی کی انجمن اسلام کے کارناموں کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔ اگرچہ یہ ادارہ کالج کی سطح کی تعلیم نہیں دیتا تھا تاہم مغربی ہندستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو رائج کرنے میں اس ادارے نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ مزید برآں یہ ادارہ شہر کے سربرآوردہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا وسیلہ بنا جس کے ذریعے وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکتے تھے۔ ہمارے تحقیقی کام کی مجوزہ مدت کے اختتام پر بمبئی کے ناظمِ تعلیمات اُن کی کوششوں سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ انھوں نے اِس امید کا اظہار کیا کہ جلد ہی مسلمان اس پریسیڈنسی کے کالجوں اور اسکولوں کا عام اور مؤثر استعمال شروع کر دیں گے۔ کچھ اسی قسم کے جذبات کا اظہار مدراس کے ڈاکٹر بورن DR. Bourne نے بھی کیا جنھوں نے اپنی پریسیڈنسی میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے زیادہ مطمئن نہ ہوتے ہوئے بھی اس بات کی اطلاع دی تھی کہ "مرکز اور جنوب کے ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دو اضلاع میں حالات کی درستگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔"87

لہٰذا اب پہلے کے مقابلے میں حالات اُتنے غیر اطمینان بخش نہیں تھے۔ حالانکہ اب بھی ایسی کئی مشکلات تھیں جن کا تدارک کیے بنا مسلمانوں کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ وہ پورے دل و جان سے انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو جائیں۔ مثال کے طور پر اب بھی قدیم طرز کے مدرسے اور مکتب اُسی آن بان سے قایم تھے جیسے کہ قدیم دَور میں ہوا کرتے تھے۔ اِس قسم کے ادارے مسلمانوں کو جدید دور کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے میں سدِّ راہ ثابت ہو رہے تھے اور مسلمانوں اور دیگر قوموں کے درمیان خلیج کی طرح حایل تھے۔ چنانچہ صوبجات متحدہ کے ناظمِ تعلیمات نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ مسلمانوں کی راہ کی متعدد رکاوٹوں کے علاوہ ایک دقّت یہ بھی تھی کہ "وہ لوگ بچّوں کو مدرسہ جانے کی عمر ہی میں مذہب اور قرآن کی تعلیم دلانے پر بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے۔ اور اپنے اِس اصرار میں" وہ اس حد تک آگے نکل جاتے تھے کہ اگر اُن کے بچّوں کو کوئی ہندو استاد غیر مذہبی مضامین پڑھاتا تو اس پر معترض ہوتے تھے۔"88

یہ ایک مسئلہ تھا جس کا مسلمانوں نے کبھی بھی کوئی سنجیدہ حل دریافت نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان کبھی بھی سرکاری مدارس یا سرکاری امداد سے چلنے والے خانگی مدارس کا خاطر خواہ فایدہ نہ اُٹھا سکے۔ اس کے علاوہ تعلیمی حکام نے بھی اس سلسلے میں کافی سے زیادہ احتیاط سے کام لیا " مبادا اُن کی جانب سے مسلم عوام کی قدامت پسندی، مذہبی احساسات اور کلاسیکی دور سے اُن کے والہانہ عشق کو ٹھیس نہ پہنچ جائے۔"89

ان تمام عوامل نے ایک ساتھ مل کر مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو زیادہ مقبول ہونے نہ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ مجموعی طور پر اس میدان میں کچھ ترقّی ضرور ہوئی لیکن اُسے ہمّت افزا قسم کی ترقّی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بات کا بخوبی اندازہ حسب ذیل گوشوارے کے اعداد و شمار کے ملاحظے سے ہو جائے گا جس میں 1886ء تا 1907ء کی درمیانی مدّت میں مختلف اداروں میں مسلمان طلبا کی تعداد بتلائی گئی ہے :

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سال	آرٹس کالج	سائنس کالج	ثانوی مدارس	تحتانوی مدارس
1886-87	338	39	58,644	495,680
	4·2 ٪	5·1 ٪	13·7 ٪	19·7 ٪
1891-92	736	246	66,652	571,035
	5·3 ٪	7·5 ٪	14·0 ٪	20·1 ٪
1896-97	939	291	75,976	647,159
	6·6 ٪	6·7 ٪	14·2 ٪	10·8 ٪
1901-02	1,253	؟	55,487	643,711
	7·3 ٪	6·9 ٪	14·4 ٪	19·2 ٪
1906-07	1,469	؟	70,614	787,173
	8·1 ٪	7·5 ٪	14·8 ٪	20·0 ٪

آخر میں مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا مسئلہ اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ موجود تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بعض کٹر مذہبی قسم کے رہنماؤں کو بھی اس مسئلے کا شدت کے ساتھ احساس ہونے لگا تھا اور اسے حل کرنے کے لیے جگہ جگہ کمیٹیاں بنادی گئی تھیں۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں یہ احساس اجاگر ہونے لگا تھا کہ جب تک وہ اپنی خواتین کو جہالت کے قعر مذلت سے باہر نہیں نکالتے اُس وقت تک قوم حقیقی معنوں میں ترقی نہیں کر سکتی۔ لیکن قدامت پسندی اور کٹر مذہبیت کی جڑیں مسلم قوم کے خمیر میں اتنی گہری گڑی ہوئی تھیں کہ ایک طویل عرصے تک قوم اس میدان میں کوئی خاطر خواہ ترقی نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ 1907ء میں بھی سرکاری اداروں میں مسلم طالبات کی تعداد 77,249 سے زیادہ نہیں تھی اور خانگی اداروں میں یہ تعداد 44,455 سے زیادہ نہیں تھی۔ اس طرح اُن کی جملہ تعداد 121,699 تھی جبکہ غیر مسلم طالبات کی جملہ تعداد 5266,933 تھی۔ اس کے علاوہ صرف ایک مسلمان لڑکی ایسی تھی جو کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور اعلیٰ ثانوی مدارس میں مسلمان طالبات کی تعداد 150 سے بھی کم تھی۔ گویا زیادہ تر مسلم لڑکیاں تحتانوی مدارس ہی میں زیر تعلیم تھیں جہاں اُن کے لیے یہ بات بہ آسانی ممکن تھی کہ سن بلوغ کو پہنچتے ہی تعلیمی سلسلہ کو منقطع کر دیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

پانچواں باب (انگریزی تعلیم کے اثرات)

۱۔ ملاحظہ ہو خلاصۂ کارروائی یازدہ سالہ مرتبہ سید مہدی علی خاں (اردو متن) از 1886 تا 1896 صفحہ 5۔

2۔ خاص طور پر نواب عبداللطیف اور سید امیر علی کی شہادتیں ملاحظہ ہوں جو Report by the Bengal Provincial Committee to Education Commission کے صفحات 213-24 پر درج ہیں اسی طرح بدرالدین طیب جی کی شہادت بھی ملاحظہ ہو مشمولہ Education Commission (Bombay) حصہ دوم صفحات 503 +6 اسی طرح خان بہادر قاضی شہاب الدین کا وہ تحریری بیان بھی ملاحظہ ہو جو کمیشن کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا (Ibid Memorials, 56-61)

3۔ Report of the Indian Education Commission 483-507 ملاحظہ ہو اس رپورٹ کا جز بعنوان "Mohammedans"

1۔ Ibid. جے۔ مرے۔ میچل J. Murray Mitchell نے اس نقطہ نظر کو کافی وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے: "انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ عربی اور فارسی ادب مغربی تخلیقات کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے۔ کافروں کے مضبوط ہاتھوں نے انھیں تباہ کر کے رکھ دیا اور وہ خارجی امور میں ان کی بالادستی تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن انھیں اس بات سے بڑی لگن آتی ہے کہ اپنی گھناؤنی کتابوں کے ذریعے وہ ان کے ذہن کو بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلامی کے چنگل میں جکڑ لیں۔ حافظ اور سعدی کے سامنے شکسپیر اور ملٹن کی کیا حیثیت ہے؟ قرآن کے مقابلے میں انجیل کیا چیز ہے؟ چاپلوس ہندوؤں کا عیسائی خیالات کو اپنانے کے لیے جھپٹ پڑنا ان کی نگاہ میں ہے جس کی وجہ سے وہ سرکاری ملازمتوں کی سرسبز چراگاہ میں کودتے پھلانگتے پھر رہے ہیں۔ لیکن انھیں ایسا کرنے دیجئے کیونکہ ایسی حرکات بت پرستوں سے بعید نہیں ہیں لیکن کوئی سچا موحد اپنے آپ کو اس قدر قعر مذلت میں نہیں ڈال سکتا۔" ملاحظہ ہو ان کا مضمون بعنوان "Report of the General missionary Conference held at Allahabad 1872-73,68. مشمولہ "Musalmans of Bengal"

5 ۔ جیسا کہ سید ابوفضل نے واضح کیا ہے "میں سمجھتا ہوں کہ یہ انگریزی زبان کے ساتھ ان کی بے اعتنائی ہے اور یہ بے اعتنائی ان کے تعصب کا نتیجہ ہے۔" انھوں نے مزید کہا ہے "وہ انگریزی تعلیم سے نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے خود میں لیاقت کا معیار پیدا نہیں کیا۔ وہ تو یہاں تک سوچا کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی وجہ سے اُن کا اخلاق اور کردار بگڑ جائے گا..... ہندستان کے مسلمانوں نے اپنے ہی ہاتھوں خود کے پیروں پر کلہاڑی ماری....." ملاحظہ ہو ان کی کتاب On the Mohammedans of India صفحہ 14-15 Calcutta 1872

6 ۔ حسب ذیل گوشوارے کے ملاحظے سے اُس تباہ کن صورتحال کا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا جسے سرسید نے بطور خاص محکمہ تعلیمات کی سالانہ رپورٹوں کی مدد سے تیار کر کے 1878ء میں حکومت کے روبرو پیش کیا تھا۔ اس گوشوارے میں گذشتہ بیس برسوں کے عرصے کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ڈگری	جملہ گریجویٹس کی تعداد	مسلمان گریجویٹس کی تعداد
ڈاکٹر اِن لا	6	صفر
آنرز اِن لا	4	صفر
بیچلر اِن لا	705	6
لائسنسیٹ اِن لا	235	5
بیچلر اِن سول انجنیرنگ	36	صفر
لائسنسیٹ اِن سول انجنیرنگ	51	صفر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ماسٹر آف آرٹس	326	5
بیچلر آف آرٹس	1343	30
ڈاکٹر اِن میڈیسین	4	صفر
آنرز اِن میڈیسین	2	صفر
بیچلر اِن میڈیسین	58	1
لائیسنیٹ اِن میڈیسین اینڈ سرجری	385	8
جُملہ	3155	57

ان اعداد و شمار کو Report of the Bengal provincial Committee of the Education Commission. کے صفحہ 117 پر نقل کیا گیا ہے۔ تحتانوی مدارس کی صورت حال بھی کوئی زیادہ بہتر نہیں تھی مثلاً 1880-81ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبوں میں 156081 مسلمان طلبا اِن تحتانوی مدارس میں زیرِ تعلیم تھے جبکہ وہاں مسلمانوں کی جملہ آبادی 21 ملین تھی۔ ملاحظہ ہو General report on public Instruction in Bengal for 1880 — 81. (P. 6)

7۔ اِن سفارشات کے بارے میں مقامی حکومتوں اور مختلف انتظامیوں کی جانب سے وصول ہونے والے جوابات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ Selections from the Record of the Government of India Home Dept. No. CCV Serial No-2, 372, 75

8۔ ملاحظہ ہو حکومتِ ہند وزارت داخلہ کی قرارداد نشان نمبر 7-215-25 مؤرخہ 15 جولائی 1885ء

9۔ ملاحظہ ہو سر الفریڈ کرافٹ کا Review of Education in India with Special References to the Report of the Education Commission, 316 — 22

10۔ ملاحظہ ہو Progress of Education in India (1902 — 1907) fifth quinquennial Review, I, 282

11۔ اس ادارے کے قیام اور ترقی کے مختصر احوال کے لیے ملاحظہ ہو 4 اپریل 1836ء کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Moslem Chronicle

12 ۔ ملاحظہ ہو مسلم کرانیکل کے یکم مارچ اور 8 مارچ 1902ء اور 31 اکتوبر اور 31 نومبر 1903ء کے اداریے۔

13 ۔ ملاحظہ ہو 30 جولائی 1898ء کے مسلم کرانیکل کا اداریہ بعنوان "Reflection on the Aligarh Movement"

14 ۔ سید محمود نے اسے اپنی کتاب History of English Education in India کے صفحات 163-64 پر نقل کیا۔

15 ۔ اس کے باوجود شروع ہی سے انگریزوں اور مسلمانوں کے مابین ایسی دوستی پر زور دیا جاتا رہا جس میں ہندو بالکل شامل نہ ہوں۔ 10 مارچ 1888ء کو جب سر آکلینڈ کولون کالج کے معائنے کے لیے تشریف لائے اُس وقت سرسید نے اُن سے کہا تھا: "ہمارے دل کی عین خواہش یہی ہے کہ ہلال اور صلیب مل کر اپنے نور سے ہندستان کو منور کر دیں آپ نے اِس نشانی کو چھٹے ہوئے اُس بیسمہ پر دیکھا ہوگا۔ جو اَب تک اس ہال میں آویزاں ہے جسے اُس روز آویزاں کر دیا گیا تھا جس روز اس کالج کا افتتاح عمل میں آرہا تھا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے طلبا اس نشانی کو اپنے دلوں میں محفوظ کر لیں گے اور اسے کبھی فراموش نہیں کریں گے۔"

16 ۔ ملاحظہ ہو 12 جنوری 1877ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا ضمیمہ

17 The Pioneer, Jan 11, 1877

18 ۔ ملاحظہ ہو تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمانان (اردو متن) 30 - 32

19 ۔ ملاحظہ ہو تھیوڈور موریسن کی کتاب History of the M A O College Aligarh, from its foundation to the year 1903, P. 10.

20 Ibid

21 ۔ ملاحظہ ہو ایم ۔ اے ۔ او ۔ کالج کی سالانہ رپورٹ بابتہ 1894-95 اسی طرح 1894-95 General Report on public Instructions in the N.W. Prov. & Oudh (1894-95)

کے مطابق "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں طلبا کی تعداد مسلسل اور تیزی سے بڑھ رہی ہے" (صفحہ 11)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

22 - See gen. report on public instruction in the N.W.P. and Oudh (1896-97), 26, and also for the year 1898-99, P 10.

23 - لیکن مورینسن کی 1899-1900ء کی تعلیمی سال کی رپورٹ کے بموجب ایم۔اے۔او کالج اس سال مادی طور پر اتنا مستحکم ہوگیا جتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ اسی طرح اس سال اس کالج میں جتنے طلباء نے شرکت حاصل کی اتنے کبھی اس ادارے کی چہار دیواری میں جمع نہیں ہوئے تھے۔ مسلمان قوم کی اخلاقی حمایت میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے اور دینیاتی مناقشے کی شدت میں بھی کمی ہونے لگی ہے۔ یہ ادارہ صحیح معنوں میں دن بدن شمالی ہند کے مسلمانوں کی امید و افتخار میں اضافے کا موجب بنتا جارہا ہے۔

Quoted in Ibid (1899-1900) P. 20.

24 - ملاحظہ ہو ایم۔اے۔او۔ کالج کی سالانہ رپورٹ بابتہ 1902-03ء کا ضمیمہ 'ج'، مزید ملاحظہ ہو General report on public instruction in the N.W.P. and Oudh (1901-02), P. 12.

25 - ہماری مدت کے اختتام پر شمال مغربی صوبے میں مسلمانوں کی اضافی حالت کا جائزہ ایک سرکاری اشاعت میں اس طرح پیش کیا گیا: اس پنج سالہ مدت میں ہندو اسکالرس کی تعداد میں 19595 کا اضافہ ہوا جبکہ مسلم اسکالروں کی تعداد میں 132698 کا۔ اس طرح ہندوؤں کی تعداد میں 37 فی صد اضافہ ہوا جبکہ مسلمانوں کی تعداد میں 21 فی صد کا۔ تقابلی اعتبار سے مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں کم رہی جس طرح کہ پچھلے پانچ برسوں میں ہوا تھا۔ 1901-02 میں مسلمان طلبا کی کل تعداد کا (20.7) فی صد ہوا کرتے تھے جبکہ اس وقت ان کی تعداد صرف (18.7) فی صد ہے۔ لیکن اعداد و شمار کا ایک اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبا کی تعداد دوگنی ہوگئی ہے یعنی 460 سے بڑھ کر 802 ہوگئی ہے۔ ان میں سے تقریباً نصف تعداد علی گڈھ میں مقیم ہے جہاں متعدد طلباء ان صوبوں کے باہر سے آتے ہیں General report of the Public Instruction in the United Provinces of Agra and Oudh (1907) P. 61.

26 - ملاحظہ ہو تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمانان (اردو متن) 274-97.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

27 ۔ تھیوڈور موریسن کی کتاب History of the M.A.O. College, Aligarh from its foundation to the year 1903, II

28 ۔ ملاحظہ ہو ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی سالانہ رپورٹ برائے 98-1897 ۔ اسی طرح ملاحظہ ہو بیک کے نظریات کی تنقید جو ایک مضمون بعنوان "An Educational Bonfire" کی شکل میں 29 جولائی 1898 کے Pioneer میں شایع ہوئی۔

29 ۔ ملاحظہ ہو حالی کی حیاتِ جاوید (اردو متن) حصہ اوّل صفحہ 281

30 ۔ خلاصہ کارروائی یازدہ سالہ (Proceedings of the Mohammadan Educational Conference from 1886 to 1896.)

مرتبہ مہدی علی خاں (اردو متن) صفحہ (5)

31 ۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں اس موضوع پر ان کی تقریر کے لیے ملاحظہ ہو 29 اور 30 دسمبر 1887 کا Pioneer ۔

32 ۔ ملاحظہ ہو مجموعہ رمیزولیوشن ہائے دہ سالہ (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں 1886 تا 1895 کے دوران منظور شدہ قراردادوں کا اردو متن) صفحات 18-27 اس اجلاس کی کارروائی کی رپورٹ کے لیے ملاحظہ ہو۔ 28 اور 31 دسمبر 1888ء کا Civil and Military gazette

33 ۔ The Pioneer, Jan 4, 1889 ۔ اس اجلاس کی مکمل رپورٹ اور منظورہ قراردادوں کے تفصیلی متن اور وفود کے اسمار پیشوں اور مقام ہائے رہائش کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خیرالدین شیخ کی کتاب The Third Mohammadan Educational Congress (Lahore. 1889)

34 ۔ اس قرارداد کے متن کے لیے ملاحظہ ہو مجموعہ رمیزولیوشن ہائے دہ سالہ (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں 1886ء تا 1895ء کے دوران منظور کی گئی قراردادوں کا اردو متن) صفحہ 32 ۔ اس اجلاس کی کارروائی کی رپورٹ کے لیے ملاحظہ ہو 6 جنوری 1890ء کا Pioneer ۔

35 ۔ اس مباحثے کی کارروائی کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جنوری 1890ء کا M.A.O. Magazine.

36 ۔ The Pioneer, December 30, 1891

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

37 ۔ مجموعۂ ریزولیوشن ہائے دہ سالہ (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں 1886ء تا 1895ء کے دوران منظور کی گئی قراردادوں کا اردو متن) صفحہ 37 ۔ سرسیّد اپنی عمر کے آخری ایّام تک مسلمانوں میں تکنیکی تعلیم کی ترویج کی مخالفت کرتے رہے ۔ ملاحظہ ہو حالی کی حیاتِ جاوید (اردو متن) 105-07 (حصہ اوّل) مزید ملاحظہ ہو Pioneer کے نام بیک کا مراسلہ بضمن تکنیکی تعلیم مورخہ 7 جنوری 1891ء

38 مزید ملاحظہ ہو Pioneer مورخہ یکم جنوری 1894ء Ibid. 48

39. The Pioneer, Jan 1, 1894

40 ۔ ملاحظہ ہو مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ (اردو متن)

41. The Pioneer December, 31, 1895

42 ۔ ملاحظہ ہو خلاصۂ کارروائی یازدہ سالہ (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی 1886ء تا 1896ء روداروں کا اردو متن مرتبہ مہدی علی خاں ۔ صفحہ 17

43 ۔ قرارداد کے تفصیلی متن کے لیے ملاحظہ ہو مجموعۂ ریزولیوشن ہائے دہ سالہ (اردو)

44 ۔ ملاحظہ ہو محمڈن اینگلو اورنٹیل کانفرنس کے دسویں اجلاس کی رپورٹ (اردو متن)

45 ۔ ملاحظہ ہو 2 جنوری 1897ء کا Pioneer

46 ۔ اس اجلاس کی کارروائی کی تفصیلی رپورٹ اور اس میں کی جانے والی تقاریر کے لیے ملاحظہ ہو مسلم کرانیکل بابت 15 جنوری و 7 فروری 1897ء

47 مزید ملاحظہ ہو یکم جنوری 1899ء کا Civil and Military gazette, The Pioneer, December 31, 1898

48 The Moslem Chronicle, Feb 4, 1899 کا ضمیمہ

49. Ibid

50 ۔ ملاحظہ ہو Progress of Education in India Fourth Quinquennial Review (1897-98 to 1901-02) Vol 2 P-81

51. The Moslem Chronicle, Dec 23, 1899

Ibid Nov 20, 30, and 1899 - 52

Ibid

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

5 ۔ امیر علی کے مکمل خطبے کے متن کے لیے ملاحظہ ہو ۷ جنوری ۱۹۰۰ء کا The [illegible] ۔ M. A. O. College Magazine اس اجلاس میں کی جانے والی تقاریر اور منظورہ قراردادوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ۴ جنوری ۱۹۰۰ء کے Statesman کا ہفتہ وار ایڈیشن۔ اس اجلاس کے آخری روز کی جانے والی اردو صدارتی تقریر کے لیے ملاحظہ ہو ۷ جنوری [illegible] کا مسلم کرانیکل

The Moslem Chronicle, Dec 30, 1899 - 55

The Pioneer Jan, 5, 1901 56

The Moslem Chronicle Jan 6, 1902 57

Ibid. Jan. 11, 1902 58

59 Ibid Jan 25, 1902 (Supplement) اس اجلاس کی مختلف نشستوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مورخہ 28, 29, 30 اور 31 دسمبر ۱۹۰۱ء Madras Times

60 ۔ The Moslem Chronicle Jan 25, 1902 ۔ اس کے برخلاف اینگلو انڈین اخبار کا حسب ذیل تبصرہ بھی قابلِ توجہ ہے: "یہ روایت کہ مسلمان کبھی اس ملک کے حکمران رہے ہیں۔ مغربی اور جنوبی ہندستان کے مسلمانوں کو اس حد تک متاثر نہیں کرتی جس حد تک کہ پنجاب اور شمال مغربی صوبجات کے مسلمانوں کو۔ گجراتی بولنے والے بوہرے اور خوجے یا جنوبی ہند میں تامل بولنے والے لبّے [illegible] انتہائی پکے قسم کے تاجر ہوتے ہیں جنھیں زندگی کا مسئلہ بالکل ہی الگ رنگ میں درپیش آتا ہے بہ نسبت اُن دیسی ہندستانیوں کے جو اپنی غنائی خطابت کا اظہار پُرشکوہ اردو میں کیا کرتے ہیں۔ ملازمت عام میں اعلیٰ عہدوں پر فایز ہونے کی تمنا اوّل الذکر میں اتنی نہیں پائی جاتی جتنی کہ آخر الذکر میں۔ مزید برآں دیسی مسلمانوں کے یہ [illegible] فرقے اپنے ہندستانی ہم مذہبوں کے ساتھ اُس قدر مشابہت اور لگاؤ محسوس نہیں کرتے جتنا کہ اپنے پڑوسی ہندوؤں کے ساتھ۔ انھیں اپنے بچّوں کو ان اداروں میں حصولِ علم کے لیے بھیجنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا جو دوسری قوموں کے لیے قایم کیے گئے ہوں۔"

[illegible] of India

(Mail & Advertiser) Jan. 1, 1902

Statesman (weekly) Jan 8, 1903 ملاحظہ ہو 6۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

62 ۔ خطبے کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ ہو 8 جنوری 1903ء کا Pioneer ۔ مزید ملاحظہ ہو آغا خان کے خطبے پر Times of India کا اداریہ (ویکلی ایڈیشن) مورخہ 17 جنوری 1903ء اور Statesman (ہفتہ وار ایڈیشن) مورخہ 15 جنوری 1903ء۔

63 - Report of the Indian Universities Commission 8.

64 - The Pioneer Jan. 11, 1903. مزید اس موضوع پر 15 نومبر 1902ء کے مسلم کرانیکل کا اداریہ ملاحظہ فرمائیے۔

65 ۔ اُس وقت طیب جی بمبئی ہائی کورٹ کے جج تھے۔

66 ۔ طیّب جی کے خطبے کے تفصیلی متن کے لیے ملاحظہ ہو Times of India کا ویکلی ایڈیشن مورخہ 2 جنوری 1904ء۔

67 - The Moslem Chronicle Jan 2, 1904. مزید ملاحظہ ہو 6 فروری 1904ء کے مسلم کرانیکل کا اداریہ بعنوان "پردہ"

68 - The Pioneer Dec. 30 1903 ۔ کانفرنس کی تفصیلی رپورٹ کے لیے ملاحظہ ہو 31 دسمبر 1904ء کا مسلم کرانیکل۔ مورلینڈ کے صدارتی خطبے کے تفصیلی متن کے لیے ملاحظہ ہو جنوری 1905ء کا Educational Review

69 - The Pioneer Dec. 31, 1904

70 - Ibid. Jan. 1, 1906

71 - Ibid. Jan 5, 1906

72 - V. G. Bijapurkar. Ibid. Jan. 6, 1906 ۔ مزید ملاحظہ ہو وی۔ جی بیجاپورکر کا مضمون بعنوان The Need for a Hindu University مشمولہ 'Indian Review' اپریل 1906ء

73 - The Pioneer Dec. 30. 1906. مزید ملاحظہ ہو Bengalee مورخہ 31 دسمبر 1906ء

74 - The Statesman (Weekly Edition) Jan 3, 1907

75 - The Pioneer Dec 31, 1906.

76 ۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سترھویں اجلاس کے خطبہ استقبالیہ میں یہ بات کہی گئی۔ ملاحظہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو Times of India (ویکلی ایڈیشن) مورخہ 2 جنوری 1904ء

77۔ خلاصۂ کارروائی یازدہ سالہ (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی 1886ء تا 1896ء کی کارروائیوں کی روداد) مرتبہ مہدی علی خاں (اردو متن) صفحہ 27

78۔ مجموعۂ ریزولیوشن ہائے دہ (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں 1888ء تا 1895ء کے دوران منظور کی جانے والی قراردادوں کا اردو متن)

79۔ Ibid 10 - 11, 14

80۔ Ibid 44 - 45

81۔ Ibid - 61

82۔ خلاصہ کارروائی یازدہ سالہ 49 — 51

83۔ Proceedings of Education in India, Fourth quinquennial Review (1897 — 02 to 1901 — 02) Part II 382

84۔ Proceedings of کلکتے کے مدرسے اور اس کی سرگرمیوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ Education in Bengal: Third Quinquennial Review 1902 — 03 to 1906 — 07), 153 — 56.

85۔ Report of Public Instruction in the Punjab and its Dependencies (1906 — 07) 13 - 14.

86۔ Progress of Education in the Bombay Presidency ملاحظہ ہو 1902 — 03 to 1906 — 07, 61

87۔ Report on public Instruction in the Madras Presidency for 1906 — 07 and for the preceding years 1902 — 03 to 1906 — 07 I 52

88۔ Report on the State and Progress of Education in the Central Provinces and Berar for the quinquennium ending 1906 — 07, I 35

89۔ Report on the progress of Education in ملاحظہ ہو Eastern Bengal and Assam (1901-02 to 1906-07), I, 102.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Bahadur Shah

Rebellion of 1857

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Mohsinul Mulk

Shibli Naomani

Altaf Husain Hali

Viqar-ul Mulk

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Rehmatulla Sayani

Badruddin Tyabjee

The Aga Khan II

Syed Ameer Ali

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Theodore Beck

Nawab Samiulla of Dacca

Nawab Abdul Latif

Theodore Morison

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Syed Mahmud

Zaka Ullah

Nazir Ahmed

Sir Muhammad Iqbal

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

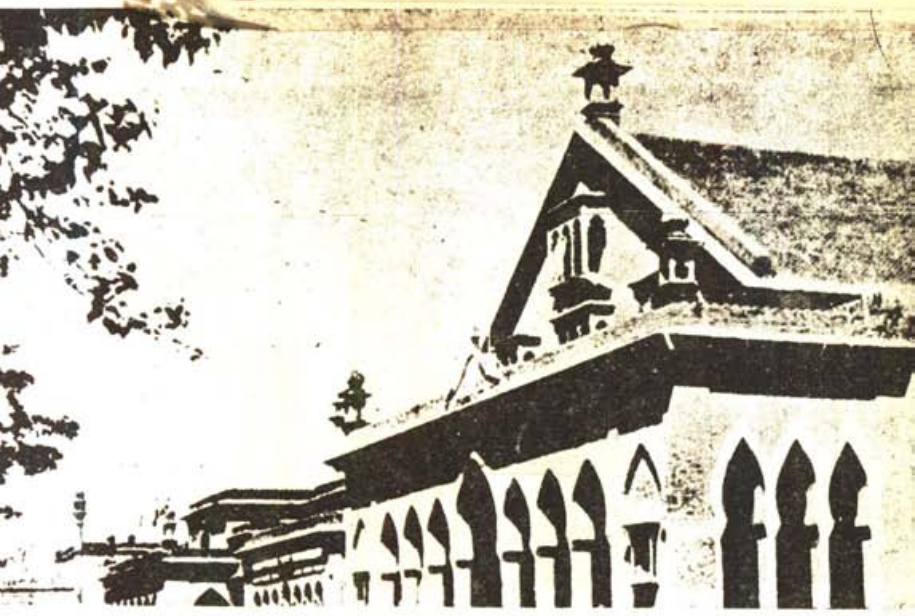

M. A. O. College, Aligarh

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

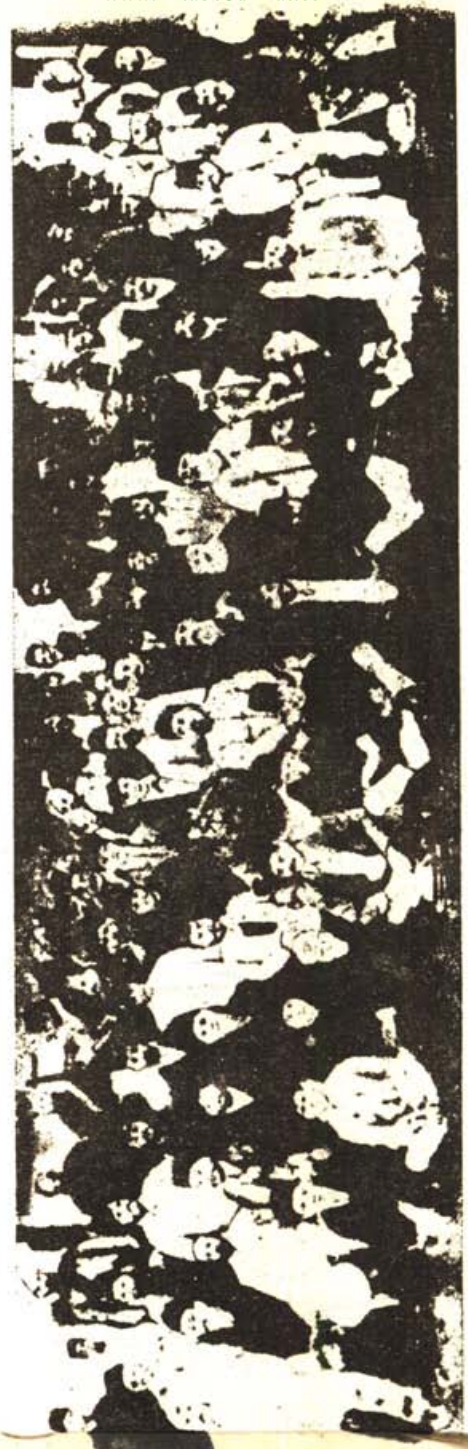

Birth of the Muslim League at Dacca (1906)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھٹا باب

پریس کا کردار

برطانوی راج میں مسلم اخبارات (ایسے اخبارات جن کے مدیر مسلمان رہے ہوں اور جو اسلامی مزاج کے حامل رہے ہوں) کی ابتدا کب ہوئی اس بات کا صحت کے ساتھ معلوم کرنا بڑا ہی مشکل امر ہے۔ اُن کی ابتدا کا سال اور ان کے اغراض و مقاصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن یہ طے ہے کہ ایسے اخبارات فارسی زبان میں اُس وقت تک شایع ہوتے رہے جب تک کہ اردو زبان نے اُس کی جگہ نہیں لے لی۔

غالباً جدید مسلم صحافت کی ابتدا ۱۸۲۰ء میں شیخ علیم اللہ نامی ایک بزرگ نے کی تھی کیونکہ حکومتِ بنگال کے Public Records ریکارڈ میں اس بات کا اندراج محفوظ ہے کہ اُنھیں سماچار شکھ رنجندرو (Samachar Sukha Rajendro) نامی ایک اخبار بیک وقت فارسی اور بنگالی زبانوں میں شایع کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

دو سال بعد ایک اور مسلم اخبار منظرِ عام پر آیا جس کا نام تھا حاکم عالم فروز (Hakim Alam Firoz) جو فارسی زبان میں نکلا کرتا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں کلکتے کے ایک سوداگر غلام حسین نے بھی سلطان الاخبار نامی ایک فارسی اخبار جاری کیا۔ اس کے علاوہ دہلی سے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ سراج الاخبار نامی زوزنامہ اور مہر منیر نامی پرچہ ہفتے میں دو بار نکالا کرتے تھے۔ یہ تمام اخبارات خام ادبی نوعیت کے حامل تھے جن کا مسلم رائے عامہ پر نہ ہونے کے برابر اثر تھا کیونکہ ان دنوں رائے عامہ نام کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی چیز کے وجود کا بہ مشکل تصور کیا جا سکتا تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس کے علاوہ بھی چند اخبارات نکلتے ہوں کیونکہ بقول فرمینڈ آف انڈیا 1838ء کے اوایل میں باغی مسلم پریس نے بڑی مستعدی کے ساتھ یہ افواہ ملک کے طول و عرض میں پھیلائی کہ روس ہندستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس بات کی تحریک اور سرمایہ اُسے پرشیا (ایران) سے حاصل ہوا۔[1]

ہندستان میں لیتھوگرافی کی ترویج کی وجہ سے جگہ جگہ اردو اور فارسی کے پریس قایم ہوگئے۔ سب سے پہلا لیتھو پریس 1837ء میں دہلی میں قایم ہوا۔ اس بات کا اردو اور فارسی ادب پر خوش آیند اثر پڑا۔ جلد ہی ان زبانوں میں نہ صرف اخبارات بلکہ پمفلٹ، کتابیں، سرکاری اعلامیے اور مجلس مقننہ کے ضابطے شایع ہونے لگے۔ چونکہ لیتھوگراف پر چھپی ہوئی مطبوعات مقابلتاً ارزاں قیمت پر دستیاب ہونے لگی تھیں اس لیے عوام میں علم اور معلومات کے حصول کی خواہش میں اضافہ ہونے لگا جس کی وجہ سے اُن میں اخبار بینی کا یہ ذوق پروان چڑھنے لگا جس کا اس سے قبل سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اگرچہ یہ ذوق ایک مختصر سے حلقے تک محدود تھا تاہم مستقبل میں اس کے وسیع امکانات کے پیشِ نظر اس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔[2]

غالباً اردو کا سب سے پہلا اخبار آگرہ اخبار تھا جس کی ابتدا 1830ء میں کسی وقت ہوئی۔ ویسے اس اخبار کے بانی کا نام تلاش کرنا ممکن نہیں ہے لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ شخص کوئی غیر مسلم رہا ہو۔ ایک مصنف کے بقول یہ اخبار اپنے "ذہین اداریوں" اور اپنے خصوصی امتیاز کی وجہ سے مشہور تھا کہ یہ اپنے صفحات پر "فوج کے ادنیٰ عہدیداروں، خوبصورت نوجوان عورتوں، مایوس بیواؤں اور با تدبیر ماؤں کے شکووں اور شکایات کو جگہ دیتا ہے"۔[3]

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے 1837ء میں دہلی میں سید الاخبار جاری کیا۔ بدقسمتی سے یہ اخبار جبکہ اپنی عہد طفلی ہی میں تھا اس کے بانی نے عین عالمِ شباب میں پیغامِ اجل کو لبیک کہا۔ اس لیے سرسید نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُنھوں نے اس اخبار کے معاشی موقف کو مستحکم بنانے کے لیے قرض حاصل کیا۔ اسے چلانے کے لیے ایک باصلاحیت مدیر کا تقرر کیا اور اکثر و بیشتر خود بھی اس کے کالموں میں اپنے مضامین شایع کرواتے رہے لیکن ان کی کوششیں رائیگاں گئیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قارئین کی بے انتہا کمی کے باعث سید الاخبار مالی بحران کا شکار ہوگیا۔ بالآخر سرسید نے مایوس ہو کر اخبار بند کر دیا۔ انھیں اس سلسلے میں کافی مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اُن دنوں مسلمانوں میں اخبار کی بظاہر کوئی مانگ موجود نہیں تھی۔ اس کے علاوہ 1857ء کے غدر نے جن شکوک و شبہات کو جنم دیا تھا ان کی موجودگی میں اس قسم کے صحافتی اقدام کی کامیابی کے امکانات قطعی معدوم تھے۔ ویسے سرسید کو اس ذریعہ ابلاغ کے غیر معمولی امکانات کا علم تھا۔ خاص طور پر مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے لیکن انھیں اپنی دوسری صحافتی کاوش کو شروع کرنے کے لیے کم و بیش اگلے تیس برسوں تک انتظار کرنا پڑا۔

1830ء میں دہلی سے جاری ہونے والے اردو زبان کے روزنامے دہلی اخبار کو چھوڑ کر جسے مولوی محمد باقر نے جو اردو کے مشہور ادیب مولانا محمد حسین آزاد کے والد تھے، جاری کیا تھا تقریباً 1860ء تک دوسرا اور کوئی مسلم اخبار میدانِ صحافت میں موجود نہیں تھا[9] لیکن یہ اخبار بھی سیاسی نہیں بلکہ مذہبی نوعیت کا حامل تھا۔ غالباً ایسا اس وجہ سے تھا کہ مولوی صاحب خود سنّیوں کے ایک خاص فرقے کے رہنما تھے اور چاہتے تھے کہ اسلام کے دوسرے فرقوں پر اُس فرقے کی فوقیت کا اچھی طرح پرچار کریں۔ تاہم انھیں 1857ء میں اسے بند کر دینا پڑا جس کے بعد وہ پھر کبھی شایع نہیں ہوا۔

بلاشبہ سرسید کا علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ پہلا اہم مسلم اخبار تھا جو 1866ء میں جاری کیا گیا۔ یہ علی گڈھ سائنٹیفک سوسائٹی کا ترجمان تھا۔ ابتداً یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا، جو ہر جمعہ کو شایع کیا جاتا تھا لیکن بعد ازاں یہ ہفتے میں دو بار ہر منگل اور جمعہ کو شایع ہونے لگا۔ بقول حالی سرسید نہ صرف اس اخبار کے مالیاتی امور کی جانب توجہ دیتے بلکہ اس کی ابتدا ہی سے عملاً اس کے تمام اداریے اُنھی کے سپردِ قلم کیے ہوئے تھے[5]۔ اگرچہ مئی 1870ء تک حاجی اسماعیل خاں اس کے برائے نام مدیر بنے رہے۔ ابتدائی چند برسوں تک سرسید اس اخبار میں سیاسی امور پر ہی رائے زنی کرتے رہے جن کا تعلق ہندستانی امور سے کم اور بین الاقوامی امور سے زیادہ ہوا کرتا تھا خاص طور پر ایسے واقعات سے جو اسلامی ممالک سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ مثلاً ترک، آرمینیائی قضیے میں اُنھوں نے ترکی کی حمایت میں اس اخبار کے کئی کالم سیاہ کر ڈالے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یوروپین قارئین کی توجہات کو اپنی جانب مبذول کرنے اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں انگریزی پڑھنے کے نوزائیدہ ذوق کی تسکین کے لیے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اخباری صفحات کو دو کالموں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا جس میں سے ایک کالم میں انگریزی میں خبریں شایع ہوتی تھیں اور دوسرے میں اُن کا۔ اردو ترجمہ اکثر اس اخبار کے اہم اداریوں اور خاص مضامین کا جنھیں حالی، شبلی، یا ذکاء اللہ جیسے اردو کے نامور ادیب سپرد قلم کیا کرتے تھے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جاتا تھا اور انگریزی کے کالم میں شایع کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اکثر و بیشتر انگریزی جرائد کے طویل اقتباسات اردو ترجمے کی شکل میں شایع کیے جاتے تھے۔

سرسید اور ان کے رفقاء علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعے نہ صرف سیاسی بلکہ سماجی، مذہبی اور تعلیمی امور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے کئی برسوں تک متعدد عوامی معاملات میں گزٹ نے غیر مقلدانہ رویہ اختیار کیا۔ حکومتی اقدامات پر اُس کی تنقیدیں اکثر سخت اور بے باک ہوا کرتی تھیں۔ جبکہ اُس کے بیرونی صفحے پر ہمیشہ یہ مقولہ شایع ہوا کرتا تھا " آزادیِ صحافت کی ضمانت دینا عقلمند حکومت کا اور اس کی حفاظت کرنا آزاد عوام کا کام ہے۔"

1876-78ء کے دوران اس بات کی کافی افواہیں اُڑیں کہ حکومت "دیسی" اخبارات کا گلا گھونٹنا چاہتی ہے۔ یہ خدشات درست بھی تھے لیکن اُس وقت تک حکومت نے اِس جانب کوئی عملی اقدام نہیں کیا تھا۔ سرسید نے اپنا پورا زور لگا کر حکومت کے اس دباؤ کی مخالفت کی انھوں نے لکھا: " مجھے یقین ہے کہ نئے وائسرائے اپنے نام کو کسی ایسے اقدام کے ساتھ ہرگز وابستہ نہیں کریں گے جس کا مقصد دیسی زبانوں کے اخبارات کی آزادی کا گلا گھونٹنا ہو۔ وہ لوگ جو اس شر پسندی پر آمادہ ہیں انھیں شاید اس کے نتایج کا علم نہیں۔ لارڈ لٹن اُن نتایج سے عدم واقفیت کا دعویٰ کرتے ہوئے اس قسم کی نازیبا حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس اقدام سے نہ صرف ہندستانیوں کو نقصان پہنچے گا بلکہ انگریزوں کو بھی یہ اقدام آگ بگولہ کر دے گا۔"[6]

متعدد اردو اخبارات کے برخلاف جن کی تعداد 1878ء تک کافی بڑھ چکی تھی، علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کبھی بھی معاشی بار ثابت نہیں ہوا۔ اگرچہ اس سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کبھی بھی منافع حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی لیکن اپنے مستقل پانچ سو قارئین کی موجودگی کی وجہ سے اس اخبار کا خرچ بہ آسانی چلتا رہا۔ مزید برآں دیسی زبانوں کے کئی اخبارات کے برخلاف، جن میں نہ صرف اردو زبان کے اخبارات شامل تھے بلکہ دیگر ہندستانی زبانوں سے تعلق رکھنے والے دیگر کئی اخبارات بھی شامل تھے، گزٹ انتہائی پابندی سے شایع ہوا کرتا تھا۔ اُن دنوں اسے ایک غیر معمولی کارنامہ ہی کہا جا سکتا تھا کیونکہ دیسی زبانوں کے کئی روزنامے بعض اوقات ہفتے میں صرف تین بار شایع ہوا کرتے تھے اور ہفتہ وار اخبارات بعض اوقات دو دو مہینے کے وقفے سے شایع ہوتے تھے جبکہ ماہناموں کا حال یہ تھا کہ مستقل خریداروں کو اطلاع دیئے بغیر ہی یہ ماہنامے اچانک بند ہو جاتے تھے اور پھر کافی طویل عرصے کے بعد اچانک ہی دوبارہ منظرِ عام پر آجاتے تھے۔

اسی وجہ سے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو رائے عامہ کے ایک ترجمان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی خبروں کو معتبر مانا جاتا تھا اور اس کے تبصروں کی قدر کی جاتی تھی۔ دراصل حالات حاضرہ کے بارے میں اُس کا سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ رویہ ہی اُس کی خصوصیت سمجھا جاتا تھا جیسا کہ حالی نے اسی بات کو دلچسپ مشرقی پیرائے میں یوں بیان کیا ہے:

> اپنی پیش کشی کے معاملے میں یہ اخبار کسی قوم یا فرقے سے کسی قسم کا بغض و عناد نہیں رکھتا تھا۔ اس اخبار نے اپنی متانت اور وقار کو قربان کر کے اپنے کسی قاری کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس اخبار نے سب کی بہتری کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف چند لوگوں کے مفاد کی حصول کی خاطر اپنی گرجدار آواز کو کبھی پست ہونے نہیں دیا۔ یہ غیر مسلموں کی ترقی پر کبھی ناراض نہیں ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو ہندو مسلم جھگڑوں سے بالا رکھا۔ اس نے دوسری قوموں کے رہنماؤں کی موت پر ویسا ہی سوگ منایا جیسا کہ اپنی قوم کے رہنماؤں کی وفات پر۔ اور آخر میں اگرچہ اس نے اکثر حکومت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا لیکن کبھی اپنے تواز ن، وقار اور خوش خلقی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا جو کہ محکوم عوام کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جواہر زر نگار ہوتے ہیں۔

اُس دَور کے مشرقی ادیبوں کی جذباتی مبالغہ آرائی کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم مندرجہ بالا بیان کو گزٹ کی کارکردگی کا ایک متوازن تجزیہ قرار دے سکتے ہیں ویسے حالی سے زیادہ کوئی اور شخص اس موضوع پر لب کُشائی کی اہلیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ انھوں نے انتہائی قریب سے اس اخبار کی نشوونما اور ترقی کا مشاہدہ کیا تھا۔ غالباً سرسید کے علاوہ کوئی اور شخص اس اخبار سے اس قدر قریب نہیں تھا۔ خود حالی اس اخبار کے قلمی معاونین میں بھی شامل تھے۔

زیرِ تحقیق دور میں اور اس کے بعد بھی گزٹ پابندی سے نکلتا رہا۔ جن دنوں سرسید انگلستان گئے تھے اُن دنوں بھی گزٹ نکلتا رہا۔ اُن کے سفر کی مشہور یادداشتیں Travel Notes سب سے پہلے اسی اخبار میں شایع ہوئیں لیکن اس اخبار کی تعدادِ اشاعت کم ہوتی گئی اور 1890ء تک تو یہ اس حد تک کم ہوگئی کہ اسے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین میں ضم کر دینا پڑا جو ایک دولسانی رسالہ تھا اور جس کی مشترکہ ادارت کے فرائض بیک اور شبلی کو تفویض تھے۔ مزید برآں کالج کے قیام کے بعد سے اس اخبار کی پالیسی میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی تھی وہ برطانیہ کا شدید حامی اور ہندوؤں کا مخالف ہوگیا تھا۔ کانگریس کی سرگرمیوں کے علاوہ، جن سے سرسید کو کوئی ہمدردی نہیں تھی، جس چیز نے سرسید کو ہندستانی سیاسی زندگی کے دھارے سے دور لا پھینکا وہ بیک کا اثر تھا جس کی وجہ سے وہ حالات کو جوں کا توں بنا رہنے دینے کی پالیسی کے زبردست حامی بن گئے تھے۔

1885ء میں لوٹیں تو ہمیں ہندستان بھر میں صرف دو مسلم روزنامے نظر آتے ہیں۔ دونوں ہی اردو زبان میں نکلا کرتے تھے لیکن ان دونوں کا شاید ہی ملک پر کوئی اثر رہا ہوگا۔ ان میں کا پہلا اخبار سعید الاخبار تھا جو بدایوں (شمالی صوبہ سرحد) سے نکلا کرتا تھا اور جس کی قیمت ایک پیسہ ہوا کرتی تھی۔ اسے مولوی ایم۔ فاضل علی نکالا کرتے تھے۔ دوسرا اخبار تھا حیدر آباد دکن کا ہزار داستان جسے 1886ء میں سید حسن جشن نے جاری کیا تھا۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ یہ اخبار انتہائی گراں قیمت یعنی دو آنے فی شمارہ کے حساب سے فروخت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مدراس کا مسلم ہیرالڈ بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا جسے خاں بہادر احمد محی الدین نے اکتوبر ۱۸۸۴ء میں جاری کیا تھا۔ یہ اخبار ہفتے میں تین بار انگریزی میں شایع ہوتا تھا یعنی بروز منگل، جمعرات، ہفتہ، اس کی اشاعت عمل میں آتی تھی۔ اس اخبار کی تعداد اشاعت ۵۰۰ تھی"۔ یہ اخبار جنوبی ہندستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں پر خاصا اثر رکھتا تھا۔ یہ اخبار سرسید اور اُن کی سیاست کا زبردست حامی تھا۔

ایک اور مسلم اخبار ہفتے میں تین بار گجراتی زبان میں بمبئی سے شایع ہوتا تھا جس کا نام تھا قاصدِ ممبئی Kassida Mumbai جسے وہیں کے ایک تاجر غلام علی غلام رسول چلایا کرتے تھے۔ یہ اخبار نیم مذہبی نیم تجارتی نوعیت کا تھا۔ اسی طرح مدراس محمڈن ایسوسی ایشن بھی اپنا ایک ترجمان اتفاق کے نام سے نکالا کرتی تھی جو ہفتے میں تین بار شایع ہوا کرتا تھا۔

ہفتے میں دو بار شایع ہونے والے کئی مسلم اخبارات بھی تھے جو ہلکے پھلکے قسم کے پرچے ہوا کرتے تھے۔ صرف چند ہی سنجیدہ قسم کے اخبارات تھے جن کا مقصد رائے عامہ کی رہنمائی کرنا تھا اس قسم کے اخبارات میں علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور اخبار تھا جس کا نام تھا اخبار دارالسلطنت جو ہر بدھ اور ہفتے کو کلکتہ سے جو اُن دنوں ملک کا دارالسلطنت تھا شایع ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ اخبار کے نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے نجم الاخبار اٹاوہ (شمال مغربی صوبہ) سے پنجابی اخبار لاہور سے اور دکن جرنل حیدرآباد (دکن) سے شایع ہوتے تھے۔ لیکن ہفتے میں دو بار شایع ہونے والے اخبارات میں علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے بعد سب سے اہم امرتسر کا وکیل تھا جو شیخ غلام محمد اور خواجہ صمد شاہ کی مشترکہ ادارت میں شایع ہوا کرتا تھا۔ اس اخبار کی خصوصیت اس کی اسلامی خبریں تھیں جنھیں وہ عربی اور ترکی اخبارات سے نقل کیا کرتا تھا۔ خاص طور پر ترک۔ آرمینی جنگ کے دوران اس اخبار نے مسلمانوں کی جوانمردی کے تفصیلی واقعات شایع کیے تھے۔ سلطان کی حمایت میں مضبوط موقف اختیار کرنے کے باعث اس اخبار کی اشاعت کافی بڑھ گئی تھی۔

سیاسی اعتبار سے پنجاب آبزرور Punjab Observer بھی کافی اہمیت کا حامل تھا۔ انگریزی زبان کے اس اخبار کی ادارت شیخ عبدالقادر انجام دیا کرتے تھے (جو اس وقت ایک نوجوان مسلم گریجویٹ تھے اور بعد ازاں سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کے رکن بھی نامزد کر دیے گئے تھے) یہ اخبار ہر بدھ اور ہفتے کے روز لاہور سے شایع ہوا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا تھا۔ اس اخبار کے صفحات پر کئی مسلم گریجویٹس اور خصوصیت کے ساتھ علی گڈھ کے گریجویٹس کے مضامین شایع ہوا کرتے تھے۔ اپنی پالیسی کے لحاظ سے یہ اخبار نہ صرف سرسید کا حامی تھا بلکہ اُن کے خیالات کی تشہیر بڑے زور و شور سے کیا کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا رویہ ہندوؤں کے تعلق سے جارحانہ نہیں تھا لیکن اکثر یہ کانگریسی رہنماؤں پر حملے کیا کرتا تھا اور اُنھیں باغی سرشت رہنما کہا کرتا تھا۔

دوسرا مسلم اخبار جو ہفتے میں دو بار انگریزی میں شایع ہوا کرتا تھا مدراس کا محمڈن تھا جو 1890ء میں جاری کیا گیا تھا۔ یہ اخبار ہر پیر اور جمعرات کو شایع ہوتا تھا۔ یہ اخبار مسلمانوں کا نقیب تھا اور سرسید اور اُن کی علی گڈھ تحریک کا زبردست حمایتی تھا۔ ایک بار تو اس اخبار نے ایک گمنام مسلمان کی گورنر جنرل کی کونسل میں شمولیت پر اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا جس نے نہ صرف ہندستانیوں بلکہ انگلستان والوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کروالی تھی[12]۔

ہفتہ وار اخبارات کی تعداد کم و بیش پچاس تھی جنھیں ہر قسم کے مسلمان ہر قسم کے مقصد کے تحت نکالتے تھے۔ بعض تو یونانی ادویہ کو مشتہر کیا کرتے تھے، بعض مذہبی عبادات کی ہمت افزائی کیا کرتے تھے اور بعض کا مقصد صرف اپنے متمول سرپرستوں اور بزرگوں اور ولیوں کی مدح سرائی ہوتا تھا۔ لیکن چند ایک ہفتہ وار ایسے بھی تھے جو سماجی بہبود کے لیے وقف تھے اور عوامی معاملات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس قسم کے ہفتہ وار پرچوں میں سب سے زیادہ اہمیت محمڈن آبزرور Muhammadan Observer کو حاصل تھی جو بعد میں یعنی 1894ء میں مسلم کرانیکل Muslim Chronicle کہلایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُس دور میں یہ ہفتہ وار ہندستان میں غالباً مسلم رائے عامہ کا سب سے نمایندہ ترجمان تھا جسے "دیسی" صحافت میں ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ اس کے خیالات کو اکثر The Times اور دیگر برطانوی اخبارات ہندستان میں وقوع پذیر ہونے والے حالات پر مسلمانوں کے ردِ عمل کے طور پر نقل کیا کرتے تھے[13]۔ کانگریسی اخبارات بھی اس ہفتہ وار پر اپنی کافی توجہ مرکوز رکھتے تھے۔ بنگالی Bengalee۔ انڈین مرر Indian Mirror، 'ہندو پیٹریاٹ Hindu Patriot' انڈین ڈیلی ٹیلی گراف Indian Daily Telegraph اور امرت بازار پتریکا Amrita

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جیسے اخبارات کے کالموں میں سیاسی معاملات پر مسلم کرانیکل Bazm Patrika کے ساتھ مستقل نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ بعض اوقات تو دشنام طرازیوں تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔

مسلم کرانیکل یا محمڈن آبزرور جیسا کہ اُسے ابتداً کہا جاتا تھا۔ 1872ء میں جاری کیا گیا تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک سیاسی جریدہ تھا حالانکہ اس کے سرورق پر لکھا ہوتا "سیاست، ادب اور سماج کا ہفتہ وار اخبار"۔ 1895ء میں اپنی ہی گذشتہ سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے مسلم کرانیکل نے اس بات کا فخریہ اظہار کیا کہ ماضی میں وہ دو محاذوں پر "صحافتی جنگ" لڑتا رہا ہے۔ پہلی جنگ تو "وہمی روشن خیالی کے خبط Fads اور ہمارے ہندو برادرانِ وطن کی جانب سے اکثر پریس کے ذریعہ پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کے خلاف" اور دوسری "حکومت کے اُن اقدامات کے خلاف جو بظاہر نیک نیتی پر مبنی ہونے کے باوجود غیر دانشمندانہ اور ناقابلِ عمل ہوتے ہیں جنھیں حکومت محض ہندوؤں کے دباؤ میں آکر نافذ کرتی ہے"۔[14]

اپنے آپ کو چھ کروڑ مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان قرار دیتے ہوئے مسلم کرانیکل نے ایک اور موقعے پر اپنے کردار کی وضاحت اس طرح کی۔

> اگر کبھی کبھار ہم نے اپنے لہجے میں درشتگی اختیار کی تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ ہمیں جارحانہ زبان اختیار کرنے کا شوق ہے یا جارحیت سے مریضانہ عشق ہے بلکہ یہ اس وجہ سے تھا کہ ہم سمجھتے تھے کہ تاجِ برطانیہ سے ہماری وفاداری اس بات کی متقاضی تھی کہ ہم بے لاگ صاف گوئی سے کام لیں خواہ حقایق کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔ ہم اسے بڑی بددیانتی سمجھتے رہے کہ شدید جذبات اور ٹھوس حقایق کو منافقانہ طور پر نرم زبان میں بیان کریں تاکہ ہماری بات بہ آسانی حکومت کے حلق سے نیچے اُتر سکے۔

اس اخبار کی پالیسی خود اسی کے الفاظ میں یہ تھی:

(1) "تاجِ برطانیہ کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری"

(2) "دیگر قوموں کے ساتھ برادرانہ تعلقات"

(3) "جایز، نڈر، راست، مؤدبانہ اور وفادارانہ طریقے سے مسلمانانِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہند کے مفادات کی ترجمانی"

مسلم کرانیکل کلکتہ سے بنگال کے ایک سربرآوردہ گروپ کی زیرادارت شایع ہوتا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے اور اُن کے بارے میں بہت سی خبریں اور نظریات Views شایع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی دلچسپی کے سیاسی مضامین بھی جو حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہوتے وقتاً فوقتاً اس میں شایع ہوا کرتے تھے۔

اردو زبان کے ہفتہ وار اخبارات کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن اُن میں سے بیشتر ہمیشہ مالی بحران کا شکار رہتے تھے۔ اُن کے بارے میں ایک بار سرسید نے کہا تھا: "وہ چاہے جو کچھ ہوں لیکن میں نے اُن کے بارے میں تین باتیں سُن رکھی ہیں۔ پہلی یہ کہ اُن کے کوئی قارئین ہی نہیں ہیں، دوسری یہ کہ جن اخبارات کو تھوڑے بہت قارئین ملتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اخبار کا چندہ ہی نہیں دیتے اور تیسری یہ کہ یہ اخبارات ایسے لوگوں کو بھیجے جاتے ہیں جو سرِعام اس بات پر فخر کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمیں تو بغیر طلب کیے ہی یہ اخبار بھیجے جارہے ہیں"۔ کوئی بیس برس پہلے انھوں نے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں "دیسی اخبارات" کے مالیے کے بارے میں دلچسپ باتیں شایع کی تھیں! اُن کا اس بات پر پکا ایقان تھا کہ اگر انگریزی پریس نہ ہوتا تو دیسی زبانوں کے پریس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہوتا۔ انھوں نے لکھا: "دیسی مدیران بڑی حد تک انگریزی پریس سے حاصل ہونے والی خبروں پر انحصار کرتے ہیں جنھیں نقل کرکے وہ اپنے اخبارات میں شایع کرتے ہیں"! یہ صورتِ حال مالیے کی انتہائی کمی کی وجہ سے تھی کیونکہ دیسی زبانوں کے اخبارات کے قارئین ہمیشہ اخبار پر خرچ کرنے سے جی چراتے تھے۔ اگر انھوں نے ایک بار سالانہ چندہ دے دیا تو اس بات کی توقع کرتے تھے کہ کم از کم تین سال تک انھیں اخبار ملتا رہے۔ اسی ناگفتہ حالت کی وجہ سے اکثر اخبارات کسی نہ کسی راجہ یا نواب کی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مسابقت کیا کرتے تھے۔ کئی اخبارات کے بانیوں کے نزدیک یہی ایک ایسا ذریعہ تھا جس کے سہارے اخبار کو زندہ رکھا جاسکتا تھا۔

لیکن 1882ء کے بعد متعدد ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں جن کی وجہ سے حالات بڑی حد تک سُدھر گئے۔ دیسی زبانوں کے پریس ایکٹ Vernacular Press Act

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی منسوخی کے بعد کئی دشواریوں کا خاتمہ ہوگیا۔ دیسی زبانوں کے اخبارات کا خرچ گھٹا کر آنے کی بجائے گھٹا کر ایک پیسا کیے جانے کی وجہ سے اکثر اخبارات کی اشاعت کافی بڑھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیکڑوں نئے نئے اخبارات منظرِ عام پر آ گئے اور بعض اخبارات تو دور دراز کے فاصلے تک قارئین کے پاس پہنچنے لگے۔

لیکن یہ صورتِ حال بنگالی، گجراتی اور مراٹھی کے اخبارات کے لیے زیادہ سود مند ثابت ہوئی بہ نسبت اردو اخبارات کے جو بھونڈے پن کے ساتھ شایع ہوتے تھے اور جن کا دائرۂ اشاعت محدود ہوتا تھا اور جو اکثر مالی بحران کا شکار رہتے تھے۔ اس کے علاوہ نام نہاد اردو پریس پر بھی ہندوؤں کا اثر غالب تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اخبار عام اور کوہِ نور جیسے اردو کے اہم اخبارات کی ملکیت اور ادارت ہندوؤں ہی کے ہاتھوں میں تھی۔ حتیٰ کہ پیسہ اخبار بھی جو مکمل طور پر محبوب عالم کے ادارتی کنٹرول میں تھا نول کشور پریس کی ملکیت تھا جو ایک مشہور ہندو ادارہ تھا۔ یہی حال وکٹوریہ پیپر Victorian Paper کا تھا جو ابتداً اخبار چشمۂ فیض کہلاتا تھا۔[13]

بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں نے ہفتہ واری صحافت میں اچھا کام کیا اگرچہ ان کے بیشتر جرائد جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، خبروں یا تبصروں کی بجائے خام قسم کی اشتہار بازی کی نوعیت کے حامل تھے۔ تاہم کانپور کا اخبار مہر نیم روز، اٹاوہ (یوپی) کا نجم الاخبار، گورکھپور (یوپی) کے ریاض الاخبار اور فتنہ، حیدرآباد (دکن) کا شفق، جودھپور کا مارواڑ گزٹ، لاہور کے ریفارمر اور رفیقِ ہند، لکھنؤ کا اودھ پنچ، مدراس کا شمس الاخبار، میرٹھ کے طوطیِ ہند، ظریفِ ہند اور ثنائے ہند، پنجاب کا ملتان ایڈورٹائزر، مراد آباد کے جام جمشید اور آئینہ سکندری اور مولوی ایس۔ ایم نصرت علی کی ملکیت کے دہلی سے شایع ہونے والے تین ہفتہ وار نصرت الاخبار، مہر درخشاں اور نصرت الاسلام ایسے اخبارات تھے جنھوں نے مسلمان قارئین میں حالاتِ حاضرہ سے متعلق دلچسپی پیدا کرنے میں اہم کردار انجام دیا۔[14]

1888ء میں پیسہ اخبار کی اجرائی سے اردو صحافت انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ یہ اخبار ابتداً گجرانوالہ (پنجاب) سے اور بعد ازاں لاہور سے شایع ہوتا رہا۔ اس کی قیمت صرف ایک پیسہ ہوا کرتی تھی جبکہ بیشتر "دیسی" اخبارات ایک آنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے کم قیمت کے نہیں ہوا کرتے تھے۔ مزید برآں اس اخبار میں شایع ہونے والے مضامین نہ صرف جدید موضوعات پر مشتمل ہوا کرتے تھے بلکہ ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے ہم عصر اخبارات کے مضامین سے بے حد مختلف ہوا کرتے تھے۔ اُن میں گل و بلبل کا قصہ یا مجنوں اور فرہاد کے مناظر نہیں ہوا کرتے تھے[20]۔ اس کے برخلاف اس اخبار کے مضامین میں عام دلچسپی کے سماجی اور سیاسی مسایل سے بحث کی جاتی تھی۔ دوسری خاص بات یہ تھی کہ یہ اخبار بالکل ہی نئی سائز میں نکلنے لگا تھا جو کہ انگریزی اخباروں کا عام سائز ہوا کرتا ہے لیکن اس وقت تک اردو صحافت اس سائز سے ناواقف تھی[21]۔

قیمت کی کمی کے باوجود پیسہ اخبار جلد ہی اپنے مالک کے لیے منفعت بخش چیز ثابت ہوا۔ یہ بات اشتہارات کی وجہ سے ممکن ہو سکی جن سے اُس وقت تک اردو صحافت محروم تھی۔ جوں جوں اخبار کا دائرۂ اشاعت بڑھتا گیا توں توں اُسے ملنے والے اشتہارات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی مقبولیت کی وجہ سے اس کی اشتہاری قدر میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اُس وقت تک اردو اخبارات اخباری انتظامیہ کے اس سیدھے سادے گُر سے ناواقف تھے۔ پیسہ اخبار نے اس اصول کی افادیت کو پہلے پہل اردو صحافت میں اجاگر کیا۔

وہ شخص جس نے ان تمام "جدتوں" کو کامیابی کے ساتھ اردو صحافت میں رایج کیا۔ پیسہ اخبار کے باصلاحیت مدیر منشی محبوب عالم تھے۔ وہ ایک ذہین اور ہوشیار صحافی تھے۔ اُن کا ہاتھ ہمیشہ عوام کی نبض پر رہا کرتا تھا اور وہ اس قدر ذہین تھے کہ نہ صرف عوام کو ان کی پسند کا مواد بہم پہنچاتے بلکہ اُسی انداز میں پہنچاتے تھے جس انداز میں وہ چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ اخبار کے ذریعے اپنے قارئین کو گپ شپ، مزیدار چٹ پٹی خبریں اور کبھی کبھار لطیف انداز میں نئے خیالات اور افکار سے روشناس کراتے تھے۔ ملاؤں پر پھبتی کستے ہوئے وہ بتلاتے تھے کہ کیونکر جدید تعلیم کے فقدان نے انھیں مضحکہ خیز کردار بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے قارئین سے سادہ اور فطری انداز میں مخاطب ہوا کرتے تھے اور ان پر سماجی اور سیاسی مسایل کو مناسب ڈھنگ سے آنکنے کی اہمیت کو واضح کیا کرتے۔ وہ یہ بات بھی زور دے کر کہا کرتے کہ انگریزی سے نابلد اردو اخبار کا مدیر حالاتِ حاضرہ سے قطعی ناواقف ہوتا ہے۔ اسی لیے اردو پریس سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وابستہ اپنے ساتھیوں سے وہ یہ اصرار کیا کرتے کہ انگریزی سیکھیں اور جدید تکنیک سے کماحقہ واقفیت بہم پہنچائیں۔

ذاتی طور پر مولوی محبوب عالم صاحب نے نہ صرف خود انگریزی سیکھی تھی بلکہ یورپ کا سفر بھی کیا تھا تاکہ یورپی صحافت کے تمام پہلوؤں کا بغور جایزہ لے سکیں۔ پیسہ اخبار کے کالموں کے ذریعے وہ قارئین کو اپنے یورپی تجربات اور ہندستان میں ان کی افادیت سے آگاہ کرتے رہے۔ انھیں اس امر کا یقین تھا کہ جب تک اردو صحافت اپنے آپ کو جدیدیت سے آشنا نہیں کر لیتی تب تک اس کے تابناک مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

ہندستان لوٹنے کے بعد مولوی صاحب اردو پریس کو نیا رنگ روپ عطا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے نئے لوگوں کو تربیت دینی شروع کر دی کیونکہ انھیں پرانے لوگوں سے کوئی اُمید باقی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے انھیں ایڈیٹر گر ایڈیٹر کہا جاتا تھا۔ وہ اپنے منصوبے میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ دراصل یہ اُنھی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانانِ پنجاب الحکماء کے حکیم غلام نبی، غمخوار عالم کے منشی احمد دین کاشمیری کے محمد الدین فوق اور ملّت کے مولوی شجاع الدولہ جیسے عظیم مدیر پیدا کر سکے۔

پھر ایک بار اردو ہفتہ واروں کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بلاشبہ سرسید کا تہذیب الاخلاق سب سے منفرد ہفتہ وار تھا جو لندن کے Spectator اور Tatler کے خطوط پر وضع کیا گیا تھا۔ سرسید اپنے قیام انگلستان کے دوران ان دو جریدوں سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اُن کے مطالعے کے بعد سرسید نے طے کر لیا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے لیے ضرور اس قسم کا ایک اخبار نکالیں گے چنانچہ انھوں نے فوری طور پر لندن میں تہذیب الاخلاق کے سرورق کا بلاک تیار کروالیا اور اسے اپنے ساتھ واپسی کے وقت ہندستان لے آئے۔ علی گڈھ لوٹنے کے بعد انھوں نے اس مجوزہ نئے جریدے کی اشاعت کے لیے احباب کی ایک چھوٹی سی کمیٹی تشکیل دی جس سے ہر ایک نے انھیں ساٹھ روپیہ بطور پیشگی سالانہ چندہ ادا کیا تاکہ جریدے کے ابتدائی اخراجات کی تکمیل ہو سکے۔ ویسے عام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خریداروں سے اس اخبار کا سالانہ چندہ صرف ساڑھے چار روپیہ سالانہ لیا جاتا تھا۔

تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ ۲۷ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا اور بلا ناغہ آئندہ چھ برسوں تک شایع ہوتا رہا۔ سرسید اس کے مدیر تھے اور مینجر بھی۔ اُس کے سرورق پر نمایاں طور پر یہ عربی مقولہ درج تھا۔

حب القوم تمحه الایمان من یسع فی المغراز یسعی فی المزاز دینه

قوم کی محبت مذہب سے حاصل کی جاتی ہے۔ لہذا وہ جو اپنی قوم کے اعزاز کو بلند کرنے کی جدوجہد کرتا ہے (لازماً) اپنے دین کی سربلندی میں مددگار بنتا ہے۔"

ویسے تو تہذیب الاخلاق کے صفحات میں کئی منفرد مسلمانوں کی تخلیقات شائع ہوئیں تاہم محسن الملک اور مولوی چراغ علی اس رسالے کے مستقل قلمی معاونین میں شامل تھے۔ دونوں طرز نگارش انتہائی سادہ تھا اور اسلام کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر غیر مقلدانہ تھا۔ سرسید ہی کی طرح یہ دونوں بزرگ بھی مسلمانوں میں سماجی تبدیلیاں پیدا کرنے کے متمنی تھے۔ زیادہ تر یہ لوگ اسلامی موضوعات پر ہی لکھا کرتے تھے لیکن اس جریدے میں دیگر موضوعات پر بھی مضامین شایع ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ سماجی اور مذہبی موضوعات پر شایع ہونے والے مضامین کی تعداد زیادہ ہوا کرتی تھی۔

تہذیب الاخلاق کا مقصد اسلام کی سمت کا نئے سرے سے تعین کرنا تھا۔ اس لیے روز ابتدا ہی سے اس نے کئی مروجہ رسموں کو تنقید کا ہدف بنانا شروع کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ علما برافروختہ ہو گئے۔ انھوں نے منبروں پر سے اور قدیم رجعت پسند اخبارات کے کالموں کے ذریعے اس کی مذمت کرنی شروع کر دی۔ تہذیب الاخلاق کے نظریات کی تکذیب کرنے کے لیے نئے جریدے بھی نکالے گئے جن میں نور الآفاق اور نور الانوار کافی مشہور ہوئے۔ انتہا یہ کہ رسالہ اشاعت السنہ جیسے سنجیدہ جریدے نے بھی تہذیب الاخلاق پر جارحانہ حملے شروع کر دیے حالانکہ اوّل الذکر جریدہ مسلمانوں کے ایک کم راسخ العقیدہ گروہ یعنی اہلِ حدیث کا ترجمان ہوا کرتا تھا[22]

تاہم تہذیب الاخلاق کے پسند کرنے والے بھی، جن کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس رسالے کے ساتھ کوئی کم جذباتی وابستگی نہیں رکھتے تھے۔ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دم روک کر اُس کے ہر شمارے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ اس رسالے نے اردو ادب کو ایک نئے اسلوب سے بھی آشنا کیا۔ جو راست، سادہ اور تصنع سے پاک تھا۔ انھی باتوں کی وجہ سے اخبار کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا۔ ظاہر تھا کہ قارئین اب قدیم طرز نگارش سے اکتا چکے تھے۔ وہ کسی نہ کسی نئی چیز کے متلاشی رہتے تھے۔ تہذیب الاخلاق نہ صرف ان کی ضروریات کی تکمیل کرتا تھا بلکہ اس نے اُن کے لیے نئی دلچسپیاں اور فکر کے نئے سانچے فراہم کیے تھے۔

بہ حیثیت مجموعی، بقول حالی، تہذیب الاخلاق ہندستان میں ایک نئے اسلام کی سربلندی کے لیے جو برطانوی راج میں پہلے ہی کی طرح اپنی آن بان کے ساتھ پھل پھول سکے، وقف ہوگیا۔[23] انسانی کاوش کے مختلف شعبوں میں یورپ کی شاندار کامیابیوں پر زور دیتے ہوئے اس نے اپنے قارئین سے کہا کہ وہ اُن نئے امکانات کا جایزہ لیں جو ہندستان اور مغرب کے باہمی ربط کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اسلام اُس کی عبادات اور اس کے اداروں کے تعلق سے عقلی رویہ اپنایا جائے۔ لہٰذا اس جریدے نے ہر قسم کی جہالت، تعصب اور توہم کی مذمت کی۔ اگرچہ ابتدا میں اسے قبولیتِ عام حاصل نہیں ہوئی لیکن جلد ہی اسے مسلمانوں میں اصلاح کا نقیب تصور کر لیا گیا اور دہلی اور لکھنؤ کے علمی حلقوں میں بڑے پیمانے پر اسے پڑھا جانے لگا۔

سرسید نے اپنی ایک یادگار تحریر میں بڑے ہی دُکھ کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کس طرح مقبولیت حاصل کرنے سے پہلے اس جریدے کو مختلف دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات انھوں نے تہذیب الاخلاق کے ایک اداریے میں کہی، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، یہ پرچہ ایڈیسن Addison اور اسٹیل Steele کے Spectator اور Tatler کے نمونے پر جاری کیا گیا تھا۔ سرسید لکھتے ہیں:

"اسٹیل اور ایڈیسن اس وجہ سے خوش قسمت تھے کہ اُن کے ہمعصر اُن کی تحریروں کو پڑھ کر ان کی قدردانی کرتے تھے لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری تحریروں کو مذہب کے خلاف سمجھا جا رہا ہے۔ انھیں پڑھنا عذابِ جہنم کو دعوت دینا ہے۔ اسٹیل اور ایڈیسن کی دن بھر کی محنت اور مشقت کا صلہ تو انھیں صدائے تحسین کی صورت میں ان کے اخبار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ہر شمارے کی اشاعت کے ساتھ ہی مل جاتا ہے۔ لیکن ہمارے اخبار کی اشاعت پر ہمیں بجز مذمت اور دشنام طرازیوں کے کسی اور صلے کی توقع نہیں رہتی۔ اسٹیل اور ایڈیسن جن لوگوں کی ہمدردانہ خدمات انجام دیا کرتے تھے اُن سے انھیں ہمدردی کے الفاظ سننے کو ملتے تھے جب کہ ہم جن لوگوں کی ہمدردانہ خدمات انجام دیتے ہیں اُن سے بدلے میں بڑی بے رحمانہ باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ ہزاروں دلوں کو جیتنا اسٹیل اور ایڈیسن کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن ہمارے لیے ایک دل کا جیتنا بھی انتہائی مشکل کام ہے۔ اسٹیل ایڈیسن کو تو صرف رضامند اور صحت مند دلوں کو جیتنا تھا لیکن ہمارا مقدر یہ ہے کہ پہلے تو ہمیں دلوں کو تخلیق کرنی پڑتی ہے پھر اس کے بعد انھیں جیتنے کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔"

"اس کے علاوہ لوگ ہماری باتوں پر پاگل پن اور ہراقیت Hypochondria کا بہتان تراشتے ہیں لیکن ہمارے اس پاگل پن میں بھی ایک سلیقہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اس لیے اس مختصر سی مدت میں ہمیں جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی اُس کی قدر کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے ہم آیندہ اچھے نتائج کی توقع رکھتے ہیں اور یہ کہنے کی جرات کرتے ہیں کہ روشن مستقبل ہمارے سامنے ہے وہ اچھا زمانہ کب آئے گا ہم کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن ہمیں اس بات کا پکا یقین ہے کہ وہ اچھے دن آئیں گے ضرور۔"[24]

تہذیب الاخلاق کی اشاعت کو دو بار بند کرنا پڑا تھا۔ پہلی بار اس لیے کہ سرسید کے پاس اس کام کے لیے وقت ہی باقی نہیں بچا تھا کیونکہ وہ دوسری مصروفیات میں بے حد منہمک تھے بطور خاص قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں۔ اشاعت کے اس طرح رُک جانے کی وجہ سے قارئین کو بڑی مایوسی کا شکار ہونا پڑا اور کئی گوشوں سے اپیل کی جانے لگی کہ اس جریدے کی اشاعت کو دوبارہ شروع کیا جائے۔ بالآخر نذیر احمد، سرسید کو راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے اور جریدے کی اشاعت پھر سے شروع ہو گئی۔ لاہور کے ممتاز علی نے اس کے انتظامات کی ذمہ داری سنبھالی اور محسن الملک، نذیر احمد، حالی، شبلی اور مشتاق احمد جیسے مشہور ادیبوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس جریدے کے لیے مستقلاً لکھتے رہیں گے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرسید کے رفقاء اور پیروؤں نے جریدے کی دوبارہ اشاعت کا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا لیکن لاہور کے مولوی ابوسعید محمد حسین جیسے مذہبی جنون رکھنے والے کئی لوگ اور اٹاوہ کے نجم الاخبار جیسے کئی اخبارات کو یوں لگا" جیسے نفرت کا بازار جو چند دنوں سے سرد پڑ گیا تھا ایک بار پھر گرم کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے"۔ چنانچہ انھوں نے پھر اس جریدے کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کر دیا لیکن ان کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں کیونکہ اب حالات کافی بدل چکے تھے۔ اس طرح سرسید کے مخالفین عوام کو اپنی جانب راغب نہ کر سکے۔

لیکن بعض خیر خواہ اور احباب ایسے بھی تھے جو اس جریدے کے دوبارہ اجراء کی موافقت میں نہیں تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جریدہ اپنی افادیت کی وجوہ سے کچھ زیادہ ہی زندہ رہا۔ اُن کا خیال تھا کہ اب مزید انگریزی تعلیم پر زور دینے کی ضرورت اتنی نہیں رہی کیونکہ مسلمانوں کو اب اس بات کی افادیت کا احساس ہو چکا ہے۔ اسی طرح اُن کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے سماجی اور معاشی اصلاحات کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اُن پرانی باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل جو اچھی طرح ذہن نشین ہو چکی ہیں ؟ اس قسم کے اعتراضات کا محسن الملک نے معقول جواب دیا۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ معترضین جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ درست ہے (حالانکہ خود ہمیں معترضین کے ایک ایک لفظ پر شک تھا) تب بھی کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ باقی بچا تھا۔ "اس جریدے کے مقاصد محدود نہیں ہیں" انھوں نے لکھا" اس کے برخلاف اُن مقاصد میں کافی وسعت اور گیرائی ہے۔ تہذیب الاخلاق انسانی مساعی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرنا چاہتا ہے خواہ وہ نظری ہوں یا عملی، سماجی ہوں یا ثقافتی، مذہبی ہوں یا دنیاوی۔ یہ رسالہ ہر رکاوٹ کو دور کرنے، ہر خامی کو درست کرنے اور ہر ترقی پسند اقدام کی حمایت کرنے کے اصول پر کاربند ہے۔ اور یہ ایسے امور ہیں جن کی ضرورت قوم کو اُس وقت تک لاحق ہوتی رہے گی جب تک کہ یہ زندہ ہے"

تاہم نیا تہذیب الاخلاق پرانے سے کافی مختلف تھا۔ اب اس میں تعلیم اور سماجی اصلاح پر کم ہی مضامین شامل کیے جاتے تھے۔ زیادہ تر مضامین مذہبی مناقشات اور سرسید کے نیچری فلسفے سے متعلق ہوتے تھے کبھی کبھار بعض تخلیقی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مضامین بھی اس میں شایع ہوتے تھے۔ جو بعد ازاں اردو ادب کا کلاسیکی سرمایہ بن گئے۔ اس کے علاوہ حالی کا مشہور مسدس بھی پہلی بار تہذیب الاخلاق کے صفحات پر ہی شایع ہوا۔

اس جریدے کے ادبی کردار کے بارے میں بھی ایک بات کہی جانی چاہیے جسالی کے کہنے کے مطابق اس جریدے نے "ہمارے ادب کے تصور میں انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے"۔ اس کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے ہندستانی مسلمانوں کے ادبی ذوق کی تطہیر کا کام انجام دیا جس پر ایک عرصے سے فارسی زبان کا اثر موجود تھا۔ تہذیب الاخلاق نے بڑی جرأتمندی کے ساتھ قدیم ادب میں جو کچھ مصنوعی اور بناوٹی تھا اس کی جانب اشارہ کیا اور اردو میں ایک سادہ، راست اور فطری اسلوب کی طرح ڈالی۔ یورپ کے بعض ادبی شاہکاروں کا اردو زبان میں ترجمہ کر کے اس رسالے نے اردو زبان کی زبردست خدمت انجام دی[25]۔ پہلی بار اردو کے قارئین کو اس بات کا احساس ہوا کہ یورپ کے مقابلے میں اُن کے ادبی خزانے کس قدر کھوکھلے ہیں۔ اس بات نے اہلِ ادب کو وقت کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ساتھ نئی منزلوں کو اپنانے پر آمادہ کیا۔ بعض اوقات لوگ اس معاملے میں بہت آگے نکل گئے اور اردو تحریریں انگریزی کے مکمل جملوں تک کو شامل کرنے لگے۔ اس قسم کے گنہگاروں میں حالی اور نذیر احمد سرفہرست نظر آتے ہیں لیکن سرسید کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بار تو انھوں نے بڑے پُرجوش طریقے سے اس عادت کا دفاع کیا تھا۔

دوسرا اہم ہفتہ وار تھا البشیر جو الٰہ آباد (صوبجات متحدہ) سے نکلا کرتا تھا۔ اس کی ابتدا 1899ء میں ہوئی اور جلد ہی یہ پورے شمالی ہند میں مقبول ہو گیا۔ اپنے قدیم معاصرین کے مقابلے میں البشیر کی زیادہ کامیابی کے اسباب حسب ذیل تھے۔

(1) پابندی وقت کے ساتھ اشاعت (2) اچھی خبروں کی فراہمی

(3) متنوع اور دلچسپ مضامین۔

اس کی ادارت کے فرائض مولوی بشیرالدین انجام دیتے تھے جو کسی زمانے میں نجم الاخبار کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ اس رسالے کی پالیسی خود اسی کے ایک اداریے کی زبانی جو مسلمانوں سے مخاطب ہو کر تحریر کیا گیا تھا؛ حسب ذیل تھی:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(1) "برطانیہ کے وفادار رہو"

(2) "کانگریس کی باتوں پر کان نہ دھرو"

(3) "اپنی تمام توانائیوں کو انگریزی تعلیم پر مرتکز کردو اور ایم۔ اے۔ او کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس جیسے اداروں کی مدد کرو"

1899-1900 کے ہندی اردو قضیے میں البشیر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے کالموں میں 70 سے زیادہ مضامین شایع کیے جن میں سر انٹونی میکڈونل (Sir Antony Macdonnell) اور ان کی موافق ہندی پالیسی کو ہدفِ ملامت بنایا گیا۔ ویسے تو یہ رسالہ ہندوؤں اور اُن کے مطالبات کے ساتھ کبھی بھی کوئی ہمدردی نہیں رکھتا تھا تاہم اس قضیے کے بعد تو کھلے بندوں یہ ایک ہندو مخالف جریدہ بن گیا۔

مسلمانوں میں تعلیم نسواں کو فروغ دینے کی غرض سے انھی دنوں مولوی ممتاز علی نے بھی اپنی اہلیہ کی زیر ادارت مشہور ہفتہ وار رسالہ تہذیب النسواں جاری کیا تھا۔ اُس وقت نکلنے والے اردو جریدوں کے مقابلے میں اس رسالے کی وضع دلکش اور اسلوب شستہ تھا۔ اس رسالے نے سستے اور جنسی اشتہارات کو اپنے صفحات میں جگہ دینے سے سخت احتراز کیا حالانکہ اُن دنوں "دیسی اخبارات" اور رسایل میں اس قسم کی چیزوں کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ تہذیب النسواں میں قارئین کے لیے ہفتہ بھر کی خبروں اور حالاتِ حاضرہ پر دلچسپ مطبوعہ مضامین کا خلاصہ شایع کیا جاتا تھا۔ رسالے میں ایک حصہ بچوں کے لیے بھی مختص کیا جاتا تھا۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے اس رسالے کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور جلد ہی یہ ادارہ اردو صحافت میں ایک طاقت کی حیثیت اختیار کر گیا۔

دیگر اہم مسلم ہفتہ وار رسالوں میں دہلی کے بشیر الاخبار، بجنور کے اخبار مہر نیمروز لاہور کے امپیریل پیپر، بمبئی کے کشف الاخبار اور میرٹھ کے اخبارِ عالم کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ بمبئی کے انقلابِ عظیم کا تذکرہ بھی ضروری ہے جسے منشی غلام رسول نے 1904ء میں جاری کیا تھا۔ اگرچہ اس میں اچھے سیاسی مضامین بھی شایع ہوتے تھے لیکن اس کا بنیادی مقصد اردو رسم الخط کی اصلاح کرنا تھا جو بقول اس کے نہ صرف بھونڈا اور بے ڈول تھا بلکہ سیکھنے میں انتہائی مشکل بھی تھا۔ اس نے تجویز کیا تھا کہ اردو والے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتابت کروا کر پتھو کے ذریعے طباعت کروانے کی بجائے "ٹائپ" کے ذریعے طباعت کے ذریعے طباعت کے طریقے کو اپنائیں۔

ان چند رسالوں کو چھوڑ کر ہفتہ وار صحافت یا یومیہ صحافت کا مسلمان عوام پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ پہلے تو یہ کہ اخبارات کی اپنی کوئی پالیسی ہی نہیں تھی، دوم یہ کہ اُن کی بقاء کا دارومدار کسی رئیس یا شہزادے یا کسی بزرگ کا مرہون منت تھا، سوم یہ کہ مدیر حضرات دنیوی امور سے اُتنے ہی غافل تھے جتنے کہ قارئین۔ بعض صورتوں میں بڑھ کر۔ اور آخری وجہ یہ کہ دس میں سے نو جریدے محض اسی وجہ سے چل رہے تھے کہ ان میں سستے قسم کے جنسی اشتہارات کی بھرمار ہوتی تھی جو اُنھیں نیم حکیموں اور ادھورے طبیبوں کی جانب سے موصول ہوا کرتے تھے جن سے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ کیوں کہ اس اشتہار بازی کی وجہ سے اُن نیم حکیموں کا کاروبار بھی زوروں پر چلتا تھا۔

صحیح معنوں میں مسلمانوں کے فکر و عمل پر اثر انداز ہونے والے رسالے وہ ماہنامے تھے جو اُن انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں نے نکالے تھے جو ابھی ابھی جامعات سے فارغ ہو کر نکلے تھے۔ غالباً ان ماہناموں میں سے سے زیادہ غیر معمولی رسالہ شیخ عبدالقادرؒ کا مخزن تھا جسے وہ لاہور سے نکالتے تھے۔ اس رسالے میں کئی باصلاحیت نوجوانوں کی تخلیقات شایع ہوتی تھیں جن میں سے ایک مشہور و معروف سر شیخ محمد اقبال بھی تھے جو اُس وقت اسلامیہ کالج میں انگریزی کے ایک نوجوان پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اقبال کی کئی مشہور نظمیں سب سے پہلے مخزن ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں مثلاً "تمنائے ہندی" "ہندیہ" "جگنو اور صبح کا ستارہ" "چاند" "ایک پرندہ اور جگنو" اور "رخصت اے بزم جہاں" یہ بات اُنھی دنوں تسلیم کی جا چکی تھی کہ ان تخلیقات کا مسلمانوں کے ذہن پر زبردست اثر پڑا۔ علمی و ادبی دنیا اقبال کی ذہانت سے اسی رسالے کے صفحات کی توسط سے پہلے پہل متعارف ہوئی۔ دیگر مشہور اہل قلم میں شبلی جیسے مصنف، محمد اسماعیل جیسے نغمہ گو، محمد نور الٰہی جیسے تمثیل نگار، اکبر الہ آبادی جیسے ظریف، ظفر علی خاں جیسے سیاس، شاد عظیم آبادی اور آغا شاعر قزلباش جیسے شعراء اور اسلم جیراج پوری جیسے مورخ شامل تھے۔

ان منفرد قلمی معاونین کے علاوہ مخزن کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ اس نے نئے خیالات کو پیش کرنے کے معاملے میں تخصص حاصل کر لیا تھا۔ اگرچہ اُس نے اردو میں انگریزی الفاظ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استعمال کی مذمت کی، جو اُس زمانے میں ایک فیشن سا بن گیا تھا، تاہم اس رسالے نے اپنے قارئین کو انگریزی فکر کے خزانے سے روشناس کرانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انھی نئے خیالات کے ذریعے وہ مسلمان دانشوروں میں نئے رجحانات کو پروان چڑھانا چاہتا تھا۔

سیاسی طور پر مخزن علی گڈھ تحریک کا زبردست حامی تھا اور کانگریس کا ناقد۔ اُس نے ہمیشہ مسلمانوں کے وفادارانہ کردار پر زور دیا تاہم ادبی نقطۂ نظر سے اُس نے علی گڈھ اسکول کے رہنماؤں جیسے حالی، شبلی اور نذیر احمد کے نظریات سے اختلاف کیا۔ ان کے برخلاف مخزن اسلوب کی پاکیزگی، خیال کی صفائی اور طرزِ ادا کی سادگی پر زور دیتا تھا۔

اس کے علاوہ علی گڈھ منتھلی Aligarh Monthly نامی رسالہ بھی تھا جو اس نام سے جنوری 1903ء میں جاری ہوا۔ لیکن یہ وہی ایم۔ اے۔ او۔ کالج میگزین تھا جو نئے لباس میں پیش کیا گیا تھا۔ اپنے پیش رو کی طرح علی گڈھ منتھلی کے بھی دو حصے اردو اور انگریزی کے لیے وقف تھے لیکن اس کے برخلاف موجودہ رسالے کا میدانِ عمل کافی وسیع تھا اور جلد ہی یہ رسالہ ہمہ اقسام کی عقلی بحث کا وسیلہ بن گیا جس میں خاص طور پر علی گڈھ کے گریجویٹ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ تاہم اس کی پالیسی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یہ سرسید کے خیالات کی حمایت کرتا رہا۔ اس نے مسلم علاحدگی پسندی Exclusiveness پر زور دیا۔ یہ کانگریسی سیاست کا غیر مصالحت پسند ناقد تھا۔[29]

اردو معلیٰ ایک اور مشہور رسالہ تھا جسے ممتاز شاعر و سیاستداں حسرت موہانی دہلی سے نکالا کرتے تھے۔ اُس وقت حسرت موہانی کی شہرت کا آغاز ہی ہوا تھا۔ اس رسالے نے اُبھرتے ہوئے اردو ادب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ رسالہ اردو شاعری کی قدیم ہئیت کا حامی تھا اور جلد بازی میں اختیار کی جانے والی اختراعات اور جدّتوں کا مخالف تھا نقطۂ نظر کے اعتبار سے یہ رسالہ کسی قدر رجعت پسند تھا۔ اس میں سماجی اور سیاسی مسایل کے علاوہ حالاتِ حاضرہ پر متعدد سنجیدہ مضامین شایع ہوتے تھے لیکن اس کا لب و لہجہ دیگر معاصرین کے برخلاف بہت کم برطانیہ کے موافق تھا۔

مشہور رسالہ معارف بھی، جس نے اردو ادب کی ترقی میں اس قدر اہم کردار انجام دیا، اسی دور میں شایع ہونا شروع ہوا۔ اُس وقت یہ رسالہ مولوی وحیدالدین سلیم کی ادارت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں نکلتا تھا جس میں جدید مکتب فکر کے کئی ممتاز علما کی تخلیقات شایع ہوتی تھیں۔ ان میں سرفہرست مولانا شبلی کا نام آتا ہے۔ معارف کا اجرا ندوۃ العلماء کے ترجمان کے طور پر کیا گیا تھا۔ لیکن اس میں کئی غیر مذہبی مضامین بھی شایع ہوتے تھے۔ بدقسمتی سے بعض مالی اور دیگر دشواریوں کی وجہ سے اس کی اشاعت چند برسوں کے لیے روک دینی پڑی تھی۔

دیگر مذہبی رسالوں میں قابلِ ذکر پرچے پٹنہ کا الاصلاح جو اثنا عشریہ کا ترجمان تھا اور ثنائے ھند Sanai Hind جو اہلِ حدیث کا ترجمان تھا۔ دونوں ہی پرچے اپنے اپنے فرقے کی دوسرے فرقوں پر فوقیت کے قایل تھے اور دیگر فرقوں کی سرگرمیوں کی مذمت کرتے تھے۔ مذہبی جریدوں میں غالباً سب سے کشادہ ذہن اور وسیع القلب جریدہ الندوہ تھا جس کی شبلی اور حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مشترکہ طور پر ادارت کیا کرتے تھے۔ یہ پرچہ غیر ضروری فرقہ وارانہ قضیات میں الجھنے سے پرہیز کرتا تھا اور اسلام کے ترقی پسندانہ کردار پر زور دیتا تھا۔[30]

1903ء میں عصرِ جدید کی اشاعت شروع ہوئی جس کی ادارت کے فرایض مشہور سماجی مصلح، غلام الثقلین کو تفویض تھے۔ اس پرچے کو جلد ہی اردو صحافت میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوگیا۔ اگرچہ یہ رسالہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے وقف تھا لیکن اس میں بیشتر دلچسپ سیاسی مضامین بھی شایع ہوتے تھے۔ اگرچہ یہ پرچہ سرسید کا مداح تھا لیکن علی گڈھ تحریک کے رہنماؤں کی اندھی تقلید کا قایل نہ تھا اور اکثر ان کی سرگرمیوں پر حرف گیری سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ اگرچہ عصرِ جدید نظریاتی اعتبار سے ایک اسلامی پرچہ تھا لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین بہتر مفاہمت کا قایل بھی تھا۔ یہ ان گنے چنے مسلم رسالوں اور اخباروں میں سے ایک تھا جو فرقہ وارانہ اتحاد پر زور دیتے تھے۔ معیار کے اعتبار سے اس کے مضامین مخزن کی طرح بلند پایہ نہیں ہوتے تھے تاہم سماجی اور سیاسی مسایل میں یہ رسالہ یقیناً کہیں زیادہ کشادہ دل اور غیر فرقہ وارانہ نوعیت کے حامل تھے۔ اس کے علاوہ یہ ملک میں ترویج پانے والے ترقی پسندانہ رجحانات کا ہمیشہ خیر مقدم کرتا تھا اور خبروں کی ماہانہ تلخیص میں ملک میں وقوع پذیر ہونے والے جدید واقعات کی اہمیت پر زور دیتا تھا۔[31]

بہ حیثیت مجموعی اپنے نقطۂ نظر میں مسلم اخبارات زیادہ فرقہ واریت کے شکار تھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اپنی قوم کے لیے خصوصی تحفظات اور مراعات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ سیاسی طور پر وہ علی گڑھ کی قیادت کو قبول کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا لانے میں انھیں بہت ہی کم دلچسپی تھی۔ اگرچہ اس میدان میں عصر جدید نے کچھ کوشش ضرور کی لیکن وہ بھی نیم دلی کے ساتھ۔ غالباً مشہور ناول نگار عبدالحلیم شرر کی زیر ادارت شایع ہونے والا پندرہ روزہ رسالہ اتحاد ہی اس کلیے کا واحد استثنیٰ تھا۔ اس کی اجرائی کا مقصد ہی یہ تھا کہ دونوں قوموں میں بہتر تعلقات استوار کیے جائیں اسی وجہ سے اس کا نام اتحاد رکھا گیا تھا[32] لیکن شرر کے چٹ پٹے اسلوب اور دل کو لبھانے والے اندازِ تحریر کے باوجود اس رسالے کو نہ تو ہندوؤں اور نہ مسلمانوں میں مقبولیت حاصل ہوسکی۔ اس لیے جلد ہی اس کی اشاعت رُک گئی۔

مسلم پریس کے اس مختصر سے جایزے میں ہم نے کم و بیش اُن سبھی اہم مسلم اخباروں اور رسالوں کی سرگرمیوں کا جایزہ لینے کی کوشش کی ہے جو ہماری تحقیق کی مجوزہ مدت کے دوران شایع ہوتے تھے[33] لیکن جوں جوں ہم اس مدت کے آخری برسوں کی جانب بڑھتے ہیں توں توں یہ نظر آتا ہے کہ اُن میں سے بیشتر غائب ہوگئے اور ان کی جگہ نئے نئے اخبارات اور رسائل نے لے لی۔ یہ صرف اردو صحافت ہی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ دیسی پرچوں کی اکثریت بہت کم مدت تک زندہ رہی۔ یہ پرچے جن غیر یقینی حالات کے ساتھ عالمِ وجود میں آتے تھے اُنھی میں دفعتاً غائب بھی ہوجاتے تھے۔ دیسی" پریس کے رپورٹر" کے مطابق ہر سال دس یا بعض اوقات بیس پرچے بند ہوجایا کرتے تھے جس کا نہ کسی کو رنج ہوتا اور نہ ملال۔ مثال کے طور پر ۱۸۹۰ء میں تنہا بمبئی پریسیڈنسی میں چوبیس اخبارات بند ہوگئے جبکہ اتنے ہی نئے پرچے اُس سال جاری بھی ہوئے[34]

لیکن بیشتر اہم مسلم جریدے جن کا ذکر ہم اوپر کرچکے ہیں مذکورہ بالا مدت تک اور اس کے بعد بھی جاری رہے۔ اس کے علاوہ چند نئے پرچے بھی جاری ہوئے جیسے کہ بمبئی سے شایع ہونے والا گجراتی روزنامہ اخبار اسلام اور لاہور کا مشہور ہفتہ وار زمیندار[35] لیکن چونکہ یہ سبھی پرچے دیسی زبانوں میں شایع ہوتے تھے اس لیے ان کا کوئی خاص سیاسی اثر مرتب نہیں ہوتا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں کا تعلق اُن تعلیم یافتہ ہندستانیوں سے تھا جو صرف انگریزی اخبارات کے مطالعے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زبانوں کے پریس کے پاس قاری کو دینے کے لیے بجز بے جان، غیر دلچسپ اور عدم واقفیت پر مبنی مواد کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس ہندستانی پریس میں بھی اردو اخبارات کا معاملہ تو اور بھی دگرگوں ہوا کرتا تھا۔ انھیں ہمیشہ بند ہونے کا خطرہ لاحق رہتا تھا اور ان کے قارئین کی بڑی تعداد مسلم سماج کے جاہل اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے اُن اخبارات کا دانشوروں پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ویسے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ، تہذیب الاخلاق، البشیر، وکیل، معارف مخزن اور عصرِ جدید جیسے اخبارات اور رسائل نے مسلمانوں کے معاملات میں کافی اہم کردار انجام دیا ہے تاہم یہ سب اس وجہ سے ہو پایا کہ ان اخباروں اور جریدوں کے ساتھ قوم کے ممتاز افراد کے نام جُڑے ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف تعداد کے اعتبار سے بہت کم ہونے کے باوجود انگریزی اخبارات کافی با اثر تھے اور بعض اوقات تو ان کا یہ اثر فیصلہ کن حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔[30]

اردو پریس کی اس زبوں حالی کی وجہ سے کئی سربرآوردہ مسلمان متفکر تھے سرسید کے ایک قریبی رفیق حاجی محمد اسماعیل نے تو اردو اخبارات کے بارے میں ایک چھوٹی سی کتاب ہی شایع کر دی جس میں انھوں نے اخبارات کی اصلاح کے لیے کئی انمول مشورے دیئے۔ انھوں نے لکھا: "اردو اخبارات بلیک بیری Blackberry کی طرح تعداد میں تو بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی کوئی مضبوط معاشی اساس نہیں ہے اور چونکہ ان کی کوئی معینہ پالیسی نہیں ہے اس لیے وہ اپنے پڑھنے والوں کے اذہان پر تندرست اور صحت بخش اثر نہیں ڈال سکتے۔" اس لیے وہ اس بات کے مخالف تھے کہ "بلا کسی مقصد کے ایسے اخبارات نکالے جائیں" جو رائے عامہ کی تربیت کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ انھیں اس بات کا گہرا دُکھ تھا کہ اردو اخبارات کی ایک بڑی اکثریت اپنی بقا کے لیے یا تو اپنے سرپرستوں کی جھوٹی سچی مدح سرائی کرتی رہتی ہے یا ان لوگوں کے خلاف دشنام طرازی میں مشغول رہتی ہے جنھیں ان کے مُربّی اور سرپرست پسند نہیں کرتے۔ انھیں اس بات کا علم تھا کہ اردو مدیران کو یہ سب کچھ دوسروں پر معاشی انحصار کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے لیکن ان کے نزدیک محض اس بنا پر انحطاط اور اخلاقی خرابی کو روکنے کی کوشش نہ کرنا غلط تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اگر انھوں نے حالات کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنجیدگی سے جایزہ نہیں لیا تو ان کی رسائی خبروں اور معلومات کے اُن سوتوں تک نہیں ہو پائے گی جن تک پہنچنا آج کل اخبار کو مفید اور کامیاب طریقے سے چلانے کے لیے ضروری ہے۔ معاشی الجھنوں سے چھٹکارا پانے کی ترکیب ان کے نزدیک یہ تھی کہ مختلف اخبارات کو یکجا کر کے متعدد جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کی شکل دے دی جائے" انھوں نے اخبارات کی ظاہری وضع قطع سنوارنے اور ادبی معیار کو بلند کرنے کے تعلق سے بھی کئی مفید مشورے دیئے[37]

حاجی محمد اسماعیل کی اس تنقید سے زیادہ کڑی تنقید مولوی عزیز مرزا نے کی جو حیدرآباد کے نظام سرکار کی حکومت میں ایک اہم عہدے پر فایز تھے۔ انھوں نے لکھا تھا" ہمارے عمدہ ترین اخبارات کا مقابلہ دوسروں کے خراب ترین اخبارات سے بھی نہیں کیا جا سکتا" انھوں نے دریافت کیا کہ آیا کسی اردو اخبار نے کبھی عوامی خدمت کا کوئی فریضہ بھی انجام دیا ہے؟ مثلاً کسی خراب قانون کو بدلوانے یا اچھے قانون کو منظور کروانے کے لیے کوئی مہم چلائی ہو؟ یا کسی سازش یا جرم کا پردہ فاش کیا ہو یا کسی گمنامی میں رہنے والے مستحق شخص کو منظرِ عام پر لاکر اس کی عزت افزائی کی ہو، اپنے نمایندے باہر متعین کیے ہوں؟ یا کسی خطرناک صورتحال کا جایزہ لینے کے لیے اپنے خصوصی نمایندوں کو موقع واردات پر بھیجا ہو یا کسی اچھے کام کی حمایت کی ہو۔ انھیں اس بات کا گہرا دکھ تھا کہ کس طرح یہ اخبارات قوم کے لیے بے مصرف ہیں۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ" جیسے قاری ویسے اخبار" انھوں نے اپنی قوم کو متنبہ کیا کہ جب تک ان کے پاس ایک اچھا پریس نہیں ہوگا اُس وقت تک وہ اس نئے زمانے میں ترقی نہیں کر سکتے[38]

لیکن ان خیالات کو من وعن قبول کر لینا بڑی غلطی ہوگی۔ مغربی معیار پر پرکھنے کے بعد ہو سکتا ہے کہ ہمیں اردو اخبارات ہیچ اور غیر دلچسپ نظر آئیں لیکن جب آپ کا تقابل دیگر ہندستانی زبانوں کے اخبارات سے کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ اخبارات اتنے بُرے نہیں تھے۔ اگرچہ تعلیم یافتہ طبقے پر ان اخبارات کا کوئی زیادہ اثر نہیں تھا تاہم نیم تعلیم یافتہ مسلم عوام پر اُن کا زبردست اثر تھا۔ مانا کہ اخبارات معیار کے اعتبار سے اس قدر کم تر ہوا کرتے تھے کہ کسی معاملے میں قوم کی رہنمائی کرنے کے موقف میں نہیں تھے، تاہم اُن میں کسی چیز کا پروپیگنڈہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ حالانکہ علماء کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر جب ان اخبارات نے سرسید کی مخالفت شروع کی تو ان کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا لیکن جب سرسید کا ستارۂ اقبال بام عروج پر پہنچا اور ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تو یہی اخبارات اُن کے لیے بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد بھی یہ اخبارات بڑی دیانت داری سے اُنھی باتوں پر عمل پیرا رہے جن کی تلقین سرسید کے رفقا کرتے رہتے تھے

لہٰذا ان تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اُن کا کردار ایک لحاظ سے غیر معمولی رہا[99] اسی لیے 1903ء میں جب بمبئی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد کیا گیا تو ایک مسلم پریس کانفرنس کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان بھر کے تمام مسلم مدیروں کی ایک مرکزی تنظیم قایم کی جائے جو علی گڈھ تحریک کے قائدین کے ساتھ اشتراک عمل کرے۔ ایک درجن سے زیادہ مدیروں نے اس پریس کانفرنس میں شرکت کی جو مندوبین کی حیثیت سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ سبھی نے اس امر پر اتفاق کیا کہ مسلم پریس کے مسائل سے نپٹنے کے لیے ایک مرکزی تنظیم قایم کی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے دو یا تین قرار دادیں بھی منظور کیں اور ابتدائی کام کا جایزہ لینے کے لیے ایک سکریٹری کا انتخاب کر کے منتشر ہو گئے۔[100]

اگلے دس ماہ تک اس تنظیم کے بارے میں کچھ بھی نہیں سُنا گیا۔ تب عصرِ جدید نے احتجاج کرتے ہوئے دریافت کیا کہ اس کے منتخب سکریٹری کیا کر رہے ہیں۔ عملاً انھوں نے اس دوران کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس لیے اُن کی بجائے ہمدرد کے مدیر شیخ جمال احمد کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ ایک جوشیلے نوجوان تھے جنھیں عوامی خدمت کا شوق تھا۔ انھوں نے مختلف مدیروں سے ربط قایم کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ صرف چند نے اُن کی مراسلت کا جواب دینے کی زحمت گوارا کی۔ چند دنوں تک انھوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور بالآخر مایوس ہو کر اس کام سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی نام نہاد پریس کانفرنس کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا اور نہ پھر سے مسلم مدیروں کو یکجا کرنے کی کوئی کوشش ہی کی گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

چھٹا باب (پریس کا کردار)

1818ء سے لیکر 1851ء کی مدت The Friend of India, Feb. 26, 1851.
کے دوران بنگال سے نکلنے والے ایک سو "دیسی" اخبارات ورسایل میں سے ایک بھی
مسلم اخبار یا رسالہ نہیں تھا۔ ملاحظہ ہو رپورٹ جسے۔ لانگ کا مرتب کردہ
Selections from the Records of the Bengal Government relating to the
Native Printing Presses and Publications, No: XXII, 145-48

2۔ ملاحظہ ہو سکسینہ کی A History of Urdu literature pp. 21-22 and 265-66

3۔ ملاحظہ ہو جی۔ پی۔ پلائی کا مضمون بعنوان The Press in India, It's origin and growth
مطبوعہ Asiatic Quarterly Review
January - April, 1899, p.p. 16 — 38.

4۔ سکسینہ کے کہنے کے مطابق مولوی محمد باقر "شمالی ہندستان میں صحافت کے پہلے بانی تھے"
ملاحظہ ہو سکسینہ کی A History of Urdu Literature, p. 274.

5۔ ملاحظہ ہو حالی کی حیاتِ جاوید (اردو متن)، حصہ اوّل صفحہ 105

6 The Aligarh Institute Gazette, May 12, 1876.

7۔ جیسا کہ ایک مشہور برطانوی ادیب نے واضح کیا: "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے
گذشتہ دو برسوں کے مضامین کے انتخاب سے روس۔ ترکی، روس۔ افغانی اور ہندو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افغانی سیاست کے بارے میں ہندستانی مسلمانوں کے مستعد اور با اثر طبقے کے انوکھے نظریات کے بارے میں ایک سبق آموز مواد تیار ہو جاتا ہے اگرچہ یہ طبقہ تعداد کے اعتبار سے بہت چھوٹا ہے۔ یہ بالائی ہندستان سے شایع ہونے والے جراید میں ایک بہترین جریدہ ہے لیکن انگریز قاری کو ایک دیسی ہندستانی اخبار کی اثر پذیری کے بارے میں انگریزی مماثلت کے باعث کسی قسم کی غلط رائے قایم نہیں کر لینی چاہیے۔ گزٹ اس امر پر فخر کا اظہار کرتا ہے کہ وہ ہر پندرہ روز میں تین یا ساڑھے تین سو نسخے شایع کرتا ہے۔ لیکن میں شایع ہونے والے ایک حالیہ مضمون کے مطابق New Quarterly Magazine کسی اخبار یا رسالے کو پڑھنے والے یا اُس سے متاثر ہونے والے قارئین کی حقیقی تعداد کا اندازہ کرنے کے لیے اس کی تعداد اشاعت یا خریداروں کی فہرست صحیح نمائندگی نہیں کرتی۔ اکثر لوگ اخبار خریدے یا پڑھے بغیر بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے جراید اُن طبقات کے حالات کی ترجمانی کرتے ہیں جو عامۃ الناس کو متاثر کرتے ہیں Pillars of Empire by T.H.S. Escall, pp. 160 - 69.

8۔ حالی: حیات جاوید (اردو متن) صفحہ 105 (حصہ اوّل)

9۔ 1903ء کے آخری نصف حصے میں گزٹ دو لسانی اخبار نہیں رہا۔ اس کا انگریزی حصہ ختم کر دیا گیا۔ اس تبدیلی پر ملاحظہ ہو مسلم کرانیکل کا تذکرہ مورخہ 7 نومبر 1903ء۔

10۔ ملاحظہ ہو Indian Press guide.

11۔ اس بارے میں پبلک سروس کمیشن کے روبرو دیا گیا خان بہادر کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔ Proceedings of the Public Service Commission relating to Madras Presidency including Coorg) V 112

12۔ ملاحظہ ہو اس موضوع پر 13 فروری 1895ء کے مسلم کرانیکل کا اداریہ۔ ہماری مجوزہ مدتِ تحقیق کے آخری ایام میں محمڈن نے کانگریس کے خلاف اپنی جارحیت میں بڑی حد تک کمی کر دی تھی۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو اس کا مشہور اداریہ جس کا موضوع یہ تھا کہ ہندستانی مسلمان پہلے ہندستانی اور بعد میں مسلمان ہیں یا صورتِ حال اس کے برعکس ہے" اسے 19 دسمبر 1906ء کے بنگالی نے نقل کیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

13 - ملاحظہ ہو مضامین بعنوان The Muslim unrest اور The Indian Mohammedan مطبوعہ علی الترتیب The Times مورخہ 4 جون 1895ء اور 30 اگست 1897ء۔

14. The Moslem Chronicle Jan, 10, 1895

15 - یہ بات انھوں نے 1896ء میں میرٹھ کے مقام پر منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں اپنی تقریر کے دوران کہی تھی۔ ملاحظہ ہو سرسید کے لکچروں کا مجموعہ (اردو متن)

16 - علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابتہ 12 مئی 1876ء تا 14 جولائی 1877ء

17 - ملاحظہ ہو Pioneer کے بارے میں ایک مضمون جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے 19 جون 1877ء کے شمارے میں شایع ہوا۔ مزید ملاحظہ ہو مضمون بعنوان Why the Native press should be Licensed جو جنوری 1900ء کے Calcutta Review میں شایع ہوا۔ صفحات 130 — 50

18 - اُس وقت وکٹوریہ پیپر کے حقوقِ ملکیت امرتسر کے راو بہادر دیوان گیان چند کے پاس تھے۔ ویسے اس اخبار کو ابتداً رائے دیوان چند نے 1853ء میں لاہور سے جاری کیا تھا۔ کوہ نور کے مالک و مدیر دہلی کے ہرسکھ رائے تھے۔ اخبار عالم کو کشمیر کے ایک برہمن پنڈت مکند لال نے جاری کیا تھا۔

19 - ان میں سب سے مقبول ترین اخبار رفیق ہند تھا جس کی تعدادِ اشاعت 700 تھی۔ ملاحظہ ہو اس اخبار کے مدیر منشی محرم علی چشتی کی وہ شہادت جو انھوں نے پبلک سروس کمیشن کے روبرو دی تھی۔

Proceedings of the Public Service Commission (Relating to the N.W.P and Oudh), 203

20. ملاحظہ ہو ڈاکٹر بول چند کا مقالہ بہ عنوان 'Urdu Journalism in Punjab' مطبوعہ Journal of Punjab University Historical Society April 1933 PP. 29-42

21 .. Ibid

22 - ایسے جریدوں میں جو تہذیب الاخلاق کے توڑ پر جاری کیے گئے تھے، حالی نے حسب ذیل کا تذکرہ کیا ہے، لوح محفوظ (مرادآباد)، تزوین سعدی آگرہ اور شمال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغربی صوبہ کے دیگر مقامات سے نکلنے والے امدادالآفاق، شہاب ثاقب اور تائیدالاسلام (ملاحظہ ہو حالی کی حیاتِ جاوید حصہ اوّل صفحہ 227)

23. Ibid. صفحہ 135، (حصہ اوّل)۔ مزید ملاحظہ ہو سید غلام حیدر کا مضمون بعنوان "تہذیب الاخلاق کے حقیقی مقاصد کیا ہیں؟" (تہذیب الاخلاق۔ یکم ذی الحجہ 1289ء ہجری جلد سوم شمارہ نمبر 20)

24. انگریزی ترجمہ از ڈاکٹر سید عبداللطیف۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب Influence of English Literature on Urdu Literature, p. 117.

مزید تہذیب الاخلاق کی پالیسی پر Tatler اور Spectator کس حد تک اثر انداز ہوئے یہ جاننے کے لیے تہذیب الاخلاق کے یکم محرم 1289ء ہجری جلد سوم شمارہ میں سرسید کا مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

25. ماخوذ از تہذیب الاخلاق بابتہ یکم شوال 1311ء ہجری جلد 1 شمارہ (جدید سلسلہ) تہذیب الاخلاق دوبارہ کیوں شایع کیا گیا؟ اس بارے میں ممتاز علی کا مضمون تہذیب الاخلاق کی سالانہ جلد برائے 1296 ہجری کے ضمیمے میں ملاحظہ فرمائیے۔

26. تہذیب الاخلاق، یکم ذی القعدہ 1311 ہجری جلد 1 شمارہ 2 (جدید سلسلہ)

27. کایستھ سماچار نے اپنی مئی 1901ء کی اشاعت میں مخزن کے اجراء کو "اردو صحافت میں ایک صحت مند روایت کی ترویج کا قابلِ قدر کارنامہ" قرار دیا ہے۔ (صفحات 371-73) مخزن کی پالیسی سے متعلق بیان کے لیے ملاحظہ ہو اپریل 1901ء کا شمارہ۔ اُسی اداریے میں حسب ذیل چار اخبارات کو اہم جرائد کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے (1) دلگداز (2) معارف (3) افسر اور (4) اودھ ریویو۔

28. اردو میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کا رجحان اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ ایک ضلع جسٹریٹ کو جو اردو سے اچھی طرح واقف تھا انجمن ترقی اردو کو یہ مشورہ دینا پڑا کہ وہ فوری طور پر "زبان کی پاکیزگی اور صفائی" کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرلے۔ اس نے کہا کہ تقریباً ہر اردو جریدے میں انگریزی الفاظ کی بھرمار دیکھ کر وہ ششدر رہ جاتا ہے ملاحظہ ہو اس کا مضمون بعنوان "اردو زبان" مشمولہ مخزن بابتہ فروری 1905ء۔ اُسی طرح اردو رسالے تالیف و اشاعت کے 15 جنوری اور یکم فروری 1903ء کے شمارہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ایک اور مضمون بعنوان "ہماری مادری زبان" ملاحظہ فرمائیے۔

29 - اس کی پالیسی سے متعلق تفصیلی بیان کے لیے ملاحظہ ہو مضمون بعنوان "ہم" یا Ourselves مشمولہ Aligarh Hastily بابتہ جنوری 1903ء جس میں اس امید کا اظہار کیا گیا ہے کہ "رفتہ رفتہ علی گڈھ منتھلی ایک ایسا ترجمان بن جائے گا جس کی جانب مسلمان عوامی اور قومی دلچسپی کے معاملات کے بارے میں ملت کا ردِ عمل جاننے کے لیے رجوع ہونا سیکھ لیں گے۔"

علی گڈھ منتھلی کے ممتاز قلمکاروں میں مولوی محمد ذکاء اللہ، میر ولایت حسین، اسلم جیراجپوری، ابوالکلام آزاد، سید نواب علی اور سید سجاد حیدر یلدرم جیسے نام شامل تھے۔

30 - الندوہ کی کارگزاریوں پر علی گڈھ منتھلی کے اردو حصے میں ایک مضمون ملاحظہ فرمائیے۔ (علی گڈھ منتھلی بابتہ جنوری 1905ء)

31 - پالیسی سے متعلق اس کے تفصیلی بیان کے لیے ملاحظہ ہو عصر جدید، جنوری 1903ء

32 - ملاحظہ ہو میر ولایت حسین کا دلچسپ مضمون بعنوان "رسالۂ اتحاد اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین باہمی مفاہمت" جو علی گڈھ منتھلی کے اردو کے حصے میں اگست 1904ء میں شایع ہوا۔

33 - لارڈ کرزن نے جن 34 دیسی اخبارات کو 1903ء کے دربار میں اپنے نمائندے بھیجنے کے لیے مدعو کیا تھا اُن میں صرف چھے مسلمان تھے:

1 - مدراس کا محمڈن
2 - سکھر (سندھ) کا الحق
3 - بمبئی کا مسلم ہیرالڈ
4 - کلکتہ کا مسلم کرانیکل
5 - لاہور کا آبزرور
6 - آگرے گا آگرہ اخبار

الحق کی اشاعت 1902ء میں سکھر کے مقام پر ایک ہفتہ وار کی صورت میں کی گئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن بعد ازاں اسے حیدر آباد (سندھ) منتقل کر دیا گیا۔ یہ بیک وقت سندھی اور انگریزی زبانوں میں شایع ہوتا تھا۔ انگریزی حصّے کی ادارت ابتدًا ایک ہندو مدیر کو سونپی گئی تھی لیکن بعد ازاں اس ذمہ داری کو علی گڈھ کے ایک مسلم گریجویٹ سید محمد نے سنبھال لیا تھا۔

34۔ ملاحظہ ہو آر۔ پی۔ کرکریا R.P. Karkaria کا مضمون بعنوان The Oldest paper in India: The Bombay Samachar, مطبوعہ Calcutta Review بابتہ اپریل 1898ء صفحات 218-36

35۔ جون 1904ء میں زمیندار کا اجرا ایک ہفتہ وار کی شکل میں عمل میں آیا جس کا مقصد پنجاب کے زمینداروں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ بعد ازاں مولانا ظفر علی خاں کی ادارت میں یہ ایک روزنامے میں تبدیل ہو گیا اور مسلم سیاست میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

36۔ ایسے نئے انگریزی اخبارات میں جن کے مالک مسلمان تھے خاص طور پر مدراس کا اخبار Muslim Patriot قابلِ ذکر ہے جو اپنے لب و لہجے کے معاملے میں جارح قسم کا فرقہ پرست اخبار تھا جو نہ صرف ہندوؤں پر بلکہ انگریزوں بھی کڑی تنقیدیں کیا کرتا تھا۔

37۔ مزید ملاحظہ ہو سید ابو محمد کا مضمون بعنوان The Moslem Chronicle, Nov 6, 1907 "ہمارے اردو اخبارات" مشمولہ علی گڈھ منتھلی (حصّہ اردو) جنوری 1904ء۔

38۔ عصرِ جدید، بابتہ ستمبر 1903ء صفحات 330-37 "دیسی صحافت" اور اس کی خصوصیات سے متعلق ایک دلچسپ مضمون ٹی۔ کے۔ گوپال پانی کر نے کلکتہ ریویو کے اکتوبر 1902ء کے شمارے میں سپردِ قلم کیا ہے pp. 287-91

39۔ ایک برطانوی ادیب کے حسب ذیل الفاظ سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے:

> دیسی اخبارات احمق ہوں یا عقل مند، وفادار ہوں یا غدار، وہ خواہ جیسے بھی ہوں لیکن وہی تو ہیں جو حقیقی ہندستانی پریس کی تشکیل کرتے ہیں۔ پریس کا قانون Press Law بھی اسی حقیقت کا اعتراف ہے۔ یوروپی پیمانوں سے جانچا جائے تو یوں لگے گا گویا کہ اس پریس کا دایرہ اشاعت بہت محدود ہے یا اسے زیادہ مناسب طریقے سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کے چندہ دہندگان کی فہرست مضحکہ خیز حد تک مختصر ہے۔ لیکن فہرست کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس اختصار کے ساتھ پریس کے اثر کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

T. H. S. Escott: Pillars of the Empire, 139

40۔ مسلم پریس کے بارے میں قاضی کبیر الدین کا مضمون، جو بمبئی میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے معتمد تھے، ملاحظہ ہو 17 اکتوبر 1903ء کے مسلم کرانیکل میں۔ مزید ملاحظہ ہو مسلم کرانیکل کا اداریہ بعنوان The Proposed Press Association بتاریخ 16 جنوری 1905ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتواں باب

مذہبی اور سماجی اصلاحات

راسخ العقیدگی کے ماحول میں پرورش پانے کے باوجود سرسید، نواب عبداللطیف اور سید امیر علی جیسے اصحاب نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ مسلم سماج جس کے وہ خود دلدادہ تھے، بدلے ہوئے حالات میں ایک بے وقت کا راگ Anachronism بن کر رہ گیا ہے۔ اگر تاجِ برطانیہ کے زیرِ سایہ مسلمانوں کو حیاتِ نو کی برکتوں میں اپنا پورا پورا حصہ پانا ہو تو لازم ہے کہ اس سماج میں اصلاحات کے ذریعے مناسب تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہندوؤں نے کافی ترقی کر لی ہے اور اس دوڑ میں مسلمانوں سے کافی آگے نکل گئے ہیں۔ ہندوؤں کی اس ترقی کے پسِ پشت رام موہن رائے اور مہادیو گوند رانا ڈے جیسے مصلحین کا جذبۂ اخلاص اور برہمو سماج اور پرارتھنا سماج جیسے اداروں کی انتھک مساعی کارفرما رہی۔

مسلمانوں میں حالات کی اس نزاکت اور اصلاح کی فوری ضرورت کا احساس سرسید سے بڑھ کر اور کسی کو نہیں ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام کے کٹر رسوم و رواج کا مسلمانوں پر کتنا گہرا اثر ہے۔ انہیں قدیم روایات کو ترک کرنے کی تلقین کرنا انتہائی مشکل کام تھا کیونکہ یہ چیزیں اب اُن کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھیں۔ اُن سے اصلاح کی بات کرنا مزید تکالیف کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور سرسید کے پاس پہلے ہی تکالیف کی کمی نہیں تھی۔ لیکن اگر مسلمانوں کو باعزت زندگی گزارنی ہو تو ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا کیونکہ جب تک ان کے مذہبی اور سماجی نقطۂ نظر میں انقلابی تبدیلی نہیں لائی جاتی اس وقت تک اُن کا ترقی کرنا محال تھا۔ اسی وجہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے سرسید نے پھر سے خطرات مول لے لیے اور نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندستانی وہابیت اس رجحان کی پیش رو تھی، گو یہ بات اس کے انگریز مخالف کردار کی وجہ سے متنازعہ سی لگتی ہے۔ سرسید ہی کی طرح عظیم وہابی رہنما رائے بریلی کے سید احمد بھی اس ابتدائی اسلام کو جس پر رسولِ خدا صلعم اور ان کے صحابہ کرام کاربند رہے تھے، تمام الحاقی اور اخترافی عناصر سے پاک کر دینا چاہتے تھے لیکن دونوں مصلحین کی مماثلت یہیں پر ختم ہو جاتی ہے دیگر امور میں دونوں کے مابین فرق کی ایک وسیع خلیج حائل تھی جسے پاٹنا ممکن نہ تھا۔ سید احمد کو انگریزوں سے نفرت تھی جبکہ سرسید کو اُن سے پیار تھا۔ اوّل الذکر کا خیال تھا کہ انگریزوں کے زیرِ سایہ اسلام پنپ نہیں سکتا جبکہ آخر الذکر کا خیال تھا کہ اُن کے زیرِ سایہ اسلام ماضی کی تمام عظمت اور شان و شوکت کے ساتھ پروان چڑھ سکتا ہے۔

مزید براں سرسید کو اسلام کی تطہیر سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ اس میں کشادگی پیدا کر کے اُسے انیسویں صدی کی برطانوی جدیدیت، تجارتی طریقوں، صنعتی پیمانوں، اخلاقی قدروں اور اس کی انسان دوستی کے مطابق بنانے میں تھی۔ اس میدان میں وہ تنہا نہیں تھے۔ امیر علی اور چراغ علی نے بھی انہی خطوط پر سوچنا شروع کر دیا تھا اور یہ لوگ بھی برطانیہ کی موافقت میں تھے۔ دیگر عظیم مصلحین میں حالی، شبلی اور محسن الملک شامل تھے۔ لیکن یہ لوگ سرسید کے اتنے پکے پیرو تھے کہ ہمیشہ اپنے نظریات اور سرگرمیوں کو سرسید سے ہم آہنگ کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ مذہبی امور میں یہ لوگ سرسید کے ساتھ ایسی رواداری برتتے گویا کہ وہ اُن کے اسقف یا پوپ ہوں اور سیاسی معاملات میں اُن کی ایسی اطاعت کرتے گویا وہ اُن کے بادشاہ ہوں۔

اس سے قبل ایک باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کس طرح سرسید نے انگریز حکمرانوں کو مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ اس باب میں ہم بتائیں گے کہ کس طرح انہوں نے یہ وفاداری مسلمانوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی جو اب تک ناپید تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک اُن مذہبی رکاوٹوں کو ڈھایا نہیں جاتا جو مسلمان کو انگریزوں سے الگ رکھے ہوئی تھیں، اس وقت تک یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہنچ سکتا۔ اس لیے انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں اسلام اور عیسائیت کی بنیادی یکسانیت کو ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دی اور اس طرح مسلمانوں اور انگریزوں کو ایک ساتھ ایک روحانی سطح پر لا کھڑا کیا۔

لیکن یہ صورتِ حال 1857ء کے بعد کی تھی۔ 1857ء سے قبل بلاشبہ وہ مذہبی مناقشات اور قضیات میں دلچسپی رکھتے تھے لیکن ان کے بعد کے خیالات پر ان چیزوں کا کوئی اثر مترتب نہیں ہوا۔ انہی خیالات کی وجہ سے ہندستان میں اسلام انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔ یہ بات اس مذہبی لٹریچر سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے جس کی تخلیق انہوں نے اس دور میں کی۔ اُس لٹریچر میں کم و بیش نصف درجن کتابچے پمفلٹ کی شکل میں شامل ہیں۔ اُن کے مطالعے سے یہ قطعی پتہ نہیں چلتا کہ آگے چل کر ان کا مصنف مذہبی مصلح کا کردار انجام دے گا کیونکہ کسی بھی کتابچے میں انہوں نے مسلمہ عقائد سے سرِ مو انحراف نہیں کیا تھا اُن کتابچوں کے ناموں سے اُن کے موضوع کا اندازہ ہو جاتا ہے:-

(1) جلاء القلوب بذکر المحبوب (یہ رسول اکرم اور ان کے معجزات کا ایک تذکرہ ہے جس میں اسلام کے مافوق الفطرت مسائل سے بحث کی گئی ہے۔)

(2) تحفہ حسن (اس کا تعلق شیعہ سنی قضیے کے مابہ النزاع مسائل سے ہے۔)

(3) کلمۃ الحق (یہ روحانی تہذیب کے متعلق ایک رسالہ ہے)

(4) راہ سنت در رد بدعت (یہ راسخ العقیدہ سنی عقائد سے متعلق ایک رسالہ ہے۔)

(5) نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ (روحانی مراقبے کے اسرار و رموز سے متعلق یہ ایک رسالہ ہے۔)

1857ء کے غدر کے بعد سرسید کے نقطۂ نظر میں یکسر تبدیلی واقع ہوگئی جس کا اظہار نہ صرف اُن کی عوامی سرگرمیوں میں ہوا بلکہ اُن کی مذہبی فکر بھی اس سے متاثر ہوئی۔ اُنہیں اس بات کا یقین سا ہوگیا تھا کہ اگر اسلام اور عیسائیت کی مفاہمت نہ ہو پائی تو ہندستانی مسلمان ہمیشہ کے لیے تباہی اور بربادی کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ محسوس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے تھے کہ یہ بات مسلمانوں کے تعلق سے انگریزوں کے دلوں میں پائے جانے والے شکوک وشبہات کے ازالے کے لیے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں وفاداری کی روح کو بیدار کرنا ضروری تھا جس کے بغیر وہ کسی قسم کی ترقی کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ بغاوت فرو ہوتے ہی انہوں نے اُن تمام روایات اور عملی طریقوں کا بطلان شروع کر دیا۔ جنہوں نے اب تک دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا تھا۔ مثال کے طور پر اُنہوں نے نظریہ نسخ کی تکذیب کی ۱۔ اور دعویٰ کیا کہ عیسائیوں کی مقدس کتابوں میں کسی قسم کی تحریف نہیں کی گئی ہے۔ بائیبل اور انجیل ۲۔ دراصل ایک ہی صحیفے کے دو نام ہیں۔ یہ کوئی معمولی قسم کا اعلان نہیں تھا۔ اس کے خلاف اُن کے دشمن متعدد مسلمہ قرآنی آیات کا حوالہ دے سکتے تھے جیسے کہ "اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں سے دوستی مت اختیار کرو۔" اور "اے وہ لوگ کہ جن تک اللہ کے صحیفے پہنچ چکے ہیں، کیوں تم لوگ سچائی پر جھوٹی شان کے پردے ڈالتے ہو اور حق کو جان بوجھ کر چھپاتے ہو۔" مزید برآں علماء نے عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کئے جانے کے نظریے کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا کیوں کہ اُن کے نظریے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت صلیب پر واقع نہیں ہوئی بلکہ فرشتوں نے انہیں جسمانی طور پر جنت میں پہنچا دیا۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری وجوہات کی بنا پر مسلمان یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ انگریز اُن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو ہیں جن کا ذکر قرآنِ مجید میں بارہا آیا ہے۔ علماء کا اُن انگریزوں کے تعلق سے یہ کہنا تھا کہ وہ نہ صرف مسلمانوں ہی کے تعلق سے جھوٹے ہیں بلکہ خود اپنے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعلق سے بھی ویسے ہی ہیں۔

یہ کام اگرچہ بہت مشکل تھا تاہم سرسید نے اس کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ دونوں قوموں کے مابین بہتر مذہبی مفاہمت پیدا کرنے کی غرض سے اُنہوں نے عہد نامہ قدیم و جدید کی مشہور تفاسیر بعنوان تبیین الکلام تحریر کیں۔ مذہبی مناقشات کے سلسلے میں یہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ کتاب میں، دونوں مذاہب میں پائی جانے والی مماثلت پر زور دیا گیا تھا۔ بطورِ خاص دونوں ادیان میں پائی جانے والی بنیادی وحدت کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا گیا تھا۔ سرسید نے یہ کام کسی لمحاتی جذبے سے متاثر ہو کر نہیں کیا تھا بلکہ سخت محنت کے بعد اس اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام کو پایۂ تکمیل تک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہنچایا تھا۔ اس کتاب میں بھرپور مواد کو انتہائی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ منظرِ عام پر لایا گیا تھا۔ دراصل اس کام کی تکمیل میں سرسید نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے سرسید نے نہ صرف قدیم وجدید عہدناموں اور قرآن مجید کی مختلف تفاسیر کا بغور مطالعہ کیا بلکہ عیسائیت اور اسلام کی تمام ہی اہم تواریخ کو کھنگال ڈالا۔ انہوں نے دونوں مذاہب میں مختلف فرقوں کی ابتدا اور ترقی کے بارے میں بھی کافی چھان بین کی۔ حتیٰ کہ انہوں نے یورپ اور امریکہ کی توحید پرست تحریک Unitarian Movement پر بھی کافی داد اکٹھا کر لیا۔ اسی طرح انہوں نے سائنسی مفکرین کے عقلی استدلالات پر مبنی رسائل بھی جمع کر لیے۔ اس کتاب کی تصنیف کا بنیادی مقصد، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں مسلمانوں اور عیسائیوں پر یہ واضح کرنا تھا کہ دونوں ہی مذاہب میں کس طرح ایک واضح توافق enlightened Concordance موجود ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام اور عیسائیت ایک ہی نصب العین کے دو پہلو ہیں۔ دونوں مذاہب نے ذہنِ انسانی پر جو تاثرات چھوڑے ہیں اُن میں کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا۔ وہ آخر وقت تک اسی عقیدے پر قائم رہے۔ اپنی وفات سے چند ماہ قبل انہوں نے لکھا تھا: "اگرچہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے مذہبی عقاید میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن تاریخ یہ بات ثابت کرنے سے قاصر ہے کہ ابتدائی دنوں سے اب تک دونوں میں کسی قسم کی مخالفت antagonism پائی جاتی ہے۔"

تاہم سرسید کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ نظری مباحث خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں، اُن کے مقصد کے حصول کے لیے ناکافی تھے چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ کسی نہ کسی طرح خود کے نظریات کو عملی جامہ پہنائیں۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے مسلمانوں سے کہنا شروع کر دیا کہ وہ اُن تمام سماجی رکاوٹوں کو دُور کریں جن کی وجہ سے مسلمانوں اور انگریزوں کا یکجا ہونا نہ صرف مشکل بلکہ ناخوشگوار بھی ہو جاتا ہے۔ ذاتی تجربے کی بنا پر وہ یہ جانتے تھے کہ اکثر کٹر قسم کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ ہم طعامی کو ایک قسم کا گناہ تصور کرتے تھے۔ اکثر لوگ تو اس عمل کو روحانی تغلیظ تک قرار دیتے تھے۔ سرسید نے انگریزوں اور مسلمانوں کے مابین دوستی کا رشتہ استوار کرنے کی غرض سے اس "غیر فطری" حد بندی کو ابتدائی اقدام کے طور پر توڑنا شروع کیا۔ انہوں نے کھلے عام سرکاری دعوتوں میں شریک ہونا شروع کر دیا اور برطانوی حکام اور اُن کی بیگمات سے کھل کر ملنے جلنے لگے۔ فوراً یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی کہ سرسید نے شراب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور الکحل پینا خنزیر کا گوشت کھانا شروع کر دیا ہے۔ ان کی سرِ عام مذمت کی گئی لیکن انہوں نے ان باتوں کی پرواہ نہیں کی اور برطانوی حکام کو اپنے دولت خانے پر مدعو کرنے لگے۔ یہ بات علماء کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ انہوں نے سرسید کو منافق کہہ کر ان کی مذمت کی اور ان کے معاندانہ طرزِ عمل پر رسالے تصنیف کر ڈالے۔ جب علماء کی جانب سے کیے جانے والے یہ حملے شدت اختیار کر گئے تب انہوں نے ان کے الزامات کا جواب ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں تحریر کیا جس کا نام تھا رسالہ در طعام اہلِ کتاب۔ اس رسالے میں انہوں نے نہ صرف نظری طور پر عیسائیوں کے ساتھ ہم طعامی کو جائز قرار دیا بلکہ یہ بھی واضح کیا کہ مسلمانوں کے لیے قدیم حجابات کو ترک کر کے انگریزوں کے ساتھ قریبی روابط کا پیدا کرنا کتنا ضروری ہے۔

بدقسمتی سے عین انہی دنوں جب سرسید مسلمانوں کو انگریزوں سے قریب لانے میں کسی قدر کامیاب ہو رہے تھے۔ انگلستان میں حضرت محمد صلعم کی زندگی کے بارے میں ایک کتاب شائع ہوئی جو ہندستان بھر کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث بنی۔ چونکہ اس کتاب کا مصنف ایک لیفٹیننٹ گورنر اور سرسید کا گہرا دوست تھا اس لیے شمالی ہندستان میں اس کا ردِ عمل انتہائی شدید ہوا۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ عیسائی مبلغین نے اس کتاب کے کئی اقتباسات کے اردو تراجم شائع کروا کر بڑے پیمانے پر مسلمانوں میں تقسیم کروائے۔ بعض مبلغینِ عیسائیت کا تو یہ بھی خیال تھا کہ اس طرح اسلام کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ مذکورہ کتاب سر ولیم میور کی Life of Mahammad تھی جس میں مصنف نے نہ صرف اسلام کی الہامی اساس پر ضرب کاری لگانے کی کوشش کی تھی بلکہ پیغمبرِ اسلام کو نعوذ باللہ ادنیٰ کردار کا ایک ایسا شخص ثابت کرنے کی کوشش کی تھی جو بعض اسفل ترین انسانی برائیوں کا شکار رہا ہو۔

سرسید کا اس صورتِ حال کی وجہ سے پریشان ہو جانا ایک قدرتی فعل تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس کتاب کی اشاعت کی وجہ سے ان کے مقصد اور کام کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ تاہم وہ کسی قیمت پر حاکم و محکوم کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کے اپنے کام کو ترک کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی راہ میں جوں جوں دقتیں حائل ہوتی گئیں توں توں ان کے عزائم میں پختگی پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ اپنے لندن کے سفر کے دوران میور کے الزامات کا جواب دینے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے وہ جس قدر مواد جمع کر سکتے تھے، کرتے رہے۔ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود وہ دن رات برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں کام کرتے رہے۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں کئی یوروپین تصانیف کے اُردو زبان میں ترجمے کروانے پر زرِ کثیر صرف کیا مشرقِ وسطیٰ سے بھی جس قدر کتابیں حاصل کی جا سکتی تھیں، انہوں نے حاصل کیں۔ ان تمام مساعی کا نتیجہ خطباتِ احمدیہ (یعنی آنحضرت صلعم کی حیاتِ طیبہ پر خطبات) کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس کتاب میں سرسید نے میور کے ہر الزام کا جواب دیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں زیادہ تر انہوں نے یوروپی دستاویزات پر ہی انحصار کیا ہے اور یوروپین مصنفین کے اقتباسات کو آزادانہ طور پر استعمال کیا ہے۔ اُنہوں نے اس بات کو ملحوظ رکھا کہ کسی طرح بھی عیسائیت کی شان میں بدگوئی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اُن کے اس جواب کی متانت اور لہجے کے وقار نے قارئین پر اپنا مثبت تاثر چھوڑا۔ ہندستان میں جب اس کتاب کی اشاعت ہوئی اس وقت سرسید کے ہزاروں چاہنے والوں کے دل باغ باغ ہو گئے اور ان کے مخالفین پر اس کا یہ اثر ہوا کہ اُن کی زبانیں بند ہو گئیں۔

اپنے قیامِ انگلستان کے دوران سرسید نے مسلمانوں میں پائی جانے والی بعض بُری رسوم اور عادات کے تدارک کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس ضمن میں انہیں اڈیسن اور اسٹیل کے اس کام سے بڑی تقویت پہنچی جو انہوں نے ایسے ہی مقاصد کے تحت انگلستان میں جاری کر رکھا تھا۔ چنانچہ ہندستان واپس لوٹتے ہی انہوں نے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، تہذیب الاخلاق نامی جریدہ جاری کیا۔ مسلمانوں میں مذہبی اور سماجی اصلاح کے لیے سرسید نے اسے زبردست ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ اس رسالے کے ذریعے سرسید اور ان کے رفقاء نے منجملہ اور چیزوں کے حسبِ ذیل امور کا خوب پرچار کیا:۔

(۱) اسلام کی عقلی توجیح

(۲) اسلامی روایات و رسوم کی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تطبیق۔

(3) اسلامی تاریخ اور ادب میں فعال دلچسپی۔

(۴) زندگی کے تعلق سے ایسا جدید رویہ جو اپنی بنیاد کے اعتبار سے تو خالص اسلامی نوعیت کا ہو لیکن عصری تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(5) عیسائیوں اور اُن کے طرزِ حیات سے متعلق بہتر شعور۔

ان موضوعات پر گرما گرم بحثیں چھڑیں اور کئی نزاعی مسائل زیرِ بحث آئے۔ بعض مسائل کے بارے میں تو عقلی آزادی کی نئی راہیں کھولنے والے بدعتی خیالات کا اظہار بھی کیا گیا۔ یہ نزاعی مسائل دین اور دنیا کے باہمی تعلق، حیات بعد ممات، افضلیتِ آدم اسلام میں فکر و عمل کی آزادی، اسلامی رواج Convention اور ان کی حلت Sanction مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلیاں، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اسلام کی تطبیق پذیری، جادو ٹونا، احادیث اور ان کی مختلف توجیہات میں اختلاف، پیغمبر صلعم کی تکریم، عبادتِ خداوندی اور مذہبی تعلیم، حدیث اور تفسیر میں اساطیر کا استعمال وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض قرآنی سورتوں کی تاویل عہدِ جدید کے تقاضوں کے مطابق کی گئی، خاص طور پر اُن کی جو "جن" "فیل" اور "سماوات" سے متعلق ہیں۔

اگرچہ یہ صورت حال عقلی اعتبار سے انتہائی پسندیدہ تھی لیکن علماء کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ وہ اب سرسید اور ان کے حواریوں کو دائرۂ اسلام میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ ساٹھ عدد مولویوں، مفتیوں اور قاضیوں نے جداگانہ اور مشترکہ طور پر سرسید کے خلاف فتوے جاری کر کے انہیں انتہائی قابلِ نفرت کافر قرار دیا۔ اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے بات یہاں تک پہنچی کہ علی بخش خان نامی ایک مولوی صاحب مکہ پہنچے اور "چاروں مذاہب فقہ" کے ائمہ سے ایک دستاویز لکھوائی اور اس پر ان کی مہریں اور دستخطیں ثبت کروالیں جس کے ذریعے سرسید کو جدّال قرار دیا گیا اور تمام مسلمانانِ عالم کو اس کے ظہور سے باخبر کیا گیا۔ ایم۔ اے۔ او کالج کو شیطان کی درسگاہ Seminary قرار دیا گیا اور سرسید کو اسفل السافلین میں جگہ عطا کی گئی۔ انہیں دو ایک بار قتل کی دھمکی بھی دی گئی۔

سرسید بلا خوف و خطر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے رہے۔ اُنہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کو یکجا لا کے رہیں گے چنانچہ کوئی دھمکی انہیں اس نصب العین سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ اس کام میں انہیں محسن الملک کی جانب سے کافی مالی اور قلمی تعاون حاصل ہوا۔ محسن الملک نہ صرف دل کے بڑے آدمی تھے بلکہ طاقتور قلم کے بھی دھنی تھے۔ اگرچہ انہیں سرسید کی تمام مذہبی تاویلات سے اتفاق نہیں تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور بعض تاویلات کی وجہ سے تو وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے، تاہم انہیں سرسید کی اس بات سے سو فیصدی اتفاق تھا کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو رائج کیا جائے اور انگریزوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لایا جائے۔ مزید برآں اپنے مصالحت پسندانہ رویئے اور ذمہ دارانہ طرز عمل کی وجہ سے انہوں نے کئی علماء کو علی گڑھ تحریک کا ہمنوا بنا لیا تھا۔ انہوں نے کئی علماء کو اس بات کا قائل کر دیا تھا کہ اسلام کو اگر عہد حاضر میں سرخرو ہونا ہے تو لازماً اُسے توہمات، نقصان دہ اور مشرکانہ رسم و رواج سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔

سرسید کی شخصیت کے علاوہ چراغ علی اور امیر علی کی تحریروں نے بھی مسلمانوں کی نئی ابھرتی ہوئی انگریزی تعلیم یافتہ نسل کو نئی ڈگر پر گامزن رکھا۔ چراغ علی، سرسید کے گہرے دوست تھے اور اکثر تہذیب الاخلاق کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے۔ امیر علی نے علیگڑھ تحریک میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ لیکن سرسید کی طرح یہ دونوں مذہب میں عقلیت پسندی کے قائل تھے اور خود کو معتزلہ کہتے تھے اور کم و بیش اسلام میں انہی اصلاحی قدروں حامی تھے جن کے لیے سرسید سرگرم عمل تھے۔

چراغ علی کی کاوشوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہر طرح سے عیسائی مشنریوں کی مساعی کو ناکام بنا دیا جائے اور اسلامی معاشرے کو انتشار سے محفوظ رکھا جائے۔ انہیں ڈر تھا کہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان بہ آسانی ان عیسائی مشنریوں کے ہتھے چڑھ جائیں گے کیوں کہ بڑے دھرم اور کوتاہ خیال علماء نے انہیں پہلے ہی بدظن کر رکھا ہے۔ اس وجہ سے نئی نسل کو ذہن میں رکھتے ہوئے چراغ علی اکثر انگریزی ہی میں لکھا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اسلام، جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے، امن و آشتی کا مظہر ہے، جارحیت نام کی کوئی چیز اس میں نہیں پائی جاتی۔ خود جہاد بھی دفاعی قسم کی جنگ ہے[15]۔ 'قرآن یا تلوار' قسم کی تمام باتیں لغو ہیں جو اسلام کو بدنام کرنے کی غرض سے گھڑی گئی ہیں۔ کیا خود قرآن نے یہ واضح اعلان نہیں کر دیا کہ: لا اِکراہ فی الدین (دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔) انہوں نے اپنی متعدد تحریروں میں بڑی ذہانت کے ساتھ واضح کیا کہ اسلام نے کس طرح غلامی کو ختم کرنے، عام انسانوں کی ذہنی اور اخلاقی سطحوں کو بلند کرنے اور علوم و فنون کو بام عروج تک پہنچانے کے لیے انتھک جدوجہد کی۔

لیکن چراغ علی کا سب سے زبردست کارنامہ اُن کی وہ کتاب تھی جس کا عنوان ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

The Proposed Political, Legal and Social reforms in the Ottoman Empire and other Muslim States

علیحدہ کرنے کی وکالت کی ہے۔ یہ ایسا تصور ہے جو اسلام کی سرشت کے عین منافی ہے۔ اس طرح وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں اور یورپینوں کے مابین مفاہمت پیدا کی جائے جس کے لیے دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ وہ خود اور سرسید کوشاں تھے۔ انہوں نے اپنے اس جرأت مندانہ موقف کی وضاحت کتاب کے دیباچے میں اس طرح کی: "میں نے اس کتاب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسولِ عربی حضرت محمد مصطفیٰ صلعم نے جس دین کی تعلیم ہمیں دی ہے اس میں اس قدر لچک موجود ہے کہ وہ بہ آسانی خود کو اُن سیاسی اور سماجی انقلابات سے ہم آہنگ کرسکتا ہے جو اس کے اطراف واکناف میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں"[11] انہوں نے یکے بعد دیگرے متعدد قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "قرآن یا حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کی تعلیمات نہ تو روحانی ترقی اور نہ مسلمانوں کی فکری آزادی میں سدِ راہ ثابت ہوں گی اور نہ ہی زندگی کے کسی شعبے میں اختیار کی جانے والی اختراعیت کی راہ میں حائل ہوں گی خواہ ان کی نوعیت سیاسی وسماجی ہو یا عقلی واخلاقی"[12] وہ تو یہاں تک کہہ گئے کہ چونکہ آنحضرت صلعم "محض ایک انسان تھے" اس لیے اُن کی ذات، اُن کے ارشادات اور ان کے عمل کو ضرورت سے زیادہ تقدس کا درجہ نہیں دیا جانا چاہیے۔ خالص مذہبی معاملات میں تو آپ کا اتباع کیا جانا چاہیے لیکن "دیگر اُمور میں جب بھی آپ نے کسی رائے کا اظہار فرمایا وہ صرف ایک انسان کی حیثیت سے تھا۔ کتاب کے مباحث انہی خطوط پر آگے بڑھتے گئے بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آنحضرت صلعم نے کبھی بھی "مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط نہیں کیا ہے" لہٰذا اُن لوگوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آنی چاہیے جو اسلام کو جدیدیت سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں اور انگریزوں کے زیرِ سایہ رہ کر نئی زندگی سے پوری طرح متمتع ہونا چاہتے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان ان نظریات سے کسی قدر متاثر ہوئے کیونکہ اس طرح انہیں جدید حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں مدد ملی۔

امیر علی چونکہ کسی خاص مقصد کو فوری طور پر حاصل میں کوشاں نہیں تھے اس لیے جدید اسلامی فکر کو ان کی دین زیادہ مثبت انداز کی ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء کی طرح وہ مدافعانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اسلام کو محض ایک معزز اور ترقی پسند مذہب ثابت کرنے پر قانع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں تھے بلکہ ان کا کہنا تو یہ تھا کہ اسلام سب سے بہترین مذہب ہے اور آنحضرت صلعم تمام پیغمبروں سے زیادہ عظمت والے نبی ہیں۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ مذہبی نقطۂ نظر سے نہ صرف ہندو اور دیگر مشرکین مسلمانوں سے کمتر ہیں بلکہ یہودی اور عیسائی بھی۔ یہ بات اُنہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف The spirit of Islam کے دیباچے میں انتہائی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ اسلامی مناظرے کا یہ شاہکار انتہائی خوبصورت انگریزی میں تصنیف کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے اہلِ یورپ کو بڑی حد تک اپنی جانب متوجہ کیا حالانکہ "بنیادی طور پر یہ کتاب مسلمانانِ ہند کے لیے تصنیف کی گئی تھی"[14]

امیر علی کا اسلام عملاً اس اسلام سے قطعی مختلف تھا جس پر ہندستانی مسلمان عمل پیرا تھے۔ اُنہوں نے تمام غیر معقول اور ناقابلِ عمل باتوں کو غیر اسلامی قرار دے کر اسلام سے خارج کر دیا تھا۔[15] وہ محض اسلام کی بنیادی تعلیمات کا اعادہ کرنے پر ہی مطمئن نہیں تھے بلکہ ادب و فنون کے میدان میں مسلمانوں کے کارہائے نمایاں کی قصیدہ خوانی بھی شاندار الفاظ میں کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کی نوجوان نسل کو نہ صرف نئے سرے سے اسلام کا وفادار بنانا چاہتے تھے بلکہ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ ماضی کے اپنے عظیم اور شاندار ورثے پر فخر محسوس کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اجتہاد کا سہارا لے کر اسلام میں ضروری تبدیلیاں بھی لانا چاہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جوں جوں دنیا ترقی کرتی جاتی ہے توں توں اسلامی اداروں، اسلامی افکار، اسلامی طرزہائے حیات، اسلامی قوانین اور ان کی توضیحات میں بھی تبدیلی اور ترقی ہونی چاہیے۔ یہ تمام باتیں اسلامی حدود میں رہتے ہوئے ممکن العمل ہیں اور آنحضرت کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔

لیکن امیر علی بنیادی طور پر ایک مفکر تھے یا ایک ایسے عالم و فاضل جو اپنے نظریات کی وضاحت اور تشریح میں بہ نسبت اُن کے نفاذ کے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے برخلاف سرسید صرف اتنی ہی بات کرتے تھے جتنی کہ ضروری ہوتی اور اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھتے تھے کہ جو کچھ کہا انہوں نے کہا اس پر عمل بھی کیا جائے۔ اسی وجہ سے مذہبی معاملات میں بھی امیر علی کے مقابلے میں سرسید کی باتوں کا زیادہ اثر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سرسید صرف اُن مذہبی اصلاحات کی وکالت کرتے تھے جو ان کے مقصد کے حصول کے لیے انتہائی ضروری ہوں۔ ایسے معاملات میں جو ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتے ہوں انہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عدم مداخلت کی پالیسی کو بخوشی اپنائے رکھا۔ اسی وجہ سے اس انقلابی مصلح نے بعض امور میں جہاں تک ایک طرف چند بنیادی تبدیلیوں کا مطالبہ کیا وہیں دوسری طرف کئی فرسودہ مسلم رواجوں کی حمایت بھی کی۔ مثال کے طور پر اُن کی جانب سے پردے کی حمایت ہی کو لے لیجئے۔ اس بارے میں اپنی وفات سے دو ایک سال قبل ہی انہوں نے لکھا تھا: "لوگ سوچتے ہوں گے کہ میں بھی 'نئی روشنی' کا دلدادہ ہوگیا۔ لیکن بنیادی طور پر میں راسخ العقیدہ انسان ہوں۔ میں مسلمان خواتین میں پائے جانے والے پردے کے رواج کو انتہائی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں" وہ اپنے موقف پر اس قدر اٹل تھے کہ اس بارے میں یہ بحث کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ آیا قرآن اس کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ وہ بعض انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اس استدلال سے مطمئن نہیں تھے کہ پردے کے خاتمے کی وجہ سے مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین سماجی روابط استوار ہوں گے۔ اُنہوں نے مسلمان مردوں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا: "پہلے آپ (مرد) تو انگریزوں کے ساتھ اختلاط پیدا کرنے کے لائق بن جائیے پھر اُس کے بعد اپنی خواتین کے بارے میں سوچئے" اپنی اس نیک صلاح کی تائید میں انہوں نے حسب ذیل فارسی کا شعر نقل کیا:۔

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

اس بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ سرسید نے اسلامی دینیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور الٰہیات میں درجۂ فضیلت پر فائز تھے۔ ان کے متعدد مضامین، خطبات اور بطورِ خاص اُن کی مشہور تفسیر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اُنہیں کس پائے کی عبقریت حاصل تھی اور اُن کا نقطہ نظر کس حد تک تعقل پسندانہ تھا۔

اُن کی تمام تصانیف کے پیچھے ایک ہی مقصد تھا حتیٰ کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں بھی عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین بہتر تعلقات کے قیام پر زور دیا اور اسلام کو ایک ایسے مذہب کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جو مغربی نظریات سے ہرگز متصادم نہیں۔

اس پیغام کو اپنی قوم تک پہنچانے کے لیے سرسید نے اس کردار کو واضح کیا جو منطق یا فطرت یا غیر ذی روح وجود، زندگی میں ادا کرتے ہیں۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ جس چیز کو عقل قبول نہ کرے اُسے رد کر دینا چاہیے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے استدلال کا تمام تر زور قرآنی الفاظ پر زور دیا اور باقی تمام چیزوں کو بشمول حدیث، فقہ اور اجتہاد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذیلی اور دوسرے درجے کی چیزیں" قرار دے کر رد کر دیا۔ "جدید دور کے آزاد فرد" کو گھسی پٹی روایات اور ازکار رفتہ نظریات کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی رہنمائی کے لیے تنہا قرآن کافی ہے جس کی تاویل اور تشریح نہ تو علم الکلام کے اصولوں کے مطابق کی جانی چاہیے اور نہ ان اصولوں کے مطابق جن پر عام طور پر مفسرین اور مجتہدین کا اتفاق ہے بلکہ یہ کام جدید تقاضوں کے مطابق انجام دیا جانا چاہیے۔ وہ تو وجدانی اور الہامی کلام کے تعلق سے بھی آزادانہ فیصلہ کرنے کے قائل تھے۔ عقیدے کو منطق کے ذریعے استحکام بخشنا چاہیے۔ سرسید کے یہی خیالات تھے جنہوں نے فطری طور پر کئی پکے مسلمانوں کے جذبات کو جن میں خود ان کے کئی بہترین دوست بھی شامل تھے، مجروح کیا۔[19]

مثال کے طور پر انہوں نے قرآن میں پائے جانے والی بعض غیر فطری مثالوں کو رد کرتے ہوئے کہا کہ "خدا کے کلام کی تفسیر" خدا کے کام" ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے لہٰذا معجزات چونکہ غیر فطری یا مافوق الفطرت مظاہر ہیں اس لیے ان کا بیان مجازاً یا تمثیلاً کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلعم کے آسمانی سفر یعنی واقعۂ معراج کا تفصیلی بیان بھی اسی حکم میں آتا ہے۔[20] اسی نقطۂ نظر کے تحت انہوں نے جارحانہ جنگوں، غلامی کے رواج اور عورتوں کو محکوم بنا کر رکھنے کے عمل کو عین ملامت بنایا۔ حالانکہ انہوں نے تعدد ازدواج اور طلاق کے طریقوں کو اس بنا پر [illegible] قرار دیا کہ یہ طریقے قوانینِ فطرت کے عین مطابق ہیں۔ حتیٰ کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے مسلمہ اسلامی ارکان کے تعلق سے بھی سرسید کچھ نہ کچھ نئی بات کہا کرتے تھے اور حیات بعد ممات یا مستقبل کی زندگی، روح کا وجود اور ماہیت، جزا و سزا، جنت اور دوزخ جیسے مسائل کے بارے میں ان کی تاویل مسلمہ نظریات سے قطعاً مختلف تھی۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ قرآن مجید کی وہ آیات جو انسان کی جنسی جبلتوں میں ہیجان برپا کر دیتی ہیں ان میں اعلیٰ روحانی صداقتیں کنایۃً بیان کی گئی ہیں اور سب سے بڑھ کر بات تو یہ ہوئی کہ سرسید نے بطورِ خاص تجارتی لین دین میں "سود لینے" کی کھلے عام حمایت کی۔ سرسید کا سود کے بارے میں یہ موقف عملاً تمام ہی ممتاز علماء کے اختیار کردہ موقف سے یکسر متصادم ہے۔

غالباً اسی وجہ سے علماء نے انہیں بدعتی Heretic قرار دیا۔ اگر فی الحقیقت مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ ان کی بعض تاویلات اور توجیہات میں "بدعت" کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ معترضین کا تو ذکر ہی کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محسن الملک اور شبلی جیسے اُن کے قریبی احباب کو بھی اس بارے میں ان سے اختلاف رہا ہے لیکن اُن کے دل میں سرسید اور ان کے کام کی اتنی عزت تھی کہ وہ سرِعام اُن کی مذمت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

سرسید پر انیسویں صدی کے سب سے بڑے اسلامی مفکر جمال الدین افغانی نے بھی تنقید کی ہے جن کا نام آج بھی دنیا بھر کے مسلم مذہبی حلقوں میں بڑی عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہ ان اسلامزم تحریک کے ابتدائی رہنما جمال الدین افغانی نے ایشیا اور یورپ کے دُور دراز ملکوں کا سفر کیا تھا اور کئی یورپین زبانیں جانتے تھے اور جدید مذہبی فکر اور سیاسی حالات کی نشوونما سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ وہ کوئی پرانے قسم کے عالم نہیں تھے بلکہ اُس دور کے ذی شعور نباض تھے جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے۔ الافغانی انگریزوں سے نفرت کرتے تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ انگریز ہی اسلام کے زوال کا سبب ہیں۔ فطری بات ہے اُن میں اور سرسید میں کوئی خلوص برقرار نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ انہوں نے سرسید پر "اپنے مذہب اور اپنے ملک کے ساتھ غداری" کرنے کا الزام لگایا تھا۔ اپنے ہم مذہبوں کے مسائل کے حل کے تعلق سے دونوں کے رویوں میں بُعدِ مشرقین پایا جاتا تھا۔

الافغانی نے سرسید کی "فطرتیت" یا Naturalism کا یہ کہہ کر مذاق اُڑایا ہے کہ یہ یورپ کے مادہ پرستوں کے بنیادی نظریات کی محض ایک بھونڈی نقالی ہے۔ اُنہی کی طرح یہ (سرسید) بھی سمجھتے رہے کہ یورپ کی ترقی کا راز اس کے علوم اور فنون میں پوشیدہ ہے اسی لیے انہوں نے مسلمانانِ ہند کو مشورہ دینا شروع کر دیا کہ وہ اپنے تہذیبی ورثے کو دریا برد کر دیں اور انگریزی تہذیب کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں۔ الافغانی نے لکھا کہ "فطرت کے طریقوں کی نمائش کے لیے انہوں نے ایک جھوٹ گھڑ لیا ہے جسے وہ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔"

علاوہ ازیں الافغانی کے کہنے کے مطابق سرسید نہ صرف اپنے مذہب کے غدار تھے بلکہ اپنے ملک کے بھی۔ لہٰذا اُن کا حال تو ایک یوروپین مادہ پرست سے بھی بدتر تھا۔ "جو اگرچہ اپنے مذہب کو ترک کر دیتا ہے لیکن اپنے ملک سے محبت کرتا ہے۔" اس کے برخلاف سرسید نے مسلمانوں میں کام کرتے ہوئے نہ صرف اُن کے مذہبی جوش،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو ختم کیا ہے بلکہ "حب الوطنی" کو بھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بقول الافغانی، سرسید نے مسلمانوں کو نہ صرف انگریزوں کا زر خرید غلام بنا دیا بلکہ "ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق کے بیج بھی بو دیئے"۔ اس طرح انہوں نے ہندستان پر بدیسیوں کی گرفت مضبوط کروادی ہے۔ انہوں نے سرسید اور ان کے رفقاء پر الزام لگایا کہ انہوں نے "ہندستان میں انگریز حکومت کے لیے ایک ایسی فوج کا کام کیا جو اپنے ہی ہم مذہبوں کے گلے کاٹنے کے لیے اپنی شمشیریں برہنہ کرے اور پھر مقتولین کے مُردہ جسموں سے چیخ چیخ کر کہے کہ انہیں خود اُن کی بھلائی کے لیے قتل کیا گیا ہے۔ ہم نے یہ کام تم پر انتہائی ترس کھا کر ازراہِ ترحم تمہاری ہی بھلائی کی نیت سے کیا ہے۔" انگریزوں کے پاس بقول الافغانی "اپنے مقصد کے حصول اور اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کا" اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

عام طور پر سرسید اس قسم کے حملوں سے متاثر نہیں ہوتے تھے تاہم الافغانی کی اس تنقید سے اُنہیں سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن اس کی وجہ سے وہ پست ہمت نہیں ہوئے۔ انہوں نے انگریزوں کے زیرِ سایہ مسلمانوں کے موقف کو مضبوط اور مستحکم بنانے کا تہیہ کر رکھا تھا اور ہزار دقتوں کے باوجود وہ اپنے اس فیصلے پر اٹل رہے چنانچہ رفتہ رفتہ اُن کی مساعی بار آور ہونے لگیں۔ وہ ایم۔ اے۔ او کالج کو ایک مکمل اور مثالی تعلیمی ادارے کی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے جس میں ہندستان بھر کے متمول طلباء آ کر شریک ہونے لگے۔[27] اپنی تحریری اور دیگر عوامی سرگرمیوں کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں میں انگریزی خیالات کی جیسا وہ انہیں سمجھ پائے تھے، نشر و اشاعت شروع کر دی، اس کے علاوہ اُن کے تعلیمی ادارے سے فارغ ہونے والے کئی گریجویٹ طلباء حکومت کی جانب سے نفع بخش ملازمتوں پر مامور ہونے لگے تھے۔ اور مسلمانوں اور انگریزوں کے سماجی مراسم میں اضافہ ہونے لگا تھا جس وقت سرسید کے صاحبزادے سید محمود انگلستان سے بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے ہندستان لوٹے سرسید نے ان کے لیے ایک عالی شان خیر مقدمی ضیافت کا انتظام کیا جس میں مساوی تعداد میں مسلمانوں اور انگریزوں کو مدعو کیا گیا۔ اس تقریب کی کافی تشہیر کی گئی اور اسے دونوں قوموں کے مابین باہمی اعتماد اور خیر سگالی کے جذبے کی فتح قرار دیا گیا۔

ان نئے قایم ہونے والے تعلقات کو اور کئی طرح سے مستحکم کیا گیا۔ بیک اور دیگر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریز پروفیسروں نے طلبار کو مغربیت کے زیر اثر لایا جبکہ سرسید نے اپنی ضیافتوں اور پارٹیوں کے ذریعے انگریز و فترشاہی کو مسلمانوں سے ہم آہنگ رکھا۔ اپنے مقصد میں وہ اس حد تک کامیاب ہوئے کہ جس وقت 1890ء میں برطانیہ کا ایک قدیم ہوشلسٹ ایڈورڈ کارپینٹر Edward Carpenter ہندستان کے سفر پر آیا تو اس نے علی گڈھ میں "حاکم و محکوم کے مابین مفاہمت اور خیر سگالی کی ایک غیر معمولی مثال کو پھلتے پھولتے ہوئے دیکھا۔ اس نے لکھا "ہندستان کا یہ واحد مقام ہے جہاں میں نے دونوں طبقات کے مابین مخلصانہ جذبات کی موجودگی کا احساس کیا۔"[30]

لیکن ان "مخلصانہ جذبات" میں اتنی گہرائی نہیں تھی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے دونوں کے دلوں کو حقیقی رشتہ اخوت میں پرونے کی انتھک جدوجہد کی لیکن اس کاوش میں تصنع اور ایک قسم کی ظاہرداری ضرور موجود رہی۔ زندگی کے آخری دنوں میں سرسید کو اس تکلیف دہ حقیقت کا احساس شدید طور پر ہوا جب انھوں نے دیکھا کہ یورپین ججوں نے ان کے لختِ جگر سید محمود کے ساتھ کس قدر گھٹیا سلوک روا رکھا جس سے دل برداشتہ ہو کر انھیں الہ آباد ہائی کورٹ کی بنچ سے مستعفی ہو جانا پڑا تھا۔[31]

اُن دنوں سرسید کی دل برداشتگی اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ خود انھوں نے اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ "میری دانست میں ابھی وہ وقت نہیں آیا، اور شاید کبھی نہیں آئے گا، جبکہ ہمارے یوروپی دوست، جو اس ملک کے فاتح ہیں اور جنھیں اپنی فتح پر فطری طور پر ناز بھی ہے، اس بات پر آمادہ ہوں کہ ان مفتوح اور معتوب ہندستانیوں کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھنا گوارہ کریں جو یہ چاہتے ہیں کہ اعلیٰ عہدوں کی ذمہ داریوں سے مساویانہ اعزاز اور احساس ذمہ داری کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ بعض شیخی خور یہ کہنے لگیں کہ حقیقتِ حال ایسی نہیں ہے لیکن جو عقلمند ہیں صرف وہی جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے۔"[32] یہ صورتِ حال 1896ء میں یعنی سرسید کی وفات سے صرف چار سال قبل پیدا ہوئی۔

مذہبی اور سماجی اصلاحات کے میدان میں سرسید کی کامیابیوں کا ٹھوس تخمینہ لگانے قدرے مشکل کام ہے۔ غالباً اُن کی جدوجہد کے فوری اثرات کم لیکن دور رس اثرات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ مترتب ہوئے۔ "منصب قضات" اور ٹیکہ اندازی کے مسایل کو چھوڑ کر سرسید نے مزید کسی تبدیلی یا اصلاح کے لیے قانون ساز مشنری کو استعمال نہیں کیا۔ لیکن ان کی پے در پے ادبی تخلیقات کی وجہ سے فکری انقلاب نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اُن متعدد مذہبی اور سماجی اصلاحات کے لیے فضا سازگار ہونے لگ گئی جس کا بیڑا سرسید کے نوجوان پیروؤں نے اُٹھا رکھا تھا۔ اصلاح کے جوش میں یہ نوجوان مصلحین اتنے آگے نکل گئے کہ خود سرسید بعد کے دنوں میں زندہ رہتے تو ان کی تجویز کردہ کئی اصلاحوں کی مخالفت کرتے۔ لیکن یہ امر توجہ طلب نہیں ہے بلکہ غور طلب بات یہ ہے کہ سرسید نے مسلمانوں میں نہ صرف نئے خیالات ہی پیدا کیے بلکہ اُن میں نئی آرزوؤں اور امنگوں کو بیدار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری نئی نسل ان جدید افکار و خیالات سے متاثر ہوئے۔

خود سرسید کی زندگی میں مسلمانوں کی اس نئی نسل نے مذہبی اور سماجی اصلاحات کے بارے میں اپنے طور پر آزادانہ طریقے سے سوچنا شروع کر دیا تھا لیکن اُن دنوں وہ اتنے کمزور اور تعداد کے اعتبار سے اتنے کم تھے کہ ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ ملت کے تمام گوشوں پر سرسید کی بھاری بھرکم شخصیت اس حد تک مسلط تھی کہ یہ نیا نوجوان طبقہ کسی بھی معاملے میں نہ تو انھیں چیلنج کر سکتا تھا اور نہ ہی قوم کے سامنے اپنے نقطہ نظر کو مناسب طور پر پیش کر سکتا تھا۔ مصطفیٰ خاں نامی علیگڈھ کے ایک گریجویٹ نے اصلاحات سے متعلق اپنے دور کے تعلیم یافتہ طبقے کے خیالات کی عکاسی کی کمزور سی کوشش ضرور کی لیکن فوری طور پر اس کا کوئی خاص اثر مترتب نہیں ہوا۔

مصطفیٰ خاں نے اپنی تصنیف An apology for the New Light مطبوعہ 1891ء میں شکایت کی کہ انگریزی تعلیم سے بہرہ ور مسلمانوں کا نیا طبقہ اپنے اطراف جارحانہ ماحول کی موجودگی کی وجہ سے خود کو "تنہا" محسوس کرتا ہے۔ اور یہ کہ "غیر ہمدردانہ الفاظ اور نگاہیں اُن کا تعاقب کرتی ہیں"۔ اس طبقے کی یاسیت اور احساسِ محرومی کو دور کرنے کے لیے مصنف نے حسب ذیل طریقے تجویز کیے:

(۱) (چند ناگزیر تبدیلیوں کے ساتھ) انگریزی لباس اور یورپی تہذیب کی دیگر ظاہری برکتوں کو اپنانا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

2 ۔" موجودہ مذہبی فکر کے ڈھانچے میں" فوری طور پر ناگزیر تبدیلی پیدا کرنا۔

3 ۔" بعض سماجی اصلاحات" کا نفاذ[33]

مصطفیٰ خاں چاہتے تھے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمانوں کا نیا طبقہ یورپین تہذیب کو مثالی نمونے کے طور پر قبول کر لے لیکن نہ تو سرسید اور نہ ہی ان کے رفقاء اس انقلابی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرسید اپنی ترکی ٹوپی پر ہمیشہ ناز کرتے رہے۔

اُن دنوں علماء کے طبقے میں عظیم تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں کیونکہ انھیں سرسید کے ہاتھوں ہزیمت برداشت کرنے کا شدید احساس ہونے لگا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اپنے معاملات کو عہدِ جدید کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کر لیں۔ گو علماء کا طبقہ مذہبی اصولوں کے مقابلے میں کسی مصالحت پر آمادہ نہیں تھا تاہم دُنیوی اور میں وہ عصری تقاضوں کے مطابق ضروری توافق اور تطبیق پر آمادہ تھے۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی نے نمایاں کردار انجام دیا۔ اگرچہ وہ سرسید کے رفیق تھے لیکن عمر میں اُن سے بہت چھوٹے تھے۔ ایم۔ او۔ کالج میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے اُنھیں دن رات نہ صرف سرسید سے سابقہ پڑتا بلکہ بیک، مارمیسن اور آرنلڈ جیسے یورپی دانشوروں سے بھی ان کا مسلسل ربط قایم تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں جدید افکار و نظریات سے واقفیت بہم پہنچتی رہی۔ انھوں نے یورپی تہذیب کی بہت سی باتوں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ انھیں اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی جدید طریقے سے تشکیل و تنظیم کی جانی چاہیے تاکہ وہ عصری مطالبات پر پورے اُتر سکیں۔ انھوں نے انگریزی کی اہمیت کو تسلیم کیا اور بعض سماجی اداروں کو مناسب تبدیلیوں کے ذریعے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی حمایت بھی کی لیکن اسلام کے ساتھ ان کا شغف اس قدر گہرا تھا کہ سرسید کی اُن متعدد " جدت طرازیوں" کو من و عن قبول کر لینے میں انھیں تکلف محسوس ہونے لگا جن سے وہ کراہیت محسوس کرتے تھے۔ وہ راسخ العقیدگی پر مبنی مذہبی روایات کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ علماء کے طبقے کو جنھیں وہ اسلام کا لازمی جز تصور کرتے تھے۔ نظر انداز کرنے کے روادار تھے۔ سرسید اسلام کو مغربیت کے رنگ میں رنگ دینا چاہتے تھے جبکہ شبلی مغربی نظریات اور قدروں کو اسلامی معیار پر پرکھنے کے قایل تھے۔ لیکن سرسید کی طرح شبلی بھی دونوں کی مشترکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدریں تلاش کرنے پر زیادہ زور دیتے تھے نہ کہ متضاد پہلوؤں کی تلاش پر۔ سرسید کے نزدیک عقل زیادہ سے زیادہ مذہب کی تابعدار کنیز کہلا سکتی ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے خیالات اور نظریات کا فرق گہرا نہ تھا بلکہ نہایت ہی لطیف اور مہین تھا تاہم اس کا اثر خاص طور پر مذہبی اور سماجی اصلاح کے معاملات میں دونوں کے نقاط ہائے نظر پر مترتب ہوا۔

شبلی کو اسلام اور مکمل اسلام سے والہانہ عشق تھا۔ وہ اس کے تعلق سے ہر وہ بات جانتے تھے جو جانی جا سکتی ہے جیسے کہ اس کی تعلیمات اور عبادات، اس کے صوفیاء اور مبلغین، اس کی تاریخ اور اس کے تاریخ ساز سورما، اس کے علوم و فنون، اس کی ثقافت اور تمدن۔ ان تمام چیزوں میں اُنھیں اتنی اچھائیاں نظر آئیں کہ اُن میں سے کسی ایک کو بھی وہ بہ آسانی نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ اُسی صورت میں یورپی نظریوں اور رواجوں کو اپنانے کے روادار تھے جبکہ وہ اسلام کی اصلاح و تقویت کے لیے انتہائی ناگزیر ہوں۔ یہ بات نہ صرف ان کی عوامی خدمات بلکہ ان متعدد کتب سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے تصنیف کیں جن میں بعض سطحی اور مضحکہ خیز اُمور کو چھوڑ کر تمام مُسلّمہ مذہبی امور کا احاطہ انتہائی احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اس کام میں شبلی کو، خاص طور پر سرسید کے انتقال کے بعد، حالی اور محسن الملک سے بڑی مدد ملی۔ اُنھی کی طرح حالی بھی اسلام کے عہد رفتہ کی مدح سرائی کیا کرتے تھے جبکہ محسن الملک کا خیال تھا کہ علماء اور اُن راسخ العقیدہ اداروں کے تعاون کے بغیر جن کی یہ علماء نمایندگی کرتے ہیں عامۃ المسلمین کو جدیدیت کے اس حلقے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔[34]

اس مقصد کے حصول کے لیے 1894ء کے اواخر میں ندوۃ العلما کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا افتتاحی اجلاس کانپور کے مقام پر حافظ ابراہیم بخش نامی ایک بزرگ کے زیر اہتمام عمل میں آیا جو مدرسہ فیض عام چلاتے تھے۔ اس اجلاس میں مختلف فرقوں کی نمایندگی کرنے والے کم و بیش تین سو مولویوں نے شرکت کی۔ محسن الملک نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقعے پر اس اقدام کی کافی ستایش کی۔ انھوں نے اسے "وقت کی ایک امید افزا علامت" قرار دیا۔ انھیں اس بات کی خوشی تھی کہ علما "ان قدیم اور فرسودہ طریقوں کو خیرباد کہہ رہے تھے جو روح عصر کے جدید تقاضوں سے کوئی مطابقت نہ رکھتے تھے"۔ اس بات کی شہادت اُن متعدد قراردادوں سے مل جاتی ہے جو علماء نے اپنے اجتماع میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منظور کی تھیں۔ غالباً سرسید بھی اس سے بڑھ کر علماء سے اور کچھ نہیں چاہتے تھے۔ اپنی اس بات کی تائید میں انھوں نے کانفرنس کے گذشتہ اجلاسوں کی تقاریر سے متعدد حوالے دے کر واضح کیا کہ یہی باتیں سرسید بھی گذشتہ پچیس برس سے کہتے آئے تھے۔ سرسید کے پیروؤں اور علماء کے نظریات میں ہم آہنگی یقیناً ترقی کی جانب اگلے قدم کی حیثیت رکھتی تھی اگرچہ یہ ہم آہنگی کافی غلط فہمی اور نزاع کے بعد پیدا ہو پائی۔ غالباً یہ "ہندستانی مسلمانوں کی حالیہ تاریخ کا سب سے اہم واقعہ" تھا۔[35]

بقول محسن الملک اس قدر بلند بانگ دعویٰ کرنے کی وجوہات بھی ظاہر تھیں۔ نئے حالات کی روشنی میں جس قسم کی سماجی اور مذہبی اصلاحات کی فوری ضرورت قوم کو لاحق تھی اُن کا موثر نفاذ علماء کے عملی تعاون کے بغیر ممکن نہیں تھا جنھیں عامۃ الناس کا بھرپور اعتماد حاصل تھا اور جنھیں وہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جس وقت تک علماء کا یہ طبقہ الگ تھلگ رہا اُس وقت تک اصلاحی کام کو کامیابی کی منزل تک پہنچانا بڑا مشکل امر تھا۔ "لیکن اب" بقول محسن الملک "ہماری خوش قسمتی سے ان فاضل رہنماؤں نے بالآخر اپنے کٹرپن کو ترک کر دیا ہے۔" انھوں نے عہد کر رکھا تھا کہ "اب وہ خود ہی کچھ نہ کچھ کر دکھائیں گے" اس بات کو بقول محسن الملک، اگر "مولویوں کی عام قدامت پسندی" کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ ایک غیر معمولی فیصلہ جان پڑتا ہے۔ جو یہ حق رکھتا ہے کہ "ہندستانی مسلمان خلوصِ دل سے اس کی تائید کریں۔"[36]

ندوۃ العلماء کا اگلا اجلاس لکھنؤ میں 12، 13 اور 14 اپریل 1895ء کو منعقد ہوا جو پچھلے اجلاس کے مقابلے میں زیادہ نمایندہ حیثیت کا حامل تھا۔ اس اجلاس میں دیگر شرکاء کے ساتھ ساتھ الہ آباد کے مولانا شاہ محمد حسین، غازی پور کے مولانا شاہ محمد امانت اللہ، پھلواری شریف کے مولانا شاہ محمد سلیمان، دہلی کے مولانا ابو محمد عبدالحق اور آرہ کے مولانا ابو محمد ابراہیم جیسے گرامی قدر علماء اور فضلاء کی شخصیتیں شامل تھیں۔ شبلی نعمانی کانفرنس کے روحِ رواں بنے ہوئے تھے کانفرنس میں شریک ہونے والے وفود گھنٹوں تک اس مشکل گتھی کو سلجھانے میں لگے رہے کہ اپنے اسلامی نقطہ نظر کو برقرار رکھتے ہوئے وہ کس حد تک محمڈن کو اس علم سے آراستہ کر سکتے ہیں جو یورپین سائنس اور تعلیم کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ وہ اس بات پر متفق تھے کہ عامۃ المسلمین کے لیے مغربی خطوط پر عام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم کا حاصل کرنا ایک "بڑھتی ہوئی ضرورت" بنتا جا رہا ہے۔ لیکن انھوں نے عربی اور فارسی کے علاوہ "مشرقی علوم کے اُن شعبوں کی کلاسیکی تعلیم پر بھی کافی زور دیا جن میں مسلم ماضی کے عظیم الشان خزانے محفوظ کیے گئے ہیں"[37]۔ علماء کے لیے یہ ایک جرأتمندانہ اقدام تھا۔ ان پر اس سے زیادہ کے لیے زور ڈالنا محض حماقت کے مترادف ہوتا۔

اس کے بعد سال بہ سال علماء کی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہیں جن میں وہ اپنے کنزرویٹن کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اُسی حد تک جس حد تک یہ کمی اُن کے اسلامی ورثے کے لیے مُضر ثابت نہ ہوتی ہو۔ اُنھیں جدید تعلیم کے حصول پر اس حد تک کوئی اعتراض نہ تھا جہاں تک کہ وہ اسلام کی مذہبی بنیادوں کو کمزور نہ کرنے لگ جائے۔ انھوں نے برطانوی حکمرانوں کے خلاف اپنی جلد جیت کو بھی ختم کر دیا۔ اب تو وہ اس بات کی تمنا کرنے لگے کہ اُن کی تحریک کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو جائے۔ انگریز بھی اپنے طور پر اس بات پر آمادہ تھے کہ ان کی تحریک میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے بشرطیکہ وہ حکومت کے ساتھ وفادار رہے۔ یہ امر اس واقعے سے بھی ظاہر ہو گیا کہ جس وقت 2 نومبر 1898ء کو لکھنؤ میں دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا اُس وقت اِس افتتاحی تقریب میں کئی اعلیٰ یورپین عہدیداروں نے شرکت کی جن میں کمشنر اور ڈپٹی کمشنر بھی شامل تھے جنھوں نے شخصی طور پر ندوۃ العلماء کے رہنماؤں کو اس نئے اقدام کی کامیابی کے لیے مبارکباد دی اور نیک تمناؤں کا تحفہ پیش کیا جس کا مقصد نوجوان مسلمانوں کو جدید خطوط پر دینیات اور دیگر مذہبی علوم سے آشنا کروانا تھا[38]۔

جوں جوں ندوۃ العلماء ترقی کی منزلوں سے گذرتا رہا توں توں اُس نے اپنے دایرہ کار میں وسعت پیدا کرنی شروع کر دی اور حسبِ ذیل امور کو اپنے اغراض و مقاصد میں شامل کر لیا۔

1۔ خصوصاً مکاتب کی اصلاح و ترقی اور عموماً عربی تعلیم کے کام کی اصلاح و ترقی۔

2۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مابین باہمی تنازعات کا خاتمہ، خصوصاً اہلِ حدیث[39] اور اہلِ سنت والجماعت کے مابین[40]۔

3۔ سماجی اصلاحات، اور

4۔ مسلمانوں کی روحانی تربیت کا نظم اور تبلیغ کے ذریعے اشاعتِ اسلام[41]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دارالعلوم میں ان مقاصد کی تکمیل کے لیے مبلغین کو تربیت دی جاتی تھی اور انھیں "اس تبلیغی کام" کے لیے ہندستان کے مختلف گوشوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اپنے ماہانہ ترجمان الندوہ کے ذریعے وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ نوجوان نسل پر اسلامی فکر اور جدید سائنس کے مابین پائی جانے والی ہم آہنگی کو واضح کریں۔ اس کے علاوہ کانپور میں ایک یتیم خانہ بھی قایم تھا جہاں یتیموں کو پرجوش مذہبی مبلغوں کی حیثیت سے تربیت دی جاتی تھی جس کے بعد انھیں اشاعتِ اسلام کے کام پر ہندستان کے مختلف گوشوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ ان تمام مساعی کی وجہ سے علمار عوام پر اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھ پائے۔ ان کے سمجھوتے کے باوجود اسلام میں نئے ترقی پسند رجحانات کو بہت کم باریابی نصیب ہوسکی لیکن ان کی نئی حکمتِ عملی کی وجہ سے ان رجحانات کو نئی زندگی ضرور نصیب ہوئی۔

اس سلسلے میں اُس غیر معمولی کتاب کی اشاعت کا حوالہ دینا ضروری ہے جس کی وجہ سے نہ صرف شبلی اور اُن کے مذہبی رفقا کی ڈھارس بندھی بلکہ سرسید اور ان کے ساتھیوں کی بھی۔ یہ کتاب تھی آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام یہ کتاب جیسا کہ اُس کے ذیلی عنوان سے ظاہر ہے "تاریخ اشاعت عقاید اسلامی" کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید اس کتاب کی اشاعت سے اس لیے خوش تھے کہ اس میں بھی انھی کے اس نظریے کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اسلام میں تنگ نظری اور بہیمیت کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے[42]۔ شبلی اور علمار کا نیا گروہ اس کے برخلاف اس کتاب کی اشاعت پر اس لیے خوش تھا کہ اس میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں صوفیائے کرام کے کارناموں پر کافی زور دیا گیا تھا۔ جیسا کہ آرنلڈ نے واضح کیا،

> "چنانچہ اپنی ابتدا ہی سے اسلام عملی اور نظری اعتبار سے ایک مبلغانہ مذہب رہا ہے۔ حضرت محمد صلعم کی زندگی اسی تعلیم کی آئینہ دار ہے اور آپ ہی کی حیاتِ طیبہ سے اُن مبلغینِ اسلام نے بھی رہنمائی حاصل کی ہے جنھوں نے کافروں کے دلوں میں نورِ ایمان کی شمعیں روشن کردیں۔ اسلام کی تبلیغی روح کو ہمیں نہ تو عقوبت شعاروں کے ظلم وستم میں تلاش کرنا چاہیے اور نہ مذہبی جنونیوں کے قہر وغضب میں اور نہ ہی اُس خیالی مسلمان جنگجو سپاہی کی شخصیت میں جس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہو اور دوسرے ہاتھ میں تلوار، بلکہ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تلاش ہمیں اُن مبلغوں اور تاجروں کے خاموش اور پرامن تبلیغی کام میں کرنی چاہیے جنھوں نے اپنے حریفوں سے دنیا کے ہر گوشے میں پہنچا دیا۔"

اسی بات کو واضح کرنے کے لیے آگے چل کر دنیا کے مختلف حصّوں میں مسلمان مبلغین کی تبلیغی سرگرمیوں کا اعلیٰ سطحی تحقیقی جایزہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے[43]۔ اب اگر ایسی کتاب جسے یورپ کے ایک عظیم اسکالر نے سپردِ قلم کیا ہو مسلمانانِ ہند کے دلوں کو گرما دے اور انھیں احساسِ طمانیت سے سرشار کر دے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔

اس کے باوجود علی گڈھ تحریک کے رہنماؤں اور علماء کے مابین اکثر سماجی اور مذہبی اصلاحات کے معاملے میں مابہ النزاع مسایل پیدا ہوتے ہی رہے تاہم ان مسایل پر کسی نہ کسی طرح یا تو "لو اور دو" کے جذبے کے تحت یا غیر ضروری اختلافی مباحث سے گریز کر کے فریقین قابو پاتے ہی رہے۔ اکثر تو ان اختلافات کو ضرورتاً یا ہنگامی حالات کے پیشِ نظر بالائے طاق رکھا جاتا رہا۔ اُس دور کی تحریریں گھسی پٹی کلاسیکل دلیلوں سے بھری پڑی ہیں جن کا مقصد اسی قسم کی باتوں کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا ہے۔

مثال کے طور پر فارسی مصرع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" (اگر دنیا تیرا ساتھ نہیں دیتی تو تو دنیا کے ساتھ ہو جا) یا عربی مقولہ "درمع الدھر کیف مادار" (اگر دنیا تیرے ساتھ نہ ہو تو تو دنیا کے ساتھ ہو جا) اس سے زیادہ مقبولیت اس قرآنی آیت کو حاصل تھی۔ "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم" (بیشک خدا اُس وقت تک کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو بدل نہیں ڈالتی) اسی خیال کو زیادہ موثر اور مقبول بنانے کے لیے حالی نے اِسے حسبِ ذیل اردو شعر کا قالب عطا کیا ہے:

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

چنانچہ مسلمانوں کے سماجی ڈھانچے میں جو تبدیلی ناگزیر ہو گئی علی گڈھ کے رہنماؤں نے وہ کر ڈالی بغیر اس بات کا لحاظ رکھے ہوئے کہ یہ تبدیلی اسلامی روایات کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے نزاعی مسایل کو پس پشت ڈال دیا گیا اور صلح جوئی کی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا۔ مزید برآں تاوقتیکہ انتہائی ضروری نہ ہو انقلابی نوعیت کی بنیادی تبدیلیوں سے احتراز کیا گیا۔ کئی ترقی پسندوں کا نقطۂ نظر بھی لازماً تنگ نظری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا شکار تھا اور ان کی انقلاب پسندی Radicalism بھی صرف سطحی نوعیت کی تھی۔

بہرحال سبھی "جدیدیت کے علمبردار" اپنی "عذرخواہی" یا "مغرب زدگی" سے مطمئن نہیں تھے۔ انگریزی دانی کے باوجود اُن میں کے بعض "جدیدیت پسند" حضرات اس بات کا پکا یقین رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی نجات اس میں مضمر ہے کہ وہ اپنے مذہب، تمدن اور ثقافت کے ساتھ وفادار رہیں۔ گو وہ لوگ جدید اصطلاحوں میں بات کرتے تھے لیکن ان کی تمام باتوں میں اسلام کے شاندار ماضی پر ہی زور دیا جاتا تھا۔ وہ کہہ اٹھتے "اے مسلمانو! کہاں ہیں تمہاری دلآویز صفات، زندگی کے ہر شعبے میں تمہاری برتری، تمہارے ایمان کی دہکتی آگ، تمہارے دولت کے انبار، تمہارے علم کے خزانے، تمہارا ناقابلِ تسخیر استقلال، تمہاری لاثانی خودکوشی اور تمہاری برق رفتار ترقی!" اگر مسلمان اپنے آباواجداد کے نقش قدم پر چلنے لگ جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اہلِ یورپ حتیٰ کہ انگریزوں سے بھی برتر ہو جائیں۔[44]

ہندستان کو انتہائی اضطراب و غصہ کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے وہ پوچھتے!

"اے سورج کی سرزمین! اے قوموں کو نگل جانے والی، اے رہزن حسنات و صفات، اے مسلم کاروانوں کی قزاق! کیا ہم اُنھیں اجداد کے وارث ہیں جن کے کھیل کود کا میدان تاتار سے زنجبار تک پھیلا ہوا تھا جن کی فاتحانہ فوج کشیوں سے مراٹھے اور راجپوت بخوبی واقف ہیں، جن کی فتح و نصرت کی تاریخ تیری چٹانوں اور دریاؤں پر کندہ ہے؟ کیا مسلمانوں کی آج وہی حالت ہے جسے تو صدیوں سے دیکھنے کی عادی رہی ہے؟ کیا ہم اُسی شاندار نسل کے وارث ہیں؟ آہ! غفلت، جہالت اور نفاق کی وبا! کیا یہی ہماری محنتوں کا ثمرہ ہے؟"[45]

اس قسم کے لوگ سرسید سے بہت کم مماثلت رکھتے تھے حالانکہ انھیں بھی مسلمانوں کی بیداری میں سرسید کی خدمات کا اعتراف تھا۔ لیکن ان کا اسلام اس حد تک جارح نوعیت کا تھا کہ سرسید اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ سرسید نے کبھی کھلے عام ایسے لوگوں کی مخالفت نہیں کی لیکن انھوں نے کبھی ان لوگوں کے خیالات کو پسند نہیں کیا اور نہ ہی اس اندازِ فکر کو پسند کیا جو یہ لوگ مسلمانوں کے مسایل کو حل کرنے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔

پانچ دریاؤں کی سرزمین (پنجاب) میں اُنھیں کام کرنے کے لیے ذرخیز زمین میسر آگئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاں 1885ء میں انھوں نے چھوٹے سے پیمانے پر لاہور میں انجمن حمایت الاسلام قایم کی اور بہال بہ سال محنت محنت کرتے رہے تاکہ ان کی تحریک دیگر صوبوں تک پھیل سکے۔ چنانچہ ہندستان کے کئی شہروں اور قصبوں میں اس انجمن کی شاخیں قایم ہوگئیں لیکن بجز لاہور کے کسی اور مقام پر اس انجمن کا دیرپا اثر ثابت نہیں ہوا دیگر مقامات پر ایک وقتی جوش وخروش ضرور پیدا ہوا جو جلد ہی فنا ہوگیا۔ لاہور میں البتہ اس تحریک نے بڑی تقویت حاصل کی۔ اس کے کیفیت نما [illegible] میں انجمن کے حسب ذیل اغراض ومقاصد بیان کیے گئے ہیں۔

(ا) اسلام پر لگائے جانے والے الزامات کا زبانی اور تحریری طور پر معقول اور مدلّل طریقے سے جواب دینا اور اس کی تبلیغ واشاعت کے کام کو آگے بڑھانا۔

(ب) مسلم طلبا اور طالبات کو موزوں اور ضروری تعلیم سے آراستہ کرنا تاکہ انھیں اپنی صداقت سے منحرف ہونے سے باز رکھا جا سکے۔

(ج) بہ حدِ مقدور مسلمان یتیم بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری قبول کرنا اور تمام غریب مسلمان بچوں اور بچیوں کو ممکنہ تعلیمی امداد بہم پہنچانا تاکہ وہ دیگر مذاہب والوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔

(د) مسلمان قوم کی سماجی، اخلاقی اور ذہنی حالت کو سدھارنا اور ان اقدامات کو روبہ عمل لانا جن کے ذریعے قوم کے مختلف فرقوں کے مابین اخوت اور بھائی چارگی کے جذبات پیدا ہوں اور پروان چڑھیں، اور

(ھ) مسلمانوں پر برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری کی افادیت کو واضح کرنا۔[46]

اس کا بھی ذکر کیا گیا کہ "اِن مقاصد کی تکمیل کے لیے انجمن مبلغین کا تقرر کرے گی، ماہنامے کا اجرا کرے گی، تعلیمی ادارے اور یتیم خانے قایم کرنے کے علاوہ دیگر ذریعوں کو بھی روبکار لائے گی۔" اس کے علاوہ ہر سال انجمن ایک قسم کا میلہ منعقد کرتی رہی جس میں شمال مغربی ہندستان کے ہزاروں مسلمان شریک ہوتے رہے جن میں نہ صرف اسلامی نغمے گائے جاتے اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں بلکہ مشہور ومعروف علماء اور اسکالر اسلام کے شاندار ماضی کے بارے میں طویل مباحثے اور تقریریں بھی کیا کرتے تھے جنھیں بعد ازاں کتابچوں کی شکل میں چھاپ کر دیگر کتابوں اور رسالوں کے ساتھ ملک کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طول و عرض میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ انجمن نے مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے کے معاملے میں نمایاں خدمات انجام دیں اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں چند مدارس اور کالج بھی قایم کیے۔ مزید برآں اس نے تعلیم نسواں کے مسئلے کو ہاتھ میں لیا اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدارس اپنے زیر انتظام چلانے لگی۔

انجمن کی سب سے اہم کامیابی یہ ہوئی کہ جلد ہی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اپنے مذہب کے بارے میں دوبارہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ایک واقف کار عیسائی مصنف نے انجمن کی دیگر کامیابیوں کا جایزہ ان الفاظ میں لیا ہے:

> مساجد کی مرمت کی گئی ہے اور نمازیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش میں بھی انھیں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ عیسائی مشنریوں کے خلاف شروع کیے گئے بائیکاٹ کے نتیجے میں عیسائی گرجا گھروں اور اسکولوں میں مسلمانوں کی حاضری گھٹ گئی ہے اور اس طرح بلاشبہ عیسائیت کی تبلیغ کے متعدد دروازے بند ہو گئے ہیں۔[47]

تاہم انگریزی تعلیم سے آراستہ مسلمان نوجوانوں کو اسی قسم کی کسی انجمن سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اگرچہ اُن میں سے بعض لوگ انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسوں کے موقعوں پر میسّر آنے والی سہولتوں کو اپنے ذاتی نقاط ہائے نظر کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ ایسے لوگوں میں اقبال کا شمار بھی ہوتا ہے جو بعد کو شہرت کے بام عروج پر جا پہنچے لیکن ان دنوں بھی انھیں کافی مقبولیت حاصل تھی کیوں کہ ان کی نظموں کو ہزاروں شرکائے جلسہ نہایت توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتے تھے۔ اقبال اُن دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اور اپنے دوست عبدالقادر (جو بعد میں سر کے خطاب سے بھی نوازے گئے) کے جاری کردہ ماہنامہ مخزن میں کم و بیش پابندی سے لکھتے رہتے تھے۔

اپنے ایک ابتدائی مقالے میں، جو مخزن میں شایع ہوا تھا، اقبال نے مسلم سماج میں اصلاحات کے مسئلے پر کافی تفصیلی بحث کی ہے۔ جاپان کو مثال قرار دیتے ہوئے، جو اُن دنوں ہر میدان میں تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا، انھوں نے اپنے ہم مذہبوں پر زور دے کر یہ بات واضح کی کہ انھیں دو اُمور پر اپنی توجہات کو مرکوز کر دینا چاہیے۔ تعلیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سماجی اصلاح۔ سماجی اصلاح کے بارے میں انھوں نے کہا تھا:

مسلمانوں کے مابین سماجی اصلاح کا مسئلہ دراصل ایک مذہبی مسئلے کے عملی اظہار کا دوسرا نام ہے۔ مزید برآں ہم اپنی زندگی کے کسی شعبے کو بھی مذہبی اصولوں کی گرفت سے آزاد نہیں رکھ سکتے۔[48]

اقبال کو اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ جدید عہد کی انقلابی تبدیلیوں کے باعث شریعت اسلامی کی تشکیل نو ازبس ضروری ہوگئی ہے۔ قدیم تشریحات اُس زمانے کے حسبِ حال تھیں جب انھیں پیش کیا گیا تھا لیکن موجودہ دور میں وہ فرسودہ ہو چکی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے واضح کیا کہ اسلام کو اُس کے حسبِ حال اظہار کے لیے نہ صرف یہ کہ ایک نئے علم الکلام کی ضرورت ہے بلکہ ایک عظیم فقیہہ کی بھی ضرورت ہے جو نئے حالات کی روشنی میں اسلامی قوانین کی صحیح تشریح پیش کر سکے۔ اُن دنوں مسلمانوں میں کسی ایسے عظیم مفکر کے پیدا ہونے کے امکانات بہت ہی کم تھے۔ لہٰذا اقبال نے مشورہ دیا تھا کہ اس کام کو پوری قوم اجتماعی طور پر انجام دے جس کے لیے اس عظیم کام کو کئی دہائیوں پر اور اگر ضرورت پڑے تو ایک صدی پر تقسیم کر دیا جانا چاہیے۔

فوری طور پر موجودہ دور کے لیے اقبال نے کئی دقیع اصلاحات کا مشورہ دیا جیسے کہ خواتین کے خواتین کے حقوق کا جایز تحفظ اور ان کی تعلیم کا مسئلہ۔ وہ پردے کو ختم کرنے کے خلاف تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندستان میں پردے کے رواج کو اخلاقی بنیادوں پر رائج کیا گیا ہے "اس لیے یہ یک جنبش قلم اسے ختم کر دینا" میرے خیال میں" قوم کے لیے مضرت رساں ثابت ہوگا" تعدد ازدواج کا طریقہ ان کے خیال میں اپنی افادیت کے دن پورے کر چکا ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے معاملے میں وہ بہت سی فرسودہ رسموں اور رواجوں کو خیرباد کہنے کے حق میں تھے۔ مثال کے طور پر وہ سمجھتے تھے کہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء کے حکم پر عمل پیرا ہونا عملاً ممکن نہیں ہے۔ وہ منگنی کے طریقے کے خلاف نہیں تھے بشرطیکہ وہ یورپین کورٹ شپ Courtship کے نمونے پر کی جائے۔ تعلیم کے میدان میں اقبال چاہتے تھے کہ صنعتی تعلیم کو عام طور پر فروغ دیا جائے جس کے بغیر، بقول اُن کے، مسلمانوں میں کسی قسم کی ترقی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال نے اس سلسلے میں کوئی عملی خدمت انجام نہیں دی۔ وہ یا تو اپنے کالج میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درس وتدریس میں مشغول رہے یا ولولہ انگیز نظمیں لکھتے رہے جن کی وجہ سے بلاشبہ مسلمانوں میں نئے حالات سے نبرد آزمائی کا حوصلہ پیدا ہوا۔ نئے سماجی افکار کی مسلمانوں میں اشاعت کرنے اور حتی الامکان انھیں عملی روپ عطا کرنے کا کام خواجہ الثقلین اور نیاز احمد جیسے نوجوان مسلمان گریجویٹ حضرات کے کاندھوں پر آن پڑا۔ اس غرض سے یہ حضرات محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے منتظمین سے ملتمس ہوئے کہ وہ اپنے تحت ایک شعبۂ اصلاح بھی قایم کریں جس کے اغراض ومقاصد میں علاوہ دیگر باتوں کے حسب ذیل امور بھی شامل ہوں،

(1) شادی بیاہ اور تجہیز وتکفین کے معاملات میں فضول خرچی سے دریغ کرنا، بطور خاص لباس اور زیورات کے سلسلے میں۔

(2) پیشہ ور بھکاریوں اور صحت مند فقیروں کو خیرات کا نہ دینا اور ان کی توانائیوں کو بامقصد رُخ کی جانب موڑ دینا۔

(3) بچوں کے سنِ بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی ان کی شادی کر دیے جانے سے اُن کے والدین کو باز رکھنا اور ایسی شادیوں کی روک تھام کرنا جو فریقین کی منشا کے خلاف کی جارہی ہوں۔

(4) بچوں اور بچیوں کو زیورات اور زر وجواہر کے استعمال کی اجازت نہ دینا تاکہ ان کے دلوں میں اِن اشیاء کا موہ نہ پیدا ہو۔

(5) جدید طرز زندگی کو اپنانے کے سلسلے میں جن فضول خرچیوں کی عادت پڑ چکی ہو ان سے احتراز کرنا۔

(6) اس امر کا خیال رکھنا کہ ایک بھی مسلمان بے روزگار نہ رہنے پائے اور اس امر کا اطمینان کرنا کہ ہر وہ مسلمان جس میں دوسروں کو ملازم رکھ پانے کی حیثیت موجود ہو وہ اپنے ایک عزیز یا دوست کو لازماً ملازمت عطا کرے۔

اگرچہ یہ پورا پروگرام منفی نوعیت کا تھا تاہم اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن برائیوں کی جانب شعبۂ اصلاح نے اس قدر واضح اشارہ کیا تھا وہ حقیقی نوعیت کی تھیں جن کا فوری تدارک کیا جانا ازبس ضروری تھا[49]۔ ان دنوں مسلمانوں کا ایک غریب سے غریب خاندان بھی شادی بیاہ اور تجہیز وتکفین کے معاملات میں ناقابلِ برداشت اخراجات کا متحمل ہوا کرتا تھا۔ مسلمانوں کو مزید معاشی تباہ حالی سے بچانے کے لیے لازمی تھا کہ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قسم کے اخراجات پر روک لگائی جائے[50]۔ وہ متمول مسلمان جو اس قسم کی فضول خرچیاں کرتے رہتے ہیں کیوں نہ وہ لہو و لعب پر ضایع کی جانے والی رقومات کو اپنے غریب بھائیوں کی بھلائی کے لیے عطیے میں دے دیا کریں؟ کیا ان کا یہ فعل اسلامی روح اور قرآنی منشار کے مطابق نہ ہوگا؟ بعض حلقوں میں اس اپیل کا اچھا اثر ہوا لیکن وسیع پیمانے پر اسے شرفِ قبولیت حاصل نہ ہو سکا۔ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں پر اس بات کا بہ نسبت دوسرے طبقوں کے زیادہ اثر مترتب ہوا۔ اسی وجہ سے شعبۂ اصلاح کے رہنماؤں نے اس طبقے میں اپنے کام کو جاری رکھا۔

ان خیالات کی ترویج کے لیے **عصرِ جدید** نامی ایک رسالہ جاری کیا گیا جس کے صفحات میں مسلمانوں کے سماجی مسایل کے تعلق سے متعدد دلچسپ نزاعی بحثیں چھڑیں۔ مثلاً اس رسالے میں پردہ، مسلمانوں کی مذہبی تعلیم، جدید دور میں موزوں اور عمدہ قسم کی شادی جیسے موضوعات پر مضامین شایع ہوتے رہے۔ لیکن اس رسالے میں شایع ہونے والے مضامین میں شاید سب سے دلچسپ مضمون وہ تھا جو اسلامی لباس کے تعلق سے مولوی حافظ سید سجّاد علی نے لکھا تھا[51] جس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ اسلامی لباس نام کی کسی شئے کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے اس لیے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضے کے مطابق اگر مسلمان بھی انگریزی سوٹ، جیکٹ اور پتلون پہننے لگیں تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے[52]۔ اس بات پر سرسید نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور اکثر انگریزی سوٹ کے ساتھ سر پر ترکی ٹوپی پہننے لگے۔ ان کے نزدیک لباس کی یہ ترکیب اسلامی کہلائی جا سکتی تھی کیوں کہ اُن دنوں ترکی میں اس کا عام رواج تھا۔ مسلمانوں میں عام طور پر اس خیال سے اتفاق پایا جاتا تھا گو بعض انتہا پسند اب بھی قدیم لباس یعنی شیروانی اور پاجامے کے استعمال پر زور دیتے تھے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بعض یوروپین حکام بھی مسلمانوں اور دیگر ہندستانیوں کے انگریزی لباس کے استعمال کو پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے[53]۔

جن بے شمار میدانوں میں عملاً اصلاحی کام کی ابتدا کی گئی اور جہاں کسی قدر کامیابی بھی نصیب ہوئی اُن میں حسبِ ذیل سماجی اور مذہبی رسموں اور رواجوں کا ذکر لازماً کیا جانا چاہیے جن کی تکمیل کو شعبہ اصلاح کی انتھک جدوجہد کے باعث، سادہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارزاں' اور بڑی حد تک غیر رسمی بنایا جا سکا ۔

(1) شادی بیاہ ؛ خاص طور پر برات' رخصتی اور جہیز کی رسوم ۔
(2) پیدائش ؛ خاص طور پر عقیقہ ' بسم اللہ اور ختنہ کی رسمیں ۔
(3) اموات ؛ خاص طور پر نوواں' دسواں' چہلم اور برسی کی رسومات ۔
(4) دیگر سماجی اور مذہبی تقاریب جیسے کہ عید ' محرم ' محفل فاتحہ' منگنی وغیرہ ۔

یہ رسمیں امراء اور غرباء دونوں میں یکساں طور پر مروج تھیں مصلحین نے واضح کیا کہ کس طرح اس قسم کی بیشتر رسمیں اسلامی تعلیمات کے مغایر تھیں اور کیونکر اُن سے چھٹکارا پایا جا سکتا تھا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس خصوص میں مصلحین کو کسی قدر کامیابی ضرور حاصل ہوئی لیکن ظاہر ہے کہ جب تک لوگوں کو مناسب طور پر تعلیم سے آراستہ نہیں کیا جاتا اور انھیں ان کی حرکات کے بے وقعت ہونے کا احساس نہیں دلایا جاتا اس وقت تک کسی خاطر خواہ کامیابی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی ۔

اس باب کے اختتام سے پہلے ضروری ہے کہ ہم قادیانی تحریک کا تذکرہ بھی کرتے چلیں جسے مرزا غلام احمد[54] نامی ایک پنجابی مولوی نے شروع کیا تھا ۔ ایک روز انھوں نے اعلان کر دیا کہ " اس عہد میں میرا نزول محض مسلمانوں کی اصلاح کے لیے نہیں ہوا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ میرے ذریعے تین عظیم اقوام یعنی ہندوؤں' مسلمانوں اور عیسائیوں کی اصلاح کا کام لے[55] پہلے پہل تو انھوں نے خود کو مسلمانوں اور عیسائیوں ہی کا مسیح موعود قرار دینے پر اکتفا کیا لیکن بعد ازاں انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہندوؤں کے بھی اوتار ہیں ۔ ہندوؤں اور عیسائیوں پر ان کا اثر نہ ہونے کے برابر پڑا لیکن ہندستانی اسلام پر اس تحریک نے پریشان کن اثرات چھوڑے ۔

ان کی تعلیمات میں کئی اختراعات پائی جاتی تھیں ۔ انھوں نے مسلم راسخ العقیدگی اور یورپین تہذیب کے مابین خود کے لیے راہ نکالنی چاہی جس کے لیے بعض اوقات انھیں مضحکہ خیز قسم کی بھونڈی بازیوں سے کام لینا پڑا ۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اسلامی تعلیمات میں بنیادی ترمیمات کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ۔ مثلاً انھوں نے ہر قسم کے جہاد کی مخالفت کی ۔ انھوں نے غازیوں کو کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور ایسے مہدی کے ظہور سے انکار کیا جو اس دنیا میں آ کر مدی کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلاف اعلانِ جنگ کر دیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ قرآن فوری طور پر غلامی کے طریقے کو ختم کرنا نہیں چاہتا بلکہ یہ کام تدریجی مراحل میں انجام دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح انھوں نے تعدد ازدواج، پردہ اور طلاق کے طریقوں کو اس لیے جایز قرار دیا کہ ان کے خیال میں یہ چیزیں سماجی توازن برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔

مرزا صاحب کے دعووں کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی حلقوں میں شدید نوعیت کے قضیات اُٹھ کھڑے ہوئے[56]۔ دنیائے اسلام کے ہر گوشے سے اس فتنے کے کڑے الفاظ میں مذمت کی گئی۔ مرزا کو کافر، جدّال، مُلحد، مُرتد، کذّاب، دغاباز وغیرہ جیسے القاب سے یاد کیا گیا۔ ایک مرحلے پر تو حکومتِ پنجاب کو ان سے کہنا پڑا کہ وہ فتنہ انگیز پیشین گوئیوں سے احتراز کریں۔ چنانچہ اُنھوں نے بلا چوں وچرا اس حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا[57]۔

تاہم اپنی متعدد کوتاہیوں کے باوجود مرزا صاحب اپنے کام میں مصروف رہے اور جلد ہی اپنے گرد سینکڑوں مسلمانوں کا حلقہ بنا لیا جو ایک نئے جوش و خروش سے سرشار تھے اپنے عقاید کی تبلیغ کے لیے انھوں نے ایک ہائی اسکول اور چند دیگر ادارے قایم کیے اور متعدد اخبارات جاری کیے جن میں ایک الحکم تھا۔ جو اردو زبان میں شایع ہوتا تھا اور دوسرا اخبار Review of Religions تھا جو بہ زبان انگریزی شایع ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد رسالے، کھلے خطوط اور چیلنج بھی تحریر کیے۔ تاہم مذہبی فکر اور تحریک اصلاح کو ان کی دین خالص منفی نوعیت کی تھی۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کی جذباتیت کو کافی ہوا ملی اور پتہ چلا کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے کا نتیجہ کس قدر بھیانک نکل سکتا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں میں بعض اصلاحات رائج کرنا چاہیں لیکن مذہب کے سچے پرستاروں میں شرفِ قبولیت حاصل کرنے کے لیے یہ امر لازمی ہے کہ مجوزہ اصلاحات اسلامی ڈھانچے کے اندر ہی رہ کر کارفرما ہوں نہ کہ اس سے باہر۔ اگر کوئی مصلح اس شرط کو پورا نہیں کرتا تو خواہ وہ کتنا ہی ذہین اور قابل کیوں نہ ہو مستقبل میں کسی کامیابی کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ سرسید نے اس نکتہ کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ وہ اسی اصول پر کاربند رہے اور انھیں بڑی حد تک کامیابی بھی نصیب ہوئی جبکہ مرزا غلام احمد نے سرے سے اس ڈھانچے ہی کو تبدیل کر دینا چاہا جس کی وجہ سے وہ اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہ ہو پائے تھے کہ منہ کے بل جا گرے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

ساتواں باب (مذہبی اور سماجی اصلاحات)

1 ۔ اصول نسخ یعنی ایک حکم خداوندی کے ذریعے دوسرے حکم کی تنسیخ کے نظریے کو دو عظیم مسلم علماء فخرالدین رازی اور اسماعیل بخاری کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

2 ۔ عیسائیوں کی مقدس کتاب کا قرآنی نام۔

3 The Quran, V 56

4 Ibid, III, 64

5 ۔ "اللہ نے کہا، اے عیسیٰ! بے شک میں تجھے موت کا مزا چکھاؤں گا اور تجھے اپنے پاس بلالوں گا۔" (III, 48)۔ لہٰذا علماء کی مسلمہ تفسیر کے مطابق یہودی عیسیٰ علیہ السلام کو زندگی سے محروم نہیں کر سکتے۔ "نہ انھوں نے اسے قتل کیا اور نہ ہی مصلوب کیا بلکہ اُس کی جگہ ویسی ہی شباہت کا دوسرا شخص بھیج دیا گیا تھا۔" (IV, 156)۔ اس واقعے کو سب سے زیادہ قابلِ قبول پیرائے میں الکلبی نے بیان کیا جس نے ابی صالح سے نقل کیا جس نے ابی عباس سے نقل کیا۔ اس کے علاوہ وہاب اور مقتدر کے فاضلانہ بیانات بھی ہیں جو اوّل الذکر سے کسی قدر مختلف ہیں۔

6 ۔ ملاحظہ ہو E. Rehatsek کا مضمون بعنوان The Life of Jesus According to the Quran and Muslim Tradition

مطبوعہ Calcutta Review بابتہ 1881ء صفحات 34-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

7 ۔ سرسید : آخری مضامین (اردو متن) 29

8 ۔ ملاحظہ ہو Sir William Muir: The life of Muhammad
III, 226 — 31, 242 — 43, IV 158-64, 302, 24

9 ۔ اسلام میں اہلِ سنت والجماعت کے حسب ذیل چار مذاہب فقہ ہیں :
(1) حنفی (2) شافعی (3) مالکی اور (4) حنبلی ۔

10 ۔ ملاحظہ ہو Chiragh Ali : A critical exposition of the
Popular Jihad pp. 16-34, 91-114, 116-61

11 Chiragh Ali : The proposed political legal and
Social Reforms in the Ottoman Empire & the
Mohammadan States

12 Ibid xxxv — vi

13 Ibid 3 — 28

14 ۔ ملاحظہ ہو امیر علی کی کتاب The Spirit of Islam مزید ملاحظہ ہو اُنھی کی کتاب
A critical examination of the life and teachings of
Muhammad 1 — 25, 171, 96, 197-16, 310, 46

15 ۔ جیسا کہ ممتاز عالم ڈی۔ بی۔ میکڈونلڈ D. B. Macdonald نے کہا ہے ،
"سید صاحب اس کی وضاحت کرنے کے مرحلے میں ہیں اور یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ انھیں
ایسا کرتے وقت بے باک اور سیدھی سادی خوش تدبیری کی قربانی دینی پڑتی ہے اور
بڑی حد تک انخفائے حق Suppressio Veri کے مرتکب بھی ہوئے ہیں۔

16 ۔ اپنی تاریخ کی کتاب A short History of Saracens کے دیباچے میں امیر علی
نے انتہائی افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ " مغربی ممالک میں تو ان کی تاریخ کا علم بعض ماہرین
کی حد تک ہی محدود رہ سکتا ہے جبکہ ہندستان میں، جو ایک دور میں ان کی تہذیب کے
زیر اثر رہا ہے، یہ علم تقریباً معدوم ہے۔"

17 ۔ ملاحظہ ہو سرسید کا مضمون بعنوان Essay on the Mohammadan
Theological Literature

18 ۔ سرسید کے مذہبی فلسفے کو دیکھئے Wilfred Cantwell Smith اس طرح بیان کرتا ہے " لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُن کی فکر (ہم اسے نظام (System) نہیں کہہ سکتے) ضمیر اور فطرت کے تصورات سے زیادہ متاثر ہے۔ اُن کے نزدیک ضمیر انسان کے کردار کی اُس کیفیت کا نام ہے جو تربیت اور تفکر Reflection کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اسے ہم انسان کا حقیقی رہنما یا رسول کہہ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تغیر پذیری کا شکار ہو سکتا ہے اس لیے لازم ہے کہ تاریخی پیغمبر یا رسول وقتاً فوقتاً اس کی اصلاح کرتے رہیں۔ کسی پیغمبر کے برحق ہونے کو جانچنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اُس کی تعلیمات کا مقابلہ قوانین فطرت کے ساتھ کر لیا جائے اگر دونوں میں یکسانیت پائی جائے تو ہمیں اُن تعلیمات کو قبول کر لینا چاہیے۔ انھوں نے ایک فرانسیسی ادیب کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ اسلام چونکہ اپنے بانی کے تعلق سے کسی قسم کی کرشماتی یا معجزاتی طاقت کا دعویٰ نہیں کرتا اس لیے صحیح معنوں میں یہ ایک عقلی مذہب ہے۔" (ملاحظہ ہو Islam and Modern Thought کی کتاب Wahrecht صفحہ 5 مزید ملاحظہ ہو سرسید کی تفسیر جلد اوّل صفحہ 238)

19۔ ملاحظہ ہو شبلی کی مقالاتِ شبلی (اردو متن) صفحہ 64۔ مزید ملاحظہ ہو سرسید کی تفسیر پر حالی کا تنقیدی تبصرہ جس میں انھوں نے سرسید کے مذہبی نظریات سے اختلافات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ (حیاتِ جاوید ضمیمہ V)

20۔ ملاحظہ ہو سرسید کا مضمون بعنوان "شقِ صدر اور معراج" یعنی آنحضرت کے سینۂ مبارک کا کھولا جانا اور آپ کا سفرِ معراج۔

21۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ان کا جنگ بدر کے تعلق سے وہ ذہانت آمیز دفاع جو انھوں نے اپنی تفسیر میں یسئلونک عن الانفال کے متن کی تشریح کرتے ہوئے پیش کیا ہے (اردو متن) IV 1-21

22۔ مثال کے طور پر سرسید نے قرآنی متن ینفخ فی الصور کی تفسیر کرتے ہوئے ان الفاظ کے لفظی معنوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور تمام واقعے کو محض ایک کنایہ قرار دیا۔ (تفسیر III 52-63)

23۔ ملاحظہ ہو قرآنی آیت واحل اللہ البیع وحرم الربوا کے بارے میں سرسید کی تفسیر (اردو متن) (I 230-313)

24۔ ہانس کون Hans Kohn نے "عظیم جمال الدین الافغانی" کو ایک ایسی شخصیت قرار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیا ہے جس نے "اسلام میں جدید سیاسی شعور بیدار" کے تقریباً مشرقی ممالک میں اپنی شخصیت کے اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں" Hans Kohn: A History of Nationalism in the East

25 ۔ ملاحظہ ہو الافغانی کا مضمون قاہرہ کے عربی اخبار العروۃ الوثقیٰ کے 28/ اگست 1884ء کے شمارے میں۔

26 ۔ الافغانی کے اردو سوانح نگار کے بموجب "اگرچہ شیخ زیادہ تر اسلام ہی کی خدمت میں منہمک رہا کرتے تھے لیکن جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔ ان کا پیغام ہمیشہ دونوں قوموں کے لیے ہوا کرتا تھا..... اُنھیں اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ ہندستان کی تقدیر کا تعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کی بیداری اور ترقی کے ساتھ یکساں ہے۔ انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں اسی بات پر زور دیا ہے جو عروۃ الوثقیٰ میں شایع ہوئے (قاضی محمد عبدالغفار: (قاضی محمد عبدالغفار: آثارِ جمال الدین الافغانی۔ اردو متن 55-120)

27 ۔ ملاحظہ ہو تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمان (اردو متن)

28 ۔ ملاحظہ ہو تھیوڈور مورین کی

29 ۔ اس موقعے پر کی جانے والی ضیافت اور تقاریر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 11/ جنوری 1877ء کا پایونیر

30 Edward Carpenter: From Adam's Peak to Elephanta

31 ۔ ملاحظہ ہو 14/ نومبر 1897ء کے Aligarh Institute gazette میں سرسید کے ارشادات .....

32 ۔ سرسید کے مکمل اداریے کے انگریزی ترجمے کو 18/ نومبر 1893ء کے Bengalee میں شایع کیا گیا۔

33 Mustafa Khan: An apology for the New Light-

The New Light - in these despatches appears to me to be as much as the Britons were immediately after the Romans had left them to themselves between the barbarians and the deep sea - wedged between Europeans and the majority of their own

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

co-religionists, their conclusions is by no means enviable

Ibid 9

34 - ملاحظہ ہو شبلی کا وہ خطبہ جو انھوں نے 12 / اپریل 1895ء کو ندوۃ العلماء کے افتتاحی اجلاس میں دیا تھا جس میں مسلم سماج میں علماء کے مرکزی کردار کا جایزہ لیا گیا (رسایل شبلی اردو متن۔ صفحات 3-8)

35 - خلاصۂ کارروائی یا ذوالسالہ (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی 1886ء تا 1897ء کی روئیداد) مرتبہ مہدی علی خاں (اردو متن) 62-64 مزید ملاحظہ ہو اس واقعے پر کی گئی سید محمود کی تقریر Ibid 62-64

36 The Moslem Chronicle مورخہ 7 / مارچ 1895ء۔ اس اخبار نے ندوۃ العلماء کو "اُن مولویوں اور محدثوں کی کانفرنس قرار دیا جنھوں نے اب تک انگریزی تعلیم کی بڑی سختی سے مخالفت کی تھی"

37 - ملاحظہ ہو سکسینہ کی A History of Urdu Literature 190-91

38 - The Moslem Chronicle مورخہ 12 / نومبر 1898ء

39 - عرب مصلح عبدالوہاب کے ہندستانی پیرو۔

40 - راسخ العقیدہ سنی جو اسلام میں بنیادی تبدیلیوں کے مخالف ہیں۔

41 - تبدیلیٔ مذہب کے نقطۂ نظر سے اسلام کی اشاعت۔

42 - اس کتاب کی اشاعت پر سرسید اتنے زیادہ خوش تھے کہ وہ چاہتے تھے ہر تعلیم یافتہ نوجوان کو اس کا ایک ایک نسخہ تحفتہً پیش کریں۔ (سرسید: خطوط: اردو متن 311)

43 - T.W. Arnold: Preaching of Islam صفحہ 4 بطور خاص ملاحظہ ہو باب "ہندستان میں اشاعت اسلام" صفحات 411-208

44 - ملاحظہ ہو خواجہ ضیاء الدین کی کتاب Mohammadan India: (It's today and Tomorrow) P. 9-12

45 - اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر خواجہ ضیاء الدین کی اُس تقریر کا اقتباس جو انھوں نے 20 / جنوری 1897ء کو لاہور کے مقام پر انجمن حمایت اسلام کے بارھویں سالانہ جلسے میں کی تھی (مزید ملاحظہ ہو مندرجہ بالا صفحات 10-9)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

46 ۔ ملاحظہ ہو محمد شاہ دین کا مضمون بعنوان Muhammadan Societies مطبوعہ Indian Magazine in the Panjab. بابتہ اپریل 1888ء 186 - 92.

47 Report of the Madras Decennial Missionary Conference صفحہ 334

48 مخزن ۔ مارچ 1905ء

49 ۔ ملاحظہ ہو سلطان احمد کا مضمون بعنوان Colonies and their Reforms مطبوعہ عصرِ جدید بابتہ ستمبر، اکتوبر اور نومبر 1904ء ۔ مزید ملاحظہ ہو اسی مضمون پر 16 جنوری 1902ء کے Times of India, Mail Ed. کا ادارتی تبصرہ

50 ۔ ملاحظہ ہو فروری 1904ء کے عصرِ جدید میں نذیر احمد کا مضمون بعنوان Our New and old Extravagances.

51 ۔ یہ تنازع کافی پرانا تھا ۔ 1890ء میں نظام کے ہائی کورٹ کے ایک جج میر اقبال علی نے ایک مشہور و معروف اردو رسالے محسن میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ بات زور دیکر کہی گئی تھی کہ مسلمان یورپی لباس کو قبول کرلیں ۔ اقبال علی کے اس "غیر اسلامی رویے" کو کافی ہدفِ ملامت بنایا گیا ۔ خصوصاً آزاد کے مدیر نے اس پر کڑی تنقید کی ۔

52 ۔ عصرِ جدید بابتہ جولائی 1904ء ۔ مزید ملاحظہ ہو منشی جمال احمد مدیر ہمدرد کا مضمون جو عصرِ جدید کے اپریل 1904ء ——— کے شمارے میں شایع ہوا ۔

53 ۔ لارڈ ڈفرن اور لارڈ کرزن اُن انگریزوں میں شامل تھے جو ہندستانیوں کے انگریزی لباس پہننے کا مذاق اُڑایا کرتے تھے ۔ اس سلسلے میں ابتداً سرسید کو بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ (ملاحظہ ہو حالی ، حیاتِ جاوید، اردو متن)

54 ۔ دورِ جدید میں پیدا ہونے والے مذہبی تضیوں میں مرزا صاحب کے کردار کا صحیح تخمینہ کرنے کے لیے ملاحظہ ہو Gairold کی کتاب Mirza Ghulam Ahmad

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

The Review of Religions, November, 1904

۔ سرسید کو البتہ اس قسم کے قضیات سخت ناپسند تھے چنانچہ انھوں نے اپنے نجی خطوط میں اپنے احباب سے التماس کی تھی کہ وہ اس "نبی" کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ ملاحظہ ہو سرسید کے خطوط (اردو متن) 321-42

۔ اس ضمن میں ملاحظہ ہو مرزا صاحب کا وہ بیان جو لاہور کے اخبارِ عام کے 17 مارچ 1893ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آٹھواں باب

معاشی تبدیلیاں

دیگر میدانوں کے ساتھ ہی ساتھ ہندستان کے معاشی میدان میں بھی 1825ء کے لگ بھگ متعدد تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں جس کی کئی وجوہات تھیں۔ اوّل تو یہ کہ انگریزی حکومت کے قیام کے باعث یہ ملک مغرب کے کئی جدید معاشی نظریوں اور نئے عملی طریقوں سے واقف ہوا۔ دوم یہ کہ رسل و رسائل کے ذریعوں میں زبردست انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں، سوم یہ کہ برطانوی صنعت کار کاروباری میدان میں اُتر آئے اور آخری وجہ یہ کہ مال اور عدلیہ کے محکموں کی تشکیلِ جدید عمل میں آئی۔ اگرچہ یہ تبدیلیاں صدی کے آغاز ہی سے قدیم معیشت پر آہستہ آہستہ اثر انداز ہو رہی تھیں لیکن ان کا مجموعی اثر ابتداً اس شدت کے ساتھ محسوس نہیں کیا گیا جتنا کہ زیرِ تحقیق مدت کے آخری ایام میں محسوس کیا گیا جن دنوں بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا کہ ہندستان صنعت کاری کے میدان میں ان تمام تبدیلیوں کے ساتھ اُتر پڑا ہے جو اس عمل کے نتیجے میں پیداوار اور تبادلۂ زر کے طریقوں کے لیے ناگزیر ہو جاتی ہیں۔

تاہم یہ اس بات کا محل نہیں ہے کہ ہم یہاں قدیم و جدید معاشی ڈھانچوں کے ناگزیر تضاد کو واضح کر سکیں۔ ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ ہم اس تغیر کی مکمل طور پر وضاحت کر سکیں اور یہ بتلا سکیں کہ کس طرح اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی متعلقہ حالت متاثر ہوئی۔ حالانکہ یہ کام خاصا دقت طلب ہے کیوں کہ فرقہ جاتی نقطہ نظر سے جایزہ لینے کے لیے ہمارے پاس نہ تو کوئی اعداد و شمار موجود ہیں اور نہ کوئی دوسرا دستاویزی ریکارڈ موجود ہے جو ان عظیم معاشی تغیرات پر روشنی ڈال سکے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے کہ اس دور میں دو قسم کی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا جن میں باغ لگانا اور فیکٹریاں قایم کرنا شامل ہے۔

صنعتِ باغبانی شروع ہی سے انگریزوں کے تصرف اور ملکیت میں رہی۔ 1860ء کے بعد اِن باغات میں کافی اضافہ ہوا اور ایک طرح سے اُن کے مالکوں کو ہندستان میں چائے کافی، نیل اور پٹ سن کی صنعتوں پر اجارہ داری حاصل ہوگئی۔ اپنی حکومت کے ابتدائی مرحلوں میں تو یورپینوں کا عمل دخل صرف بیرونی تجارت کی حد تک محدود رہا لیکن جب انھوں نے باغات کی صنعت میں اپنا سرمایہ لگانا شروع کیا تو ہندستان کی معاشی ترقی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ ہندستانی دولت اور ذرائع و وسایل کے استحصال کے لیے مسابقت شروع کر دی۔

جدید ہندستان کی دو سب سے اہم صنعتیں کپاس اور پٹ سن رہی ہیں۔

ہندستان کا پہلا سوتی کارخانہ 1851ء میں بمبئی کے قریب قایم ہوا۔ لیکن اس صنعت کی ترقی سست رفتاری کا شکار رہی۔ چنانچہ 73-1872ء تک صرف 18 ملیں بمبئی میں اور 2 بنگال میں قایم ہو پائیں۔ لیکن 1879ء کے آخر تک ہندستان میں سوتی کارخانوں کی تعداد 56 تک پہنچ گئی جس میں پچاس ہزار مزدور کام کرنے لگے۔

پٹ سن کی صنعت خاص طور پر بنگال ہی کی حد تک محدود رہی جس میں موٹے رسّے، چھوٹی رسّیاں اور تھیلے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ 1882ء تک پٹ سن کے 20 کارخانے قایم ہو چکے تھے جن میں 20,000 افراد کام کرتے تھے۔ کپاس کی صنعت کے برخلاف پٹ سن کی صنعت یوروپین لوگوں ہی کی ملکیت میں رہی۔

ان صنعتوں کے علاوہ کوئلے کی کان کنی جیسی دیگر صنعتوں میں اُن دنوں جدید طریقے روبہ عمل لائے جا رہے تھے۔ کوئلے کی صنعت کو ہندستانی ریلوں کے نظام کے قیام کی وجہ سے کافی تقویت حاصل ہوئی۔ یہ صنعت بتدریج ترقی کے مراحل طے کرتی رہی اور 1889ء تک کوئلے کی 56 کانوں سے کوئلہ نکالا جانے لگا جن میں 20,000 افراد کام کرنے لگے۔

برطانوی افکار، سرمائے اور مساعی کی وجہ سے اس ملک میں صنعت کاری کو فروغ حاصل ہوا جس کے باعث ہندستان کی کئی ابتدائی صنعتوں کی ملکیت اور انتظام انگریزوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ تاہم سوتی کپڑوں کی صنعت کی ابتدا اور ترقی دونوں ہی بعض ہندستانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاجروں کی دلچسپی کی مرہونِ منت ہیں۔ جوں جوں پارچہ بافی کی صنعت ہندستانی معیشت میں اہم کردار انجام دینے لگی توں توں ان تاجروں کو روز افزوں اہمیت حاصل ہونے لگی۔ اپنے کپڑا لوں کے ذریعے اِن تاجروں نے نہ صرف صنعتی کاروبار میں اپنے موقف کو مستحکم بنایا بلکہ بے انتہا دولت بھی اکٹھا کرلی۔ ان تمام باتوں کا اثر یہ ہوا کہ عرصے سے چھپی ہوئی دولت منظرِ عام پر آگئی۔ چونکہ اس ملک کے لوگوں میں عام طور پر اور ہندوؤں میں خاص طور پر مشترکہ خاندان کا طریقہ چلا آرہا تھا اس وجہ سے اس صنعتی ترقی کا زیادہ تر فیض کارخانہ داروں کے عزیز و اقربا کے حلقے تک ہی محدود رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندستان میں سوتی کپڑے کی صنعت کے فوائد چند افراد تک ہی محدود رہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس صنعت نے بڑی تیزی کے ساتھ غیر معمولی ترقی کی۔ حسب ذیل اعداد و شمار سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے:

سال	کارخانے	منظورہ سرمایہ	ملازمین کی تعداد	راچھے Looms	تکلے Spindles
1883-84	74	Rs: 81,677,250 (£ 80,000)	61,836	16,251	1,895,284
1893-94	138	Rs: 113,300,840 (£ 568,216)	130,570	29,392	3,539,681
1903-04	206	Rs: 154,870,050 £: 1,067,245	186,144	45,281	5,167,608

اِن اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے کہ ان برسوں میں کپاس کی صنعت میں تگنی ترقی ہوئی۔ 1882ء میں درآمدی محصول کی تنسیخ کے باعث اس صنعت کو تیزی سے پروان چڑھنے کا موقع نصیب ہوا۔ جیسا کہ ہنری جیمس نے دارالعوام کو بتایا تھا کہ 1882ء تا 1895ء کی درمیانی مدت میں تکلیوں کی تعداد 1,550,000 سے تجاوز کرکے 3,500,000 تک پہنچ چکی تھی اور یہ کہ 1882ء میں ختم ہونے والی چھے سالہ مدت کے دوران ہانگ کانگ، چین اور جاپان کے ساتھ کی جانے والی برآمدی تجارت کا دو تہائی حصہ صرف برطانیہ تھا جبکہ 1895ء میں ختم ہونے والی چار سالہ مدت کے دوران اس تجارت کا $\frac{4}{5}$

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واں حصہ ہندستان کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔[3] 1890ء کے ابتدائی مرحلے ہی میں ہندستان نے 170, 518, 804 پونڈ سوت اور بٹا ہوا دھاگا برآمد کیا۔[4]

یہ تمام حالات اُن ہندستانیوں کے لیے نہایت ہی ہمت افزا تھے۔ جنھوں نے اس نئے میدان میں قدم رکھا تھا اور جنھوں نے ہندستان میں صنعتی کاروبار کی داغ بیل ڈالی تھی۔ لیکن اُن ہندستانیوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ ڈاکٹر پی۔ ایس۔ لوک ناتھن کے کہنے کے مطابق: "..... پارسیوں اور بھاٹیاؤں جیسے مالدار تاجر فرقوں نے مغربی ہندستان میں صنعتوں کے قیام اور توسیع میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں"۔[5] دوسرے ہندستانی مسلم الثبوت ماہر ڈاکٹر پی۔ پی۔ پلائی کہتے ہیں: "مل مالکوں میں سب سے نمایاں حیثیت بھاٹیاؤں کو حاصل تھی۔ جن کے بعد انگریزوں، پارسیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کا درجہ تھا"۔[6] درحقیقت اس تمام مدت کے دوران ہندوؤں اور پارسیوں کے بیسیوں کارخانوں میں مسلمانوں کا صرف ایک قابلِ ذکر کارخانہ موجود تھا۔ کریم بھائی کاٹن ملز جس کا قیام 1886ء میں عمل میں آیا تھا اور جس کی توسیع 1900ء میں کی گئی تھی جبکہ اس میں محمد مل اور ابراہیم مل کو ضم کیا گیا تھا۔[7]

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اُن دنوں پٹ سن کے جملہ کاروبار پر انگریز قابض تھے لہٰذا اس صنعت میں ہندستانی سرمایہ کاری اور انتظام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم یہ بات ذہن میں رکھی جانی چاہیے کہ اس مدت کے اختتام تک بعض مارواڑی تاجر کسی نہ کسی طرح بعض پٹ سن کی ملوں کے حصص بھاری تعداد میں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنا کچھ ہندستانیوں نے کپاس کی صنعت کی توسیع و ترقی کے لیے کیا اُس کے مقابلے میں پٹ سن کے میدان میں ان کی کاوشیں عملاً صفر کے برابر تھیں۔ یہ صورتِ حال بعد میں طویل عرصے تک برقرار رہی۔ جیسا کہ جٹھار (Jathar) اور بیری Bar نے کہا ہے۔

> "ہندستان کی دو انتہائی اور اہم منظم صنعتوں میں یہ تضاد پایا جاتا ہے کہ سوتی کپڑے کی صنعت تو پوری طرح ہندستانیوں کے ہاتھ میں ہے، ہندستان ہی میں اکٹھا کیے گئے سرمائے سے چلتی ہے جبکہ پٹ سن کی صنعت کی ابتدا اور ارتقاء کے ذمہ دار یوروپین ہیں جن کا تعلق زیادہ تر اسکاٹ لینڈ سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور جن کے سرمائے اور مساعی کی وجہ سے یہ صنعت یہاں پروان چڑھ سکی۔[8]

دوسرا نکتہ جسے خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے یہ ہے کہ پٹ سن کی صنعت شدید مرکزیت کے زیر اثر پروان چڑھ رہی تھی کیونکہ اس قسم کے نوے فیصدی صنعتی کارخانے کلکتہ ہی کے گرد و نواح میں واقع تھے اور جیسا کہ ڈاکٹر بلائی نے واضح کیا ہے: "غالباً اس صنعت کو متواتر حاصل ہونے والے برطانوی سرمائے اور پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے بنگالی لوگ تجارت اور سرمایہ کاری کی حدود سے آگے بڑھ کر صنعت کاری کے میدان تک نہ پہنچ سکے۔"[9]

ہندستان میں صنعتی دور کے آغاز کی وجہ سے بینک کاری کو کافی تقویت حاصل ہوئی جو انگریزوں کی یہاں آمد سے کافی پہلے کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی لیکن اُس جدید بینک کاری کی تاریخ 1881ء سے شروع ہوتی ہے جس کا قیام خالصتاً ہندستانیوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔[10] چنانچہ اس سال اودھ کمرشیل بینک قایم کیا گیا جس کی ابتدا Rs. 2730/- کے قلیل سرمائے سے ہوئی جو 1887ء تک بڑھتے بڑھتے ایک لاکھ روپے اور 1888ء میں دو لاکھ روپے اور 1897ء میں تین لاکھ روپے تک جا پہنچا۔ یہ بینک پنجاب اور صوبجات متحدہ کے ہندو زمینداروں اور وکیلوں کی ملکیت اور انتظام میں تھا اور اس کا صدر دفتر فیض آباد (یوپی) میں واقع تھا۔

چند برس بعد یعنی 12 اپریل 1895ء کو مشہور کانگریسی رہنما لالہ لاجپت رائے کی کوششوں کی وجہ سے پنجاب نیشنل بینک کا قیام عمل میں آیا جس کا سرمایہ دو لاکھ روپے پر مشتمل تھا۔ اس بینک کے تمام بڑے حصے دار اور سبھی ڈایریکٹر ہندو تھے جن میں سے اکثر انگریزی تعلیم یافتہ پروفیسر، ڈاکٹر اور بیرسٹر تھے۔ اس بینک نے جلد ہی ہندوؤں کے تجارتی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر لی اور اس کی شاخیں بمبئی، کلکتہ اور کراچی میں کھل گئیں۔

1905ء میں شروع ہونے والی سودیشی تحریک کی وجہ سے ملک بھر میں ایسے کئی چھوٹے بڑے بینکوں کے قیام کو تقویت حاصل ہوئی جن کی ملکیت ہندستانیوں کے پاس تھی۔ 1910ء تک ان بینکوں کی تعداد 476 تک جا پہنچی لیکن بینک کاری کی اس صنعت میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُن کی ملکیت میں ایک بھی ایسا بینک نہیں تھا جو توجہات کا مرکز بن سکے۔ اس کے علاوہ دیسی بینک کاری میں بھی انھیں کبھی اہمیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل نہ ہو سکی۔ ہر جگہ مہاجن، مارواڑی اور بنیے چھائے رہے۔ مسلمان شاذ و نادر ہی سود پر قرض دیتے تھے۔ ہاں قرض لینے کے معاملے میں البتہ ان کا جواب نہیں تھا۔

وہ دوسرا میدان جس کی جانب اُن حوصلہ مند ہندوؤں نے توجہ مبذول کی جو جدید کاروباری طریقوں سے واقف تھے، انشورنس یا بیمہ کا تھا۔ اس میدان میں اُن کی پہلی کامیاب کوشش بھارت انشورنس کمپنی تھی جسے لالہ ہرکشن لال نے قایم کیا تھا۔ اس کمپنی نے اُن دنوں زندگی کے بیمے کے تصور کو ملک بھر میں عام کیا جب عملاً ہندستان میں لوگ اس سے قطعاً نابلد تھے۔

ہندستان میں بیمے کے کاروبار کو ترقی دینے میں پارسیوں نے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ چنانچہ جب 1897ء میں آر۔ ای۔ بھروچا R. E Bharucha اور ای۔ ایف۔ ایم E. F. Allum نے مشہور و معروف دی ایمپایر آف انڈیا لائف انشورنس کمپنی The Empire of India Life Assurance Company قایم کی تو ان کے عظیم رہنما سر فیروز شاہ مہتا ہی بڑی حد تک اس کمپنی کی کامیابی کے باعث بنے۔

زیرِ تبصرہ مدت کے دوران بیمہ کے کاروباری میدان کی وہ واحد کمپنی جس پر مسلمانوں کا گہرا اثر تھا بامبے میوچول لائف انشورنس سوسائٹی Bombay Mutual Life Assurance Society تھی جو 1871ء میں رجسٹر کی گئی تھی۔ اگرچہ اس کمپنی کے اکثر ڈائریکٹر ہندو یا انگریز تھے لیکن کچھ عرصے تک مرزا علی محمد خاں نامی مُشیرِ قانونی اس کمپنی کے چیرمین رہے اور اس کے چند بنیادی حصص مسلمانوں کے پاس رہے۔ اس کے علاوہ بمبئی کے مشہور مسلمان صنعت کار سر کریم بھائی ابراہیم کو اور نیشنل گورنمنٹ سیکیورٹی لائف انشورنس کمپنی کے انتظامی امور میں کچھ عمل دخل حاصل رہا کیوں کہ کئی برسوں تک وہ اس کمپنی کے ڈایریکٹروں میں شامل رہے۔ اسی طرح آر۔ کریم بھائی نامی ایک دوسرے مسلمان تاجر نے اسی کمپنی کے 25 بنیادی حصص خرید رکھے تھے۔

مزید برآں اس مدت کے دوران حالات نے ایک اور طرح کی مخصوص صورت اختیار کرلی جو کھلے طور پر ہندستان کی معاشی زندگی میں مسلمانوں کی عدم شمولیت کی غمازی کرتی ہے یہ صورتِ حال قدیم شہروں کے گوشۂ گمنامی میں کھو جانے اور نئے شہروں کے منظرِ عام پر آجانے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر جے۔ ایچ۔ کلیفم Dr. J. H. Clapham کہتے ہیں :

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"جدید حالات میں کسی قوم کی زندگی میں صنعتی ترقی کو جانچنے کا بہترین پیمانہ یہ ہے کہ اُس ملک میں کس ڈھنگ اور رفتار سے شہر آباد ہو رہے ہیں۔ صنعتی دور کے آغاز کے نتیجے میں ابھرنے والے شہروں میں کلکتہ، بمبئی، مدراس اور جزیرہ نمائے ہند کے اندرونی علاقوں میں واقع شہر کانپور اور احمد آباد مشہور ہیں جبکہ ڈھاکہ، مرشد آباد، لکھنؤ، تنجور وغیرہ جیسے کئی مشہور قدیم شہر جنھیں مسلم دورِ حکومت میں خاصی شہرت حاصل تھی نہ صرف اپنی اہمیت کھو بیٹھے بلکہ ان میں بسنے والے کاریگروں کی تعداد بھی گھٹ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی قدیم دستکاری صنعتیں جن کی ماہرانہ کاریگری میں مسلمانوں نے یدِطولیٰ حاصل کیا تھا زوال پذیر ہوگئیں[13] مثلاً ڈھاکہ جو کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت والا ایسا شہر تھا جسے بنگال کے نوابوں کا دارالخلافہ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا اپنی ململ کی صنعت کے لیے چہار دانگِ عالم میں مشہور تھا۔ لیکن اُن دنوں یہ شہر بھی بڑی سرعت کے ساتھ تنزل پذیر ہوا۔ یہی داستان مرشد آباد، لکھنؤ اور دیگر قدیم شہروں کی بھی ہے جو مسلم دورِ حکومت میں نہ صرف دستکاری کی صنعتوں کے معاملے میں بلکہ تہذیبی امور میں بھی اپنے بام عروج پر تھے[14]

قدیم اور جدید شہروں کا یہ تضاد اور بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے جب ہم صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ابھرنے والے شہروں کی نوعیت اور اُن میں بسنے والی مختلف قوموں کی آبادی کے تناسب پر نظر ڈالتے ہیں۔ 1901ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق ہندستان کے بعض اہم ترین شہروں میں بسنے والی آبادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب حسبِ ذیل تھا:

شہر	جملہ آبادی	ہندو	مسلمان
کلکتہ	847,796	553,271	249,939
بمبئی	776,006	508,608	155,747
مدراس	509,346	410,648	57,331
کانپور	197,170	144,013	47,949
احمد آباد	185,889	129,505	38,159

چونکہ نئے ابھرنے والے شہروں میں غالب اکثریت ہندوؤں کی تھی اس لیے نظری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طور پر صنعتی دور کی برکتوں سے بڑے پیمانے پر فیض یاب ہونے والے بھی ہندو ہی تھے اور مارکیٹوں اور حصّہ بازاروں (شیر بازاروں) میں بھی ہندو تاجر ہی مکمل طور پر چھائے ہوئے تھے۔ مثلاً بمبئی مارکیٹ پر بھاٹیاؤں اور بنیوں کا تقریباً قبضہ تھا۔ کلکتہ میں بورڈوین اثر چھایا ہوا تھا' لیکن آہستہ آہستہ بنگالی اور مارواڑی تاجر مارکیٹ میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ شہر مدراس کم و بیش شیٹی تاجروں کی گرفت میں تھا۔ مسلمانوں کی حالت کانپور میں اُسی طرح ابتر تھی جتنی کہ احمد آباد یا کسی اور دوسرے صنعتی یا تجارتی مرکز میں۔

میں اپنے ابتدائی باب ہی میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے بعض اسباب کا جائزہ لے چکا ہوں۔ 1883ء تک یہ زبوں حالی اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ ملک بھر میں شاید مٹھی بھر مسلمان بھی ایسے نہ تھے جنھیں صحیح معنوں میں متمول اور صاحبِ ثروت کہا جا سکے۔ وہ جو خوش قسمت تھے اُن میں کے بعض لوگ یا تو زمیندار تھے یا صاحب جایداد۔ ہندستانی صنعتی کمیشن Indian Industrial Commission کی قلمبند کردہ شہادتوں سے صاف ظاہر ہے کہ صنعتی ادارے جن ذرایع سے سرمایہ حاصل کیا کرتے تھے وہ زمینداروں یا صاحبِ جایداد طبقے نہیں تھے۔

یہ کیونکر ہوا کہ مسلمان ہندستان کی نئی معاشی زندگی سے یکسر خارج کر دیے گئے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی لیکن تمام وجوہات واضح نہیں ہیں ڈی۔ ایچ بخانن D. H. Buchanan ان وجوہات کا جایزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہے "سب سے بڑی وجہ تو غالباً یہ ہے کہ صدیوں تک حکمرانی کرتے رہنے کے باعث مسلمانوں کو تجارت کا تجربہ نہیں رہا۔ معزز گھرانوں کا زیادہ تر تعلق سرکاری ملازمتوں سے رہا جبکہ تجارتی میدان پر ہندوؤں کی تاجر ذاتوں کا قبضہ رہا یہ لوگ نہ صرف اپنے پیشے میں انتہائی ہوشیار تھے بلکہ کثیر دولت و ثروت کے مالک بھی تھے۔ جب انگریزوں نے ملک کا نظم و نسق سنبھالا تو مسلمانوں کو ملازمتوں سے بے دخل ہو جانا پڑا۔ اُن میں کسی اور میدان میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود نہیں تھی۔ اگرچہ انھیں کئی سرکاری ذرایع سے آمدنی ہوا کرتی تھی لیکن وہ اس قدر فضول خرچی کر چکے تھے کہ اب ان کے پاس تجارت یا کاروبار میں لگانے کے لیے بالکل سرمایہ موجود نہیں تھا۔ سود لینے کے معاملے میں بھی انھیں ابتدائی دور کے عیسائیوں جیسا ہی رویہ وِرثہ میں ملا..... ساتھ ہی اپنے خاندان کے ساتھ شدید لگاؤ ہم مذہبوں کے مابین اخوت پر شدید زور اور دنیوی دولت کو بانچھن کے ساتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے دریغ خرچ کرنا جیسی صفات بھی ملیں"۔ اپنی صفات کی وجہ سے ان کی دولت ضائع ہوتی رہی ہوگی اور وہ غربت کا شکار ہوتے رہے ہوں گے۔ پنجاب کے کسانوں کے بارے میں اپنی مشہور تحقیق کے دوران ڈارلنگ Darling اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمان دیہی قرضوں کے معاملے میں اپنی تعداد کے متناسب حصے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مقروض ہوتے تھے اور ایسے تمام قرضے انھیں ہندو اور سکھ مہاجنوں سے حاصل ہوا کرتے تھے۔[15]

لیکن صنعتی میدان میں مسلمانوں کی پسماندگی کی وجوہات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ طے ہے کہ من جملہ دیگر وجوہات کے (1) اُن کی بڑھتی ہوئی غربت اور (2) اُن میں پیشہ ور تاجر طبقے کا فقدان اس معاملے میں فیصلہ کن اثرات کے حامل رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اُس سرمائے کا بڑا حصہ جو ہندستانیوں نے صنعتی اور تجارتی کاروبار میں لگایا دراصل پیشہ ور اور تاجر طبقوں سے حاصل کیا گیا تھا جو ذخیرہ اندوزی کرنے یا زیورات اور تقاریب جیسی غیر منفعت بخش چیزوں پر خرچ کرنے کی روایتی عادتوں پر قابو پا چکے تھے۔ ہندستانی صنعتی کمیشن کی قلمبند کردہ شہادتوں سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ ذیل میں ایسی دو شہادتیں درج کی جاتی ہیں:

(1) آنریبل جیمس کیوری Hon. James Currie جو اُس زمانے میں پنجاب چیمبر آف کامرس کے نائب صدر تھے کہتے ہیں: "صنعتی کاروبار کے لیے سرمایہ حاصل کرنے کا سب سے بنیادی ذریعہ وہ پیشہ ور سرمایہ کار ہیں جنھیں کلکتہ اور بمبئی کے بازار سے وافر مقدار میں منافع حاصل ہوتا ہے۔"[17]

(2) آنریبل اے۔ ایچ۔ سلور A. H. Silver جو اُس زمانے میں آگرہ اور اودھ کے صوبجات متحدہ کے محکمہ صنعت کے ڈایریکٹر تھے کہتے ہیں، "ہندستانی وکیل، ڈاکٹر اور صنعتی اداروں میں کلرکی جیسے پیشہ ورانہ کام کرنے والے متوسط طبقے کے ہندستانی اپنی بچت کو سرکاری کمپنیوں میں لگانے پر انتہائی مستعد نظر آتے ہیں۔"[18]

اُن دنوں مسلمانوں میں تاجر پیشہ طبقے کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بمبئی میں چند بوہرے اور خوجے ضرور تجارتی کاروبار میں مصروف تھے تاہم عام ترقی کے تناسب سے ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ علاوہ ازیں وہ واحد کاروبار جس میں مسلمانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے ترقی کی وہ گوشت فروشی کا کاروبار تھا اور اس کاروبار میں بھی ان کی ترقی اس وجہ سے ممکن ہو سکی کہ انھیں اس میدان میں ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی مسابقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے پیشہ ور طبقے کے بارے میں میں اپنے ابتدائی باب میں تفصیلی روشنی ڈال چکا ہوں جہاں نہ صرف میں نے مسلمانوں کے اس شکوے کا ذکر کیا ہے کہ "سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین عدم توازن کا تدارک کیا جائے" بلکہ اس موضوع پر لارڈ ڈفرن کی مشہور قرارداد کا ذکر بھی کیا ہے۔ بدقسمتی سے بعض مقامی حکومتوں کی کوشش کے باوجود زیر تبصرہ مدت کے اختتام تک سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے موقف میں کوئی خاص سدھار پیدا نہیں ہو سکا۔ یہ حقیقت اگلے صفحات پر درج شدہ تختہ جات کے مطالعے سے عیاں ہو جائے گی۔

ان گوشواروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تمام مدت کے دوران ایسی سرکاری ملازمتوں کی تعداد جوں کی توں برقرار رہی جن پر مسلمان فایز تھے یہ تعداد 1887ء میں پانچ فیصد تھی، 1897ء میں پانچ فیصد رہی اور 1903ء میں بھی پانچ فیصد ہی رہی۔ جبکہ دوسری قوموں کے موقف میں بتدریج بہتری پیدا ہوتی رہی یعنی ان کی تعداد 1887ء میں 29 فیصد تھی جو بڑھتے بڑھتے 1903ء میں 33 فیصد تک پہنچ گئی۔ ان اعداد و شمار سے اس جھوٹے پروپیگنڈے کی قلعی کھل جاتی ہے کہ انگریز دوسری قوموں پر مسلمانوں کو فوقیت دیا کرتے تھے۔ یا یہ کہ برطانوی راج کے دوران مسلمانوں کی استغنائی حد تک طرفداری کی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سماجی زندگی اور سیاسی مباحث کے دوران بعض اعلیٰ برطانوی حکام سرسید اور ان کے رفقا کے ساتھ غیر معمولی طور پر ہمدردانہ اور ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً وہ مسلمانوں کی حیثیت کے بارے میں شاندار الفاظ میں بیان بھی دیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کو سیاسی تحریک سے الگ رکھنے کے لیے اکثر تاج برطانیہ کے ساتھ ان کی وفاداری کے راگ بھی الاپے جاتے اور نازک لمحات میں "عظیم مسلمان قوم کے عظیم رہنماؤں" کو برطانیہ کی انصاف پسندی کا قائل ہونے پر شاباشی بھی دی جاتی۔ لیکن ان تمام باتوں سے اس اکثر دُہرائے جانے والے دعوے کی تصدیق نہیں ہوتی کہ مسلمان انگریزوں کے منظورِ نظر تھے۔ اس کے برخلاف محولہ بالا اعداد و شمار کے علاوہ بھی ایسا کافی مواد موجود ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انگریزوں کو کبھی بھی مسلمانوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ غیر منصفانہ قسم کا لگاؤ نہیں رہا۔ حتیٰ کہ جذبات کا اظہار کرتے وقت بھی تفریق کا عمدگی کے ساتھ خیال رکھا جاتا تھا۔ یہ بات پارلیمنٹ میں ہندستانی موضوعات پر کی جانے والی بحثوں اور برطانوی پریس میں شایع ہونے والے ہندستانی معاملات سے متعلق ادارتی تبصروں کے مطالعے سے بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

مزید برآں سرکاری الطاف وعنایات کی جانب پھر سے رجوع کرتے ہوئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُن دنوں صرف اُعلیٰ عہدوں پر مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا جن کی تنخواہ ماہوار پانچ سو روپے اور اس سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ 1887ء میں ایسے 51 عہدوں پر مسلمان فایز تھے جبکہ 1897ء میں ان کی تعداد 83 ہوگئی اور 1903ء میں یہ تعداد 98 تک جا پہنچی۔ غالباً ان اسامیوں میں سے اکثر پر وہ نئے مسلمان گریجویٹ فایز تھے جو ایم۔اے۔ او کالج اور دیگر اسلامی اداروں سے فارغ ہوئے تھے

A-1887

	ہندو بشمول سکھ، پارسی، بدھ اور ہندستانی عیسائی	مسلمان
سرکاری ملازمتوں کی جملہ تعداد	2595	408
فیصد	29	5
ذیل کے مشاہروں والی جایدادوں کا فیصد		
Rs: 200 — 300	47	8
Rs: 300 — 400	35	4
Rs: 400 — 500	41	8
Rs: 500 — 600	18	2
Rs: 600 — 700	21	2
Rs: 700 — 800	6	1
Rs: 800 — 900	13	1
Rs: 900 — 1000	7	—

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

B. 1897

	ہندو (بشمول سکھ، پارسی، جین اور ہندستانی عیسائی)	مسلمان
سرکاری ملازمتوں کی جملہ تعداد	3149	533
فیصد	32	5
ذیل کے مشاہروں والی جایدادوں کا فیصد		
Rs: 200 — 300	52	8
Rs: 300 — 400	33	5
Rs: 400 — 500	34	6
Rs: 500 — 600	23	3
Rs: 600 — 700	26	3
Rs: 700 — 800	12	2
Rs: 800 — 900	10	1
Rs: 900 — 1,000	8	3

C 1903

	ہندو (بشمول سکھ، پارسی، جین اور ہندستانی عیسائی)	مسلمان
سرکاری ملازمتوں کی جملہ تعداد	3503	577
فیصد	33	5
ذیل کے مشاہروں والی جایدادوں کا فیصد		
Rs: 200 — 300	52	8
Rs: 300 — 400	37	6
Rs: 400 — 500	35	5
Rs: 500 — 600	20	5
Rs: 600 — 700	25	2
Rs: 700 — 800	11	1

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

2	16	Rs: 800 — 900
2	7	Rs: 900 — 1,000

دراصل تعلیم سے اُن کی فراغت کی رفتار اتنی سُست تھی کہ دوسری قوموں کی غیر ضروری حق تلفی کیے بغیر انھیں ملازمتوں میں ضم کرنا حکام کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ لہٰذا ان حالات میں اُس "بے چینی" کا کوئی جواز ہی موجود نہیں تھا ـــــ کئی برس پہلے لارڈ لینس ڈاؤن Lord Lansdowne نے سیاسی شورش کی توپ کی غذا قرار دیا تھا[19] ہندوؤں کے معاملے میں صورتِ حال اس سے بالکل مختلف تھی۔ ہندو گریجویٹوں کی تعداد میں سُرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کی تعداد موجودہ آسامیوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا اُس وقت پائی جانے والی صورتِ حال کے بارے میں حکومت کے خلاف اُن کی اشتعال انگیزی ایک فطری امر تھا۔ معاشی عوامل نے ہندوؤں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اُکسایا جب کہ اُنھی کی وجہ سے مسلمان حکومت کی وفاداری کا دم بھرنے لگے تھے۔

علاوہ بریں تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ان کے رہنما ہمیشہ جتلایا کرتے تھے کہ ان کی معاشی فلاح و بہبود تمام تر انگریزوں کی ذات پر منحصر ہے۔ خود انھیں بھی اس بات کا شدید احساس تھا کہ سرکاری ملازمتوں سے ہٹ کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے باوجود اُن کے لیے دوسرا کوئی باوقار ذریعہ معاش موجود نہیں ہے کیوں کہ ہندوؤں کی طرح ان کے پاس اور کوئی ذرائع ملازمت موجود نہیں تھے۔ اُن کے پاس نہ تو کوئی صنعتی ادارے تھے نہ بینک تھے اور نہ بڑے اخبارات تھے جہاں انھیں ملازمتوں میں ضم کیا جا سکتا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہندو اداروں میں اُنھیں بہ آسانی ملازمتوں پر فایز نہیں کیا جائے گا۔

اِن تمام امور کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے اپنی تمام تر توجہات کو حکومت پر مرکوز کر ڈالا اور حکومت ہی انھیں ملازمتوں پر فایز کرنے لگی لیکن چند استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر عموماً انھیں بھی ان تمام شرطوں کو پورا کرنا پڑا جنھیں دوسری تمام قومیں اور فرقے پورا کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن دنوں مسلمانوں کی کارکردگی زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہی۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھار حکومت نے ملازمتوں کے معاملے میں پائے جانے والے عدم توازن کو درست کرنے کی کوشش بھی کی لیکن یہ کوشش شاید ہی کبھی بڑے پیمانے پر کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئی ہو۔ بہ حیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ حکومت نے ان معاملات میں مساوات کے اصول کو ملحوظ خاطر رکھا جس کا اظہار مدراس کے گورنر سر آرتھر لالی Sir Arthur Lawley کے 1906ء کے اس بیان سے بخوبی ہو جاتا ہے: "جہاں تک سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد کی کمی کا تعلق ہے تو اس بارے میں میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ کمی اس وجہ سے نہیں ہے کہ حکومت اُن پر سرکاری ملازمت کا دروازہ بند کر دینا چاہتی ہے بلکہ اس کے برخلاف یہ کمی اس لیے ہے کہ اس دروازے سے گزرنے کے لیے ان پر بھی لازم آتا ہے کہ وہ اپنے ہمراہ تعلیمی لیاقت اور مستعدی کا پاسپورٹ لیتے آئیں اور ہر وہ سرکاری عہدہ قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کریں جس کی پیش کش حکومت کی جانب سے اُنھیں کی جائے۔"[20]

اُن دنوں مستعدی کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ امیدوار انگریزی زبان سے کماحقہ واقفیت رکھتا ہو اور یہی وہ میدان تھا، جیسا کہ ہم پچھلے ابواب میں دیکھ چکے ہیں، جس میں مسلمان دیگر برادران وطن سے میلوں پیچھے تھے۔

مزید برآں نام نہاد شاندار ماضی کی یادیں اُن کے خمیر میں اتنی گہری اُتر چکی تھیں کہ انھیں بدلے ہوئے حالات کی حقیقتوں سے صحیح معنوں میں آشنا کرنے کے لیے انقلابی انداز میں جھنجھوڑنے کی ضرورت تھی۔ لیکن اُن کی قیادت خالص جاگیردارانہ نوعیت کی حامل ہونے کی وجہ سے نہ تو اس مشکل فرض کی ادائیگی کی اہلیت رکھتی تھی اور نہ خواہش۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مسئلے کو غلط بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی گئی جس کی وجہ سے مسلمانوں کے احساس محرومی اور شکست خوردگی میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا اور وہ بتدریج ہندستان کی معاشی ترقی کے قومی دھارے سے علیحدہ ہوتے چلے گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

آٹھواں باب (معاشی تبدیلیاں)

۔ ملاحظہ ہو تھیوڈور موریسن کی کتاب Economic Transition in India صفحات 153-81 اس تبدیلی کا ایک عجیب وغریب نتیجہ جہاز سازی کی صنعت کی تباہی کی شکل میں برآمد ہوا جو ایک صدی قبل تک اتنی عمدہ حالت میں تھی کہ ہندستان میں بنے ہوئے جہاز دریائے تھیمس Thames میں برطانیہ میں بنے ہوئے جہازوں کے شانہ بہ شانہ تیرتے تھے۔ اس تباہی کی ضرب کاری بُری طرح مسلمانوں پر بھی پڑی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس کے اجلاس کی روئیداد کے ایک نکتے کے مطابق: "ہمارے قومی اخلاق کے لیے یہ انتہائی شرم کی بات ہے کہ ہندستان کے دیسی ملاح، جو خاص طور پر مسلمان ہیں، ایسی حالت میں پہنچا دیے گئے ہیں کہ وہ اُس عزت واحترام سے محروم ہو گئے ہیں جو یوروپین ملاحوں کا طرۂ امتیاز ہے اور جو کبھی ان دیسی ملاحوں کو بھی حاصل تھی۔ اُن سے اُن کی مال ومتاع چھین لی گئی اور انھیں تباہ حالی اور کسمپرسی کے عالم میں سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتے پھرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔" یہ دلایل تو اس لیے دیے گئے تھے کہ کمپنی کے اُس فیصلے کو حق بجانب قرار دیا جا سکے جو اس نے ہندستان میں صنعت جہاز سازی اور جہاز رانی کے خلاف کیا تھا۔ ملاحظہ ہو۔

Appendix No. 47, Supplement to Fourth report East India Company 23, 24.

2۔ ملاحظہ ہو Statistics of British India Vol. I, pp. 153-155

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

3 - Hansard (Debates on Indian Affairs) Session 1895, 35-36

4 - ڈی۔ آر۔ گاڈگل نے اپنی تصنیف Industrial Evolution of India میں نقل کیا ہے۔ اس مدت کے دوران دیگر صنعتوں کی ترقی کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لیے ملاحظہ ہو۔ پروفیسر وی۔ جی۔ کالے کی کتاب Indian Industrial and Economic Problems کا باب بعنوان "Forty-five years Survey of Indian Industries" صفحات 92 - 113

5 - P.S. Loknathan: Industrial Organisation in India p 22

6 - P. Padmanabha Pillai: Economic Conditions in India 191

7 - مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو اپریل 1904ء کا Indian Textile Journal

8 - Q.B. Talkar and S.G. Barve: Indian Economics II 57

9 - P. Padmanabha Pillai: Economic Conditions in India P. 185

10 - جے۔ ایم۔ کینس J.M. Keynes نے 1913ء میں اپنی کتاب موسوم Indian Currency and Finance میں لکھا تھا: "1900ء کے زمانے تک یہ بینک مقابلتاً زیادہ اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ اس کے بعد البتہ یہ بینک اتنی بڑی تعداد میں سرمایہ جمع کرانے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ جلد ہی یہ اس ملک کے بینک کاری کے نظام کا اہم جز بن گئے۔ صفحہ 224

11 - حتیٰ کہ وہ مسلمان بھی جو بہ آسانی قرض دے سکتے تھے اس طرح کے کاروبار سے استفادہ نہ کرتے۔ زمیندار جو ایک متمول اور آزاد خیال مسلمان ہوتا ہے اپنے لگان داروں کو اتنی آسان شرحوں پر قرض دیتا ہے جنھیں مہاجن برائے نام سود کا نام دیں گے۔ اس قسم کے قرض دینے کو ضمناً سودی کاروبار تصور نہیں کرتا کیوں کہ اُس کے نزدیک سود خوری اخلاقی طور پر ایک غلط فعل ہوتا ہے۔" An Inquiry into the Economic Condition of the Agricultural and Labouring Classes in the North-west Provinces and Oudh (1888), 115

12 - J.H. Clapham: Economic Development of France and Germany 1815 — 1914) 54

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

13 ۔ مدورا جیسے دور دراز کے جنوبی علاقے میں بھی حالات کچھ زیادہ بہتر نہیں تھے مثلاً اس شہر میں "کلابتوں Lace کی درآمد سے پہلے پانچ سو مسلمان خاندان دن رات جھالرسازی کے کام میں مصروف رہا کرتے تھے لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ صرف دس خاندان ایسے باقی بچ رہے ہیں جو دیسی جھالریں تیار کرتے ہیں۔" Memorandum on the progress of the Madras presidency during the last Forty years of British Administration ccxv

14 ۔ 1757ء میں جس وقت لارڈ کلائیو مرشد آباد میں داخل ہوا تب اُس نے اس شہر کے بارے میں لکھا: "یہ شہر بھی لندن ہی کی طرح وسیع، گنجان اور متمول شہر ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ اس شہر میں ایسے بھی لوگ آباد ہیں جن کے پاس لندن کے امیر ترین لوگوں سے کہیں زیادہ دولت اور جایداد موجود ہے۔"

(اس اقتباس کو ولیم ڈگبی نے اپنی کتاب Prosperous British India by William Digby میں نقل کیا ہے) A Revelation from official Records 104

15 ۔ D.H. Buchanan: Development of Capitalist Enterprise in India 147 - 48

16 ۔ M.L. Darling: The Punjab Peasant in Prosperity and Debt xvi

بقول ڈارلنگ "ان حالات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں بہتری پیدا نہیں کی جا سکتی کیونکہ طویل معاشی معذوری، بے اعتمادی اور بے انصافی کے احساس کو جنم دیتی ہے جس کی وجہ سے خیر خواہی کا پنپنا ناممکن بن جاتا ہے۔" مزید ملاحظہ ہو ایس۔ ایس تھاربرن S.S. Thorburn کی کتاب Mosalmans and Money-lenders in Punjab.

خاص طور پر مسلمانوں کے مقروض ہونے کے بارے میں اوبرائن O'Brien اور لائل Lyall کے خیالات قابلِ توجہ ہیں جو اس کتاب میں نقل کیے گئے ہیں 84-88 اسی طرح دو نہایت ہی پر از معلومات ضمیمے Appendices بھی قابلِ توجہ ہیں 155 - 78

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

17- Indian Industrial Commission, Main Report, I, 1918

18- Ibid, 126

19- ملاحظہ ہو مضمون بعنوان "Indian Affairs" The Times London مطبوعہ بابت 29 جنوری 1894ء

20- The Bombay Gazette, Oct 4, 1906.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نواں باب

فرقہ وارانہ تنازعات

اس تمام مدت کے دوران متعدد فرقہ وارانہ مناقشات وقوع پذیر ہوئے۔ یہ جھگڑے صرف سیاسی امور تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ دیگر میدانوں میں بھی ان چپقلشوں نے سر اُبھارا۔ ان میں سے متعدد تنازعات کی جانب ہم نے پچھلے ابواب میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے اس باب میں البتہ میں اس مسئلے کے دو سنگین پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہوں گا جن کی وجہ سے فرقہ وارانہ مخالفت کا بدترین اظہار ہوتا رہا ہے۔ اُن دنوں کسی اور قضیے کے دوران مذہبی جذبات اتنی شدت سے نہیں بھڑکتے تھے جتنے کہ ہندو مسلم فساد اور اردو ہندی قضیے کے دوران اشتعال پذیر ہوئے۔ اسی لیے ذیل میں ہم ان دونوں کا تفصیلی جایزہ پیش کرتے ہیں:

(و) ہندو مسلم فسادات

ہندستان کے دونوں اہم مذاہب کے ماننے والوں کے تعلقات میں انگریزوں کی آمد سے قبل شاید ہی کبھی اتنی کشیدگی پیدا ہوئی ہو جسے پُرتشدد فساد کا نام دیا جا سکے۔ اور اگر کبھی کبھار کسی قسم کی کشیدگی پیدا ہو بھی گئی تو اس کا دائرۂ اثر انتہائی محدود رہا۔ من جملہ دیگر وجوہات کے غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان دونوں گروہوں میں ایک گروہ سمجھتا تھا کہ وہ فی نفسہٖ حکومت ہے اور دوسرا گروہ اس دعوے کو تسلیم بھی کرتا تھا۔ یا اس صورتِ حال کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اُن دونوں گروہوں کے مابین معاشی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیادوں پر کسی قسم کے ٹکراؤ کے امکانات بہت ہی کم تھے۔ یہ محل نہیں ہے کہ ہم اس جگہ فرقہ وارانہ فسادات کی ابتدا کے بارے میں تاریخی تحقیقات شروع کر دیں۔ اس کے علاوہ یہ مسئلہ اتنا وسیع اور اس قدر پیچیدہ ہے کہ اس کے بارے میں کوئی عام رائے بہ آسانی قایم نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے لیے تو یہی کافی ہے کہ ہم اپنی زیر تحقیق مدت کے دوران وقوع پذیر ہونے والے فسادات کے بارے میں ایک موٹی سی رائے قایم کرلیں اور اس بات کا جایزہ لیں کہ ان فسادات کا دونوں قوموں کے مابین پائے جانے والے سیاسی اور سماجی رشتوں پر کیا اثر پڑا۔

اس مسئلے کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قدیم ترین فسادات پر نگاہ ڈالیں ہندستان سے متعلق دستوری کمیشن Indian Statutory Commission کے روبرو پیش کردہ حکومتِ ہند اور انڈیا آفس کی یادداشتوں کے بموجب "برطانوی عملداری کے دوران وقوع پذیر ہونے والے فرقہ وارانہ فساد کی سب سے پہلی مثال بنارس کے وہ بلوے ہیں جو ۱۸۰۷ء میں ہوئے تھے"۔[1] لیکن یہ بیان اس لیے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دسمبر ۱۷۹۱ء میں بھی سلہٹ (آسام) کے مقام پر ایک ہندو مسلم فساد رونما ہوا تھا جس کے باعث فورٹ سینٹ ولیم کے عہدیداروں کو شدید تشویش لاحق ہوگئی تھی، اس فساد کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ضلع سلہٹ کے حاکم اعلیٰ آر۔ لنڈزے R Lindsay نے وارن ہسٹنگز Warren Hastings کو لکھا تھا کہ اس ضلع میں مسلمانوں کی دو تہائی اکثریت آباد ہے جن میں سے چند مسلمانوں نے ہندوؤں سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ لوگ" محرم کے دس دنوں میں اپنی مذہبی تقریبات نہ منائیں"۔[2] ہندوؤں نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور لنڈزے کے پاس درخواست پیش کی کہ وہ اُن کی شکایات کا ازالہ کرے جب مسلمانوں کو اس صورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو وہ برافروختہ ہو گئے اور انھوں نے نہ صرف ہندو دیوان پر حملہ کر دیا بلکہ ہندو پجاریوں اور ان کی عبادت گاہوں کو بھی نشانہ بنایا۔ لنڈزے کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی تو وہ جائے واردات پر پہنچا اور مسلمانوں کو منتشر ہو جانے کا حکم دیا۔ یہ حکم سنتے ہی مسلمانوں کے رہنما نے جو ایک بلند مرتبت مولوی بھی تھا، فوراً اپنی تلوار میان سے باہر نکال لی اور لنڈزے پر یہ کہتے ہوئے حملہ آور ہوا کہ" آج مارنے یا مرنے کا دن ہے"۔ انگریزی اقتدار کا آخری وقت آن پہنچا"۔[3] اس کے بعد جو ٹکراؤ ہوا اس میں لنڈزے نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کے کئی سرکردہ رہنماؤں کو جن میں مذکورہ بالا مولوی بھی شامل تھا گولیوں سے اڑا ڈالا۔ اس واقعے کے دو روز بعد جب لنڈزے نے سرکردہ مسلمانوں کو طلب کیا تو وہ لوگ اس معذرت خواہی کے ساتھ اُس کے روبرو پہنچے کہ "اس موقع پر بعض جوشیلے افراد کی مجنونانہ حرکت کی وجہ سے عام مسلمان بھی آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ خاطیوں کو ان کی حماقت کی خاطر خواہ سزا مل چکی ہے"۔[4]

1809ء میں ہونے والے بنارس کے فسادات کی اہم وجہ یہ تھی کہ "ہندوؤں نے اورنگ زیب کی تعمیر کردہ مسجد اور بشیشور کے موجودہ مندر کے درمیان غیر متعلقہ خالی جگہ پر ایک عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی"۔[5] مسلمانوں نے اس عمارت کی تعمیر کی مخالفت کی اور مندر پر حملہ کر کے لاٹ بھیروں نامی ستون کو گرا ڈالا۔ "دوسرے روز ہندوؤں کے ایک بہت بڑے مجمعے نے مسجد اورنگ زیب پر دھاوا بول دیا اور اُس میں آگ لگا دی اور اطراف و اکناف میں جو بھی مسلمان ان کے ہاتھ لگا اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ تمام شہر میں لوٹ مار اور کشت وخون کا بازار گرم ہو گیا۔ فوجی دستوں نے حالات کو قابو میں لانے کی بہت کوشش کی لیکن انھیں اس مقصد میں کامیابی حاصل ہونے تک اس مقصد میں کامیابی حاصل ہونے تک تقریباً پچاس مسجدیں مسمار اور کئی سو مسلمان شہید ہو چکے تھے"۔[6]

اس کے بعد آئندہ کئی برسوں تک امن وسکون کی فضا برقرار رہی جس میں پہلی بار 1851ء میں اور دوسری بار 1874ء میں زخنہ اندازی ہوئی لیکن ان دونوں ہی موقعوں پر بمبئی میں مسلمانوں اور پارسیوں کے درمیان فسادات پھوٹ پڑے۔ پہلے فساد کی وجہ تو یہ تھی کہ چترو نیان وربان Chitro Nyan Burban نامی ایک گجراتی اخبار میں بہرام جی کرسٹ جی گاندھی نامی ایک پارسی نے ایک مضمون شایع کروایا تھا جس میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی شخصیت کو نشانہ بنایا گیا تھا اور مضمون کے ساتھ ہی آپ کی ایک فرضی تصویر بھی شایع کی گئی تھی۔ اس پر مسلمان برافروختہ ہو اٹھے تھے کیونکہ وہ اپنے رسول کی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے فساد کی نوعیت بھی، جو پہلے فساد کے مقابلے میں زیادہ سنگین تھا، اسی قسم کی تھی لیکن اس بار بھڑکنے کی وجہ کوئی مضمون نہیں تھا بلکہ رستم جی ہرمز جی جال بھائی نامی پارسی کی گجراتی زبان میں لکھی ہوئی وہ کتاب تھی جس کا نام تھا "دنیا کے عظیم پیغمبر"۔ مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ اس کتاب میں مصنف نے نہ صرف پیغمبر اسلام اور آپ کے عزیز و اقارب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے کردار پر کیچڑ اچھالی تھی بلکہ آپ کے صاحبزادے ابراہیم کے بارے میں یہ بھی لکھا تھا کہ آپ نے ماریہ نامی ایک حبشی کے بطن سے جنم لیا تھا۔[7]

زیر تبصرہ مدت سے قریب تر پہنچتے ہوئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عین اُس وقت جبکہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی کالی کٹ کے قریب ملیاپورن نامی گاؤں میں ایک چھوٹا سا موپلوں کا فساد پھوٹ پڑا ہے جس میں گیارہ فسادی مارے گئے اور دو زخمی ہوئے۔ اس فساد کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اعلیٰ ذات کا ایک رامن نامی ہندو اس نیت سے اسلام قبول کرلیتا ہے کہ ایک مسلمان خاتون سے شادی کرسکے۔ لیکن شادی کے فوری بعد وہ مرتد ہوکر دوبارہ ہندو دھرم اختیار کرلیتا ہے جس پر موپلوں کو طیش آجاتا ہے۔ چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۴ء کے روز چند درجن موپلے ہندو قیں لگاکر رامن کے گھر پہنچتے ہیں اور اس کے بعض رشتہ داروں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بناکر اُس کے گھر میں آگ لگادیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ موپلے ایک مالدار برہمن کے گھر جاکر اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں اور بالآخر تری کلیور Thrikulyam نامی گاؤں کے ایک مندر میں جاکر پناہ لے لیتے ہیں۔ اُن واقعات کو سُن کر لفٹیننٹ ڈے اور کیپٹن میکسویل برطانوی سپاہیوں کی ایک کثیر جمعیت کے ساتھ مقام واردات پر پہنچ جاتے ہیں اور موپلوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ خود کو حکام کے حوالے کردیں لیکن موپلوں کی جانب سے اُنھیں یہ جواب ملتا ہے کہ وہ خود کو اسلام پر قربان کردینے کو اس بات پر ترجیح دیں گے کہ خود کو حکام کے حوالے کردیں۔ موپلوں نے انگریزوں کا اس پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا کہ بالآخر انگریز انھیں زیر کرنے کے لیے ڈائنامائٹ کے استعمال پر مجبور ہوگئے۔ دراصل موپلوں نے انگریزوں کے مقابلے میں اتنی سخت مدافعت کی کہ برطانوی سپاہیوں میں سے ایک پرائیویٹ بیرٹ Private Barrett نامی سپاہی کو وکٹوریا کراس کے تمغے سے سرفراز کیا گیا کیوں کہ اُس نے موپلوں کے شدید حملوں کو پسپا کرنے میں انتہائی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا۔[8]

اس سرکشی کے کوئی دور رس اثرات مترتب نہیں ہوئے۔ لیکن اکتوبر ۱۸۸۶ء سے پہلے ہفتے میں الٰہ آباد اور دہلی میں ہونے والے بدنام زمانہ فسادات پر اس قدر شدید عوامی ردعمل ہوا کہ The Times کے ہندستانی نامہ نگار کو کہنا پڑا[9] اس بات سے قطع نظر کہ آج کل اس ملک کے دیسی باشندوں میں پیدا ہونے والے اتفاق اور یگانگت کے بارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بہت کچھ سننے میں آرہا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ آج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پائی جانے والی عداوت اور دشمنی اتنی ہی گہری اور تلخ ہے جتنی کہ ایک سو سال پہلے ہوا کرتی تھی۔" سرکاری رپورٹوں کے مطابق ان فسادات کی وجہ دو مذہبی تہواروں کا ایک ساتھ انعقاد تھی یعنی ہندوؤں کی رام لیلا اور مسلمانوں کا محرم۔ اُنہی دنوں بمبئی پریسیڈنسی میں واقع کاٹھیاواڑ ضلع کے مقام جیت پور میں بھی فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ ان فسادات کی وجہ بھی وہی تھی لیکن ان میں سنگین نوعیت کے حادثات نہیں ہوئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن "پنجاب میں واقع لدھیانہ ملتان اور دیگر شہروں میں بھی کشیدگی پھیل گئی تھی۔"[10]

دہلی میں حالات نے نہایت سنگین صورت حال اختیار کرلی تھی۔ اس بارے میں ایک مبینہ تاثیر سے تبصرہ کرتے ہوئے The Times کے نامہ نگار نے لکھا تھا "یوں لگتا ہے کہ دہلی کے حالیہ مذہبی دنگوں نے اپنے پیچھے کافی تلخیاں چھوڑی ہیں۔ اس شہر کے ہندو پارچہ فروشوں نے متفقہ طور پر مسلمانوں کے ہاتھ کپڑا بیچنے یا کسی قسم کی معاملت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بائیکاٹ اور سازش کی علامتیں دیگر تجارتی شعبوں میں بھی نظر آنے لگی ہیں۔" حالات نے اُن دنوں اس قدر سنگینی اختیار کرلی تھی کہ بڑی تعداد میں بااثر مسلمانوں کو اس شہر کے ڈپٹی کمشنر کے حضور یہ معروضہ پیش کرنا پڑا کہ وہ اس بارے میں مداخلت کریں اور مسلمانوں کو تحفظ فراہم کریں۔

تین سال بعد پھر ایک سنگین نوعیت کا فساد پھوٹ پڑا۔ اس بار یہ فساد ڈیرہ غازی خاں کے قبائلی علاقوں میں رونما ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک ہندو شخص نے اسلام قبول کرلیا۔ مقامی مسلمانوں نے اس موقعے پر کافی جوش و خروش کے ساتھ خوشی کا مظاہرہ کیا اور نومسلم کو جلوس کی شکل میں سڑکوں سے گزارا، جس پر قدرتی امر تھا کہ ہندو مشتعل ہوجاتے چنانچہ وہ لوگ بھی "سیکڑوں کی تعداد میں لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے لیس ہوکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔"[12] اس کے بعد جو دنگا فساد ہوا اُس میں ویسے تو دونوں فریقوں کو کافی نقصان برداشت کرنا پڑا لیکن کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ نقصان پہنچا۔ ایک بار پھر The Times کے نامہ نگار نے لکھا:

> ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پائی جانے والی مذہبی اور قومی رقابتوں میں وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ کمی ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اگر برطانوی عہدیدار سخت اور سرد قسم کی غیر جانبداری کا رویہ نہ اپنائیں تو کوئی عجب نہیں کہ یہ فرقہ وارانہ رقابتیں جلد ہی پورے ملک کو خانہ جنگی کی آگ میں لپیٹ لیں۔[13]

1891ء تک فرقہ وارانہ منافرت کا یہ زہر ملک کے جنوبی علاقوں تک پہنچ گیا۔ اس سال مدراس پریسیڈنسی کے سالم ضلع میں واقع پال کیڑ Plaad نامی مقام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ایک شدید قسم کا فساد پھوٹ پڑا۔ اس فساد کی وجہ بھی پھر ایک باڈھی مذہبی جلوس بنا۔ لیکن اس بار "غیر مہدی" کہلانے والے بعض جنونی مسلمانوں نے ہندوؤں کے ایک مذہبی جلوس پر حملہ کیا تھا۔[14]

اگلے دو برسوں تک نسبتاً سکون رہا۔ لیکن 1893ء کے جون کے مہینے میں ملک کے مختلف حصوں میں خطرناک قسم کے فسادات رونما ہوئے جن میں رنگون اور بمبئی کے فسادات کے علاوہ شمال مغربی صوبجات میں واقع ضلع اعظم گڈھ کا اور بنارس ڈویژن میں واقع ضلع غازی پور کا اسی طرح یو۔پی میں بلیا، روہیل کھنڈ میں بریلی، اودھ میں بہرائچ، بہار میں بسنت پور اور جونا گڈھ میں پربھاس پٹن کے فسادات قابلِ ذکر ہیں۔ اکثر مقامات پر فسادات اس وجہ سے ہوئے کہ بقرعید کے موقعے پر مسلمانوں نے گائیں ذبح کر کے قربانی کی تھی یا تحفظ گاؤ کی انجمنوں نے مسلمانوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا تھا۔ سرکاری رپورٹوں کی بنا پر یہ کہنا مشکل ہے کہ دراصل جارحیت کی مرتکب کونسی قوم ہوئی تھی۔ جہاں بمبئی اور رنگون کے فسادات کا ذمہ دار گردانا گیا تھا۔[15] دراصل سرکاری توضیحات سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں فریقین ان فسادات کے لیے مساوی ذمہ دار تھے۔ جیسا کہ اُس وقت کے وایسرائے لارڈ لینس ڈاؤن (Lord Lansdowne) نے آگرہ کے مقام پر اپنی ایک تقریر میں کہا تھا: "غلطی کا ارتکاب کبھی تو مسلمانوں کی جانب سے کیا جاتا تھا اور کبھی ہندوؤں کی جانب سے۔"[16]

اخبار The Times نے "ہندستانی امور" کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں مندرجہ بالا فسادات میں سے ایک فساد کو نکر شروع ہوا اس بات کی بڑی تفصیلی معلومات مہیا کی ہیں۔ اس مضمون کا تعلق بمبئی کے اُس فساد سے ہے جس میں ایک ہفتے کے لڑائی جھگڑوں کے دوران 65 افراد ہلاک اور 500 افراد زخمی ہوئے تھے۔

بمبئی کے یہ فسادات براہِ راست اُن جلسوں کا نتیجہ تھے جو بظاہر ایک نیک اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امدادی مقصد کے لیے موافقانہ اور مخالفانہ انداز میں منعقد کیے جا رہے تھے۔ دیسی ریاست جوناگڑھ کے شہر سومناتھ میں اُس وقت سے ہندو مسلم فسادات ہوتے چلے آئے ہیں، جب ۱۰۲۴ء میں وہاں محمود (غزنوی) نے بت شکنی کی تھی، آج یہ مقام کھنڈرات اور مزارات کا شہر ہے۔ ایک شہر کا مغربی میدان مسلمانوں کے معبدوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس شہر کا موجودہ نام پربھاس پٹن ہے اور یہ مقام آج بھی خونریز مذہبی ہنگاموں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس سال تو ہمیشہ کے مقابلے میں یہاں بہت زیادہ خون خرابہ ہوا جس کی خبر پاکر بمبئی کے ہندوؤں نے ایک جلسۂ عام منعقد کر کے دیسی ریاست جوناگڈھ میں اپنے ہم مذہب مصیبت زدگان کی مدد کے لیے خطیر رقم جمع کی۔ اس کے جواب میں بمبئی کے مسلمانوں نے بھی ایک جلسۂ عام منعقد کیا تاکہ زخمی اور تباہ حال فرزندانِ اسلام کی امداد کے لیے رقم جمع کی جا سکے۔ کم تر درجے کے ہندوؤں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ مسلمان بہت بڑے پیمانے پر کھلے عام گایوں کو ذبح کرنے والے ہیں جبکہ کم تر درجے کے مسلمانوں میں یہ متضاد افواہ پھیل گئی کہ ہندو لوگ مل کر مسلمان قصابوں کی دکانوں کو تباہ و تاراج کرنے والے ہیں۔ اس طرح دونوں جانب جذبات کو خوب بھڑکنے کا موقع دیا گیا جس کے نتیجے میں مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی، مندروں پر حملے کیے گئے اور سڑکوں پر دو بدو لڑی جانے والی لڑائیوں میں بڑی تعداد میں مساوی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانیں تلف ہوئیں۔[17]

دیگر فسادات کے حالات بھی غالباً ان حالات سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ اکثر صورتوں میں فسادات کے محرکات میں (۱) افواہیں (۲) غنڈوں کی سرگرمیاں اور (۳) مذہبی تعصبات کا استحصال شامل ہیں۔ سبھی صورتوں میں فسادیوں کو اپنی کامیابی کا اس وجہ سے یقین ہوتا تھا کہ دونوں ہی قوموں کے عوام کے فرقہ وارانہ جذبات کو بہ آسانی برانگیخت کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اکثر موقعوں پر حکام اور پولیس نے نہ تو مستعدی سے کام لیا اور نہ سخت گیری سے، جیسا کہ حالات کا تقاضہ تھا۔ بعض موقعوں پر تو اُن پر اس بات کا سنگین الزام عاید کیا گیا کہ انھوں نے حالات سے مناسب طور پر نمٹنے میں قصور کیا۔[18]

اِن تمام باتوں سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ بار بار کے فسادات کی وجہ سے دونوں قوموں کے باہمی تعلقات پر بہت برا اثر پڑا جس کی وجہ سے انتہائی تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقوں میں بھی اپنی قوم کی بے جا طرفداری کا فرقہ وارانہ رجحان پیدا ہونے لگا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ بات دیسی اخبارات میں شایع ہونے والے مواد سے بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کیونکہ ہندو اخبارات، ہندو فسادیوں کی حمایت میں مضامین شایع کر رہے تھے جبکہ مسلم اخبارات مسلم فسادیوں کی حمایت میں۔[19] حتیٰ کہ کئی وفادار قسم کے رہنما بھی اس مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ کیونکہ بسا اوقات وہ اپنے ہم مذہب فسادیوں کی حمایت میں جوش و خروش کے ساتھ کمربستہ ہو جاتے تھے اور یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے کہ ان کے اس طرزِ عمل سے حالات میں سُدھار پیدا ہوگا یا مزید ابتری پیدا ہوگی۔[20] ایسے رہنما بہت ہی قلیل تعداد میں تھے جنھوں نے واقعتہً حالات کا تجزیہ خالص عقلی بنیاد پر کیا ہو اور جن کی کوششوں کی وجہ سے فضا میں موجود فرقہ واریت کی آلودگی میں کمی واقع ہوئی ہو۔ نتیجتہً ایسے تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بھی جارحانہ قسم کی فرقہ واریت کے مؤید بن گئے جنھوں نے خود کبھی فسادات میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اسی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فسادات نے ہندستانی سیاست میں بڑا ہی تباہ کن کردار انجام دیا ہے۔

اس کے علاوہ اس مسئلے کا معاشی پہلو بھی تھا۔ بعض اوقات فرقہ وارانہ فسادات دراصل ایک طبقے کے معاشی تسلط کے خلاف دوسرے طبقے کی بغاوت ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر بڑے ہندو ساہوکاروں کے خلاف چھوٹے مسلم بیوپاریوں کی بغاوت یا بڑے مسلم زمینداروں کے خلاف چھوٹے ہندو کسانوں کی بغاوت۔ حقیقی وجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو چھوٹے موٹے جھگڑے جلد ہی فرقہ وارانہ روپ اختیار کر لیتے تھے اور یقین کے بیشتر ایسے افراد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے تھے جن کا کوئی راست تعلق اُن جھگڑوں سے نہیں ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں پیشہ ور قسم کے غنڈے اس قسم کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اور مذہب کے نام پر واویلا مچانا شروع کر دیتے تھے اور اس طرح چھوٹے موٹے واقعات بھی بدترین قسم کی مذہبی جھڑپوں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ ویسے خالص انتظامی نقطۂ نظر سے یہ فسادات سماج دشمن عناصر کی جانب سے برپا کیے جانے والے نقضِ امن کے سوا اور کچھ نہیں تھے۔ تاہم انھیں اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کے ہنگامے ہندستانی سماج میں پائی جانے والی سنگین نوعیت کی بے آہنگی کے مظہر ہوا کرتے تھے۔ جب تک اس بے آہنگی کو دور نہیں کیا جاتا تب تک ایسے ٹکراؤ رد کے نہیں جا سکتے۔[21]

۱۹۴۶ء میں جگہ جگہ نمودار ہونے والے فسادات نے اُن لوگوں کو متردد کر دیا جنھیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذمہ دارانہ ہم آہنگی میں دلچسپی تھی۔ چنانچہ ہر جگہ امن کمیٹیاں قایم کی گئیں اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ آیندہ زیادہ چوکنی رہے اور فسادیوں سے نپٹنے کے معاملے میں سخت گیری سے کام لے۔ دارالعوام میں سر ولیم ویڈربرن Sir William Wedderburn نے انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا سے مطالبہ کیا کہ وہ ان فسادات کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرے اور یہ مشورہ بھی دیا کہ حکومتِ ہند سے کہا جائے کہ وہ سرکاری اور غیر سرکاری ارکان پر مشتمل ایک طاقتور کمیشن قایم کرے جو "اس قسم کے فسادات کی وجوہات کا پتہ چلا سکے اور مشورہ دے سکے کہ کن بہتر طریقوں سے فساد کے محرکات کو ختم کیا جا سکتا ہے"[22] چنانچہ چند ماہ بعد ایوان کی میز پر گورنر جنرل کے اُس سرکاری تار کی نقل رکھی گئی جس میں ان فسادات کی تفصیل بتلائی گئی تھی۔ جہاں تک مطالبے کے دوسرے حصے کا تعلق ہے اس بارے میں انڈر سکریٹری لارڈ رسل Lord Russell نے کہا: "جیسا کہ میرے معزز دوست واقف ہیں کہ ہندستان میں مذہبی فسادات تو تقریباً ہر سال ہوتے ہی رہتے ہیں اس لیے سکریٹری آف اسٹیٹ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومتِ ہند کو اُس کمیشن کے قیام کی ہدایت دینے کی ضرورت نہیں جس کا کہ مشورہ میرے معزز دوست نے دیا ہے"[23] یعنی بقول India "دوسرے لفظوں میں یہ کہا گیا کہ مرض اتنا شدید ہو چکا ہے کہ کسی بھی ڈاکٹر کو بلانے یا تشخیص کروانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں ہے"[24]

تین دن بعد دادا بھائی نوروجی نے پارلیمنٹ میں پھر یہی سوال اُٹھایا۔ اُنھوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا سے دریافت کیا کہ کیا وہ ایوان کی میز پر ایک ایسا گوشوارہ رکھ سکتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ گذشتہ پانچ برسوں کے دوران کتنے ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے اور اُن میں سے ہر ایک کی ابتدا کیونکر ہوئی اور ہر ایک سے کس طرح نپٹا گیا اور ہر ایک میں کتنے افراد مارے گئے اور کتنے زخمی ہوئے۔ اس کے جواب میں رسل نے کہا: "سکریٹری آف اسٹیٹ کے پاس مکمل تفصیلات موجود نہیں ہیں جن کی بنا پر مطلوبہ پانچ سالہ رپورٹ ترتیب دی جا سکے"[25]

تاہم ان سوالات کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ سکریٹری آف اسٹیٹ نے حکومتِ ہند کو ہدایت کی کہ وہ "حالیہ فسادات کے بارے میں ایک عام رپورٹ پیش کریں جس میں واضح کیا جائے کہ ان کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور یہ کہ اس قسم کے فسادات ماضی کے برخلاف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالیہ برسوں میں کثرت سے کیوں رونما ہو رہے ہیں اور ان پر قابو پانے کے لیے کونسے طریقے اپنائے جانے چاہئیں"۔[26]

اس کا جواب دینے میں حکومتِ ہند کو تقریباً دو مہینے لگ گئے جس میں کہا گیا کہ "ہندستان میں مذہبی فسادات کوئی نئی چیز نہیں ہیں" اور یہ کہ اس قسم کے فسادات برطانوی راج کے قیام سے پہلے اور اس کے بعد بھی مختلف موقعوں اور مختلف مقامات پر رونما ہوتے آئے ہیں۔ اگلے وقتوں میں ایسے فسادات کی تعداد اس وجہ سے کم ہوا کرتی تھی کہ انتظامیہ پر کسی ایک فریق کا تسلط ہوا کرتا تھا جس کی وجہ سے دوسرا فریق خود بخود سرنگوں ہو جاتا تھا۔ الحاق سے پہلے پنجاب کی صورتِ حال ایسی ہی تھی[27] اور یہی صورتِ حال آج بھی کئی دیسی ریاستوں میں پائی جاتی ہے خواہ وہ ریاستیں ہندو ہوں یا مسلمان"۔

برطانوی راج میں حالات بدل گئے ہیں کیوں کہ اب کسی ایک فریق کو اس بات کی اجازت حاصل نہیں کہ دوسرے پر اپنی مرضی کو تھوپ سکے۔ نتیجۃً دونوں فریقوں میں اپنے اپنے مذہبی استحقاق پر زور دینے کا رجحان پروان چڑھنے لگا ہے"۔ جواب میں یہ بھی کہا گیا کہ" ان حالات میں برطانوی عہدیداروں کو اس مشکل ترین مسئلے سے نپٹنا پڑ رہا ہے کہ وہ کس طرح غیر جانبداری کے ساتھ انصاف کریں اور کس طرح ایسے مظاہروں کو کچل ڈالیں جن کا مقصد یا نتیجہ مذہبی مخالفین کے جذبات کو مجروح کرنا ہو اور اس طرح امن و امان کی بحالی کا بندوبست کرتے ہوئے تمام مذاہب کے ساتھ کیوں کر مساویانہ برتاؤ روا رکھیں"[28] بسا اوقات قدیم رواج ہی کو اپنایا گیا لیکن ہر بار اس کے اطمینان بخش نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کے رواج میں شدید قسم کی خلل اندازی ہوئی ہوگی یا اُس کی ترویج کے بعد حالات یکسر بدل گئے ہوں گے یا اس کی بنا غیر یقینی اور مابہ النزاع بنیادوں پر رکھی گئی ہوگی یا اس کے نفاذ کے لیے جس قسم کی سختی ناگزیر سمجھی جاتی ہے وہ معقول مذہبی آزادی کے معیار قرار دی گئی ہو۔ مختصر یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پُرامن زندگی گزارنے پر آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور حکومتِ ہند یہ سمجھتی تھی کہ اس نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے پر چڑھ آنے سے باز رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

اس کے علاوہ حکومت اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ اُن دو مخصوص موقعوں پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مناسب احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں جن پر اکثر ہنگامے پھوٹ پڑتے تھے ایسا اُس وقت ہوتا۔

(1) جب کہ دونوں قوموں کے مذہبی تیوہار ایک ساتھ آتے اور

(2) جب کہ مسلمان روزے کے کھانے یا قربانی کے لیے گایوں کو ذبح کرتے۔

حالیہ برسوں میں فسادات کی کثرت کے وجوہات بیان کرتے ہوئے حکومت نے بتلایا کہ اس کثرت کی

(1) پہلی وجہ یہ ہے کہ ذرائع حمل و نقل میں بہتری پیدا ہونے کی وجہ سے ملک کے مختلف گوشوں میں خبریں سُرعت کے ساتھ پہنچنے لگی ہیں۔ خبروں کے اس تیز رفتار تبادلے کی وجہ سے مبالغہ آمیز رپورٹوں اور فرقہ وارانہ بیانات کی بہ آسانی تشہیر ہونے لگی ہے۔

(2) دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبات میں تلخی پیدا ہو چلی ہے کیوں کہ آئے دن اُنھیں اس امر کا شدید احساس ہونے لگا ہے کہ ہندوؤں نے انھیں زندگی کی دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا ہے اور سرکاری ملازمتوں پر اجارہ داری قایم کرلی ہے اور قانون اور دیگر پیشوں میں کامران ہو رہے ہیں۔

(3) تیسری وجہ ہندو دھرم کا احیار ہے۔ تحفظ گاؤ کی انجمنوں کا قیام اس تحریک کی اہم خصوصیت ہے جس کا مقصد ہندوؤں کو ایک مضبوط مذہبی بندھن میں باندھ کر اُن میں برہمنوں کی تکریم اور گائے کی حرمت کے جذبے کو پروان چڑھانا ہے۔[29]

تاہم چونکہ اس سرکاری توضیح کے منظرِ عام پر آنے میں کافی تاخیر ہو چکی تھی اس لیے ہندستان اور انگلستان کے اخبارات میں ان فسادات کی متعدد وجوہات بیان کی گئیں۔ بعض برطانوی اخبارات تو یہاں تک لکھ گئے کہ غالباً کانگریس نے یہ فسادات کروائے ہوں گے تاکہ انتظامیہ کو مفلوج کر دیا جائے اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ کانگریس کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اخبار The Times خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ موجودہ فسادات کی غالباً وجہ یہ تھی کہ بیک وقت امتحانات کے انعقاد کے مسئلے کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات نے شدت اختیار کر لی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔[30] دوسرے اخبار ڈیلی کرانیکل The Daily Chronicle نے اس نظریے سے اختلاف کیا اور بالکل متضاد موقف اختیار کیا۔ اس اخبار کے مطابق یہ فسادات اس وجہ سے وقوع پذیر ہوئے کہ "ہندستان کے بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ حکومت اوّل تو یہ چاہتی ہے کہ ہندو عناصر کو نظر انداز کر کے مسلمان عناصر کی پشت پناہی کی جائے اور دوم یہ کہ اس قسم کی پشت پناہی حکمرانوں کی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی عام پالیسی کے عین مطابق ہے"۔[31] اسی طرح مانچسٹر گارجین Manchester Guardian کا رویہ بھی مسلمانوں کے ساتھ ہمدردانہ نہیں تھا۔ اس بات سے انکار کرتے ہوئے کہ موجودہ فسادات ہندوؤں کی گئو رکھشا تحریک نے بپا کرائے تھے[32] اخبار مذکور مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے رقمطراز ہے کہ "اس جگہ کیونکر امن و امان کی توقع کی جا سکتی ہے جہاں ایک فرقہ شرارت کی نیت سے دوسرے فرقے کے مذہبی جذبات کو مجروح اور مشتعل کرتا ہو"۔ اس اخبار نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر گائے کی قربانی کو ترک نہ بھی کیا جا سکے تو "اس فعل کو کم از کم محدود پیمانے پر اس طرح کیا جانا چاہیے کہ اس سے ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں اور بقول مسٹر پن کوٹ Pincott ہندو قوم تو ایک ایسی امن پسند قوم ہے جو ہمیشہ اس بات پر آمادہ رہتی ہے کہ ہر اُس شے سے چشم پوشی اختیار کر لی جائے، جو علی الاعلان لگاہوں میں نہیں کھٹکتی"۔[33]

ہندستان میں بھی اکثر ہندو اخبارات نے حکومت کی جانب سے مسلمانوں کے "بیجا لاڈ پیار" ہی کو فسادات کی وجہ قرار دیا۔[34] لیکن علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ کا کہنا تھا کہ فسادات کی وجہ یہ تھی کہ پارلیمنٹ میں ہندستانی معاملات میں دخل اندازی کی جانے لگی تھی۔ اس اخبار نے حکمرانوں کو صلاح دی کہ وہ امن و آشتی کے قیام کے پیش نظر آیندہ اپنے اصولِ جہاں بانی میں ذیل کے تین امور کو شامل کر لیں۔

> اوّل تو اس اصول کو ترک کر دیا جائے کہ ہر فیصلہ کرتے وقت اکثریت کی رائے کا احترام کیا جانا چاہیے۔ دوم یہ کہ مجالس مقننہ کے انتخابی ضوابط میں ایسی تبدیلی کی جائے جس کی رو سے مسلمان اپنے نمایندے خود منتخب کر سکیں۔ سوم یہ کہ سول ملازمتوں میں انگریزوں کی بڑھی ہوئی تعداد کو برقرار رکھا جائے۔[35]

بہرحال 1893ء کے بعد غالباً اُس سال کی دور دور تک پھیلی ہوئی قتل و غارتگری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ردِ عمل کے طور پر فسادات کی تعداد میں بڑی حد تک کمی واقع ہوئی بعد کے فسادات کی نوعیت سنگین نہیں تھی۔ یہ اس وجہ سے ممکن ہو سکا کہ حکام کو بدیر ہی بالآخر اس امر کا شدید احساس ہو گیا کہ اگر انھوں نے ان فسادات کو، بقول لینس ڈاؤن Lansdowne "سختی" سے نہیں کچلا تو ان کی وجہ سے خود حکومت ہی کو دھکا پہنچے گا اور نظم و ضبط کے ساتھ حکومت کا کاروبار چلانا انتہائی مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ جس وقت اکتوبر 1894ء میں پونا کے مقام پر فسادات پھوٹ پڑے تو بمبئی کے گورنر لارڈ ہیرس Lord Harris نے حالات کو قابو میں لانے کے لیے سخت قسم کے غیر جانبدارانہ اقدامات کیے[36] جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فساد جسے برپا کرنے کی وسیع پیمانے پر تیاریاں کی گئی تھیں اور جس کی تنظیم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا تھا ایک دن سے کم عرصے میں فرو کر دیا گیا۔ اس فساد کی وجہ یہ تھی کہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہندو مسجد کے روبرو باجا بجانے پر مُصر تھے۔ انھیں پونا کے مسلمانوں کی جانب سے حکومت کی خدمت میں بھیجی جانے والی اس عرضداشت نے مشتعل کر دیا تھا جس میں حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے تحفظ کا انتظام کرے کیونکہ بعض مقامی ہندو رہنما، خفیہ طور پر اپنے ہم مذہبوں کو مسلمانوں کے خلاف فساد پر کرنے پر اُکسا رہے ہیں۔ اُن دنوں پونا میں وسیع پیمانے پر ایسے کتابچے اور پرچیاں تقسیم کی جا رہی تھیں جن میں محرم کی تقریبات کی تحقیر کی گئی تھی اور ہندوؤں سے "مسلح ہو جانے" کے لیے کہا گیا تھا اور مرہٹوں کو تلقین کی گئی تھی کہ وہ "ملیچھوں" کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیں" جیسا کہ شیواجی نے کیا تھا۔" مذکورہ بالا کتابچوں میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ "بدیسی حکومت کی غلامی کے خنجر نے سبھی کے سینوں کو چھلنی کر دیا ہے۔" اس لیے "تمام بدیسی نشانات" کو مٹانے کی غرض سے ضروری ہے کہ ابتدائی اقدام کے طور پر مذہبی جنگ چھیڑ دی جائے۔[37]

بعض ذمہ دار حلقوں کی جانب سے اِن فسادات کی ذمہ داری تلک کی بعض اُن سرگرمیوں پر بھی عاید کی گئی جن میں تابوت کے طرز پر گنپتی کا پنڈالوں میں بٹھایا جانا بھی شامل تھا۔ جہاں رات رات بھر گانے بجانے کی محفلیں منعقد کی جانے لگی تھیں اور ڈھول پیٹ پیٹ کر مسلمانوں پر رکیک قسم کی طعنہ زنی کی جانے لگی تھی۔ اِسی وجہ سے ہیرس نے خاص طور پر مہاراشٹر کے برہمنوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا اور کھلے بندوں اُنھیں "بدنظمی" اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"قانون شکنی" کا مرتکب قرار دیا۔ اس کے فطری ردِ عمل کے طور پر مراٹھی پریس مشتعل ہو گیا اور گورنر پر الزام عاید کیا گیا کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کی غیر ضروری حمایت کرنے لگا ہے بلکہ "کانگریس کا دندان شکن جواب دینے کی نیت ہی سے وہ ایسے فتنوں کی حمایت کر رہا ہے"۔[38] خود تلک کے اخبار مرھٹہ نے گورنر کو مشورہ دیا کہ ایسے حالات میں سب سے بہتر خدمت جو ایک گورنر سرانجام دے سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بالکل خاموشی اختیار کرلے اور جہاں تک پیرس کا تعلق ہے اُس کے لیے تو "ان حالات میں خاموشی سے بہتر اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی"۔[39]

چند مہینوں بعد دھولیہ میں ایک اور ہندو مسلم فساد رونما ہوا۔ لیکن اس پر بھی فوراً قابو پالیا گیا۔ پھر ایک بار مصیبت کا آغاز مسجد کے روبرو ہندوؤں کے جلوس کے باجا بجانے کی وجہ سے ہوا۔[40] 1897ء میں چت پور کے مقام پر مسلمانوں کو اس وجہ سے بے دریغ قتل کیا گیا کہ انھوں نے عدالت کے فیصلے کے مطابق ایک ایسے قطعہ آراضی پر قبضے کے معاملے میں مزاحمت کی تھی جس پر ایک مسجد آباد تھی۔ مختصراً حالات کی ترتیب اس طرح تھی۔ دوشنبہ کے روز پولیس نے قبضہ دلوایا اور سہ شنبہ کے روز دو ہزار سے زیادہ مسلمان اس غرض سے جمع ہو گئے کہ منہدم کردہ مسجد کو از سرِ نو تعمیر کر سکیں۔ لیکن پولیس نے انھیں تتر بتر کر دیا۔ چہار شنبہ کے روز اس بات کا شبہ کیا گیا کہ مسلمان مقامی ہیمنگ اسٹیشن کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور ٹیلیفون کے تاروں کو کاٹ رہے ہیں۔ جب مجمع قابو سے باہر ہو گیا تو ملٹری نے گولی چلادی اور سرکاری رپورٹ کے مطابق "آٹھ فسادی مارے گئے اور بے شمار زخمی ہو گئے"۔ لیکن رائٹر کے نمایندے کے بموجب، جو اُس وقت مقامِ واردات پر موجود تھا "مرنے والوں کی تعداد کم سے کم تخمینے کے مطابق بھی ۵۰۰ تھی"۔[41] ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی اس متضاد تعداد سے قطع نظر یہ امر واقعہ ہے کہ یہ سارا ہنگامہ سنگین نوعیت کا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔

بہرحال ہماری مدتِ تحقیق کے بقیہ چھے یا سات برسوں میں سنگین نوعیت کے فرقہ وارانہ فسادات رونما نہیں ہوئے۔ ویسے تو اس دوران کہیں کہیں معمولی نوعیت کے جھگڑے اور ہاتھا پائی ہوتی رہی لیکن ان کی نوعیت اتنی سنگین نہیں تھی کہ دونوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرقوں میں کسی قسم کا سنگین ہیجان برپا ہو جاتا۔ غالباً ان دنوں بڑے بڑے سرغنوں کی توانائیاں "پلیگ کے فسادات" میں صرف ہو رہی تھیں جو اُن دنوں جگہ جگہ حکومت کے خلاف رونما ہونے لگے تھے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ان دنوں فرقہ وارانہ فسادات کا کوئی موقع نہ مل سکا تب بھی سماج دشمن عناصر نے اپنے گھناؤنے مزایم کی تکمیل کی راہیں دریافت کر ہی لیں۔ اس نظریے کو اس بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ فسادیوں کا نشانہ بننے والوں میں لازماً ایسے غریب خوانچے والے مزدور اور چھوٹے پیوپاری شامل ہوتے جو کسب معاش میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ انھیں کوئی مصیبت مول لینے کی فرصت ہی نہیں ہوتی[42]۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کا خون بہانا بہت آسان ہوتا ہے خواہ ان کا قصور اس کے سوا کچھ اور نہ ہو کہ وہ مخالف مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا قتل فرقہ وارانہ صورت حال میں کشیدگی کا باعث بنتا ہے اور فسادیوں کو لوٹ مار اور غارتگری میں سہولت بہم پہنچتی ہے۔

لیکن اگر ماحول میں فرقہ وارانہ کشیدگی کو پیدا ہونے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا اور فسادیوں کو اپنے اپنے ہم مذہب لوگوں کی ہمدردیاں ہی حاصل نہ ہو پاتیں تو ہرگز انھیں یہ جرأت نہ ہو پاتی کہ وہ ان خونیں سرگرمیوں میں ملوث ہو سکیں[43]۔ جیسا کہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اپنے صفحات پر شایع ہونے والے بہترین مضامین میں سے ایک میں لکھا تھا: "ہم جو ہندستان کے بہتر اور تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں کیا خود کو ان فسادات کے جرم سے بری قرار دے سکتے ہیں؟" جریدہ اس سوال کا جواب یوں دیتا ہے: "بے شک مذہبی فسادات میں ہم لوگ لاٹھیاں لے کر نہیں کود پڑے لیکن ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ ہم نے اس بارے میں اپنی زبانوں اور قلموں کو بھی استعمال نہیں کیا۔" یہ واضح کرتے ہوئے کہ "طبقات اپنے آپ کو عوام سے الگ نہیں رکھ سکتے" گزٹ لکھتا ہے کہ "اس معاملے میں اوّل الذکر کا بھی حصہ ہے اور بڑا حصّہ ہے۔" مثال کے طور پر "اگر عوام لڑتے ہیں تو اونچے طبقات اُس کے بارے میں لکھتے ہیں اور غصّے کے عالم میں تلخی کے ساتھ لکھتے ہیں۔" اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے علی گڈھ کے اس ترجمان نے اپنے قارئین کو یاد دلایا کہ ایک بار قبیلہ واری جنگ کے دوران دو قبیلے آپس میں مصروف پیکار تھے۔ جب ایک قبیلے نے دوسرے پر فتح پائی تو فاتح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قبیلے والوں نے مفتوح قبیلے کے بگل بجانے والے شخص کو گرفتار کرلیا جس پر وہ کہنے لگا۔ "آپ لوگ خواہ مخواہ مجھے کیوں گرفتار کرتے ہیں۔ میں نے تو آپ کے خلاف لڑائی میں حصّہ نہیں لیا۔ لیکن فاتح قبیلے کے سردار نے تسلیم کرتے ہوئے کہ اس نے لڑائی میں حصّہ نہیں لیا تھا اُس کے بگل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا "یہ کیا شئے ہے؟" اگرچہ تم نے ہمارے خلاف لڑائی میں حصّہ نہیں لیا تاہم تم نے اس بگل سے ایسی آواز نکالی جسے سُن کر تمہارے سپاہی ہمارے سپاہیوں کی جانوں پر چڑھ دوڑے۔"[44]

چند سال پہلے بمبئی کے ایک نامور مسلم قائد عبداللہ دھرمسی نے بھی تعلیم یافتہ طبقے کو اسی قسم کی تنبیہہ کی تھی۔ احمد آباد میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے، جہاں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے بھائی چارگی کی فضا قایم کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی، فاضل مقرر نے اس بات پر زور دیا تھا کہ پولیس اور فوج کے مقابلے میں تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان زیادہ بہتر طریقے سے فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کرسکتے ہیں۔ انھوں نے آگے چل کر کہا تھا: "محض اس بنا پر کہ ہم خود لڑائی میں حصہ نہیں لے رہے ہیں، ہمیں خود کو بے گناہ نہیں سمجھنا چاہیے۔" دھرمسی نے یہ بات بھی کہی تھی کہ اگر معمولی قسم کی رقابتیں اور حد موجود نہ ہو تو فرقہ وارانہ فسادات ہرگز نمودار نہیں ہوسکتے۔ اُن کے مطابق اگر تعلیم یافتہ ہندستانیوں نے ٹھنڈے دل کے ساتھ آپسی اختلافات کو دور کرلیا تو وہ اُس مرض کو اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہوجائیں گے جو ہندستانی سماج کی جڑوں کو گھن کی طرح کھائے جارہا ہے۔[45]

(ب) ہندی اردو قضیہ

فسادات بڑی حد تک غیر تعلیم یافتہ اور سماج دشمن عناصر کی حد تک ہی محدود تھے لیکن ہندی اردو قضیہ دراصل ہندو اور مسلم دانشوروں کے مابین چھڑنے والی لڑائی تھی۔ اگرچہ بنیادی طور پر یہ ایک لسانی قضیہ تھا لیکن اس کی وجہ سے دونوں فریقوں کے جذبات اس حد تک مشتعل ہوگئے تھے کہ اُن کے مابین پائے جانے والے تعلقات پر شدید اور دور رس اثرات مترتب ہوئے۔ مسلم سیاست پر اس کا نہایت ہی واضح اثر ہوا۔ اس کی وجہ سے وہ تمام تعلیم یافتہ مسلمان جو پہلے ہی سے نئی اُبھرنے والی ہندو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیادت کے تعلق سے مشکوک اور شبہات میں مبتلا تھے۔ اس بار شدت کے ساتھ اپنے مستقبل کے تعلق سے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ سرسید احمد خاں نے تو اس سے بہت پہلے 1867ء ہی میں اپنے اعلیٰ عہدیدار مسٹر شیکسپیر Mr Shakespeare سے کہہ دیا تھا کہ ہندی کی حمایت کرنے والے ہندوؤں کی اُردو مخالف تحریک کے بعد ہی انھیں اس کا یقین ہوگیا تھا۔ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانب سے کسی مشترکہ عمل کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ لہٰذا اب مسلمانوں کو خود ہی منظم ہوکر اپنے قومی اثاثے کی حفاظت کرنی ہوگی۔[46]

ہندی اردو قضیے کو سمجھنے کے لیے جو اتفاقاً شمال ہی کی حد تک محدود تھا، ہمیں اس مسئلے کو اُس کے تاریخی تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ گیارہویں صدی کی ابتدا ہی سے ہندستان مسلمانوں کے زیر تسلط رہا ہے لیکن یہ تسلط کبھی بھی کسی ایک نوعیت یا کسی ایک نسل کا نہیں رہا۔ مختلف اوقات میں مختلف مسلمانوں نے اس ملک پر حکمرانی کی۔ چنانچہ مختلف حکمران خاندان اپنی اپنی زبانیں اپنے ساتھ لے آئے۔ افغان حکمران پشتو بولتے تھے، منگولیائی ترک، ترکی زبان استعمال کرتے تھے جبکہ مغلوں کی زبان فارسی تھی لیکن پورے مسلم عہد میں سرکاری نظم ونسق کے لیے استعمال ہونے والی زبان میں زیادہ تبدیلیاں واقع نہیں ہوئیں تھوڑے بہت تغیرات کے ساتھ یہ زبان کم وبیش وہی رہی جسے عہدِ غزنوی میں حسن میمندی کاروبارِ سلطنت سرانجام دینے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ وہ زبان تھی فارسی جو 1837ء تک درباری زبان کی حیثیت سے برقرار رہی جب کہ بنٹنک Bentinck نے اسے منسوخ کرڈالا[47] جس کی وجہ سے بقول منشارت Manshardt راسخ العقیدہ مسلم عوام میں بے چینی اور عدم اطمینان کی حقیقی لہر دوڑ گئی۔"[48]

علاوہ ازیں شاہی فوج کے سپاہیوں کا تعلق اگرچہ مختلف نسلوں سے ہوا کرتا تھا تاہم وہ آپسی بات چیت فارسی زبان ہی میں کیا کرتے تھے۔ دراصل اُس زبان سے واقفیت اُن سب کے لیے لازمی کردی گئی تھی۔ لیکن شمالی ہند کے بازاروں اور گلیوں میں گھومتے وقت انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہاں ان کی فارسی زبان زیادہ کارآمد نہیں ہے کیوں کہ اس زبان میں گفتگو کرنے پر اُن کی باتوں کو نہ تو ہندو سمجھ سکتے تھے اور نہ ہی وہ لوگ جو نئے نئے دایرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ لہٰذا ضرورت نے ایک نئی زبان کو جنم دیا جو فارسی اور برج بھاشا کی آمیزش سے بنی تھی اور یہی زبان آج بھی شمالی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدے بیشتر حصوں میں بولی جاتی ہے[49]۔ جلد ہی یہ نئی زبان اردو کہلانے لگی جس کے معنی ترکی زبان میں فوج کے ہوتے ہیں۔ یہ زبان کب، کہاں اور کس طرح عالم وجود میں آئی اس کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ گراہم بیلی Grahame Bailey ان کے تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ "اردو زبان کی ابتدا 1027ء میں ٹھیک اس وقت ہوئی جب کہ غزنوی فوج کے سپاہیوں نے لاہور میں قیام کرنا شروع کر دیا۔"[50]

مزید یہ کہ ہندی بھی کسی ایک زبان کا نام نہیں ہے۔ یہ زبان شمالی ہند کی مختلف بولیوں کی آمیزش سے بنی ہے۔ وسیع تر مفہوم میں ہندی کو ایک ایسی زبان قرار دیا جا سکتا ہے جو بہار، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان اور پنجاب میں بولی جاتی ہے۔ ہندی اور اردو زبانوں میں بہت کچھ مشترک ہے۔ کم از کم اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دونوں زبانوں کی قواعد ایک ہی جیسی ہے[51] بقول بیمس Beames کے:

"اس عام بولی کا جنم ملک کے قدیم دار الخلافہ دہلی کے نواحی علاقے میں ہوا۔"

اُن دنوں اطراف و اکناف میں ہندی جس شکل میں بولی جاتی تھی اُسی شکل کو آہستہ آہستہ اس نئی زبان کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا گیا جس میں اسماء اور افعال کی تصریفی شکلیں بالکلیہ اور خالصتاً ہندی جیسی ہی رہیں اور عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کی خاصی تعداد بھی جوں کی توں برقرار رہی البتہ فارسی، عربی حتیٰ کہ ترکی الفاظ کی بہت بڑی تعداد اس نئی زبان میں بالکل اُسی طرح شامل ہو گئی جیسے کہ کئی لاطینی اور یونانی الفاظ انگریزی زبان میں گھل مل گئے ہیں۔ لیکن ان نئے الفاظ نے زبان کے ڈھانچے کو کسی طرح بھی متاثر یا تبدیل نہیں کیا۔ چنانچہ جب ہم اس زبان کے تصریفی یا صوتیاتی اجزاء کا جایزہ لیتے ہیں تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آج بھی یہ زبان ایک خالص آریائی بولی ہی ہے۔ یہ زبان ولی اؤ سودا کے تحریر کردہ صفحات میں بھی اُتنی ہی خالص ہے جتنی کہ تلسی داس اور بہاری لال کے صفحات میں۔ چنانچہ اردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں قرار دینا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ لوگ اس معاملے میں اور جملہ علم اللسان کے بارے میں شدید قسم کے مغالطے کا شکار ہوئے[52]

ابتداً اردو صرف بولی جانے والی زبان کا درجہ رکھتی تھی لیکن جلد ہی اس زبان کو تحریر کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ چونکہ اس زبان کا زیادہ استعمال شاہی فوج میں ہوا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا تھا لہٰذا فطری طور پر اسے فارسی رسم الخط میں لکھا جانے لگا۔ اس کے برخلاف ہندو اسی زبان کو دیوناگری رسم الخط میں لکھتے رہے[53]۔ مزید برآں اوّل الذکر نے فارسی الفاظ کو کثرت کے ساتھ استعمال کیا جبکہ آخرالذکر نے اپنے سنسکرت الفاظ کے کثیر ذخیرے کو برقرار رکھا۔ اس طرح دراصل ہندی اور اردو کے درمیان فرق ہوگیا جو آہستہ آہستہ کافی واضح ہوتا گیا۔ انگریزی دورِ حکومت میں صورتِ حال اس وجہ سے اور بھی ابتر ہوگئی کہ انھوں نے اردو کی اسامیوں پر مولویوں اور ہندی کی اسامیوں پر پنڈتوں کا تقرر کرنا شروع کر دیا۔ دراصل دونوں زبانوں کے جداگانہ رجحانات کو مناسب طور پر یکجا کرنا ابھی باقی تھا اور اگر اس ضمن میں کوشش کی گئی ہوتی تو شاید اس کے لیے کوئی خاص دقت طلب مساعی کی چنداں ضرورت بھی نہیں پڑتی[54]

مزید برآں جوں جوں اردو زبان ترقی کرتی گئی توں توں اُس میں ادب کا ایک ذخیرہ جمع ہونے لگا۔ ابتداً یہ ادب نہایت ہی سلیس اور سادہ بول چال کے انداز میں تحریر کیا گیا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس ادب کے تخلیق کرنے والے زیادہ تر فوج کے معمولی سپاہی تھے۔ بعد ازاں اس ادب کو ہمہ اقسام کے فارسی اور عربی استعاروں اور تشبیہوں سے مزین کر دیا گیا۔ اس کا اسلوب بھی بدل گیا۔ اس میں بیرونی ادب کے شہ پاروں جیسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جس کی وجہ سے ادب میں تصنع پیدا ہوگیا۔ عام روزمرہ استعمال میں آنے والے محاوروں کا استعمال کم سے کم ہوتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان ہندوؤں کے لیے آہستہ آہستہ اپنی کشش کھوتی چلی گئی اگرچہ اس کے باوجود متعدد ہندوؤں نے اس زبان و ادب کا گہرا مطالعہ جاری رکھا۔

ابتدائی دور میں اردو زبان کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور واقعہ تو یہ ہے کہ عہد شاہجہانی تک بھی اسے معتبر زبان ہونے کا اعزاز حاصل نہ ہو سکا تھا۔ اس کے بعد البتہ یہ زبان پھلنے پھولنے لگی۔ متاخر مغل درباروں میں اس زبان کی کافی توقیر کی گئی۔ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ کو نہ صرف اس زبان کے عظیم مربّی ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ اُن کا شمار اس زبان کے چند گنے چنے مایۂ ناز شاعروں میں بھی ہوتا ہے[55]

برطانوی عہد عملداری میں اس زبان کی کافی پذیرائی کی گئی۔ فارسی کا استعمال ترک کرنے کے بعد شمالی ہند کے بیشتر علاقوں میں اسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مزید برآں بعض برطانوی عہدیداروں اور اسکالروں نے اس زبان کی اتنی ہمت افزائی اور پشت پناہی کی کہ اس میں ایک جدید اور فعال قسم کے ادب کی تخلیق کا باعث بننے والی قوتِ محرکہ پیدا ہوگئی۔ اس ضمن میں گل کرائسٹ نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں[56] علاوہ ازیں اعلیٰ برطانوی عہدیداروں میں اردو زبان کی چاہت بتدریج بڑھنے لگی۔ ۶ کے اوایل ہی میں لارڈ ولارٹس نے اس امر کا برملا اظہار کر دیا کہ "سبھی طبقوں کے مابین یہ زبان سُرعت کے ساتھ استعمال کی جانے لگی ہے اور اب اسے بین الاقوامی زبان Lingua Franca کا درجہ حاصل ہوگیا ہے"[57]

تاہم زبردست عوامی تائید کے باوجود اردو زبان زیادہ دنوں تک اپنی بالادستی قایم نہ رکھ سکی اور جلد ہی برطانوی حکمرانوں کو اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا کہ شمالی ہند کی زبان کونسی ہے۔ آیا فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو یا دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی؟ اردو کے خلاف ہندوؤں کا یہ ادعا ون بدن بڑھنے لگا کہ اردو زبان اُن کے مقصد کی پوری طرح تکمیل نہیں کرپاتی ہے اس لیے اس کی جگہ ہندی زبان کو رائج کیا جائے۔ ۱۸۷۰ء تک انھوں نے اپنے نظریات کی تشہیر کے لیے متعدد انجمنیں قایم کرلیں جبکہ بنارس کے پنڈتوں نے ایک زوردار اردو مخالف تحریک کا آغاز کر دیا[58]۔ اس کے برخلاف مسلمان ہندی زبان کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں رائج کرنے کے سخت خلاف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہندی ایک ادنیٰ قسم کی ں زبان ہے جسے سرکاری طور پر ہرگز تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ بقول اُن کے اس زبان میں توازن اور پُروقار سنجیدگی کا بڑا فقدان ہے۔ انھوں نے اس بات سے انکار کیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان کی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کی زبان ہے لہٰذا اس زبان کی موجودہ مرتبت کو بحال رکھا جائے جس کی کہ وہ صحیح معنوں میں حقدار ہے۔

پہلے تو برطانوی عہدیداروں نے اس قضیے پر کوئی دھیان نہیں دیا لیکن جس وقت سرجارج کیمپ بل Sir George Campbell نے بنگال کی لفٹیننٹ گورنری کا عہدہ سنبھالا تب انھوں نے اس مسئلے کا گہرائی کے ساتھ جایزہ لینا شروع کیا۔ وہ خاص طور پر محکمہ تعلیمات سے وابستہ اپنے بعض اُن عہدیداروں کی اس رائے سے بہت زیادہ متاثر ہوئے جن کا کہنا تھا کہ ہندوؤں کی ایک بڑی اکثریت کے لیے اردو زبان قابلِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قبول نہیں ہے۔ ان عہدیداروں کا یہ بھی کہنا تھا کہ بہار کے ہندوؤں کی خصوصاً اور عام ہندوؤں کی عموماً اصلی زبان ہندی کی وہ شکل ہے جو کایتھی رسم الخط میں تحریر کی جاتی ہے لہٰذا 1872ء میں لیفٹیننٹ گورنر نے احکام جاری کر دیئے کہ تجرباتی بنیاد پر پٹنہ اور بھاگلپور ڈویژنوں میں آئندہ اردو کی بجائے دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی رائج کی جائے گی بجز اس کے کہ (1) جب کبھی اطلاع نامے Processes اشتہارات Proclamations فرمانات Notifications اقرار نامہ جات Bonds اور توثیقات Attestations جیسی دستاویزات تحریر کرنی مقصود ہوں کایتھی رسم الخط میں تحریر کیا جا سکتا ہے اور (2) عام دفتری مراسلت کے لیے فارسی رسم الخط کو برقرار رکھا جائے اور اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ دفاتر میں استعمال کی جانے والی زبان سلیس اور عام فہم ہو نہ کہ بیرونی پر تصنع زبان۔[59]

ہندی کے ہندو علم برداروں نے ان احکامات کو خوب اچھالا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جگہ جگہ ہندی پرچار سبھائیں قایم ہونے لگیں اور یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ جہاں کہیں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا اُن تمام مقامات پر اردو کی جگہ ہندی کو نافذ کیا جائے۔ ان باتوں کی وجہ سے مسلمانوں کا مشتعل ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ اُس وقت کے با اثر اینگلو انڈین اخبار The Indian Observer نے ان نئے احکامات اور اُن کے پس پشت کار فرما عوامل کو اپنی سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ لیکن سر جارج اپنے موقف پر اڑا رہا اور مذکورہ بالا احکامات کو واپس لینے سے انکار کر دیا۔ جب اس ضمن میں بار بار احتجاج ہونے لگے تو اس نے ان احکامات میں قدرے نرمی پیدا کر دی۔ کیمبل کے بعد سر رچرڈ ٹمپل Sir Richard Temple نے عہدہ سنبھالا جس کے دور میں ان احکامات پر سختی کے ساتھ عمل آوری نہیں ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی زبان اس کے عہد میں زیادہ ترقی نہیں کر سکی۔ اس صورت حال پر متعدد ہندو رہنما چراغ پا ہو گئے جن میں بہار سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد اتنی نہیں تھی جتنی کہ اُس وقت کے صوبجات متحدہ سے تعلق رکھنے والوں کی تھی۔ بنارس میں بابو فتح نرائن سنگھ نے ایک عظیم ہندی موافق تحریک کی ابتدا کی جو جلد ہی شمالی ہند کے دیگر علاقوں میں بھی پھیل گئی۔ اس کام میں اُنھیں اور ان کے ساتھیوں کو سریندر ناتھ بنرجی اور اُن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بااثر اخبار بنگالی کی جانب سے خاطر خواہ امداد اور ہمت افزائی حاصل ہوئی۔

سر ایشلی ایڈن Sir Ashley Eden کے دورانِ کارگزاری ہندی کے مسئلے پر ازسرِنو غور کیا گیا اور متعدد یورپین عہدیداروں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ ہندی کی موافقت میں ایک مضبوط موقف اختیار کرے۔ چنانچہ حکومتِ بنگال نے ۱۲ اپریل ۱۸۸۰ء کو ایک حکم جاری کیا جس کی رُو سے ہدایت کی گئی کہ بہار کے دفاتر اور عدالتوں میں استعمال ہونے والی سرکاری زبان میں فارسی رسم الخط کی جگہ کایتھی یا ناگری رسم الخط کو استعمال کیا جائے۔[60]

ان احکامات کے تعلق سے سرکار کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے سکریٹری رینالڈس Reynolds رقمطراز ہے:

> ہندی کا موضوع گذشتہ سات برسوں سے زیرِ بحث رہا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ضمن میں حکومت کی جانب سے جاری کردہ احکامات کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ 2 اپریل 1874ء اور 9 جولائی 1875ء کو جاری ہونے والے احکامات میں اُنھی سابقہ احکامات پر زور دیا گیا ہے جن کے ذریعے ہدایت کی گئی تھی کہ پٹنہ، بھاگلپور اور چھوٹا ناگپور ڈویژنوں میں واقع تمام عدالتوں اور دفاتر سے جاری ہونے والے اطلاع ناموں، اشتہاروں اور فرمانوں کو ناگری اور ہندی رسم الخط میں جاری کیا جائے تمام سرکاری ریکارڈ ہندی زبان میں رکھا جائے اور معروضات کو درخواست کنندگان کے حسب منشا ہندی یا اردو رسم الخط میں قبول کیا جائے اور تمام پولیس عہدیداروں اور دفتری عہدیداروں سے اس بات کا تقاضا کیا جائے کہ وہ ہندی رسم الخط سے جلد آگاہی بہم پہنچالیں۔[61]
>
> عملاً ان میں سے بیشتر ہدایات کو نظرانداز کر دیا گیا۔

چنانچہ سر ایشلی ایڈن کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ناگری (یا کایتھی) کو بہار کا واحد سرکاری رسم الخط قرار نہیں دیا جاتا تب تک حکومت کی منشا کے مطابق مطلوبہ تبدیلیاں روبہ عمل نہیں لائی جاسکتیں۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۸۸۱ء سے اسی قسم کے احکامات نافذ کر دیے گئے اور عدالتوں میں فارسی رسم الخط کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استعمال کو بجز شہادتی دستاویزات کے "قطعی ممنوع" قرار دے دیا گیا۔ مزید برآں پولیس کے عہدیداروں اور عملے کے ارکان کو متنبہ کر دیا گیا کہ اگر انھوں نے ناگری رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کی استعداد فوری بہم نہیں پہنچائی تو ان کی جگہ ناگری سے واقفیت رکھنے والوں کا تقرر کر دیا جائے گا۔ ان اقدامات کو جایز قرار دیتے ہوئے حکومت نے کافی زور دے کر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ اسے بہار کے ہندوؤں کے ساتھ کس قدر ہمدردی ہے "جن کے پاس ایک بدیسی رسم الخط کے سوا اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ باہمی ترسیل کا دوسرا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے"۔[62]

فطری طور پر ان احکامات کا وبال کئی مسلمانوں پر آن پڑا کیونکہ عدالتوں میں فارسی رسم الخط کے رائج ہونے کی وجہ سے ان میں سے کئی عملے اور مختیاروں کی شکل میں سرکاری ملازمتوں کے ایک بڑے حصے پر قابض تھے۔ علاوہ ازیں کئی مسلمانوں نے وکالت اور پیروی کے پیشوں کو اپنا رکھا تھا۔ رسم الخط کی تبدیلی نے ان کے موقف کو بہت نازک بنا دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے حکومت سے استدعا کی کہ "سستی جذباتیت" کی قربان گاہ پر انتظامی کارکردگی کو قربان نہ ہونے دے۔[63] ان مسلمانوں کی حمایت میں دارالامرا میں لارڈ ایسٹلے نے سکریٹری آف اسٹیٹ سے ان احکامات کے جواز کے تعلق سے سوال بھی کیا تھا جس کے جواب میں لارڈ نارتھ بروک نے کہا تھا کہ یہ احکامات بہار کے باشندوں کے مفادات کو پیش نظر رکھ کر جاری کیے گئے ہیں۔ ان نئے احکامات کا ہندوؤں نے پرجوش استقبال کیا۔ بہار کے کئی اضلاع سے مالدار زمینداروں نے حکومت کے پاس اظہار تشکر کے پیغامات روانہ کیے۔ اسی طرح حکومت کو بونتیا [illegible] دمراؤں Daraon دربھنگہ اور ہٹوا Hatua کے مہاراجاؤں کے پیغامات بھی وصول ہوئے۔ تاہم مسلمانوں کا دل رکھنے کے لیے حکومت نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ پٹنہ کی عدالتوں والی ہندی ہرگز سرکاری زبان قرار نہیں دی جائے گی بلکہ یہ ایسی ہندی زبان ہوگی جس میں عام بول چال میں استعمال ہونے والے عربی اور فارسی الفاظ کو آزادانہ طور پر شامل کیا جا سکے گا۔

ان اقدامات کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تعلقات میں بڑی حد تک کشیدگی پیدا ہوگئی اور بعض اخبارات کی جارحانہ نوعیت کی فرقہ واریت نے تو حالت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو اور بھی ابتر بنا دیا۔ دونوں قوموں کے تعلقات میں بہتری لانے کے لیے ہندی پرچار سبھا کے صدر بابو ایس۔ پی۔ سنہا Babu S.P. Sinha نے سرسید کے ساتھ مراسلت کا سلسلہ شروع کیا جس کا جواب سرسید نے بھی نہایت شائستہ اور مشفقانہ انداز میں دیا۔ تاہم ان دونوں رہنماؤں کے اختیار کردہ موقف بنیادی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھے کہ اس مراسلت سے کوئی حل برآمد نہ ہو سکا۔ اس مراسلت کی ناکامی کے بعد سرسید کے لب و لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی اور انھوں نے کھلے بندوں ہندی موافق تحریک کو مطعون کرنا شروع کر دیا: "ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کی ترویج کے باعث تعلیم یافتہ مسلمانوں کی سرکاری اور خانگی زندگی بڑی حد تک مجروح ہو گئی۔ محرومیِ مذہب کے سوا مسلمانوں کے لیے اپنی زبان اور رسم الخط سے بڑھ کر دوسرا اور کوئی زیاں نہیں ہو سکتا۔" سرسید کے حسب مشورہ پنجاب کے بعض سرکردہ اردو داں مسلمانوں نے انجمن حمایت اردو کی بنیاد ڈالی۔ اگر یہ لوگ بروقت یہ اقدامات نہ کرتے تو شاید سرجان اسٹریچی شمال مغربی صوبجات میں بھی وہی طریق کار اپنا تا جو اس کے رفقائے کار نے بہار میں اپنایا تھا۔ جس وقت سرسید کو اس بات کی بھنک پڑی کہ شمال مغربی صوبجات کے ہندو بھی اس بات کا ارادہ کر رہے ہیں کہ حکومت کے روبرو ناگری رسم الخط کو دفاتر اور عدالتوں میں رائج کرنے کا مطالبہ پیش کریں، انھوں نے فوراً الہ آباد کے مقام پر ایک اجلاس طلب کیا جس میں مطالبہ پیش کیا گیا کہ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں خالصتاً اردو کے استعمال کو جاری رکھا جائے۔ اس نظریے کی جانب حکومت کی توجہ مبذول کرانے اور عوام کے درمیان اس مطالبے کو مقبول بنانے کی غرض سے ایک مرکزی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کی معتمدی کے فرائض سرسید کو تفویض کیے گئے۔

لیکن ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن کے قیام کی وجہ سے ہندوؤں کو ہندی زبان کی ترویج کا مطالبہ پیش کرنے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا۔ اس بار انھوں نے اپنا مطالبہ صرف اس حد تک ہی محدود نہیں رکھا کہ ہندی زبان کو دفاتر اور عدالتوں میں رائج کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ مطالبہ بھی کر ڈالا کہ اس زبان کو لازمی طور پر تمام تحتانوی اور ثانوی مدارس میں پڑھایا جائے۔[64] انھوں نے یکے بعد دیگرے ہندوؤں کے ہزاروں دستخطوں والی متعدد یادداشتوں کے ذریعے حکومت پر یہ بات واضح کرنی شروع کر دی کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھیں اس تصور سے بھی نفرت ہونے لگی ہے کہ ان کی اولاد کو اردو زبان میں تعلیم دی جائے۔ ذیل میں ہم ایک ایسے ہی محضر کی عبارت نقل کرتے ہیں جس کے لب و لہجے کی تلخی کو بیشتر دیگر محضروں کے مقابلے میں ہلکا کر دیا گیا ہے: "..... ہمارے سابق حکمرانوں نے ہم پر زبردستی اردو کے نام پر ایک ایسی زبان تھوپ دی جو عربی اور فارسی زبانوں سے مل کر بنی تھی ..... لیکن عوام کے کثیر طبقے نے اس زبان کو کبھی قبول نہیں کیا..... کوئی ہندو شریف زادہ اخلاقی طور پر کبھی اتنا نہیں گرا کہ اپنی بہو بیٹیوں کو اردو اور فارسی تعلیم سے آراستہ کرنے پر آمادہ ہو جائے کیوں کہ ان زبانوں میں لکھی ہوئی کتابیں عام طور پر فحش ہوتی ہیں اور اخلاقی کردار پر اُن کا بہت برا اثر مترتب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پانچسو ہندو گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ حضرات نے ایک اور محضر میں اردو زبان کے تعلق سے کہا: "اردو ایک بدیسی اور چھچھوری upstart زبان ہے۔ ہم پُرزور طریقے سے یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اردو ہرگز وہ زبان نہیں ہے جسے ہمارے صوبے کے لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں"۔ ہندوؤں کی جانب سے نہ صرف اس قسم کی نفرت انگیز جذبات ہی کا اظہار کیا گیا بلکہ اردو کے خلاف ہر قابلِ ادراک منطق کو استعمال کر ڈالا گیا جیسے "اس زبان کی بقا ہندستان میں مسلمانوں کے قدیم ظلم و جبر کی بقا کے مترادف ہے"۔[67] ہندو بچوں کو سیکھنے کے لیے اردو انتہائی اَدق، مشکل اور بدیسی زبان ہے۔ یہ زبان ہندوؤں کی مذہبی اور سماجی امنگوں اور آرزوؤں کی ترجمان نہیں بن سکتی۔[68] چوں کہ اس زبان کا رسم الخط عربی ہے جو مسلمانوں کی مقدس زبان ہے اس لیے راسخ العقیدہ ہندو اسے ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے"۔[70] وغیرہ وغیرہ۔ خواہ پنجاب ہو یا صوبجات متحدہ ہوں یا بہار ہو ہر جگہ ایک ہی مطالبہ دہرایا جانے لگا تھا: "اگر اردو کے استعمال کو ترک کر کے اُس کی جگہ ہماری ہندی بھاشا رائج کی جاتی ہے تو ہمارے طلبا اسے بہ آسانی بڑی سہولتوں کے ساتھ کم عرصے میں سیکھ سکیں گے اور انھیں موجودہ صورتِ حال کی طرح دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اس طرح فاضل بچا ہوا وقت بہ آسانی انگریزی زبان کی تحصیل میں صَرف کر سکیں گے"۔[71]

ہندو حضرات جس طرح ہندی کی ترویج کے لیے کوشش کر رہے تھے اُس منضبط طریقے سے مسلمانوں نے اردو کی حمایت میں زیادہ کوشش نہیں کی۔ مثلاً اُس وقت جبکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متعدد ہندو انجمنوں اور تنہا شمال مغربی صوبجات کے 58,289 ہندوؤں کی جانب سے کمیشن کے روبرو متعدد محضر اور یادداشتیں پیش کی گئیں' اردو کی حمایت میں چند افراد کے دستخطوں پر مشتمل صرف ایک محضر پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں دستخط کنندگان اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ " انھیں علی گڈھ اور بلند شہر کے اضلاع کے مسلمانوں کے علاوہ رڑکی Rurkee اور میرٹھ کی میونسپل ایسوسی ایشنوں کی نمایندگی کا حق بھی حاصل ہے"[72] پنجاب میں البتہ مسٹر (بعدہٗ سر) فضل حسین کی رہنمائی پر ایک بہتر اور منظم کوشش اس ضمن میں کی گئی لیکن جب ہم اس کوشش کو بھی ہندوؤں کے جانب سے پیش کی جانے والی عرضداشتوں اور محضروں کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہ کوشش بھی بے وقعت دکھائی دینے لگتی ہے۔ مزید برآں اس قضیے میں مسلمانوں نے اپنی بات کو غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر منوانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی ایک یادداشت میں کہا تھا: " اردو ہماری مذہبی یا قومی زبان نہیں ہے اور نہ ہی اسے باہر کے کسی ملک سے یہاں درآمد کیا گیا ہے۔ یہ ہندستان ہی کی پیدا کردہ زبان ہے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اشتراکِ عمل کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی ہے"[73]۔ علاوہ بریں انھوں نے ہندوؤں کی جانب سے پیش کی جانے والی عرضداشتوں کو جن میں ہندی کی ترویج کا مطالبہ کیا گیا تھا " ایسی مضرت رساں کوششیں قرار دیا جن کے ذریعے مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصبات کو بڑھاوا دیا گیا تھا تاکہ شعوری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین غیر ضروری منافرت کے جذبے کو ہوا دی جائے"[74]۔ چنانچہ انھوں نے کمیشن پر اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ " ہندی بھاشا اور اردو کا مسئلہ یا فارسی اور ناگری رسم الخط کا مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا عام حل بہ آسانی دریافت کیا جا سکے یا یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے تعلیمی مسئلے کا جز قرار دیا جا سکے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مسئلے نے اب ایک سیاسی مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے"[75]۔ تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس قضیے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اکثر معاملات میں تو کمیشن نے حالتِ معمول میں دخل اندازی کرنے سے انکار کر دیا۔

ہندوؤں نے اپنی ہندی موافق تحریک کو نڈر طریقے سے جاری رکھا لیکن 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد تعلیم یافتہ ہندوؤں کو اس لسانی مسئلے سے کم دلچسپی باقی رہی۔ انھوں نے اپنی تمام تر توجہات کو سیاسی اور دستوری مسایل پر مرکوز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر دیا۔ جوں جوں دن گذرتے گئے توں توں کانگریسی رہنماؤں نے ہندو مسلم اتحاد کے نظریے پر زیادہ سے زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔ اسی وجہ سے انھوں نے ایسی کسی تحریک کی پشت پناہی کرنے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے برگشتہ کرنے کا موجب بنتی ہو۔ کانگریسی رہنما آنے والے کئی برسوں تک اسی پالیسی پر کاربند رہے حالانکہ ہم گذشتہ ابواب میں دیکھ آئے ہیں کہ کس طرح سرسید اور شمالی ہند کے دیگر مسلمان رہنما کانگریس کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھتے رہے اور اس تحریک کی سرگرمیوں پر کھلے بندوں اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے رہے۔

اس کے باوجود 1898ء میں شمال مغربی صوبجات اور اودھ کے بعض سرکردہ ہندو اصحاب نے بنارس کے چند پنڈتوں کی رہنمائی میں ایک وفد کی شکل میں ان صوبجات کے گورنر سر اینٹونی میک ڈونل Sir Antony Mac Donnell سے ملاقات کی جو کسی زمانے میں سر جارج کیمپبل کی ماتحتی میں پٹنہ کا کمشنر رہ چکا تھا اور بہار میں ناگری رسم الخط کے اجراء کے سلسلے میں کافی سرگرمی دکھا چکا تھا۔ اس وفد کا بڑی بڑی امیدوں سے معمور ہونا ایک فطری امر تھا، لیکن اپنے جواب میں سر اینٹونی نے جہاں ایک جانب سے اس مطالبے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں مروجہ طور طریقوں میں بہ سرعت کسی قسم کی تبدیلی لائی جائے کیوں کہ نہ صرف عوام بلکہ سرکاری حکام بھی موجودہ طور طریقوں کے اچھی طرح عادی ہو چکے ہیں۔ وہیں اُس نے اس امر کا اعتراف بھی کیا کہ اگر ناگری رسم الخط کو سرکاری کام کاج میں عام طور پر اپنا لیا جائے تو اس عمل سے بعض فوائد کی توقع کی جا سکتی ہے۔[75]

اگرچہ یہ جواب وفد کے ممبران کے لیے مکمل طور پر تشفی بخش نہیں تھا تاہم اس سے انھیں اتنی طمانیت ضرور حاصل ہو گئی کہ اگر انھوں نے اسی طرح اپنی مساعی جاری رکھیں تو آیندہ بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس نتیجے پر پہنچنے میں انھوں نے عجلت بھی نہیں کی تھی۔ آیندہ دو برسوں کے اندر ہی حکومت نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعے کم وبیش اُن کے مطالبات کو تسلیم کر لیا۔ اگرچہ فارسی رسم الخط کو مکمل طور پر ممنوع نہیں قرار دیا گیا لیکن ناگری رسم الخط کو بھی مساویانہ حیثیت حاصل ہو گئی۔ مزید برآں ناگری رسم الخط کو دفاتر اور عدالتوں میں استعمال کیے جانے کے مساوی مواقع عنایت کیے گئے اور اس قسم کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احکامات جاری کر دیے گئے کہ "آیندہ تقررات کے وقت بجز اُن اسامیوں کے جن پر خالص انگریزی داں افراد کا تقرر کیا جانا ناگزیر ہو دیگر تمام دفاتری صیغہ داروں کے تقررات کرتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھا جائے گا کہ ایسی آسامیوں پر کسی ایسے شخص کا تقرر نہ ہو پائے جو اردو اور ناگری رسم الخط سے کما حقہ واقفیت نہ رکھتا ہو۔"[77]

ان احکامات کی وجہ سے یو۔پی کے مسلمانوں کا مشتعل ہو جانا ایک فطری امر تھا، کیونکہ اس صورت میں نہ صرف ان کے معاشی بلکہ ثقافتی مفادات پر ضرب کاری پڑتی تھی۔ طوعاً و کرہاً انھوں نے بہار میں اردو کے خاتمے کو تو برداشت کر لیا تھا لیکن وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی زبان پر اس کے اپنے وطن یوپی ہی میں دست درازی کی جانے لگے۔ انھیں اس لیے بھی مزید شدت کے ساتھ اس صدمے کا احساس ہونے لگے کہ سرسید کی وفات کے فوری بعد وہ اس سے دوچار ہوئے تھے۔ انھیں بار بار یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر سرسید بقید حیات ہوتے تو شاید یہ مصیبت اُن پر نہ آتی۔ غم و غصّے کا جو طوفان اُن دنوں مسلمانوں کے سینوں میں متلاطم تھا اس کا خلاصہ مسلم کرانیکل نے اپنے اداریے میں یوں پیش کیا ہے:

عوام کی متحدہ آواز کے خلاف، فضلاء کے معقول کر دینے والے دلایل کے خلاف، قواعد اور علم ھجا Orthography کے قابل تسلیم مباحث کے خلاف، تہذیب و تمدن کے تمام تر تقاضوں کے خلاف، عقل سلیم کے تقاضائے توازن کے خلاف، یہ ایک ایسا حکم نامہ ہے جس کے ذریعے جبراً بزور اقتدار ایک ایسی بولی Jargon کو عوام پر ان کی مرضی کے خلاف مسلط کیا جا رہا ہے جو ابھی حال تک بنیوں Bannias اور مودیوں Modis کے کتب خانوں میں بند تھی۔ ایک ایسے ناعاقبت اندیش گروہ کی مسلسل درخواست بازیوں سے تنگ آ کر کہ جس کا تعصب اس کی تعلیم اور ذہانت سے زیادہ قوی ہے، جس کا خبط اُس کی معاملہ فہمی پر حاوی ہے، جس کے فرقہ وارانہ جذبات اُس کی تہذیب اور روشن خیالی پر غالب ہیں، ملک کے شمال مغربی صوبے کی مثالی انتظامیہ نے مجبوراً یہ فرمان جاری کر دیا ہے کہ آیندہ اُس علاقے کے عوام کی وہ مخصوص بول چال کی زبان کو جس کی اہمیت تاجال کھجور کے سوکھے ہوئے زرد پتّوں سے بڑھ کر نہیں تھی، اُس مرصّع زبان کی جگہ دفاتر اور عدالتوں میں استعمال کیا جائے جس میں کبھی مرزا غالب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سودا نے نغمے بکھیرے تھے۔ بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو بمقابلہ ناگری کا قضیہ گویا اُس رسہ کشی کے مانند ہے جس میں ایک جانب تہذیب و تمدن ہے تو دوسری جانب تعصب اور بہیمیت زور آزما ہے۔ اگر موجودہ احکامات جوں کے توں برقرار رہتے ہیں تو تاریخ میں تہذیب سوزی کے ایک باب کا اضافہ ہو جائے گا جس میں مستقبل کے قارئین کو بتلایا جائے گا کہ کس طرح برطانوی انتظامیہ کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے بہ یک جنبش قلم تہذیب اور شائستگی کے نصب العین کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔[78]

جلد ہی مسلمانوں میں سر اینٹونی Sir Antony کے خلاف غم و غصے کا طوفان امڈنے لگا۔ اُنھیں "دشمن اسلام" اور "ہندو نواز حکمران" کے القاب سے نوازا جانے لگا۔ نئے احکامات کے اجرا کے اندرون ایک ماہ چایو فیر نے اطلاع دی کہ "مسلمانوں کے مختلف طبقات میں بے اطمینانی کی کیفیت حد سے تجاوز کر چکی ہے"۔[79] علی گڈھ کی قیادت کو فوری کارروائی بلکہ ایک قسم کی بغاوت پر مجبور ہو جانا پڑا جسے ماضی میں انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا تھا اور جسے وہ ہمیشہ ٹالتے آئے تھے۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چلا تھا۔ چنانچہ 13 مئی 1900ء کو نواب محسن الملک نے علی گڈھ میں ایک نمایندہ اجلاس کیا جس میں لاہور، لکھنؤ، میرٹھ، بدایوں، دہلی، بلند شہر، آگرہ اور اُس وقت کے شمال مغربی صوبجات کے بیشتر سربرآوردہ مسلمانوں کو مدعو کیا گیا۔ اپنی تقریر میں نواب صاحب نے حالیہ سرکاری گشتی کی اجرائی کے باعث مسلمانوں میں پیدا ہونے والی بے اطمینانی اور دور رس خطرات کے احساس کا تذکرہ کیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے شرکاء جلسہ کو اس بات پر بھی متنبہ کیا کہ "حکومت کے ان اقدامات پر تنقید کرتے ہوئے اور ان اقدامات میں اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے انھیں اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ایک ایسی حکومت کی وفادار رعایا کے افراد ہیں جسے عوام کے مفادات نہایت ہی عزیز ہیں۔ اگرچہ انھیں یوں محسوس ہوگا گویا حکومت کے موجودہ اقدامات ان کی ترقی میں سدِراہ ہیں لیکن انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان اقدامات کا اعلان کرتے وقت حکومت کی نیت میں اُن کے خلاف کسی بھی قسم کی جارحیت موجود نہیں تھی"۔ انھوں نے البتہ اس بات کو ضرور تسلیم کیا کہ حکومت کے ان اقدامات کے نتائج ضرور سنگین اور دور رس ثابت ہوں گے اور اختیاری دفعہ optional clause کی موجودگی کے باوجود جلد ہی سرکاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکمہ جات میں اردو کی جگہ ہندی زبان رائج ہو جائے گی۔" اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے محسن الملک نے یہ بھی کہا کہ" جلد ہی اِن اقدامات کے مضر اثرات تعلیم، تجارت اور سماجی تعلقات کے میدانوں میں ظاہر ہونے لگیں گے۔" اس سے قبل نواب صاحب اور ان کے ساتھیوں نے کبھی بھی اس قسم کی احتجاجی تحریک کو چلانا روا نہ رکھا تھا اور ہمیشہ اپنے حکمرانوں کی نیک نیتی اور سمجھ داری پر تکیہ کیا تھا۔ لیکن اس دفعہ اُن کے خیال کے موجب، ایک سنگین صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اور بقائے ذات Self-Preservation اور آنے والی نسلوں کے تعلق سے اُن پر عاید شدہ فرض کے ہاتھوں وہ اس بات پر مجبور ہو گئے تھے کہ اپنی آوازوں کو پر زور لیکن مؤدبانہ احتجاجات کی شکل میں بلند کریں۔"[81]

نواب صاحب کی تائید میں تھیوڈور موریسن نے بھی حکومت کے اس فیصلے کو اُس "برطانوی پالیسی کے مغایر" قرار دیا جس کی رو سے تاحال اردو ہی کو اُن صوبوں کی سرکاری زبان تسلیم کیا جاتا رہا تھا۔ جلسے کے اختتام پر مؤدبانہ الفاظ میں لفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں ایک برقیہ Telegram روانہ کیا گیا جس کے ذریعے انھیں دیگر امور کے علاوہ مجوزہ عوامی محضر کے گزارے جانے کی اطلاع بھی دی گئی۔

بعد ازاں شمالی ہند کے مسلمانوں کے ایک عظیم الشان جلسے کے انعقاد کی تیاریاں کی جانے لگیں تاکہ ہندی کی ترویج سے متعلقہ حکومتی گشتی کے اجراء کے خلاف زبردست احتجاج کیا جا سکے۔ چنانچہ اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن Urdu Defence Association نامی ایک تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے زیرِ نگرانی متعدد کتابچے شایع کیے گئے، چندے جمع کیے گئے، اور سربرآوردہ مسلمانوں کو بطور مندوبین منتخب کیا گیا۔ اس سرگرمی میں اُس وقت کے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے زمینداروں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اسی طرح مسلم وُکلاء اور تاجروں نے بھی اس ضمن میں کافی دلچسپی لی کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمان ملازمین سرکار کی طرح اُن کے اپنے مفادات بھی اس گشتی کی وجہ سے بُری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ۱۵ اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں مجوزہ اجلاس کا انعقاد بڑے ہی طمطراق کے ساتھ عمل میں آیا جس کی اردو پریس نے جی کھول کر تشہیر کی۔

" مرحوم سرسید احمد خاں نے عالم سیاسی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر کاربند رہنے کی جو روایت قایم کی تھی اُسے حق بجانب قرار دیتے ہوئے محسن الملک نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ ہمارے لیے "یہ امر از بس ضروری ہے کہ ہم اپنی زبان کو زندہ رکھنے کی مقدور بھر کوشش کر گزریں اور اگر خدانخواستہ مسلمانوں کا یہ عظیم الشان جلسہ یا اسی نوعیت کی آیندہ مساعی اسے زندہ رکھنے میں ناکام ہو جائیں تب بھی کم از کم ہمیں اس بات کا اطمینان تو ضرور نصیب ہوگا کہ ہم نے اپنے عزیز ترین زبان کی تجہیز و تکفین کی آخری رسومات مرحومہ کی عظمت اور وقار کے عین مطابق انجام دیں اور مقدور بھر آخر وقت تک دستوری ذرایع کے ساتھ اُس کے دفاع کے لیے لڑتے رہے"۔[82] پایونیر رقمطراز ہے کہ اردو کے اس تاریک امکانی مستقبل کے تذکرے کو سُن کر "ہزار ہا سامعین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی"۔[83]

اس قضیے کے مختلف پہلوؤں کے تعلق سے کم و بیش دس قرار دادیں منظور کی گئیں جن میں سے اکثر میں حکومت سے اُس گشتی کو واپس لے لینے کی استدعا کی گئی تھی جو مبنی بر انصاف نہیں تھی۔ اس کے علاوہ مشہور ناول نگار عبدالحلیم شرر نے بھی حسبِ ذیل قرار داد پیش کی جس کی تائید پنڈت کیدار ناتھ نے کی تھی۔

چونکہ ہندستان کے دیگر علاقوں کا ادب عموماً اور شمالی ہند کا ادب خصوصاً بالکلیہ طور پر اردو زبان ہی کے دامن میں سمٹا ہوا ہے۔ جو نتیجہ ہے اس سرپرستی کا جو اس زبان کو متواتر حکومت کی جانب سے حاصل ہوتی رہی ہے جس کے باعث آج تک یہ زبان حاکم و محکوم کو ایک دوسرے کے خیالات اور جذبات سے اتنی آگاہی بہم پہنچاتی رہی ہے جتنی کہ کسی اور زبان نے بہم پہنچائی نہ ہوگی۔ لہٰذا اب یہ حکومت کا فرض ہے کہ ملک بھر میں اور خاص طور پر ان مرکزی صوبجات میں اس قدیم ادب کے تحفظ، استحکام اور توسیع کے لیے مناسب اقدام کرے۔[84]

مزید یہ طے پایا کہ لفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں ایک وفد بھیجا جائے جو انھیں وہ یادداشت پیش کرے "جو مذکورہ بالا قراردادوں کی حمایت میں پیش کیے جانے والے حقایق اور مباحث پر مشتمل ہو"۔ اس بات کی کوشش بھی کی گئی کہ ایک ایسا مستقل ادارہ قایم کیا جائے جو "اردو زبان" کے تحفظ اور توسیع" کا کام انجام دیتا رہے لیکن یہ خواب 1903ء میں شرمندۂ تعبیر ہوا جب کہ انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آیا جس کی صدارت کے فرایض ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ T. W. Arnold اور معتمدی کے فرایض شبلی نعمانی کو تفویض کیے گئے۔[85]

مسلم قیادت کے ان تمام اقدامات نے لفٹیننٹ گورنر کو اور بھی مشتعل اور برہم کر دیا۔ اپنے احکامات کو واپس لینا تو کجا وہ ان کے نفاذ پر سختی سے مُصر ہو گیا۔ سر اینٹونی Sir Antony نے بنارس کے مقام پر اپنی ایک تقریر کے دوران کہا کہ "صرف چند مسلمان" اس تحریک کو "ہوا دے رہے ہیں"۔ اس نے اسے ایک شرارت آمیز اور نامعقول حرکت قرار دیا اور اس بات پر اپنی مسرت کا اظہار کیا کہ کنور علی خاں جیسے "معزز و محترم مسلمان زمیندار"[86] نے، اُس کے اس یقین دلانے پر کہ انھیں (نواب صاحب کو) اس بارے میں گمراہ کیا گیا ہے، اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی صدارت سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ عین میدانِ کارزار میں اس طرح قیادت سے محرومی نے اردو کے حامیوں کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اگلے اقدام کے طور پر سر اینٹونی نے محسن الملک کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اردو تحریک سے اپنے تعلقات کو منقطع کر لیں۔ پہلے پہل تو محسن الملک نے اس کی اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن بعد ازاں جب لفٹیننٹ گورنر نے اپنے علی گڑھ کے دورے کے وقت ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ٹرسٹیوں پر یہ واضح کر دیا کہ اگر محسن الملک نے اردو کی حامی تحریک سے علیحدگی اختیار نہیں کی تو انھیں کالج کی معتمدی کے فرایض انجام دینے کی اجازت نہیں دی جائے گی، تب نواب صاحب کو مجبوراً اردو تحریک کی قیادت سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی۔ اس صورتِ حال نے اردو حامیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور انھوں نے ہمت ہار دی۔ محسن الملک کے استعفےٰ کے فوری بعد بیشتر عمایدین بھی یکے بعد دیگرے اس تحریک سے الگ ہو گئے اور ایک سال سے کم عرصے میں پوری کی پوری تحریک آہستہ آہستہ دم توڑ گئی۔

اس صورتِ حال کے دور رس اثرات مترتب ہوئے۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو پہلی بار اس حقیقت کا احساس ہوا کہ جب تک وہ مناسب طور پر خود کو منظم اور منضبط نہیں کر لیتے تب تک اُن کا مستقبل معرضِ خطر میں پڑا رہے گا۔ مسلم مسئلے کو نئے خطوط پر حل کرنے کا تقاضا کیا جانے لگا۔ مختلف گوشوں سے ملت کے مفادات کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحفظ کے لیے ایک اسلامی سیاسی تنظیم کے قیام کا مطالبہ دہرایا جانے لگا۔
حتیٰ کہ وہ لوگ بھی، جنھوں نے سابق میں اس قسم کے مطالبے کی مخالفت کی تھی، یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ مسئلہ نوجوان نسل نے اس شدت کے ساتھ اٹھایا ہے کہ اسے اب زیادہ دنوں تک دبایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ سرسید کے مشوروں کو پس پشت ڈالتے ہوئے دستوری بنیاد پر تحریک چلانے Constitutional Agitation کے تصور پر زور دیا جانے لگا۔[87]

مسلمانوں کی اس "ہر زمیت" کا ہندو مسلم تعلقات پر بھی بُرا اثر پڑا۔ تعلیم یافتہ مسلمان پہلے ہی ہندو رہنماؤں اور ان کی سرگرمیوں سے بدظن ہو چکے تھے۔ اس واقعے نے تو انھیں اور بھی خوفزدہ کر دیا۔ مزید برآں ہندو پریس نے اپنی اس کامیابی پر خوشی سے اتنی زیادہ بغلیں بجائیں کہ مسلمان اسے نظر انداز نہ کر سکے۔[88] چنانچہ مسلم کرانیکل اس بارے میں یوں لکھتا ہے:

"یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ حالیہ برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پائے جانے والے تعلقات میں کوئی شے کشیدگی کا اس قدر باعث نہیں بنی تھی کہ وہ فاش غلطی جو زبان کے مسئلے میں سر اینٹونی میکڈونل سے سرزد ہوئی ہے۔[89] آنے والے کئی برسوں تک یہی قرارداد دونوں قوموں کے مابین وجہ نزاع بنی رہی۔ مفاد پرستوں نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے کے لیے اس کا بے دریغ استحصال کیا۔ اس واقعے کے گزر جانے کے کئی برس بعد بھی علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کو یاد دہانی کرائی تھی کہ "اگر حکومت کی واحد قرارداد ہم میں بے گانگی اور منافرت کو جنم دے سکتی ہے تو بہ حیثیت ہم وطن اور حلیف ہمارے موقف کس قدر کمزور ہیں اس حقیقت کو ہم پر منکشف ہو جانا چاہیے۔ ان معاملات میں ہماری حالت اس حد تک ناگفتہ بہ ہے کہ اکثر ہمیں یہی خیال گزرتا ہے کہ اب ہمیں شاید دوا کی نہیں بلکہ دعا کی ضرورت ہے۔"[90]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

نواں باب (فرقہ وارانہ تنازعات)

1 - Report of the Indian Statutory Commission, Vol. IV Part I, 96

2 - The Sylhet District Records, ed by Walter F Firminger. Vol. I (1770-1785), 123-31

3 - Assam District gazetteers. Vol III (Sylhet) by B.C Allen, 33-41

4 - The Sylhet District Records Ed. by Walter F. Firminger Vol. I (1770-1785)

5 - Report of the Indian statutory Commission, Vol IV Part, I, 96.

6 - Ibid

7 - The Bombay gazette, Feb 13, 1874

ملاحظہ ہو پارسیوں کے دفاع میں لکھی گئی۔ ڈی۔ اے۔ طارخ یار خاں کی کتاب

The Riots of 1874: Their True History and Philosophy.

اسی طرح ملاحظہ ہو مسلمانوں کے دفاع میں لکھی گئی حافظ صدر الاسلام کی کتاب

Remarks of Indian ۔ ان فسادات کی سرکاری تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو

General Report on the Administration of the Bombay Presidency (1873 — 74) xxiv — xxii

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

8 - The Pioneer, Jan 23, 1885 ۔ مزید ملاحظہ ہو "موپلا بغاوت" پر اسی اخبار کی ۲۱ فروری 1885ء کی اشاعت میں تین کالموں میں شایع ہونے والا اداریہ۔

9 ۔ اس فساد کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو The Times لندن، مورخہ ۶ اکتوبر 1886ء اس پر تبصرے کے لیے ملاحظہ ہو اسی اخبار کا ۱۱ اکتوبر 1886ء کا شمارہ۔

10 - Ibid, October 18, 1885

11 - Ibid, November 29, 1886

12 - Ibid, January 24, 1889

13 - Ibid

14 - Report of the Indian Statutory Commission vol IV Part I, 97

15 - ملاحظہ ہو Parliamentary paper C. 538 (1893-4) Religious Disturbances in India

16 Speeches by Marquis of Lansdowne 358 اپنی کتاب کی وضاحت کرنے کے لیے وایسرائے نے انگریزی کی اُس مشہور کہاوت کا حوالہ دیا جس کے مطابق "ہر جھگڑے کے لیے کم از کم دو لڑنے والے درکار ہوتے ہیں"۔

17 The Times (London) مورخہ 18 ستمبر 1893ء ۔ مزید ملاحظہ ہو اسی اخبار کے ۲۱ ستمبر 1893ء کے شمارے میں فسادات پر اداریہ۔

18 ۔ ملاحظہ ہو بمبئی کے فسادات سے متعلق سر ولیم ویڈربرن Sir William Wedderburn کا مضمون جو ستمبر 1893ء کے New Review کے شمارے میں شایع ہوا۔ اسی طرح ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لیٹنر DR. G W Leitner کا مضمون بعنوان "Cow-Killing Riots, Seditious Pamphlets, and the 1894 بابتہ Asiatic quarterly Review... جو Indian police" 94-95 صفحات Jan, April میں شایع ہوا۔

19 ۔ مثلاً ملاحظہ ہو 7 ستمبر 1893ء کے Indian Mirror کا اداریہ جس میں واضح طور پر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ "اس بات میں شبہ کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ ہندوؤں اور ان کے مقدس جانور گائے کے خلاف جہاد چھیڑ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوؤں اور اُن کے مقدس جانور گائے کے خلاف جہاد چھیڑ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے جس ہے جس کے باعث فسادات بھڑک اُٹھے ہیں۔

20۔ ملاحظہ ہو پنڈت بشن نرائن در کا تحریر کردہ پمفلٹ بعنوان

An Appeal to the English public on behalf of the Hindus of the North-West provinces and Oudh

2۔ ہندو مسلم فسادات کی وجوہات کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو کے ایم پانک کا مضمون بعنوان Psychology of Hindu-Muslim Riots مطبوعہ Contemporary Review بابتہ فروری 1927ء

22 Hansard (Debates on Indian Affairs) Session 1893, 616

23 Ibid, 617

24 India, Oct. 1, 1895

25 Hansard (Debates on Indian Affairs) Session, 1893, 617

26۔ ملاحظہ ہو حکومتِ ہند کے نام سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کا مراسلہ نشان (Public) 100 مورخہ انڈیا آفس لندن، 7 ستمبر 1893ء

27۔ الحاق سے قبل پنجاب میں گاؤکشی سنگین جرم سمجھا جاتا تھا لیکن 1849ء میں لارنس برادران نے اس قانون کو منسوخ کر دیا۔

28۔ ملاحظہ ہو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے نام موسومہ حکومتِ ہند کا مراسلہ نشان 84 مورخہ ردسمبر ء۔

29۔ ملاحظہ ہو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے نام موسومہ حکومتِ ہند کا مراسلہ نشان مورخہ 27 ردسمبر 1893ء

30 The Times, London, August 14, 1893

31۔ یکم ستمبر 1893ء کے India نے نقل کیا۔

32۔ گئو رکشا تحریک کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مضمون بعنوان Indian Affairs مطبوعہ The Times-London بابتہ 18 ر ستمبر 1893ء۔ مزید ملاحظہ ہو ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لیٹنر (Dr. G. W. Leitner) کا مقالہ "Cow-Killing Riots" جس میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موصوف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "مسلمانوں کے لیے گاؤکشی کبھی بھی واجب قرار نہیں دی گئی"۔ (Asiatic Quarterly Review, July & Oct. 1893, 329-36)

33. The Manchester Guardian بابتہ 9 فروری 1894ء۔ مزید ملاحظہ ہو آر۔ گرین (R. Green) کی کتاب The Heroes Five (Panchan Pirjin of India) پر تحریر کردہ ایف پن کوٹ F. Pincott کا تبصرہ مورخہ یکم فروری 1894ء مزید ملاحظہ ہو Indian Magazine بابتہ جنوری 1894ء

34۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو شمال مغربی صوبے میں واقع بریلی کے مقام پر ہونے والے ہندو مسلم فسادات کا احوال جو 5 جولائی 1895ء کے امرت بازار پتریکا میں شایع ہوا۔ حتیٰ کہ معاصر بنگالی تک رقم طراز ہے: "کانگریس تحریک کے بعد جس چیز نے سب سے بڑھ کر ہندستانی عوام اور ان کے حکمرانوں کو متاثر کیا وہ ہے تحفظ گاؤکشی سے متعلق قایم کردہ اداروں کا قیام" (The Bengalee, 19 مئی 1894ء)

35. یکم نومبر 1893ء کے Indian نے نقل کیا ہے۔ مزید ملاحظہ ہو فسادات سے متعلق محمد اسماعیل خاں کے خیالات جن کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب موسومہ نیشنل کانگریس کی نسبت مسلمانوں کی رائے کے صفحہ 12 پر کیا۔

36۔ The Times of India میل ایڈیشن مورخہ 22 اور 29 ستمبر 1894ء۔ ان فسادات کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو لندن کا The Times بابتہ 15 اکتوبر 1894ء۔ اسی اخبار نے اپنی بعد کی ایک اشاعت میں پونا کے ہندوؤں میں تقسیم کیے جانے والے اشتعال انگیز کتابچوں اور خون کھولا دینے والی نظموں کا تذکرہ کرتے ہوئے حسب ذیل نظم کا نقل کیا ہے جس کا عنوان ہے

"ہندوؤں کو مشورہ"

یہاں وہاں ہر جگہ فسادات برپا ہوئے اور
ہر جگہ ہندوؤں کو زک پہنچائی گئی۔ مارا گیا
مقابلے کی اس گھڑی میں آؤ ہم سب متحد ہو کر
انتقام لیں دشمن سے اپنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گنپتی کو آگے لے آؤ اور محرم کی تقریبات کے بالمقابل پیش کرو۔
تاکہ لوگ جوق جوق در جوق جمع ہوں اور سوانگ سے لطف اندوز ہوں۔

The Times. London بابتہ 20 نومبر 1894ء

the Times of India (overland Weekly Edition) بابتہ 22 ستمبر 1894ء

38۔ گورنر کی تقریر پر ٹائمز آف انڈیا کے اداریٰ تبصرے کے لیے ملاحظہ ہو۔
13 اکتوبر 1894ء کا بیرونی ملک جانے والا ہفتہ وار ایڈیشن۔ مزید ملاحظہ ہو
The Times لندن، بابتہ 17 اکتوبر 1894ء۔

39۔ The Times of India کے بیرونی ہفتہ وار ایڈیشن بابتہ 20 اکتوبر 1894ء میں یہ الفاظ نقل کیے گئے۔

40 The Times of India (بیرونی ہفتہ وار ایڈیشن) بابتہ 13 اور 21 ستمبر 1895ء
مزید ملاحظہ ہو "دھولیہ فساد کے مقدمہ" پر خاندیش کے فرسٹ کلاس مجسٹریٹ جے۔ ایچ۔ بونٹلے (J.H. Bonlay) کا فیصلہ جو The Times of India کے بیرونی ہفتہ وار ایڈیشن کی 19 اکتوبر 1895ء کی اشاعت میں شایع ہوا۔

۔ ملاحظہ ہو یکم، 2 اور 3 جولائی 1897ء کا The Times لندن۔ مزید ملاحظہ ہو فسادات سے متعلق حکومتِ بنگال کی رپورٹ جو 14 اگست 1897ء کو گزٹ آف انڈیا میں شایع ہوئی۔

۔ ملاحظہ ہو ٹی۔ ایس۔ ویر (T.S. Weir) ہیلتھ آفیسر کی جانب سے 16 اکتوبر 1893ء کا جاری کردہ وہ گوشوارہ جس میں بمبئی کے فسادات کے دوران ہلاک ہونے والوں کی تعداد بتلائی گئی ہے جن کا اندراج محکمہ صحت کے صیغہ رجسٹریشن میں موجود ہے۔ مزید ملاحظہ ہو کتابچہ بعنوان The Bombay Riots: Agust 1893 (جسے Times of India سے حاصل کر کے دوبارہ شایع کیا گیا) صفحات 9-11 اور Bomby Riots, August 1893: The govt. Resolution and the official Reports, With Summary of the Trials in the high Court - 17 - 19 مزید ملاحظہ ہو 23, 24 اور "The Muhammadan and Hindu Riots in Bombay" August 1893

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(بمبئی گزٹ سے اخذ شدہ) 18, 27, 28 اور 39-40

43. ۔ ملاحظہ ہو جی۔ کے۔ گوکھلے کی جانب سے "ہندستان میں مذہبی فسادات پر حکومتِ بمبئی کی خدمت میں پیش کردہ یادداشت" (مکمل متن کے لیے ملاحظہ ہو India بابتہ فروری 1895ء)۔ گوکھلے کے مطابق ان فسادات کی بنیادی مشترکہ خصوصیات حسب ذیل ہوتی ہیں:۔

1. یہ فسادات دونوں فرقوں کے نچلے طبقے کی حد تک ہی محدود ہوتے ہیں۔
2. ان تمام کی تہہ میں صرف اور صرف مذہبی تعصبات ہی کارفرما ہوتے ہیں۔
3. اور یہ کہ یہ تصادم غالباً لازمی نتیجہ ہے اُس عہدِ تغیر اور تبدل کا جس سے فی الحال ہمارا ملک گزر رہا ہے اور سماجی مساوات کے نئے معیارات قدیم نعایتی بندشوں کی جگہ لے رہے ہیں۔"

The Aligarh Institute gazette بابتہ 16 مئی 1903ء۔

45 The Times، لندن، 20 نومبر 1894ء۔ مزید ملاحظہ ہو ایک اداریہ بعنوان A plea for conciliation ٹائمز آف انڈیا (ویل ایڈیشن) 3 نومبر 1894ء

46۔ حالی: حیاتِ جاوید (اردو متن) 151-111 (حصہ اوّل)

47 Report from the Select committe on the Affairs of the East India company (August 16, 1832) General Appendix I, 60-61

48 Clifford Manshardt: the Hindu-Muslim Problem in India, 6

49۔ ملاحظہ ہو حکیم شمس اللہ قادری کی تاریخ زبان اردو (اردو متن) 17-18 یہ اردو زبان کی پیدائش کے بارے میں سب سے معقول نظریہ ہے۔ تاہم اس کی سائنٹفک صحت کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اس موضوع پر ملاحظہ ہو جارج۔ اے۔ گریرسن کے قابلِ تعریف مباحث مطبوعہ George A. Grierson

Calcutta Review, Vol. LXXVI (1882) 151-58

LXXXIII (1886) 363-77

50 Grahame Bailey: Urdu Literature, 7

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

51. اردو کے مشہور مصنف حسن نظامی کے کہنے کے مطابق " اردو اور ہندی کے مابین صرف اُنھی لوگوں کو فرق نظر آتا ہے جنھیں دونوں میں سے کسی بھی زبان کے حُسن کا شعور نہیں ہے" ڈاکٹر عظیم کریوی نے یہ قول اپنی کتاب ھندی شاعری (اردو اور ہندی متن) کے صفحہ پر نقل کیا ہے۔

52 Comparative Grammar of the Modern Aryan Languages of India, I 31 – 32

53 ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق " اردو زبان کی یہ انتہا درجہ کی فارسی آمیزیت دراصل نتیجہ تھی ہندو اثرات کا نہ کہ فارسی اثرات کا۔ اگرچہ اپنی ابتدا کے اعتبار سے اردو ادب " مسلم " ہی رہا ہے۔ تاہم اس زبان پر فارسی اثر کے بُلبلے کے ذمہ دار ایسے ترغیب پذیر ہندو عہدیدار رہے ہیں جو اُن دنوں مغل انتظامیہ کے ساتھ وابستہ تھے اور جنھیں فارسی زبان پر کماحقہ دسترس حاصل تھی نہ کہ اہل فارس یا مُغرس مغل جو صدیوں تک ادبی مقاصد کے لیے اپنی اپنی زبانوں کو ہی استعمال کرتے رہے۔" (Ency clopaedia Britannica, Eleventh Edn. Vol. XIII, 479)

54 ۔ ملاحظہ ہو مولانا سید سلیمان ندوی کی وہ تقریر جو انھوں نے مارچ 1937ء کو علیگڈھ کے مقام پر مُحمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے گولڈن جوبلی اجلاس میں کی تھی۔

مزید ملاحظہ ہو سی۔ جے۔ لایل (C. J. Lyall) کی کتاب موسومہ A Sketch of the Hindustani Language جس میں مصنف رقمطراز ہے کہ " اردو کے مقابلے میں " بلند پایہ ہندی " کی اصطلاح ایک ایسی ترکیب ہے جس کی ترویج ابھی حال ہی میں ہوئی ہے۔ اس نظریے کی ادبی پرداخت بڑی حد تک شمالی ہند کے محکمہ تعلیمات کے اثرات کی وجہ سے اور کچھ حد تک ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کے ذرائع ابلاغ کی مخالفت کی وجہ سے ہوئی۔" صفحہ 4

55 ۔ اس شہنشاہ نے اپنے کلام میں ظفر تخلص استعمال کیا ہے۔

56 ۔ اردو زبان کے لیے مل کرسٹ کی خدمات کا جایزہ لینے کے لیے ملاحظہ ہو سید المصنفین (اردو متن) جلد اول 51, 54

Report of the Punjab Provincial Committee of the Education Commission. 51

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

58 ۔ ملاحظہ ہو بابو مدھی سودن پنت کی تقریر بعنوان A Lecture on Nagree ۔ یہ تقریر
مع روئیداد اجلاس منعقدہ نینی تال مورخہ 28 اگست 1869ء

59 ۔ اخبار Indian Observer نے اُن عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کے باعث کیمپبل Campbell کو اُن اقدامات پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ لکھتا ہے :

"ہم سمجھتے ہیں کہ اس اقدام کی فوری وجہ جس کے باعث اُس نے صرف محکمہ تعلیمات ہی نہیں بلکہ پورے بنگال کو ہلا کر رکھ دیا، وہ خطبہ استقبالیہ تھا جو بعض دیسی سربرآوردہ شخصیتوں نے عزت مآب لیفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں اُن کے حالیہ دورۂ بہار کے دوران پیش کیا تھا۔ اس خطبۂ استقبالیہ کے مصنف نے اردو زبان کا ایک ایک منتخب بلیغ لفظ چن چن کر ممدوح کی تعریف و توصیف میں استعمال کیا تھا۔ لیکن خطبہ کی اس تمام بلاغت کا اُلٹا ہی اثر ممدوح کی ذات پر مترتب ہوا۔ کیونکہ اس مدلل خطبے کی مرصع زبان مسٹر کیمپبل کی فہم سے بالاتر تھی۔ چنانچہ ممدوح اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی اپنی ذات میں تو کسی قسم کا نقص ہو نہیں سکتا لہٰذا سارا نقص اردو زبان ہی کا ہے۔ اُسے اس بات پر شدید اعتراض تھا کہ کوئی اس سے انتہائی ادق اور فرسودہ قسم کی عربی اور فارسی کے الفاظ کو بیچ کر کے یہ کہے کہ "جب چاند نے ممدوح کے رتبے کی بلندی پر نگاہ ڈالنی چاہی تو اس کی گردن ٹوٹ گئی اور بنگال میں اپنے رقیب کی زشت روئی کو دیکھ کر سورج کا چہرا زرد پڑ گیا"۔ کیمپبل اس صورت حال کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ فرمان جاری ہو گیا کہ روئے زمین پر بولی جانے والی زبانوں میں سے اُردو زبان کو خارج کر دیا جائے۔

(The Indian Observer, December 23, 1871)

60 ۔ منقول Report by the Bengal Provincial Committee of the Education Commission 1884—, 395

اُن دنوں عظیم فرانسیسی مستشرق پروفیسر گارساں دی تاسی Garcin de Tassy ہندستان کے سفر پر آیا ہوا تھا اور اس ہندی اردو قضیے کا باریک بینی سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کے مطابق "ہندوؤں کو فارسی رسم الخط کی شکایت ہے۔ اُن کے لیے ناگری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسم الخط زیادہ پسندیدہ ہے حالانکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ ایک تعصب میں انھا شخص ہی فارسی رسم الخط کی جگہ خوبصورت دیوناگری کی بجائے مروجہ بدہیئت ناگری (کایتھی) رسم الخط کو اپنانے پر مُصر ہوگا جو اُس خطِ شکستہ کی جگہ لینے کا اہل بھی نہیں ہے جس کا پڑھنا انتہائی مشکل تصور کیا جاتا ہے۔" ملاحظہ ہو اس کی کتاب

L' Histoire des Langues et des Litteratures Hindoui et Hindoustanis, I, 5.

61 - Ibid

62 - منقولہ Report by the Bengal Provincial Committee of the Education Commission, 399.

63 - Ibid

64 - Lala Dwarka Das. Hindi Versus Urdu 2

65 - Report by the North Western Provinces and Oudh Provincial Committee of the Education Commission (1884), 490

66 - Report of the Bengal Provincial Committee of the Education Commission (1884), 558

67 - تعلیمی کمیشن کی شمال مغربی صوبجات اور اودھ سے متعلقہ صوبائی کمیٹی کے روبرو بابو برشیو مترا Babu Bireshwar Mittra کی شہادت (رپورٹ ،)

68 - مذکورہ بالا کمیٹی کے روبرو راجہ جے کرشن داس کی شہادت (رپورٹ)

69 - ملاحظہ ہو بنارس کے پنڈتوں کی جانب سے پیش کردہ محضر (Ibid (436)

70 - ملاحظہ ہو میرٹھ ایسوسی ایشن کی یادداشت (Ibid, 679)

71 - علی گڈھ کی بھارت درشن نیشنل ایسوسی ایشن کے خطبہ سے منقول (Ibid (417)

72 - Report of the North Western provinces and Oudh Provincial Committee of the Education Commission (1884) 410-22

73 - Ibid 421

74 - Ibid

75 - Ibid

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

76۔ میکڈونل نے الہ آباد میں 9 مارچ 1898ء کو ملاقات کرنے والے وفد کو جو جواب دیا تھا اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 10 مارچ 1898ء کا Pioneer

77۔ ملاحظہ ہو حکومت شمال مغربی صوبجات اور اودھ کی اس موضوع پر گورنمنٹ گزٹ میں شایع ہونے والی قرارداد جو مورخہ 21 اپریل 1900ء کو مذکورہ گزٹ کے حصہ چہارم میں شایع ہوئی۔

78 - The Moslem Chronicle, May 19, 1900

79 - The Pioneer, May 12, 1900

80 - Ibid. May 17, 1900

81 - The Pioneer, May 17, 1900

82 - Ibid August 23, 1900

83 - Ibid August 18, 19, 1900

84 Ibid. مزید ملاحظہ ہو اس قضیے سے متعلق نواب محمد حیات خاں کے سوالات اور اسمبلی مسٹر رواز Rivaz کے جوابات مشمولہ Proceedings of the Legislative Council of the Governor-General of India (1900).

85۔ شبلی: سالانہ روئیداد انجمن ترقی اردو (اردو متن)۔ 1903ء

86۔ Haedonel میکڈونل The Pioneer, Aug. 1, 1900 پوری کی پوری ہندو قوم کے لیے رطب اللسان تھی۔ مہاراجہ سر پرتاپ نارائن سنگھ بہادر نے بھارت مہامنڈل سبھا کی سالانہ کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے، جو اگست 1900ء کے دوسرے ہفتے میں بمقام دہلی منعقد ہوئی تھی، ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے اُنھی کے بارے میں کہا تھا کہ "ہمیں تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے" (دی پایونیر مورخہ 20 اگست 1900ء) چند برس پہلے میکڈونل کے بارے میں معاصر بنگالی نے لکھا تھا: "ان سے قبل ایسا کوئی عہدیدار دیکھنے میں نہیں آیا جس نے خود کو اس کوتاہ نظری کے اثرات سے اس بڑی حد تک آزاد کر لیا ہو جس کا شکار اکثر اینگلو انڈین اعلیٰ عہدیدار ہوا کرتے ہیں یا جسے تعلیم یافتہ دیسی باشندوں کی آرزوؤں اور امنگوں کا اس حد تک پاس و لحاظ رہا ہو۔" (The Bengalee, Jan. 11, 1896).

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

87 - Roy Smith, Nationalism and Reform in India P. 53

88 - میکڈونل کی اس گشتی کے بارے میں ملاحظہ ہوں ہندو بابتہ 23 اگست 1900ء اور ہندو پیٹریاٹ بابتہ 28 اگست 1900ء کے ادارتی شذرات۔

89 - The Moslem Chronicle, May, 30, 1903

90 - The Aligarh Institute Gazette May 16, 1903

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دسواں باب

قیادت کی خصوصیات

ہم نے گذشتہ ابواب میں مسلمانوں کے جس سیاسی، سماجی اور معاشی ارتقار کا جایزہ لیا ہے اُس میں ملت کا معتدبہ حصّہ بالراست حصّہ گیر نہیں رہا۔ مستقبل کی تعمیر میں شاید ہی اُن کا کوئی شمار رہا ہو تاہم اُس دور کے ہر واقعے نے نہ صرف انھیں بے حد متاثر کیا بلکہ ان کی زندگیوں پر گہرے نقوش بھی چھوڑے۔ ملت کے گنے چنے چند افراد ہی تھے جنھوں نے بسا اوقات عوامی محرکات کی بجائے شخصی محرکات کی بنا پر ملّی قیادت کا دعویٰ کیا۔ ان کے اس دعوے کی صحت کی کسی نے جانچ نہیں کی اور نہ ایسی کسی جانچ پڑتال کے کوئی ذرایع ہی قوم کے پاس موجود تھے لیکن بلاشبہ یہ وہ لوگ تھے جو حکمران حلقے میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے اور اپنی ہی قوم کے صاحب جاہ و ثروت حلقے میں بے حد مقبول تھے۔ لہذا اُن دنوں اگر کسی قسم کی نمایندگی کا طریقہ معرضِ وجود میں ہوتا تو یقیناً وہ اپنے دعوے کو درست ثابت کر دکھاتے۔ مختصر یہ کہ ہندستانی معاملات میں انھوں نے جو کردار نبھایا ہے وہ فیصلہ کن اہمیت کا حامل رہا ہے اور اُسی کی اساس پر مستقبل میں مسلم سیاست کا قصر تعمیر کیا گیا ہے!

اس باب میں اس دور کے چند سرکردہ مسلم رہنماؤں کی حیات کے ساتھ ان کی فکر و عمل کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ ایسا کرنا بوجوہِ کثیر احسن ہوگا۔ اگر یہ بزرگ مختلف سرشت کے حامل ہوتے یا کسی اور ماحول کے پروردہ ہوتے تو یقیناً ہمارا یہ مطالعہ بھی کئی معاملات میں بالکل مختلف ہوتا۔ مثلاً اگر سرسید نے کانگریس کے ساتھ تعاون کیا ہوتا تو کیا ہندو مسلم تعلقات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بالکل ہی مختلف بنیاد پر استوار نہیں ہوتے ہوتے ؟ یا اگر انھوں نے مختلف سیاسی روش اختیار کی ہوتی تو کیا آج کا مسلمان ہندستانی سیاست میں طلاقی پسندی کے اتنے ہی سخت گیر رویے پر کاربند رہتا ؟

بے شک ہم سرسید یا دیگر مسلم رہنماؤں کو اس عہد اور اُن مخصوص حالات سے جدا نہیں کر سکتے جن میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی اور جن کی گہری چھاپ اُن فکر و عمل پر پڑی تھی ۔ مثال کے طور پر (1817ء تا 1898ء) تک کا وہ عہد جس میں وہ پیدا ہوئے اور جس کے پیش کردہ چیلنجوں کا انھوں نے آگے چل کر مقابلہ کیا ' ان کی عوامی سرگرمیوں پر فیصلہ کن انداز میں اثر پذیر ہوا۔ اُن کا تعلق امرار کے خاندان سے تھا۔ ان کے دادا ایک ہزاری پرفائز تھے جن کا نام مع خطاب جوادالدولہ جواد علی خاں تھا۔ اُن کے نانا مغل شہنشاہ شاہ اکبر ثانی کے وزیر اعظم تھے ۔ مزید برآں سید ہونے کے باعث سرسید آنحضرت صلعم کے ساتھ رشتے کا دعویٰ کر سکتے تھے ۔ اکثر وہ حضور اکرم کو " میرے دادا " کہہ کر یاد کیا کرتے تھے ۔ علاوہ بریں بچپن ہی سے ان پر مغل دربار کے شاہی اثرات غالب تھے خواہ وہ دربار خرابی اور انحطاط کے اثرات کا شکار ہی کیوں نہ رہا ہو۔ اپنے عنفوان شباب ہی میں اُنھیں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر سے شخصی طور پر جوادالدولہ اور عارف جنگ جیسے موروثی خطابات حاصل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو چکا تھا۔

لہٰذا سرسید نہ صرف پیدائشی طور پر بلکہ اپنی تربیت کے اعتبار سے بھی ایک امیر (نواب) تھے ۔ اُن کے اجداد کا تعلق ہندستان سے نہیں تھا ۔ وہ شاہجہاں کے دور میں ہندستان آئے تھے ۔ اورنگ زیب کے زمانے میں انھیں کافی عروج نصیب ہوا چنانچہ سرسید کو جو برطانوی حکومت کا زیر نگر ہونا پسند نہیں تھا وہ حکومت کی بدیسی نوعیت کی وجہ سے اتنا نہیں تھا جتنا کہ اسلام کی شاہانہ عظمت کے زوال کے باعث تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ 1857ء میں غدر کے پھوٹ پڑنے تک سرسید کے جوہر پوری طرح کھلے نہیں تھے ۔ اُس وقت تک اُنھوں نے صرف ایک سنجیدہ اور قابلِ ذکر کارنامہ انجام دیا تھا یعنی دہلی کے آثارِ قدیمہ کی تاریخ بعنوان آثار الصنادید مدوّن کی تھی ۔ اس کتاب کی وجہ تالیف یہ تھی کہ انھیں مسلمانوں کے کارناموں سے عشقیہ لگاؤ تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی کتاب میں ہندو فنِ تعمیر پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے ۔ سرسید کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمر کے ابتدائی برسوں ہی میں اس امر کا اچھی طرح احساس ہو گیا کہ عہدِ رفتہ کی عظمتوں کی بازیابی ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا خیال تھا کہ اب مسلمانوں کے لیے صرف یہ بچ رہا ہے کہ وہ برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونے کی کوشش کریں۔ اسی وجہ سے جس وقت اُن کے طبقے کے مسلمان جھوٹی آن بان کے بھرم میں نئی انتظامیہ سے الگ تھلگ رہے عین اُنھی دنوں اپنے عزیز و اقربا کی ناراضگی مول لے کر انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت قبول کر لی۔ ابتداً وہ سررشتہ دار کے معمولی سے عہدے پر تعینات ہوئے۔ لیکن اس مامور کی وجہ سے وہ کسی قسم کے احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مانگنے والوں کو اپنی مرضی کی کوئی چیز منتخب کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں ان کی والدہ نے جو اُنیس برس کی عمر ہوتے تک ان کی واحد سرپرست اور رہنما تھیں، اُن میں اقتدار کا بے حد احترام پیدا کر دیا تھا۔ اُن دنوں ایسی ہی تربیت اُن نوجوانوں کو دی جاتی تھی جو امرا کے اُن خاندانوں سے وابستہ تھے جن کا درباری زندگی اور منصب و وزارت کے ساتھ قریبی تعلق رہا کرتا تھا۔ ملازمت کے ابتدائی ایام میں سرسید کا واسطہ سر رابرٹ ہیملٹن جیسے مخلص اور مشفق افسر سے پڑا جس کی بدولت برطانوی حکومت کے لیے اُن کے دل میں عزت و احترام کے جذبات اور بھی پروان چڑھنے لگے۔ چنانچہ اس التفات کی وجہ سے وہ سرعت کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے اور انھیں اپنے اعلیٰ برطانوی عہدیداروں کا حسنِ سلوک بدستور حاصل ہوتا رہا۔ 1857ء کے غدر کے کچھ ہی پہلے سرسید نے بجنور کے ضلع کلکٹر مسٹر شکسپیر Mr. Shakespear کی ماتحتی میں جنھوں نے سرسید کی شخصیت میں غیر معمولی دلچسپی لی تھی، صدر امین کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تھا۔[5]

اس حسنِ سلوک کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب سپاہیوں نے علمِ بغاوت بلند کیا تو برطانوی راج کے لیے سرسید کی وفاداری غیر متزلزل رہی۔ بغاوت کے سنگین اور مہیب ترین لمحات میں بھی ایک وفادار سپاہی کی طرح وہ اپنے برطانوی عہدیداروں کا ساتھ دیتے رہے اور خود اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کئی برطانوی خواتین اور بچوں کی جانیں بچائیں۔[6] بلاشبہ انگریز اُن کے ممنون و مشکور ہوئے اور انھوں نے ان کی اس بروقت امداد کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن سرسید جیسی حساس شخصیت جسے اپنے اسلامی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ورثے پر ناز تھا اُس ظلم و ستم کو ہرگز برداشت نہیں کر پائی جو بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلے میں بعد ازاں حکومت نے ان کے ہم مذہبوں پر روا رکھا انھوں نے برملا اس رویے پر انگریزوں کو ٹوکا اور جی جان سے اس بات کی کوشش کرنے لگے کہ بے گناہوں پر آئی ہوئی مصیبت کا جلد خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ اپنی کتاب تاریخ سرکشیٔ بجنور میں انھوں نے انگریزوں سے استدعا کی کہ وہ ان کے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ عفو اور درگزر سے کام لیں۔ انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کے لیے جگہ بنانے میں سرسید نے انتھک محنت کی۔

اس مقصد کے حصول ہی کے لیے انھوں نے ایک کتابچہ بھی بعنوان ھندستانی بغاوت کی وجوھات The Causes of the Indian Revolt تحریر کیا جس میں انھوں نے اس نظریے کو غلط ثابت کیا کہ بغاوت سے پہلے اس غرض سے روس یا ایران جیسے ممالک کے ساتھ گہری سازشیں کی گئی تھیں یا اُن ممالک سے کوئی امداد حاصل کی گئی تھی۔ اُنھیں اس امر کا شدید احساس تھا کہ بہادر شاہ کے اس بغاوت میں ملوث ہونے کے باعث مسلمانوں کے بارے میں دنیا بھر کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے انتہائی تلخی کے ساتھ مغل شہنشاہ کی مذمت ذیل کے الفاظ میں کر ڈالی۔

"سابق شاہ اس قدر ضعیف العقل واقع ہوا تھا کہ اگر کوئی اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ جنت کے فرشتے اُس کے غلام ہیں تو وہ اس شخص کی اس نامعقول بات کو درست تسلیم کر لینے پر آمادہ ہو جاتا اور فوراً نصف درجن فرامین جاری کر دیتا۔ سابق شاہ کے ذہن میں اس خیال نے گھر کر لیا تھا کہ جس وقت چاہے وہ خود کی ہیئت بدل کر مکھی یا مچھر کا روپ دھار سکتا ہے اور اس حلیے میں خود کو دیگر ممالک تک آناً فاناً پہنچا سکتا ہے تاکہ معلوم کر سکے کہ وہاں کیا چل رہا ہے۔ اُسے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا پختہ یقین تھا کہ وہ قلب ماہیت Transformation کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں درباریوں سے توثیق چاہنا اُس کی عادت تھی اور اس کے درباری ایسے لوگ نہیں تھے جو اسے دھوکا نہ دیتے۔"

لہٰذا سرسید چاہتے تھے کہ انگریز بغاوت میں شہنشاہ کی شمولیت کو غیر ضروری اہمیت نہ دیں اور اس کی غلطیوں اور نادانیوں کی سزا غریب مسلمانوں کو نہ دیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرسید کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ "ایک بھی بڑا زمیندار شہزادہ ایسا نہیں تھا جس نے بغاوت کی حمایت کی ہو"۔[9] ان کے خیال کے مطابق باغیوں میں سے اکثر کا تعلق نچلے طبقات سے تھا۔ "میری بات کو جھٹلانے کے لیے جھجھر Jhajjar کے نواب یا بلگڑھ Ballygarh کے راجہ کی مثالیں پیش کرنا گویا مختلف ہندستانی حکمرانوں کے مراتب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا ہے ...!..." وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ "حالیہ ہنگامہ" مسلمانوں کے نزدیک "جہاد" کا درجہ رکھتا تھا!!

بغاوت کی مختلف وجوہات کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ہنگامہ اس وجہ سے وقوع پذیر ہوا کہ "دیسی باشندوں" پر مجلس مقننہ Legislative Council کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ اس زبردست انتظامی غلطی کے ارتکاب کی وجہ سے سبھی لوگ انگریز حکومت کو دھیما زہر، ریت کی رسّی اور آگ کا پُرفریب شعلہ قرار دینے لگے جبکہ اس جانب ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جو اُن کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کر کے انھیں ان کے خیالات کی نامعقولیت کا قایل کرتا....[12]" وہ یہ تو نہیں بتلا سکے کہ کس طرح "غیر تعلیم یافتہ اور گنوار ہندستانیوں کو انگریزی پارلیمان جیسے کسی ادارے کے لیے منتخب کیا جاتے۔ اس راہ میں خواہ کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں اس کام کا کیا جانا نہ صرف پسندیدہ بلکہ ازبس ضروری ہے"۔

اس کے بعد سرسید ہندستان کے وفادار مسلمان (The Loyal Mohammadans of India) نامی پمفلٹوں کی سلسلہ وار تصنیف میں مشغول ہو گئے انھوں نے "ایسے مسلمانوں کو جو اپنے فرض سے چشم پوشی کرتے ہوئے بغاوت میں شامل ہو گئے تھے" معاف کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے برخلاف کہا کہ "میں ان کے اس طرزِ عمل کو انتہائی کراہیت کے ساتھ پرلے درجے کا مجرمانہ فعل قرار دیتا ہوں[13]"۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے شدید غم و غصّے کے ساتھ اس بات کی مذمت بھی کی کہ بعض اخبارات نے "مسلمانوں کو من حیث القوم موردِ الزام گردانتا شروع کر دیا ہے جس کے باعث ایسے مسلمانوں کی نیک نامی بھی داغدار ہونے لگی ہے جنھوں نے 1857ء کے دوران واقعات کو نیا موڑ عطا کیا ہے"۔[14]

ان پمفلٹوں کی اشاعت کے فوری بعد انھوں نے غازی پور میں ایک دارالترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قایم کی تاکہ یورپ کے ادبی خزانوں سے اُن ہندستانیوں Translation Society
کو روشناس کرا سکیں جو انگریزی زبان نہیں جانتے۔ اُن کے علی گڈھ تبادلے کے بعد اس
سوسائٹی کو مزید وسعت دے کر اس کا نام سائینٹیفک سوسائٹی Scientific Society
رکھا گیا۔ اس ادارے کے ترجمان علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجراء 30 مارچ 1866ء
کو عمل میں آیا۔ اُسی سال سرسید نے پارلیمنٹ کو ہندستانی امور سے باخبر رکھنے کی غرض
سے برٹش انڈین ایسوسی ایشن British Indian Association بھی قایم کی۔ اس
ادارے کی تشکیل انھوں نے بعینہٖ اُنھی خطوط پر کی جن کی نشاندہی کچھ عرصے قبل کلکتے کے
Englishman نے کی تھی۔[15]

اُس وقت تک سرسید میں ہندوؤں کے ساتھ عدم تعاون کا شائبہ بھی موجود نہیں
تھا بلکہ وہ تو اپنی سرگرمیوں میں ان کے اشتراکِ عمل کا خیر مقدم کرتے تھے۔[16] لیکن ہندی
موافق تحریک نے اُنھیں ایک طرح سے متفکر کر دیا اور وہ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے
بارے میں سوچنے لگ گئے۔ اردو سے انھیں اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ وہ اسے برداشت ہی
نہ کر سکتے تھے کہ ہندو اس پر حملہ کرنے لگیں۔ بقول حالی، اسی وقت سے سرسید کو اس
امر کا بتدریج یقین ہونے لگا کہ ہندستانی معاملات میں ہندو مسلم اتحاد کا کوئی امکان
موجود نہیں ہے۔[17] یہی بات انھوں نے تفصیل کے ساتھ محسن الملک کے نام موسومہ اپنے
ایک خط میں لندن سے لکھی تھی۔[18]

انگلستان سے واپسی پر سرسید نے عملاً اپنی دیگر تمام مصروفیت ترک کر دیں اور اپنی
تمام تر توجہات کو مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح پر مرکوز کر دیا۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً وہ نہایت
ہی خوبصورت الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان دراصل ایک
ہی ہیں لیکن ان کی تمام تر توجہات مسلمانوں کی شیرازہ بندی پر مرتکز رہیں۔ اس مقصد کے
حصول کی خاطر اُنھوں نے اس امر کو ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو "باغی" ہندوؤں سے الگ
رکھا جائے۔ اسی وجہ سے 1883ء میں وائسرائے کی کونسل میں مرکزی صوبجات کی مقامی
حکومت خود اختیاری کے مسودۂ قانون پر تقریر کے دوران دونوں قوموں کے مابین پائے
جانے والے "بنیادی فرق" پر زور دیتے ہوئے انھوں نے نامزدگی کی دفعہ "کو درست
قرار دیا تھا۔[19] اُس وقت تک انھیں اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو اگر تابناک مستقبل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تعمیر کرنی ہو تو انھیں انگریزوں پر تکیہ کرنا ہوگا۔ کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے کی صورت میں اُن پر ایک ایسی افتاد آن پڑے گی جو 1857ء کے غدر کے بعد پڑنے والی افتاد سے کہیں زیادہ سنگین ہوگی۔ سرسید کو زمانہ حال کی اتنی زیادہ فکر دامن گیر تھی کہ اُن کی نگاہوں میں اس مستقبل کا تصور دھندلا سا ہو گیا تھا جس کا سامنا خواہی نا خواہی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ایک ساتھ مل کر کرنا تھا۔ علاوہ ازیں ہندستان اور انگلستان کے بے شمار برطانوی عہدیداروں کے ساتھ شخصی تعلقات رکھنے کے باوجود سرسید کا سیاسی نقطہ نظر لازمی طور پر غیر جمہوری نوعیت کا حامل تھا۔ مثلاً ابتدائی دور میں بھی جبکہ وہ مجالس مقننہ میں ہندستانیوں کی نمایندگی کا ذکر کیا کرتے تھے انھوں نے یہ بات واضح کر رکھی تھی کہ نمایندوں کے انتخاب کی ذمہ داری "مجمع" کو ہرگز نہیں سونپی جانی چاہیے جس کے لیے ان کے دل میں حقارت بھری ہوئی تھی۔ اُن کے ذہن میں یہ بات جاگزیں تھی کہ ایسا انتخاب حکمراں خود کیا کریں کیونکہ یہ ایک فطری امر تھا کہ وہ اپنی رعایا کے سب سے زیادہ شریف النفس افراد ہی کو منتخب کریں گے۔ دراصل انھوں نے فی الفور برطانوی حکمرانوں پر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ بھی "حاکم و محکوم کے مابین ویسا ہی ربط استوار کریں جیسا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اُن ممالک میں جاری رکھا جن پر اُن کی عملداری رہی"۔ چنانچہ جب مغرب کی طرز بنیادوں پر کانگریس تحریک کی ابتدا ہوئی اور متوسط طبقے کے بنگالی "بابوؤں" نے مجالس مقننہ میں نمایندگی کے مسئلے پر شور مچایا اور حکومت کی نیک نیتی پر شک و شبہ کا اظہار کرنا شروع کیا تو سرسید ہکا بکا رہ گئے۔ انھیں اس امر کا یقین تھا کہ انگریز بھی ــــ کسی مشرقی فرمانروا کی طرح ــــ باغیوں کو کچل کر رکھ دیں گے انھیں اس بات کی فکر لگی رہتی تھی کہ اُن کے ہم مذہبوں کے ساتھ کہیں اس قسم کا سلوک از سر نو روا نہ رکھا جائے جیسا کہ چند ہی برس قبل 1857ء کے غدر میں حصہ لینے پر روا رکھا گیا تھا۔

کانگریسی رہنماؤں کے مقابلے میں سرسید انگریزی سیاسی افکار اور اداروں سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے۔ چونکہ وہ انگریزی زبان سے کما حقہ واقف نہیں تھے اس لیے ان باتوں کی معنوی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکے۔ انگریزوں میں بھی ان کے خاص مراسم صرف قدامت پسندوں Tories کے ساتھ ہی تھے۔ چنانچہ شاید ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھیں یہ خیال گزرا ہو کہ کبھی انگریزوں کو ہندستان چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکے گا یا اپنے اقتدار میں کمی کرنے پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ جوں جوں کانگریس کو تقویت حاصل ہوتی رہی توں توں سرسید کے تردد میں اضافہ ہوتا رہا اور وہ بڑے ہی دکھ بھرے استعجاب کے ساتھ حالات کو بدلتا ہوا دیکھتے رہے لیکن انھوں نے برطانوی حکومت کی نرم روی کو اس صورتِ حال کا سبب قرار دیا اور دو ایک دفعہ اس قسم کی پالیسی میں مضمر خطرات سے حکومت کو آگاہ بھی کیا[21]۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے انھیں اس امر کا یقین بھی ہو گیا کہ ہندستان میں "دو متصادم قومیں" ایک دوسرے کے مقابل نبرد آزمائی کے لیے مستعد کھڑی ہیں۔ دونوں قوموں کے مابین نزاعی مسایل کا ان کے پاس سوائے برطانوی حکومت کی مداخلت اور لطف و کرم کے کوئی حل ہی نہیں تھا۔

سرسید کے کانگریس مخالف رویے کے لیے بعض ناقدین نے ایم۔ اے۔ او کالج کے انگریز پروفیسروں کو موردِ الزام گردانا ہے۔ انھوں نے اس رویے کو بطور خاص "پرنسپل بیک Beck کے لطیف لیکن طاقتور اثر کا نتیجہ" قرار دیا ہے[22]۔ سرسید کی زندگی ہی میں کانگریس کے بعض ترجمان اخباروں نے اس نظریے کا پرچار کرنا شروع کر دیا تھا، جبکہ لالہ لاجپت رائے نے ایک سے زاید مرتبہ اس امر کی جانب عام جلسوں میں اشارہ کیا[23]۔ سرسید نے ان الزامات کا جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور نہ ہی انھوں نے اپنا موقف تبدیل کیا۔ اپنے الزامات کی تائید میں ان کے ناقدین سرسید کی اُن تقاریر کا حوالہ دیا کرتے تھے جو انھوں نے بیک کی آمد سے قبل کی تھیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ابتداً وہ طریقِ نمایندگی کے قایل تھے اور ہندو مسلم اشتراکِ عمل کے حامی تھے۔ سرسید اور بیک دونوں کے انتقال کے چند برس بعد علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے واضح کیا کہ لاہور کے ایک جلسہ عام میں، جس کی صدارت سرسید کر رہے تھے، سریندر ناتھ بنرجی نے بیک کے تعلق سے چند سخت الفاظ استعمال کیے جس کی بنا پر وہ جارحانہ حد تک کانگریس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تھے۔ سرسید کا متاثر ہو جانا بھی ایک فطری امر تھا کیونکہ وہ بیک کو بے حد عزیز رکھتے تھے لیکن اس کے علاوہ دوسری بھی کئی وجوہات تھیں جن کے باعث وہ جمہوریت کے دلدادہ نہ بن سکے مثلاً اس ماحول کے تقاضے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس میں اُن کی نشوونما ہوئی تھی، یا 1857ء کی بغاوت کے خلاف اُن کا ردِّ عمل اور اُن کا جاگیردارانہ رویہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں لفٹیننٹ گورنر سر آکلینڈ کولون (Sir Auckland Colvin) کے ساتھ ان کی اتنی ہی گہری دوستی جتنی گورنر صاحب کی بیک کے ساتھ تھی (حالانکہ بیک کافی دنوں کے بعد منظرِ عام پر آئے تھے) اور ایک اوسط برطانوی عہدیدار کے عام تنفر Antipathy نے بھی سرسید کو بے حد متاثر کیا ہوگا جس کا اندازہ ان کی ادبی کتابوں کے مطالعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

لیکن یہ ایک فاش غلطی ہوگی اگر ہم تھیوڈور بیک 1859-1899 کے اُس کردار کو کمتر سمجھیں جو انھوں نے مسلمانوں کے معاملات کے سلسلے میں نبھایا ہے۔ متعدد وجوہات کی بنا پر انھیں ہیوم Hume کا پرتو قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ آخر الذکر نے جو کچھ کانگریس کے لیے کیا اتنا ہی کچھ اوّل الذکر نے علی گڑھ تحریک کے لیے کیا۔ 1883ء میں بیک ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے آئے۔ اُس وقت وہ صرف ایک چوبیس سالہ نوجوان تھے جو سیدھے کیمبرج یونیورسٹی سے چلے آرہے تھے جہاں انھوں نے یونین کے صدر کی حیثیت سے کافی نام پیدا کیا تھا۔ سیاسی اعتبار سے وہ ٹوری Tory مسلک کے حامی تھے۔ اُن کا تعلق ایک متوسط طبقے کے کیکر Anker خاندان سے تھا۔ انھیں اپنے ملک کی شاہانہ عظمت پر بڑا ناز تھا۔ برطانوی قیادت پر انھیں بڑا بھروسہ تھا اور اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ اُن کے ہم وطنوں کی وساطت سے دنیا کے پسماندہ علاقے تہذیب و تمدن کی نعمتوں سے آشنا ہوں گے۔ امن برطانوی Pax Britannica ہی ان کی زندگی کا رہنما اصول تھا۔[25]

اس بات سے قطع نظر کہ اُن کا تعلق کیمبرج یونیورسٹی سے رہا (ضمناً یہ کہ وہ ٹرینیٹی Trinity کے انتہائی ذہین طالب علم رہے تھے) یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے برطانیہ کو اس وقت چھوڑا جب کہ وہ شاہانہ عظمت کی انتہائی بلندیوں پر تھا۔ مزید برآں جس وقت انھوں نے ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھا اُس وقت وہ یہ دیکھ کر پھولے نہیں سمائے کہ ان کی ملکہ 'وکٹوریہ' کا نام کس طرح یہاں کے "اونچے طبقے" کے دیسی باشندوں پر جادو کا سا اثر رکھتا ہے۔ اپنی پہلی ملاقات ہی میں انھوں نے سرسید کا دل جیت لیا اور خود بھی اُن سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ نہ صرف سرسید کی برطانوی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

راج کے ساتھ وفاداری سے متاثر ہوئے تھے بلکہ ان کی تہذیب اور شائستگی نے بھی جو اُن دنوں مسلمان امرا کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی تھی، انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ جلد ہی اس نوجوان انگریز کے دل میں سرسید کی ستر سالہ بزرگ شخصیت کے لیے احترام کے چشمے اُبلنے لگے۔ بعد ازاں بیک نے سرسید کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا: "اشرف الشرفاء اور اعلیٰ ترین خداداد صلاحیتوں کی مالک شخصیت جس کے ساتھ مجھے ہمیشہ ہی انتہائی گہرے شخصی مراسم استوار رکھنے کا شرف حاصل رہا ہے۔"[26]

اگر بیک کی پُرخلوص کوششیں شاملِ حال نہ ہوتیں تو شاید انگریز عہدیداروں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے روابط اس قدر قریبی اور خوشگوار نہ ہوتے۔ انھوں نے اِن روابط کو ہمیشہ زندہ رکھا جس کے باعث دونوں آپسی میل ملاپ کے ذریعے ایکدوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے کانگریس کی اس لیے مخالفت کی کہ انھیں ہندو مسلم مفاہمت سے بڑھ کر انگریز مسلم دوستی عزیز تھی۔ یہ خیال اُن کے دل میں گھر کر چکا تھا کہ انگریزوں کی مصالحت مسلم قوم کے ساتھ ہوگئی تو اس سے برطانوی راج کو دوامی استحکام حاصل ہوگا۔ بیک نے ہندوؤں پر کبھی بھروسہ نہیں کیا۔ کانگریس کے دستوری مطالبات کے خلاف سرسید کی لڑائی میں بیک نے انھیں جدید خیالات اور نظریات سے لیس کیا۔ مثلاً سرسید کی لکھنؤ اور میرٹھ کی مشہور تقاریر بڑی حد تک بیک ہی کی فکری کاوش کا نتیجہ تھیں۔ اسی طرح 1890ء میں پارلیمنٹ کے روبرو پیش کیا جانے والا مسلم محضر بھی اُسی کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا۔ دراصل اُس دور کی مسلم سیاست کو مکمل طور پر برطانوی رنگ میں رنگنے کے ضمن میں بیک نے سب سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ فکری ہتھیار فراہم کرتے رہے جن کی مدد سے سرسید نے کانگریس کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی۔ لہٰذا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر بیک کئی معاملات میں پہل کر کے سرسید کی مدد نہ کرتے تو شاید ان کے کئی تعلیمی اور سیاسی منصوبے کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتے۔ بیک کی وفات پر ایک مضمون نگار نے[27] "دی ٹائمز" میں لکھا کہ "ہم انگریزوں کے لیے یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ سرسید کو ایک ایسا انگریز بالآخر دستیاب ہو ہی گیا جس کی ذات سے انھیں وہ فیاضانہ ہمدردی حاصل ہوئی جس کا شاید انھوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اور یہ کہ وہ ایک انگریز ہی تھا جس کی ذات سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھیں بھرپور حمایت اور پُراز اخلاص تعاون حاصل ہوتا رہا۔" مضمون نگار چونکہ بیک سے شخصی طور پر پرخلوص مراسم رکھتا تھا اس لیے یہ بتلاتے ہوئے کہ کس طرح بیک نے سرسید کے ذہن میں پائی جانے والی فیاضانہ آرزوؤں اور تمناؤں کو ٹھوس عملی شکل عطا کی" اور کس طرح انھوں نے پہلے پہل مسلم تحریک کی " امکانی عظمت" کا ادراک کیا ، وہ رقمطراز ہے :

" انگلستان میں رہنے والے انگریز گھر بیٹھے اس امر کا ہرگز اندازہ نہیں لگا سکتے کہ سلطنت کے استحکام کی خاطر تیوڈور بیک جیسے لوگوں کو کتنا زبردست کام کرنا پڑا ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی خدمات کے بارے میں نہ تو کوئی خصوصی رپورٹ وطن بھیجی جاتی ہے اور نہ جن کی خدمات کو اخبار کے صفحات میں خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عوام میں گھل مل جاتے اور اپنے خلوص اور صوفیانہ بے غرضی کے ساتھ ان کا اعتماد حاصل کرتے ہیں ۔ اپنی بے لوث شخصیت کا پرتو عوام پر ڈال کر یہ لوگ ان میں وفاداری کا سحر پھونک دیتے ہیں اور انھیں تہذیب و تمدن کی راہ پر گامزن کر دیتے ہیں۔"[28]

سرسید کے دیگر رفقاء میں ان کے ساتھ سب سے زیادہ قربت بلاشبہ محسن الملک (1837 - 1907) کو حاصل تھی۔ سرسید ہی کی طرح محسن الملک کا تعلق بھی مسلمانوں کے قدیم امراء کے خاندان سے تھا۔ اُن کا شجرۂ نسب بھی آنحضرت صلعم کی ذات تک پہنچتا تھا۔ اپنی والدہ کی طرف سے اُن کا تعلق شیخ پور (فرخ آباد) کے مشہور عباسی خاندان سے تھا۔ اپنے قاید سرسید ہی کی طرح انھوں نے بھی 1857ء کے غدر سے پہلے اٹاوہ کے مقام پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت قبول کرتے ہوئے کلرکی کی خدمت اپنائی تھی اور غدر کے تمام ہنگامہ خیز دور میں برطانیہ کے وفادار رہے تھے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جلد ہی انھیں بہ حیثیت تحصیلدار مامور کر دیا گیا۔ 1867ء میں ترقی کر کے وہ مرزاپور کے ڈپٹی کلکٹر بن گئے۔ ایک ذہین منتظم ہونے کی وجہ سے لفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور Sir William Muir نے اُن کی بے حد ستایش کی۔ وہ اپنے اس مسلمان افسر کو شخصی طور پر بے انتہا چاہنے لگے۔[29] 1874ء میں حیدرآباد کے وزیر اعظم سر سالار جنگ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی دعوت پر انھیں اس ریاست کے انسپکٹر جنرل آف ریونیوز (Inspector General of Revenues) کے عہدے پر مامور کیا گیا جہاں دس سال سے کم عرصے میں انھوں نے اتنی ترقی کی کہ بالآخر اعلیٰ حضرت حضور نظام کے معتمد فینانس و مال مقرر ہو گئے۔ بعد ازاں چند دنوں کے لیے انھیں سرکاری کام سے برطانیہ بھیجا گیا جہاں انھوں نے گلیڈسٹون سے شخصی روابط استوار کیے۔ 1883ء تک محسن الملک نے نظام کی خدمت کی جس کے بعد "بعض مفاد پرستوں کی جھوٹی سازش کی وجہ سے"[30] انھیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ سرسید کی دعوت پر وہ علی گڑھ چلے گئے جہاں وہ 1907ء میں اپنی وفات تک رہے۔ وہاں رہ کر انھوں نے مختلف کاموں میں سرسید کا ہاتھ بٹایا اور اپنے قائد کی وفات کے بعد بھی اُن کے کاموں کو انتہائی تن دہی اور جانفشانی کے ساتھ جاری رکھا جیسا کہ حالی نے لکھا: "ملت کے تمام افراد نے بالاتفاق آرا سرسید کی تمام تر ذمہ داریاں محسن الملک کے کاندھے پر ڈال دیں، کیونکہ ان سے بڑھ کر سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ کسی اور کو نہیں تھا۔"[31]

محسن الملک نے مالی اور ادبی دونوں طرح سے سرسید کی بے انتہا مدد کی۔ سرسید نے جب کبھی کوئی عوامی مسئلہ ہاتھ میں لیا محسن الملک نے ہمیشہ اپنے مالی عملیات کے ذریعے ان کی مدد کی[32]۔ نہ صرف یہ بلکہ نواب صاحب پابندی کے ساتھ سرسید کے اردو رسالے تہذیب الاخلاق کے لیے مضامین لکھتے رہے۔ اُن کے مضامین کا موضوع اکثر مسلمانوں کی سماجی اصلاح ہوا کرتا تھا جنھیں وہ "بڑی تحقیق اور دقتِ نظری کے ساتھ تحریر کیا کرتے تھے"[33]۔ انھوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھی اپنے مضامین کے ذریعے نئی روح پھونکی جس کے باعث یہ اخبار باشعور مسلمانوں کا ایک زبردست نقیب بن گیا۔ انھوں نے ایم۔ اے۔ او۔ کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی بہت خدمت کی۔ اگر اُن کی ذات نہ ہوتی تو شاید سرسید کے انتقال کے بعد ان اداروں کو کافی نقصان پہنچتا۔ انھوں نے ان اداروں کا نظم بڑی ہمت اور پختگی کے ساتھ چلایا اور علی گڑھ تحریک کو زندہ رکھا ورنہ وہ سرسید کی وفات کے بعد خود بھی دم توڑ دیتی۔ انھوں نے افہام و تفہیم کے ذریعے کئی علما کو علی گڑھ تحریک کی حمایت کرنے اور اس کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔ اپنے سیاسی مسلک میں آخری دم تک وہ اپنے قایدہی کے وفادار رہے۔ مورین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی مدد سے انھوں نے اپنی قدیم پالیسی جاری رکھی اور مردانہ وار وقت کی للکار کا سامنا کرتے رہے۔ گو ایسا کرتے وقت انھیں ہمیشہ ہی کامیابی نصیب نہیں ہوئی کیونکہ وقت کے بدل جانے کے باوجود آج تک محسن الملک نے اپنی پالیسی نہیں بدلی تھی۔ کئی برسوں تک انھوں نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو سیاسی تحریک سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی۔ اور بالآخر جب انھیں محسوس ہوا کہ اب سیاست میں کودنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تو انھوں نے ہدایت کی کہ ایسا کرتے ہوئے ان کے ساتھی حکومت سے وفاداری کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیں۔ آخر وقت تک وہ کانگریس کے مخالف رہے اور ۱۹۰۷ء کے دستوری مباحث کے دوران انھیں نے بڑی حد تک اس مسلم وفد کو منظم کیا تھا جس نے لارڈ منٹو سے شرف باریابی حاصل کیا۔

اگرچہ محسن الملک اکثر ہندو مسلم اتحاد کے فوایدبیان کیا کرتے تھے تاہم انھیں اس امر کا پختہ یقین تھا کہ مسلمانوں کی مناسب شیرازہ بندی کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا "جب تک کوئی معجزہ نہیں ہو جاتا تب تک میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کیونکر ہم لوگ خود کو اس زبوں حالی کے قعر ذلت سے باہر نکال سکتے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا مسلمانوں پر من حیث القوم اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مقدمہ چل چکا ہے اور وہ قصوروار ٹھہرائے جا چکے ہیں اور فیصلہ بھی صادر کیا جا چکا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ حکم مطلق نوعیت کا نہیں ہے ....[34]۔ اُن کی پوری دوڑ دھوپ محض اس مقصد کے لیے تھی کہ مذکورہ حکم کو بروقت منسوخ کروا دیا جائے۔ اپنے قائد کی طرح وہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے برطانوی سایۂ عاطفت ازبس ضروری ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی ۱۹۱۴ - ۱۸۳۷ سرسید کے دوسرے قریبی رفیق کار تھے۔ اُردو زبان کے اعلیٰ ترین شاعروں میں سے ہونے کے باوجود وہ ایک منفرد نثر نگار بھی تھے جنھوں نے اردو زبان میں حیات جاوید نامی سرسید کی ایک مستند سوانح بھی قلمبند کی ہے انھیں اپنے اسلامی ورثے پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب اوایل اسلام کے مشہور سورما حضرت ایوب انصاری سے جوڑتے تھے۔ اپنے ہندستانی اجداد کا ذکر کرتے ہوئے انھیں کوئی خاص فخر محسوس نہیں ہوتا تھا حالانکہ ان کے اجداد تیرھویں صدی عیسوی ہی میں ہرات سے اس ملک میں آ گئے تھے۔ پیدایشی اعتبار سے حالی کا تعلق بھی طبقۂ شرفا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے تھا۔ اُن کی یہ خاندانی وجاہت زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی نہ کہ دنیوی نوعیت کی دہلی کے خاندانِ غلامان کے مشہور بادشاہ بلبن ہی کے زمانے سے پانی پت کی قضات، وہاں کی درگاہوں کی تولیت اور عیدین کی امامت اُنھی کے آباد اجداد کے لیے تفویض تھی۔

حالی اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اعلیٰ مذہبی تعلیم کے حصول کی خاطر دہلی چلے گئے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات کئی اردو شاعروں سے ہوئی جن میں سب سے عظیم غالب تھے۔ چنانچہ جلد ہی انھوں نے غالب کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ ابتداً انھیں اپنے استاد کی آزاد روی، غیر مقلدانہ روش، شراب اور عشق کی مدح سرائی پسند نہیں آئی۔ حالی نے لکھا: "یہ وہ دور تھا جب میں مذہبی خود اطمینانی کے نشہ میں سرشار تھا میرا یہ خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے صرف وہی مسلمان جو اہلِ سنت ہیں اور اہلِ سنت میں بھی صرف حنفی اور حنفیوں میں بھی وہی جو صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں نجات کے مستحق ہیں[35]۔" لیکن اس تنگ نظری کے چُنگل سے آزاد ہونے میں حالی کو زیادہ وقت نہیں لگا حالانکہ اپنی نجی زندگی میں وہ مذہبی اصولوں پر سختی سے کاربند رہے مگر غالب کی انسان دوستی اس قدر گہری تھی کہ یقیناً حالی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حالانکہ چونکہ شیفتہ کے ملازم تھے اس لیے آخر الذکر کے اثرات نے بھی حالی کے آیندہ رویّے کے تعین میں نمایاں کردار انجام دیا۔

مزید برآں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جس طرح سیکڑوں مسلمان شرفاء اور امراء کے خاندانوں کو نیست و نابود کر دیا گیا اور ان کے ہم مذہبوں پر جو افتاد پڑی، اس نے حالی کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے زندگی کے ساتھ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر لیا۔ انھیں اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ اگر مسلمانوں کی از سرِ نو تنظیم جدید نہیں کی گئی تو ان کے مزید انحطاط کو روکنا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اسلام جس دورِ انحطاط سے گزر رہا تھا اس نے حالی کے دل کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر جگر سوز نظمیں لکھیں اور اس امر کا خواب دیکھنے لگے کہ ایک نیا درخشاں اسلام قدیم اسلام کی جگہ سنبھال لگا۔ لاہور میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران انھوں نے علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی اور پنجاب بک ڈپو کے شایع کردہ اردو ترجموں پر نظر ثانی کے دوران یورپین ادب سے واقفیت بہم پہنچائی۔ یہ مطالعہ اس نئی ہندستانی صورتِ حال کو سمجھنے میں اُن کے بڑے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کام آیا جو انگریزوں کی آمد کے باعث پیدا ہوگئی تھی۔

پہلے پہل تو سرسید کے ساتھ حالی کا ربط اُن مضامین کے ذریعے ہوا جو انھوں نے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے لیے لکھے تھے لیکن بعد ازاں دونوں کی ملاقات دہلی میں ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے بہترین دوست بن گئے۔ ان کی یہ دوستی علی گڑھ تحریک کے لیے فالِ نیک ثابت ہوئی۔ سرسید سے اپنی پہلی ملاقات کا حال حالی نے اِن خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اچانک میری نظر ایک اللہ والے پر پڑی جو انسانوں کے جمِ غفیر میں ایک بطلِ عظیم کی طرح دشوار گزار راہ پر آگے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اُس کے بہت سے ساتھی تھک ہار کے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ کئی رہروں کے پیروں میں چھالے پڑ چکے تھے اور وہ نحیف و نزار بے دمی کی کیفیت میں ایک ایک قدم گھسیٹ رہے تھے لیکن اُن کا مستقل اور ثابت قدم رہنما اب بھی پہلے ہی کی طرح تر و تازہ اور ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ سفر کی مشقت، ساتھیوں کی تھکان اور منزل کی دوری کی پرواہ کیے بغیر وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس شخص میں ایک عجیب قسم کی مسحور کن مقناطیسیت موجود تھی۔ وہ جس کسی شئے پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا وہ شئے مسحور ہو جاتی اتفاقاً اس کی ایک ایسی ہی نگاہ مجھ پر بھی پڑ گئی۔ اگرچہ اس وقت میں بیس برسوں کی صحرانوردی کے ہاتھوں تھک کر چور چور یاسیت اور احساسِ محرومی کا شکار ہو چلا تھا لیکن اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا میں اُس شخص کی جانب کھنچا چلا ہوں۔ میں جو کچھ کرنے لگا تھا مجھے نہ تو اُس کے منشا کا علم تھا نہ مقصد کا۔ مجھے صرف اس بات کا احساس تھا کہ ایک طاقتور ہاتھ ہے جو مجھے کسی سمت کھینچے چلا جا رہا ہے۔

میرا دل جو جواں حسن کے دامِ فریب سے بچ نکلا تھا' ایک پیر سفید ریش نے اُسے ایک نگاہ میں زیرِ دام کر لیا۔"[36]

مزید کہ بڑی حد تک سرسید ہی کی وجہ سے حالی کو اپنا مشہور مسدس[37] لکھنے کی تحریک ہوئی تھی جس میں شستہ اردو شاعری میں اسلام کے عروج و زوال کی تصویر کشی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی گئی ہے۔ اس نظم کے بارے میں گراہم بیلی Graham Bailey کا خیال تھا: "اردو بولنے والوں کو کسی ایک نظم نے اتنا زیادہ متاثر نہیں کیا جتنا کہ مسدس[38] نے" سرسید کے نزدیک بھی یہ نظم اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جو ان کے کام کو آگے بڑھانے کا موجب بنے گی[39]

تاہم جوں جوں وقت گزرتا گیا توں توں حالی کو یہ بات ناپسند ہونے لگی کہ ان کا قاید ہر چھوٹی بڑی بات کے لیے انگریزوں پر تکیہ کرنے لگا ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کی نیت سے سرسید بعض آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کی جس انداز میں تشریح اور تاویل کرنے لگے تھے وہ بھی حالی کو کھٹکنے لگی تھی[40] گو انھیں علی گڑھ تحریک سے لگاؤ تھا تاہم حالی انگریزوں کے اُن "جرائم" کو معاف نہ کر سکے جو 1857ء کے غدر کے بعد ان سے مسلمانوں کے خلاف سرزد ہوئے تھے اور جن کے دہلی میں وہ خود عینی شاہد رہ چکے تھے۔ انھیں وہ انداز بھی پسند نہیں تھا جس میں مسلمانوں کی نوجوان نسل کو جدیدیت سے آراستہ کیا جا رہا تھا۔ ایک بار خود انھی نے نوجوان نسل کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا "ترقی" کے معنی ہرگز "نقالی" نہیں ہیں۔

"کیا تم جانتے ہو" اُنھوں نے اُن سے دریافت کیا "وہ کیا شئے ہے جو تمہیں آگے بڑھنے نہیں دیتی؟ جو تمہیں آج بھی پسماندہ کیے ہوئے ہے؟ وہ ہے تمہاری لایعنی نقالی۔ اسی خامی نے جہاں ایک طرف تم سے ہر میدان، جیسے تجارت، کاروبار، زراعت، صنعت و حرفت میں پیش قدمی اور مستعدی کی صلاحیتوں کو چھین لیا ہے، وہیں مذہبی معاملات میں تمہیں زوال آمادہ کر دیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اسی نے تمہیں زوال آمادہ کر دیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اسی نے تمہیں پابہ زنجیر کر دیا ہے۔ آج تمہارا حال اُس مجبور و بے کس پرندے کی مانند ہے جس کے پر باندھ دیے گئے ہوں اور جس کی آنکھوں پر پٹی کس دی گئی ہو۔ آج تم میں طاقتِ پرواز ہی باقی ہے اور نہ تمہاری آنکھوں میں وہ روشنی جس کی مدد سے تم مستقبل میں جھانک کر دیکھ سکو۔"[41]

مزید 1893 کے اوایل میں انھوں نے اپنے مضمون "کیا ہم زندہ ہیں یا مردہ؟" میں مسلمانوں کو ضرورت سے زیادہ سرکاری ملازمتوں پر تکیہ کرنے کے خلاف تنبیہہ کی تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا "اُنھیں اپنے آپ پر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ وہ صرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سفارشوں کے سہارے زندہ ہیں۔" جو لوگ سرکاری ملازمت سے وابستہ نہیں ہیں اُن کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ان کی نگاہ قیادت کے منصب پر لگی ہوئی ہے جو "حکومت سے بڑے ہی ادب کے ساتھ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ "دیسی" باشندوں کے حقوق اُنھیں عطا کردے اور ایسا کرتے وقت انھیں اس بات کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ خود قوم کے تعلق سے اُن کے فرایض کیا ہیں۔" وہ لوگ جو "انگلستان جاکر واپس لوٹے ہیں" انھوں نے تو اپنی چمک دمک میں دوسرے سبھی لوگوں کو ماند کردیا ہے۔ "وہ یہ سمجھتے ہیں گویا سنگِ پارس اُن کے ہاتھ لگ گیا ہے جس کے چھوتے ہی تانبا سونے میں تبدیل ہوجائے گا۔" حالی کو اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ یہ نوجوان اگرچہ زندگی کے چند قیمتی برس ایک ایسی قوم کے درمیان بتاکر لوٹتے ہیں جو غیور، محبِ وطن، مستعد اور پڑھی لکھی ہے، تاہم ہندستان لوٹتے ہی یہ لوگ بھونڈی اور مضحکہ خیز قسم کی نقالی میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض حضرات کا طرزِ عمل تو اس سے زیادہ بُرا ہوتا ہے کیونکہ واپس لوٹ کر وہ اپنے ہی لوگوں کے ساتھ نفرت آمیز برتاؤ کرنا شروع کردیتے ہیں۔ بعض اوقات تو اُنھیں اپنے لوگوں سے اتنی زیادہ نفرت ہوجاتی ہے جتنی کہ شاید خود انگریزوں کو بھی نہ ہوتی ہو۔ حالی نے یہ بھی بتایا کہ "انگریز تو ہمارے ملک کے عوام کو نیم مہذب کہتے ہیں لیکن ایسے نوجوان تو انھیں مکمل طور پر غیر مہذب وحشی قرار دیتے ہیں۔" انھی خطوط پر حالی نے اپنی مشہور نظم "خدمتِ ننگ" کہی جس میں انھوں نے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے رنگ ڈھنگ اور سرگرمیوں کی مذمت کی۔ سرسید کے انتقال کے بعد تو حالی ان لوگوں کے مستقبل کے تعلق سے اور بھی مایوس ہوگئے۔ اس دل شکستہ حالی کا انتقال 1914ء میں ہوا۔ سرسید کی قیادت میں جب انھوں نے اپنے نئے کام کا آغاز کیا تھا اُس وقت انھیں کیا پتہ تھا کہ اس کا انجام اتنا تلخ ہوگا۔

مولوی نذیر احمد دہلوی (1831 - 1912) جداگانہ شخصیت کے مالک تھے۔ اُنھیں اس بات پر ناز تھا کہ نوجوان مسلمانوں میں انگریزیت کی خو بو پیدا ہونے لگی ہے۔[45] غالباً ان کی اسی بات سے سرسید اُن سے بے حد متاثر تھے۔ مولوی صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ تعلیم، ادب، سماجی خدمت اور تجارت جیسے مختلف میدانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں انھیں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ تاہم اُنھیں ادب اور خاص طور پر ناولوں کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت ملی۔ بقول سی۔ ایف۔ اینڈریوز C. F. Andrews "وہ انیسویں صدی کے چوٹی کے نثر نگار اور ناول نگار تھے۔ اور اُنھیں دنیا بھر میں اپنی اعلیٰ عربی دانی کی وجہ سے شہرت حاصل تھی"[46] پیدائشی طور پر مولوی صاحب ایک روحانی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ننھیالی اور ددھیالی سلسلوں سے "اُن کی رگوں میں قاضیوں، مفتیوں اور پیروں کا خون رواں دواں تھا"۔[47] نذیر احمد کو اپنے حسب نسب پر بھی اتنا ہی ناز تھا جتنا کہ اپنے علم و فضل پر۔

دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر Mr Taylor اُن لوگوں میں سے ایک تھے جنھوں نے نذیر احمد کی صلاحیتوں کو ان کی زندگی کی ابتدا ہی میں تعمیری موڑ عطا کیا۔ اُن دنوں نذیر احمد کے خسر بھی اسی کالج میں عربی زبان کے پروفیسر ہوا کرتے تھے۔ ٹیلر نے نذیر احمد کو انگریزی زبان سیکھنے کی بہت ترغیب دی لیکن اُن کے والد نے اس کی سخت مخالفت کی۔ نذیر احمد اِس بارے میں اپنی خود نوشت سوانح عمری میں یوں رقمطراز ہیں "وہ کہتے تھے کہ میں یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ میرا لڑکا بھیک مانگے یا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے لیکن مجھے یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے"۔[48] اس کے کئی برس بعد انھوں نے بطور خود انگریزی زبان سیکھی اور اس نئی استعداد کے بل بوتے پر انھوں نے حکومت کے لیے تعزیراتِ ہند اور دیگر سرکاری قوانین اور دستاویزات کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔

نذیر احمد نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا ایک مدرس کی حیثیت سے کی اور کے غدر کے کچھ ہی پہلے نائب ناظر تعلیمات (Deputy Inspector of Schools) بن گئے۔ سپاہیوں کی بغاوت کے دوران انھوں نے ایک انگریز خاتون کی جان بچائی جس کے لیے حکومت نے انھیں بھاری بھرکم انعام سے نوازا۔ جلد ہی انھیں ترقی دے کر پہلے انسپکٹر آف اسکولس پھر تحصیلدار اور چند برس بعد ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا۔ ان کی اس برق رفتار ترقی سے متوجہ ہو کر سر سالار جنگ نے اُنھیں ریاستِ حیدرآباد کی ملازمت میں شامل کر لیا اور وہاں ترقی کرتے ہوئے بالآخر وہ بورڈ آف ریونیو (Board of Revenue) کے رکن بن گئے۔ وظیفے پر علیحدگی کے بعد وہ دہلی میں سکونت پذیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو گئے اور اپنی بقیہ زندگی تقریریں کرنے، ناول لکھنے، نظمیں کہنے، قرآن مجید کا ترجمہ کرنے، روپے کی لین دین کرنے اور مختلف کاروبار چلانے میں صرف کر دی۔

سرسید کے لیے نذیر احمد کی ذات طاقت اور قوت کا خزانہ تھی۔ بطور خاص اُن کی تقریری صلاحیت کے باعث مسلمانوں کا کوئی ایسا جلسہ نہیں ہوتا تھا جہاں نذیر احمد کی مانگ نہ کی جاتی ہو یا جس پر نذیر احمد اپنی سحر بیانی کے اعجاز کی وجہ سے نہ چھا جاتے ہوں۔ لیکن وہ ایک بہت زیادہ مغرور شخص واقع ہوئے تھے ـــــ اُن کے بعض نقادوں نے انھیں "خود نما اور خود سر" شخصیت قرار دیا ہے ـــــ اس لیے وہ عاجزی اور انکساری کے ساتھ سرسید کا اتباع کرنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ ایک بار خود اُنھی نے کہا تھا: "میں سرسید کا قصیدہ خواں نہیں ہوں۔ اگر وہ کوئی روحانی مرشد ہوں تو میں اُن کا مرید نہیں ہوں۔ اگر وہ کوئی استاد ہوں تو میں اُن کا شاگرد نہیں ہوں۔ اگر وہ کوئی امیر اور مالدار شخص ہوں تو میں اُن پر انحصار نہیں رکھتا ..... لیکن ..... میں ایک ایسا شخص ہوں جسے اپنے دوست اور دشمن میں تمیز کرنا آتا ہے۔ جو اپنی قوم کی حالت اور اُس کی ضروریات سے کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہے"[49]۔ نذیر احمد اپنی نجی زندگی میں انتہائی کٹر قسم کے مذہبی انسان تھے جنھیں اپنے اسلامی ورثے پر بے پناہ ناز تھا لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ کسی بھی صورت میں مسلمانوں کو انگریزوں کی وفاداری ترک نہیں کرنا چاہیے۔ برطانوی حکومت کے ہندستان میں دوامی استقلال پر ان کا کامل یقین تھا۔ تبھی تو دوسرا کوئی مسلمان سے اتنا متنفر نہیں تھا جتنے کہ نذیر احمد[50]

نذیر احمد ایک کثیر زا Prolific مصنف واقع ہوئے تھے جن کی کتابوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہے۔ اُن میں سے اکثر تو ناول ہیں لیکن بقیہ کا تعلق علم صرف Morphology، قانون، منطق، اور علم الاساطیر Mythology وغیرہ جیسے مختلف موضوعات کے ساتھ ہے۔ ابن الوقت اُن مشہور ناولوں میں سے ایک ہے جس میں انھوں نے ایک ایسے نوجوان "دیسی" افسر کی زندگی کو نمایاں کیا ہے جو 1857ء کے غدر کے دوران اپنی وفادارانہ خدمات کے باعث سرعت کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہ اپنے عزیز و اقربا کو نظر انداز کرتے ہوئے دن رات یوروپین سوسائٹی میں بسر کرتا ہے لیکن ایک دن جب اُس کے یوروپین دوستوں کو اچانک ہندستان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوڑنا پڑتا ہے تو وہ یکہ و تنہا رہ جاتا ہے جس کی جانب سے سبھی منہ موڑ لیتے ہیں مستقبل میں پیش آنے والے حالات کی گویا یہ ایک الہامی پیشین گوئی تھی لیکن وفا سرشت نذیر احمد نے شاید ہی کبھی یہ سوچا ہوگا کہ بعض اوقات حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ عجیب ہوتی ہیں۔ ایک نقاد کے بموجب اس کہانی میں "خود مصنف ہی کی مبہم اور نامکمل شخصیت جھلکتی ہے[51]"۔ نہ کہ کوئی ایسا کردار جس کی تخلیق انھوں نے کرنی چاہی ہوگی۔ چونکہ وہ خود انگریزوں کے بڑے دلدادہ تھے اور ہمیشہ انھی کی صحبت میں رہنا پسند کرتے تھے اس لیے انگریزوں نے بھی اُن کی بڑی پذیرائی کی اور انھیں "خان بہادر" اور "شمس العلماء" جیسے خطابات سے نوازا۔ ایڈن برگ یونیورسٹی نے انھیں ایل۔ ایل۔ ڈی L.L.D کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی۔

مولوی ذکاء اللہ 1832-1910 نذیر احمد کے بہترین احباب میں سے ایک تھے لیکن مزاج کے اعتبار سے دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آخر الذکر ایک منفرد، خوددار اور کم آمیز اور لیے دیے رہنے والی شخصیت کے مالک تھے جبکہ اول الذکر سادگی، منکسر المزاجی اور خوش خلقی کا ایک حسین مرقع تھے۔ وہ اقتدار کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ شہنشاہیت اور اشرافیت Aristocracy پر تو گویا ان کا ملکوتی ایمان تھا۔ اپنے والد ہی کی طرح، جو بہادر شاہ کے ایک شہزادے کے اتالیق ہوا کرتے تھے، ذکاء اللہ بھی ملکہ وکٹوریہ کی صفات کی قصیدہ خوانی میں ہمیشہ رطب اللسان رہا کرتے تھے[52]۔

تعلیم سے فراغت پاتے ہی ذکاء اللہ نے درس تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ایک معمولی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کر کے بتدریج ترقی کرتے ہوئے بالآخر وہ الہ آباد کے میور سنٹرل کالج Muir Central College میں عربی اور فارسی کی پروفیسری کے عہدے تک پہنچ گئے۔ وہ درس و تدریس کا کام پوری ایمانداری اور لگن کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے طلبا میں بے حد مقبول تھے لیکن اس کے باوجود وہ مختلف موضوعات پر تحریری کام کرنے کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت نکال ہی لیا کرتے تھے۔ سکسینہ کے مطابق "ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، ادب و اخلاقیات، طبیعات، کیمیا اور سیاسیات جیسے موضوعات پر ان کی چھوٹی بڑی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد 143 سے زیادہ ہے[53]"۔ انھوں نے زیادہ تر مدرسوں اور کالجوں کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درسی کتابیں ہی تصنیف کیں لیکن بطور خاص تاریخ کے میدان میں اُن کی بعض کتابوں کو اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔

ذکاء اللہ ایک عظیم مترجم بھی تھے۔ انھوں نے کئی انگریزی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح وہ ایک انتہائی قابل مسودہ نویس Draftsman بھی تھے سرسید نے ان کی مذکورہ دونوں قسم کی صلاحیتوں کو بدرجہ اتم استعمال کیا۔ ذکاء اللہ نے علی گڑھ اسکول کے لیے کئی بار تشہیری مہم بڑی خوبی سے چلائی۔ وہ سرسید کی ٹرانسلیشن سوسائٹی Translation Society کے ایک سرگرم رکن تھے اور یہ پابندی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے لیے قلمی تعاون پیش کیا کرتے تھے۔ وہ اتنی قابلیت رکھتے تھے کہ اُن سے کسی بھی وقت کسی بھی موضوع پر مضمون لکھوایا جاسکتا تھا۔ حالی نے ایک بار اُن کے ذہن کو مشرقی تیل فروش کی دکان سے تشبیہ دی تھی جہاں ہر وقت ہر شئے خریدی جاسکتی ہے۔ اس بسیار نویسی کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تحریروں کا معیار بعض وقت متاثر ہو گیا۔ لیکن سرسید کے لیے اُن کی یہی مخصوص صلاحیت بے حد مفید ثابت ہوئی جس کا استعمال کر کے انھوں نے اپنے افکار و نظریات کی بھرپور تشہیر کی۔ ذکاء اللہ میں چونکہ ہیرو پرستی کی صفات بدرجہ اتم موجود تھیں اس لیے انھیں اپنی اشتہار بازی کے لیے اُن سے زیادہ موزوں شاید ہی کوئی اور شخص ہمدست ہوتا۔ بقول اینڈریوز Andrews - "اس امر میں کوئی کلام ہی نہیں تھا کہ منشی ذکاء اللہ کے سب سے بڑے زندہ ہیرو سرسید ہی تھے۔ ان کے دیوان خانے میں سرسید کی شبیہہ مرکزی مقام پر آویزاں تھی۔ سرسید کی خود تصنیف کردہ اور ان کے ہاتھوں میں نظر آتی تھیں۔ وہ ہمیشہ سرسید کا تذکرہ بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ وہ اکثر ان کی تقریریں مجھے پڑھنے کے لیے دیا کرتے تھے اور ان کے بارے میں میری رائے جاننے کی کوشش کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کے خیال میں ان تقاریر میں ہندستان کے مسلمانوں کی ترقی کے واحد سیدھے راستے کا سراغ ملتا ہے۔"[54]

اپنے کردار کے اسی وصف کے باعث تاج برطانیہ کے ساتھ ان کے وفاداری اس حد تک جذباتی ہو گئی تھی کہ وہ کانگریس کی سرگرمیوں کو خوفزدہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں ہندستان سے بے حد عشق تھا اور وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندو تہذیب کو بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کی اس بات کے لیے برائی بھی کرتے تھے کہ ان میں اپنے ملک کے لیے محبت اور احترام کی بے حد کمی ہے۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا "دوسرے ملکوں میں بسنے والے اپنے ہم مذہب بھائیوں کے ساتھ ہمیں بے شک خلوص کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور اُن کی خوشی اور غم کو اپنی خوشی اور غم سمجھنا چاہیے لیکن دل کی اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ ہمیں اپنے ملک سے محبت بھی تو کرنا چاہیے اور اُن لوگوں کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو اپنی مذہبی امیدوں اور ان کی تکمیل کے لیے ہمیشہ بیرونِ ہند دیکھنا چاہیے"۔[55] گو ذکاء اللہ نے ہندوؤں کے احترام میں کبھی فرق آنے نہیں دیا لیکن آخر وقت تک کہتے رہے کہ "دونوں قوموں میں اتنا زیادہ فرق پایا جاتا ہے کہ ان کے مابین دلی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا" لہٰذا " ہمیں ہمیشہ ہی ایک ایسی طاقت کی ضرورت لاحق رہے گی جو دونوں میں توازن برقرار رکھ سکے"۔[56]

سرسید کے رفقائے کار میں سیاسی اعتبار سے جو شخص سب سے کم قدامت پرست تھا وہ ان سب میں کم عمر شبلی نعمانی (1857-1914) کی ذات تھی۔ انگریزوں کے اقتدار کا احترام کرنے کے باوجود شبلی کو ان پر اعتماد نہیں تھا۔ ہندستان کے لیے ان کے دل میں پائی جانے والی محبت میں اتنی ہی صدق دلی شامل تھی جتنی کہ اسلام کے لیے پائی جانے والی ان کی محبت میں۔ بیرونی چیزوں سے انھیں جبلی طور پر ایک قسم کی نفرت تھی۔ مزید برآں مصر، ترکی اور افغانستان جیسے اسلامی ممالک کے ساتھ برطانیہ نے جس قسم کا رویہ اختیار کر رکھا تھا اُس سے وہ بہت شاکی تھے۔ انھیں شبہ تھا کہ اسلام کے تعلق سے برطانیہ کی نیت پاک نہیں ہے۔[57]

ابھی بچے ہی تھے کہ شبلی مولانا فاروق چریاکوٹی جیسے مشہور و معروف عالمِ دین کے زیرِ اثر آ گئے۔ انھوں نے ان بزرگ سے نہ صرف قرآن، حدیث اور معقولات کا درس لیا بلکہ عربی اور فارسی کی کلاسیکی کتب بھی انھی سے سیکھیں۔[58] انیس برس کی عمر میں اسلامی تعلیمات سے مکمل فراغت حاصل کرنے کے بعد شبلی نے مکہ کا قصد کیا اور حجِ بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ واپسی کے فوری بعد تو نہیں البتہ چند برسوں بعد وہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہاں آ کر وہ سرسید سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قریب ہو گئے۔ چونکہ وہ سرسید کے پڑوس ہی میں فروکش تھے لہٰذا انھیں روزانہ ان سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا۔ شبلی سرسید کے اُس کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو وہ مسلمانوں کے لیے انجام دے رہے تھے لیکن وہ سرسید کے مذہبی طرزِ فکر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شبلی نے آرنلڈ سے تاریخی تحقیق اور جدید تنقید کے اصولوں کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ چنانچہ وہ آرنلڈ کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ یہ باتیں اس وقت شبلی کے بہت کام آئیں جب وہ اسلام کے تاریخی واقعات اور اس مذہب کے مایہ ناز پیوتوں کے بارے میں لکھنے میں مصروف تھے۔

اگرچہ شبلی کو جنون کی حد تک اسلام سے لگاؤ تھا، تاہم اپنی نگارشات میں انھوں نے حقیقت پسندی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کا بس چلتا تو وہ برطانوی راج کی جگہ بدترین قسم کی مسلم حکومت کو ترجیح دینے لگتے لیکن وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اب کسی مسلم حکومت کا تصور ممکن نہیں ہے۔ ایسی خوش خیالیوں میں زندگی گنوانا اُن کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے انگریزوں کے زیرِ سایہ مسلمانوں کو منظم کرنے کے کام میں سرسید کی بھرپور مدد کی۔ انھوں نے اس بارے میں علماء کے رویّے کی تنقید بھی کی اور ان کے مزاحم ہونے پر انھیں بہت کچھ لعن طعن بھی کیا۔ اُنھیں اس امر کا احساس تھا کہ خواہ موجودہ طور طریقے کتنے ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں اگر ہم ہندستان میں اسلام کو دوبارہ زندگی دینا چاہتے ہیں تو ہمیں انھیں طریقوں کو لامحالہ استعمال کرنا پڑے گا۔ کئی برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد شبلی کئی علماء کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو پائے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ آئے ہیں، ندوۃ العلماء کے قیام میں انھوں نے بہت اہم کردار انجام دیا ہے جو آگے چل کر علمائے اسلام کے لیے ایک نئے رجحان کا مرکز بن گیا۔

1898ء میں سرسید کے انتقال کے بعد شبلی نے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اس کے دو ایک سال بعد اپنے دوست سید علی بلگرامی کی دعوت پر حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ وہاں انھوں نے چار سال تک نظام کی حکومت کے محکمۂ تعلیم کی تنظیم نو میں صرف کیے اور ساتھ ہی ساتھ مشہور و معروف سلسلۂ الصفیہ کے لیے کام کرتے رہے۔ نظام کی سلطنت سے واپس لوٹنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر شبلی اعظم گڑھ میں سکونت پذیر ہو گئے اور پورے انہماک کے ساتھ تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ یہیں انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق سیرت النبی کے علاوہ دیگر کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ اعظم گڑھ ہی میں انھوں نے "دار التکمیل" قایم کیا جہاں وہ مسلم طلبار کو اعلیٰ مطالعے اور اسلامی تحقیق کی تربیت دیا کرتے تھے۔ زندگی بھر شبلی کو بس یہی دُھن سوار رہی کہ وہ مسلمانوں کو بتلا سکیں کہ اسلام کی حقیقی عظمت کیا ہے اور اس مذہب نے انسانی تاریخ میں کتنا زبردست کردار انجام دیا ہے۔

یہی باتیں بعد ازاں علی گڑھ تحریک سے اُن کے انحراف کا باعث بنیں۔ اس تحریک کا قاید اپنی ہر بات کو انگریزوں کی مرضی کے تابع کر دیا کرتا تھا یہ بات انھیں سخت ناپسند تھی۔ اس کے علاوہ اُن کا خیال تھا کہ اپسی بھلائی کے کاموں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ رہنا چاہیے۔ اسی وجہ سے انھوں نے لارڈ منٹو کے حضور باریابی حاصل کرنے والے مسلم وفد کے ساتھ کسی قسم کا سروکار رکھنے سے انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے انھوں نے مسلم لیگ کے تعلق سے بھی کبھی کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ "جو دن رات بس یہی راگ الاپتی رہتی تھی کہ مسلمانوں پر ہندوؤں نے زیادتیاں کی ہیں لہٰذا انھیں تحفظات دیے جانے چاہئیں"۔ یہ سوال کرتے ہوئے کہ آیا اسی کا نام سیاست ہے وہ کہتے ہیں: "سیاست کے معنی تو یہ ہیں کہ حاکم و محکوم اس کے ذریعے باہمی تعلقات کا تعین کریں نہ کہ غلام اپنے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو لے کر ایکدوسرے سے لڑتے رہیں"۔ سرسید نے ہندستانی سیاست میں جس قسم کا کردار نبھایا ہے اُس کے بارے میں اپنے افسوس کا اظہار کرنے میں بھی انھوں نے کوئی جھجھک محسوس نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ قدرت تو یہ چاہتی تھی کہ سرسید تمام ہندستان کی رہنمائی کریں نہ کہ محض ایک گروہ کی[62]

1857ء کے غدر کے فوری بعد اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی مرحلے میں سرسید کو مولوی محمد سمیع اللہ خاں 1834-1908 جیسے قابلِ اعتماد رفیقِ کار کا تعاون حاصل ہوا۔ علی گڑھ کے سب جج 1868-1876 ہونے کے باعث وہاں ایم۔اے۔او۔ کالج کے قیام کے سلسلے میں انھوں نے سرسید کی بہت مدد کی[63]۔ سرسید کے دیگر کئی رفقار کار کی طرح سمیع اللہ بھی ترکی النسل تھے۔ اُن کے ایک سوانح نگار کے بموجب ان کا سلسلۂ نسب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

راست آنحضرت صلعم کے داماد حضرت علیؓ سے جا ملتا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ بھی اُن کے دیرینہ مراسم تھے کیونکہ اُن کے والد جنرل آکٹرلونی General Ochterlony کے نائب تھے جن کا شمار ہندستانی ریاستوں میں بھیجے جانے والے اوّلین سفراء Agents میں ہوتا ہے۔

دہلی کے سرکردہ مولویوں کی زیرِ نگرانی اسلامی تعلیم و تربیت سے فراغت حاصل کر چکنے کے بعد سمیع اللہ چند دنوں تک وکالت کرتے رہے۔ بعد ازاں یو۔پی کے ایک ضلع میں اُن کا تقرر ماتحت جج کی حیثیت سے عمل میں آگیا۔ جلد ہی اپنے عدالتی فیصلوں کی بنا پر انھیں کافی شہرت حاصل ہوگئی۔ ایک بار تو شمال مغربی صوبجات کے ہائی کورٹ نے مقامی حکومت کو لکھا کہ "مولوی صاحب شمال مغربی صوبجات کی عدلیہ کے ایک انتہائی قابل ترین مستعد اور فرض شناس عہدیدار ہیں"۔[64] 1864ء میں انھیں لارڈ نارتھ بروک Lord Northbrook کے عملے میں شامل کر کے مصر بھیجا گیا جہاں وہ برطانوی حکام کے لیے نہایت کارآمد شخصیت ثابت ہوئے۔ وہاں سے واپسی پر انھیں ڈسٹرکٹ جج اور بعد ازاں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مقرر کیا گیا۔ 1872ء میں انھوں نے سرکاری ملازمت سے قبل از وقت وظیفہ حاصل کر لیا اور اپنی باقی زندگی بھر مسلمانوں کی بھلائی کے کام کرتے رہے۔ اُن کی قبل از وقت وظیفے کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے لفٹیننٹ گورنر نے لکھا تھا: "میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اتنی جلد ملازمت سے سبکدوش ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، لیکن آپ نے برس ہا برس کی معزز خدمات کے ذریعے آرام اور سکون حاصل کرنے کا استحقاق پیدا کر لیا ہے"۔[65]

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو عام کرنے کے سلسلے میں سمیع اللہ نے سرسید کی بڑی مدد کی۔ رپن نے ایک دفعہ سمیع اللہ کو "سید احمد کا دست راست" قرار دیا۔ تاہم ان دونوں کے مابین دوستی زیادہ دنوں تک نہیں نبھ سکی۔ سمیع اللہ کے مشرق وسطیٰ سے واپس لوٹتے ہی اس دوستی کا خاتمہ ہوگیا، مولانا حالی نے حیات جاوید میں اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سمیع اللہ کو محسوس ہوا کہ سرسید نے ایم اے او کالج کے معاملات میں بیک اور مورسن کو بہت زیادہ کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ چنانچہ اسی مسئلے پر دونوں حضرات برسوں تک کالج کی مجلس انتظامیہ کے جلسوں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایکدوسرے سے جھگڑتے رہے۔ پہلے پہل تو سرسید سمیع اللہ کو سمجھا کنا کر راضی کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جب انھوں نے اس امر کا مطالبہ کیا کہ بیک کے اختیارات کو محدود کر دیا جائے تو سرسید نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ سمیع اللہ نے فوراً کالج سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے اور سرسید سے تمام معاملات ختم کر ڈالے اور اپنی زندگی کے بقیہ سال الہ آباد میں محمڈن ہاسٹل کے قیام اور اس کے استحکام میں صرف کر دیے۔ سرسید نے محسوس کیا کہ اس ہاسٹل کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ شمال مغربی علی گڑھ کے مسلم طلباء کو ورغلا کر اپنی جانب راغب کیا جائے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے دونوں رہنماؤں کے تعلقات میں مزید کشیدگی پیدا ہو گئی۔"

اپنے روزمرہ کے کاموں میں سرسید کو اپنے باصلاحیت فرزند سید محمود 1850-1903 سے بے انتہا مدد ملا کرتی تھی جو بتیس سال ہی کی عمر میں ایک ہندستانی ہائی کورٹ کے پہلے مسلمان جج مقرر ہوئے تھے۔ عدالت العالیہ میں جلد ہی انھوں نے اتنی نیک نامی اور شہرت حاصل کی کہ پورے ہندستان میں صرف مدراس کے سر متو سوامی ایئر Sir Mutu Swami Ayyar ہی ایک ایسے شخص تھے جو اُن کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ سر ویٹلے اسٹوکس Sir Whitley Stokes کے کہنے کے مطابق انڈین لا رپورٹس Indian Law Reports کے پورے سلسلے میں کوئی فیصلے مواد کے اعتبار سے اتنے وزنی اور پیش کشی کے اعتبار سے اتنے دلآویز نہیں ہوئے تھے جتنے کہ ان دونوں جج صاحبان کے فیصلے۔ اُن لطیف اقوام کے لیے جو ایسے ماہرینِ قانون کو جنم دیتی ہوں نہ تو کوئی قانونی اصول اتنا اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے اور نہ کوئی قانونی نظام اتنا پُر پیچ کہ یہ تو بیں اس کے معیار پر پوری نہ اُتر سکیں۔"[67]

سید محمود نے اپنی ابتدائی تعلیم دہلی اور بنارس کے کوئینس کالج (Queens College) میں حاصل کی۔ 1869ء میں ان کا انتخاب اعلیٰ تعلیم کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے عمل میں آیا اور وہ اپنے نامی گرامی والد کی معیت میں انگلستان پہنچے اور کرائیسٹ کالج کیمبرج میں داخلہ لے لیا۔ 1872ء میں انھوں نے بیرسٹری کی تعلیم مکمل کی۔ ہندستان لوٹنے کے بعد وہ چند روز تک الہ آباد میں وکالت کرتے رہے۔ 1879ء میں وہ رائے بریلی کے ڈسٹرکٹ جج مقرر ہوئے۔ تین سال بعد انھیں شمال مغربی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صوبہ جات کی ہائیکورٹ کا منصرم جج مقرر کیا گیا اور چند دنوں بعد اُسی خدمت پر انھیں مستقلاً مامور کر دیا گیا۔ لیکن چند برسوں بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ سید محمود نے اس قسم کا سنگین فیصلہ کیوں کیا۔ لیکن ان دنوں اس قسم کی افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ شمال مغربی صوبجات کی عدالت العالیہ کے چیف جسٹس اور بعض دیگر یوروپین ججوں نے اُن پر ایسا کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جس کی وجہ ذاتی قسم کا شک و شبہ بتلائی جاتی ہے۔[68]

اس بدبختانہ سبکدوشی نے سید محمود پر بُرا اثر ڈالا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف اُن کی قانونی شہرت ہی متاثر ہوئی جسے انھوں نے اتنی جانفشانی سے حاصل کیا تھا بلکہ زندگی کے آخری مراحل میں انھیں بڑی مالی دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اگرچہ وہ لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے لیکن پھر اس پیشے میں ان کا جی نہیں لگا۔ ان کے "شیطان" DR Satish chandra Banerjee ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی Devil کے کہنے کے مطابق "اُن کی عادات میں کوئی پابندی برقرار نہیں رہی۔ وہ مسلسل محنت کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھے اور رفتہ رفتہ اُن کے موکلوں کی تعداد کم ہوتی گئی"۔[69] اسی طرح وہ بعد ازاں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی بھی زیادہ خدمت نہ کر سکے۔ حالانکہ اُن کی دلچسپی کالج کے معاملات میں برقرار رہی اور وہ کالج کی مجلس انتظامیہ کے صدر بھی چُنے گئے۔ اگرچہ انھیں بعد ازاں شمال مغربی صوبجات کی مجلس مقننہ کے لیے رکن کی حیثیت سے نامزد بھی کیا گیا تھا لیکن ہائی کورٹ کے واقعے کے بعد ان کی پُرانی امنگیں اور رجولانیاں جاتی رہی تھیں۔ اُن کے انتقال کے بعد کئی لوگوں نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا لیکن ذیل میں وہ الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جو سر تیج بہادر سپرو نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے استعمال کیے جو اگرچہ جذبات سے مغلوب ہو کر ادا کیے گئے تھے لیکن ان میں ممدوح کی شخصیت کی سچی عکاسی کی گئی ہے۔

> اپنی عام تہذیب کی وجہ سے وہ نہ صرف سماج کی ایک پسندیدہ شخصیت بن گئے تھے بلکہ اسی کی وجہ سے اُن کے قانونی بیانات میں بھی یک گونہ شگفتگی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کا عمیق اور ہمہ جہتی قانونی مطالعہ، ان کی تقریری صلاحیت اکثر اوقات سامعین کو گرما دیتی تھی، ان کی بھاری بھرکم عقلِ سلیم، ان کی آزاد انفرادیت جو ہر اُس موقعے پر نمودار ہوئی جب اُس کی ضرورت تھی، اُن کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی ناقابلِ گرفت دیانت داری، اُن کے افکار و نظریات کی وسعت اور غریبوں اور مظلوموں کے لیے اُن کی ہمدردیاں۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جن کے باعث اُن کے ہم پیشہ افراد نے انھیں سراہا، جنھوں نے ان کی تعظیم کی اور عوام نے ان پر اپنے بھرپور اعتماد کا مظاہرہ کیا۔[70]

سیاسی معاملات میں وہ بالکل اپنے والد کے ہم خیال تھے۔ انھوں نے سیاسی اور عوامی امور کی انجام دہی میں بیک اور مورینسن کی طرح ہمیشہ سرسید کے ساتھ مل کر کام کیا۔[71] تاہم، بقول ڈاکٹر بنرجی زندگی کے آخری برسوں میں کانگریس کے تعلق سے اُن کا جارحانہ رویہ ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر بنرجی نے لکھا: "میرے پاس یہ کہنے کی معقول وجوہات موجود ہیں کہ اگر مسٹر سریندر ناتھ بنرجی اور مسٹر اے۔ ایم۔ بوس نے اُن سے مناسب ڈھنگ سے کہا ہوتا تو انھوں نے اس قومی تنظیم (کانگریس) کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرنے سے اتفاق کر لیا ہوتا۔ ایک بار انھوں نے اس بارے میں لکھنؤ میں مجھ سے سنجیدگی سے کہا بھی تھا کہ انھیں اس تحریک سے ہمدردی ہے اور یہ کہ انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں منظور شدہ کئی قراردادیں اُن کے لیے قابلِ قبول ہیں۔"[72] لیکن اس ضمن میں ان کے "شیطان" کے ان الفاظ کے علاوہ دوسرا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اگر واقعی سید محمود میں ایسی کوئی انقلابی تبدیلی آگئی تھی تو یقیناً وہ اس شکایت کی وجہ سے ہوگی جو انھیں یوروپین ججوں کے خلاف پیدا ہو گئی تھی جنھوں نے عدلیہ کے میدان میں اُن کے درخشاں مستقبل کو اُس وقت تاریک کر دیا جب وہ سُرعت کے ساتھ پروان چڑھنے لگا تھا۔ زندگی کے باقی دن اُنھوں نے ہزیمت خوردہ احساس محرومی کے ساتھ گزارے اور ایک شکستہ انسان کی طرح ان کی زندگی کی تلخیوں کا خاتمہ ہوا۔

1899ء میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے پرنسپل بیک کی وفات کے بعد تھیوڈور مورینسن Theodore Morison کے علاوہ جنھوں نے اوّل الذکر کی جانشینی سنبھالی، کسی اور غیر مسلم نے مسلم سیاست پر اتنا زیادہ اثر نہیں ڈالا۔ ان کا تعلق کالج کے ساتھ صرف 1905ء تک قایم رہا جس کے بعد انھوں نے کئی اہم عہدے سنبھالے۔[73] 1936ء میں اُن کے انتقال پر دی ٹائمز The Times نے لکھا تھا: "لیکن وہ زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کی حیات و احساسات کے مستند ترین ترجمان کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔ اُن کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شمار، بلاشبہ ہندستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے اہم ترین معماروں میں ہوتا ہے[74]۔ گو ۱۸۸۳ء میں کالج کی پروفیسری پر رجوع ہوتے ہی موریسن، سرسید کے نہایت قریب ہوگئے تھے لیکن آخرالذکر کی وفات کے بعد ہی انھیں مسلم سیاست پر غلبہ حاصل ہوا۔ بیک کی اچانک وفات کے بعد تمام ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر آن پڑیں اور اگلے چھے برس کی نازک مدت میں وہ اپنی مرضی کے مطابق علی گڑھ تحریک کی قیادت کرتے رہے۔ محسن الملک پر ان کا خاصا اثر تھا اور نواب صاحب بہ رضا و رغبت ہر اُس کام کو انجام دینے پر آمادہ ہوجاتے تھے جس کے کرنے کا مشورہ انھیں موریسن کی جانب سے ملتا تھا۔

موریسن انگلستان کے ایک نامور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دو اجداد اور والد کا تذکرہ قومی سوانح کی لغت Dictionary of National Biography میں ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی تعلیم ویسٹ منسٹر Westminster اور ٹرینٹی کالج کیمبرج Trinity College Cambridge میں کمل کی جہاں انھوں نے کلاسیکس classics میں بدرجہ دوم ٹرائی پوس Tripos کیا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد موریسن وسطی ہندستان کے دو نابالغ حکمران شہزادوں کے اتالیق کی حیثیت سے بندیل کھنڈ Bundelkhand میں واقع نوگانگ Nowgong چلے گئے جہاں چھترپور اور چرکھاری کے نوعمر مہاراجاؤں نے اُن کے آگے زانوے ادب تہہ کیا۔ ۱۸۸۹ء میں ایم۔اے۔او۔ کالج کے تدریسی عملے میں شامل ہوگئے۔ وہ ۱۹۰۵ء تک اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ اسی دوران کرزن نے اپنی مجلس مقننہ کے رکن کی حیثیت سے انھیں نامزد کر دیا۔

اپنی انگلستان واپسی پر موریسن نے برطانوی عوام کے روبرو مسلمانوں کے مفادات کی ترجمانی کی۔ اس ضمن میں انھوں نے متعدد تقریریں کیں اور پریس کے لیے مضامین بھی قلمبند کیے۔ اُن کی اِن بروقت مساعی کا اچھا خاصا اثر مترتب ہوا، خاص طور پر پارلیمانی حلقوں پر۔ کیوں کہ اُن دنوں دستوری اصلاحات کے موضوع پر منٹو مورلے مذاکرات چل رہے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں لارڈ مورلے نے، جو موریسن کو بچپن ہی سے جانتے تھے، انھیں انڈیا کونسل کا رکن بنا دیا۔ انڈیا آفس میں اپنی نشست سنبھالتے ہی موریسن نے بقول دی ٹائمز "اس ناپسندیدہ مشورے پر زور دینا شروع کر دیا کہ مجوزہ سیاسی اصلاحات کا نفاذ کرتے وقت مسلم اقلیت کا جس نے لارڈ منٹو سے بھی یہی درخواست کی تھی، تحفظ کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے، اس مقصد کے پیشِ نظر ان کے نمایندوں کا انتخاب مسلمانوں کے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب میں سے کیا جائے اور یہ کہ انھیں ان کی آبادی کے عام تناسب کی بہ نسبت انھیں زیادہ تعداد میں نشستیں دی جائیں۔ سر کرشنا گپتا کا اس تجویز کے خلاف کونسل کو مشورہ دینا ایک فطری امر تھا۔ چنانچہ اس مسئلے پر کونسل میں شدید اختلاف رائے پیدا ہوگیا اور اگر لارڈ مورلے اپنے فیصلہ کن ووٹ Casting Vote کے ذریعے اسے نہ رکواتے تو مورلین کی سفارش کو بالآخر قبول کر ہی لیا جاتا۔ گپتا نے حزبِ مخالف کی زوردار قیادت کی اور بالآخر مورلیسن کو اپنی تجویز سے دست بردار ہونا پڑا لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ اب کہیں جاکر یہ بات اُن کی اچھی طرح سمجھ میں آئی ہے کہ کیوں کرام ویل Cromwell کو اپنے مشیروں کو خاموش کرنا پڑا تھا۔"

یہاں پہنچ کر ہمیں علی گڑھ تحریک کے اُن رہنماؤں کا تذکرہ ختم کر دینا چاہیے جو سرسیّد کے ساتھ اپنی قریبی رفاقت کے باعث کم از کم زیرِ تحقیق مدت کے دوران مسلم سیاست پر چھائے رہے[76]۔ اِن قایدین نے کسی اور کی قیادت کو اُبھرنے ہی نہیں دیا اور کم از کم شمال مغربی ہندستان میں یہی قیادت مسلم سیاست پر غالب رہی۔ سرسیّد کی وفات کے بعد بھی ان صوبوں میں، جو ہندستان میں اسلامی تہذیب اور نشاۃِ ثانیہ کے مراکز تھے، اُنھی کا اثر غالب رہا۔ اسی وجہ سے سرسیّد اور اُن کے رفقاء کا سیاسی کردار مسلمانوں کے امور میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اس ضمن میں اُنھیں نہ صرف مسلمان امراء اور دانشوروں ہی کی جانب سے فعال قسم کا اشتراکِ عمل حاصل ہوا بلکہ سرجان اسٹریچی اور سر آکلینڈ کولون جیسے برطانوی عہدیداروں کی خاصی استعانت بھی انھیں حاصل رہی۔ دراصل تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں کے ساتھ کسی اور صوبے کی حکومت اتنا ہمدردانہ اور اچھا برتاؤ نہیں کر رہی تھی جتنا کہ شمال مغربی صوبہ جات کی حکومت۔ وہاں کے لفٹیننٹ گورنر سر آکلینڈ نے اپنی سبکدوشی کے موقعے پر اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی تھی،

> جیسا کہ آپ واقف ہیں ہر صوبائی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ بعض مستحق اور سرکردہ حضرات کی عزت افزائی کے لیے وایسرائے کی خدمت میں سفارش بھی بھیجے کرے۔ اُسے ہر سال ایک مخصوص تعداد میں ڈپٹی کلکٹروں اور تحصیلداروں کے تقرر کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے۔ ان صوبجات متحدہ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گذشتہ پانچ برسوں کے دوران اِن اختیارات کو کس طرح استعمال کیا گیا؟ جملہ اٹھائیس اٹھائیس افراد کو خطابات سے نوازا گیا جن میں چودہ مسلمان تھے اور چودہ ہندو۔ حکومت نے چھبیس لوگوں کو ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے مقرر کیا جن میں سے سولہ ہندو تھے اور دس مسلمان۔ پندرہ افراد کو تحصیلداری عطا کی گئی جن میں سے نو مسلمان اور چھ ہندو تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اِن صوبوں میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے لہذا تقررات بھی آبادی کے تناسب ہی کے لحاظ سے کیے جانے چاہئیں اور اعزازات بھی اسی طرح دیے جانے چاہئیں لیکن اگر ہم آبادی کے کاشتکاری کرنے والے بڑے حصے کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اُسی طبقے کو ملحوظِ خاطر رکھیں جس کا ان امور میں لحاظ رکھا جاتا ہے تو یہ تفاوت کم و بیش مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔[77]

سر آکلینڈ کے جانشین سر اینٹی میکڈونل کو مسلمانوں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں دیکھ آئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پیشرو کی پالیسی کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ لیکن مذکورہ پالیسی اس عمدگی کے ساتھ نافذ العمل ہو چکی تھی کہ ایک بار سر اینٹی کو علی الاعلان اس امر کا اعتراف کرنا پڑا کہ اگرچہ وہ شخصی طور پر اس پالیسی سے خوش نہیں ہیں تاہم اُسے تبدیل کرنا ان کے لیے مناسب نہ ہوگا۔[78]

تاہم دیگر صوبہ جات میں مسلمانوں کی حالت اور زیادہ ابتر تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا توں توں ان کی حالت مزید بگڑتی گئی۔ اس صورتِ حال کی بدترین مثال بنگال کا صوبہ تھا جہاں ہندستان کی جملہ مسلم آبادی کی ایک تہائی تعداد آباد تھی۔ اس صوبے میں مسلمانوں کو نہ تو تعلیمی میدان میں اور نہ ہی ملازمتوں کے میدان میں ان کا جائز حصہ دیا گیا تھا۔[79] کئی شعبوں میں اُس وقت بھی صورتِ حال ویسی ہی ابتر تھی جیسی کہ 1872ء میں اُس وقت ہوا کرتی تھی جب ہنٹر Hunter نے برطانوی حکومت کے بارے میں اپنی یادگار تحریر Indictment کی تھی۔ ہندو ہر میدان میں ترقی پر تھے جبکہ مسلمانوں کی حالت انحطاط پذیر تھی۔ یہ صورتِ حال صرف سرکاری ملازمتوں ہی کی حد تک محدود نہیں تھی بلکہ یہی حالت پریس، بلدیہ جاتی اور تعلیمی اداروں کی بھی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں میں خال خال بیداری کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے لیکن یہ اثرات ابھی اتنے قوی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہوئے تھے کہ جن کی وجہ سے مسلمانوں کو اُن کی پسماندگی سے نجات حاصل ہو جاتی۔ علاوہ اس کے بنگال کی مسلم قیادت میں نہ تو کسی معاملے میں ہمت کر کے پہل کرنے کی صلاحیت موجود تھی اور نہ نگاہ کی دور رسی۔ حد سے زیادہ نازک صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اُن میں مطلق نہیں تھی۔ نواب عبداللطیف اور سید امیر علی ہی دو آشنائی شخصیتیں تھیں جنھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو منظم کرنے اور زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے انتھک جدوجہد کی۔ لیکن سرسید کی طرح اِن دونوں بزرگوں میں سے کوئی ایک بھی خود کو قوم کے لیے ہمہ وقتی طور پر وقف نہ کر سکا۔ انھوں نے انجمنیں قایم کیں، دھواں دھار تقریریں کیں اور کتابچے اور پمفلٹ تحریر کیے لیکن ایسے جاں نثار پیدا کرنے میں ناکام رہے جو اس کام کو جاری رکھتے۔ اُن کا حال اُس ڈرپ فوج کی طرح تھا جس کا ہر شخص جنرل بنا ہوا تھا اور جس میں ایک بھی سپاہی موجود نہیں تھا۔

عبداللطیف 1828 - 1893 اپنا ناطہ عظیم عرب جنگجو خالد بن لطیف سے جوڑتے تھے جن کے ایک عزیز شاہ عظیم الدین مکّے سے ہجرت کر کے ہندستان میں مغل سلطنت کے آخری ایّام میں پہنچے۔ وہ شہنشاہ کی سرپرستی میں دہلی ہی میں سکونت پذیر ہو گئے جہاں اُنھیں علم و فضل اور خدا ترسی کی وجہ سے جلد ہی شہرت نصیب ہو گئی بعد ازاں شاہ عظیم الدین کے ایک فرزند کا تقرر مشرقی بنگال میں منصفی کے عہدے پر کیا گیا۔ اس واقعے کے کئی دہوں Decades بعد اُن کا پڑپوتا (great grand-son) کلکتہ پہنچا اور قدیم صدر دیوانی عدالت میں وکالت شروع کی۔ عبداللطیف اُسی کے دوسرے لڑکے تھے۔

لطیف نے اپنی ابتدائی تعلیم کلکتے کے مدرسے میں حاصل کی جہاں انھوں نے اپنے والدین اور اقربا کی مرضی کے خلاف انگریزی بھی سیکھی۔ انگریزی زبان کا سیکھنا اُن دنوں مسلمانوں میں گناہ سمجھا جاتا تھا اس لیے عبداللطیف کو اپنی قوم کے اس انگریزی مخالف رویّے کے خلاف زبردست جنگ کرنی پڑی[50]۔ تاہم بعض برطانوی عہدیداروں نے اُن کی کافی ہمت افزائی کی اور حکومت نے بھی انھیں تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظیفہ عطا کیا۔

اپنی تعلیم کی تکمیل کرتے ہی عبداللطیف امیر سندھ کے پرائیویٹ سیکرٹری بن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئے۔ بعدازاں انھوں نے ڈھاکہ کے کالجیٹ اسکول میں معلمی قبول کرلی جہاں سے چند برس بعد اُن کا تبادلہ کلکتہ کے مدرسہ پر اینگلو عربک پروفیسر کی حیثیت سے کر دیا گیا۔ 1849ء میں وہ ماتحت عاطانہ سروس Subordinate Executive میں شامل ہو گئے جہاں عہدہ بہ عہدہ ترقی کرتے ہوئے بالآخر وہ پریسیڈنسی مجسٹریٹ Presidency Magistrate کے عہدے تک پہنچ گئے۔ وہ 1867ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے دریں اثنا انھیں بنگال کی مجلس مقننہ کے اصلی Original ارکان میں سے ایک رکن کی حیثیت سے نامزد کیا گیا اور 1870ء میں انھیں از سرِ نو اسی عہدے پر نامزد کیا گیا اور 1872ء میں مزید ایک بار ان کی نامزدگی اسی عہدے پر عمل میں آئی۔ حکومت کی وفادارانہ خدمات کے صلے میں انھیں جے۔ پی J P بنایا گیا اور بعدازاں اُنھیں خان بہادر، نواب اور سی۔ آئی۔ ای C I E کے اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ پریسیڈنسی کالج کے بانیوں میں سے ایک تھے اور کئی برسوں تک انھیں کلکتہ یونیورسٹی کا فیلو Fellow رہنے کا شرف حاصل رہا۔

بنگال کے مسلمانوں میں انگریزی کی ترویج کا سہرہ عبداللطیف ہی کے سر بندھتا ہے کیونکہ اُنھی کی کوششوں کی وجہ سے یہ زبان اُن کے ہم مذہب سربرآوردہ احباب کی منظورِ نظر بن سکی۔ ویسے تو اس کام میں ان کی راہ میں مختلف دشواریاں حائل ہوئیں لیکن مشکلات کی پرواہ کیے بغیر وہ لٹریری سوسائٹی Literary Society کی معرفت جسے انھوں نے اسی مقصد کے تحت قایم کیا تھا اپنے کام میں مشغول ہو گئے اس کے علاوہ انھوں نے کئی ایسے وظیفے بھی قایم کیے جو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے متمنی غریب مسلم طلباء کو دیئے جاتے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے طور پر ایک راسخ العقیدہ Orthodox مسلمان تھے لیکن انگریزوں کے ساتھ آزادانہ اختلاط رکھتے تھے۔ اور ان کی دوستی پر فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ وہ اُن ابتدائی مسلمانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے جہاد کے نظریے کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ نظریہ جدید ارتقا Modern Progress کی راہ میں روڑا Brake اٹکاتا ہے۔ لطیف کو کانگریس کے نظریات سے بھی شدید اختلاف تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تحریک اُس سیاسی توازن کو درہم برہم کر کے رکھ دے گی جو بڑی محنتوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے انگریز حکومت مختلف قوموں اور فرقوں کے مابین بڑی عمدگی اور انصاف کے ساتھ قایم کر پائی ہے۔ چنانچہ سرسید کی طرح انھوں نے بھی اپنی قوم کو کانگریس کے خلاف متنبہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ہمیشہ مسلمانوں کو تلقین کرتے رہے کہ سیاسی بکھیڑوں میں پڑنے کی بجائے بہتر ہوگا اگر مسلمان اپنی تمام تر توجہات کو انگریزی زبان کی تحصیل پر مرکوز کر دیں۔ آخر وقت تک برطانوی اقتدار کے دوام مطلق پر اُن کو یقینِ کامل رہا۔ اُن کا خیال تھا کہ انگریزوں سے زیادہ بہتر اور غیر جانبدار دوسری اور کوئی حکومت ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا ہمیشہ انھوں نے اپنے ہم مذہبوں پر زور دیا کہ وہ انگریزوں پر اعتماد کریں اور ان کے احکامات کی بلا چوں وچرا تعمیل کریں۔ ان کی وفات پر دی ٹائمز نے لکھا تھا:

> برطانوی حکومت کو خطابات اور اعزازات کی شکل میں انھیں جو کچھ عطا کرنا چاہیے تھا اُس نے وہ سب کچھ انھیں عطا کر دیا لیکن ہندستانی تاریخ میں جو چیز اُنھیں نمایاں مقام عطا کرتی ہے وہ ہے جدید علوم و فنون کے میدان میں اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی کی وہ خدمت جو انھوں نے اپنی راسخ العقیدگی پر آنچ نہ آنے دیتے ہوئے انجام دی۔[۱۹]

مسلمانوں کے تعلق سے سید امیر علی 1849 - 1928 کے خیالات عبداللطیف کے خیالات سے قدرے مختلف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان نہ صرف تعلیم حاصل کریں بلکہ سیاست میں بھی سرگرمی سے حصہ لیں۔ گو وہ کانگریس کی مخالفت میں عبداللطیف سے پیچھے نہیں تھے لیکن ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر مسلمانوں کو کانگریس کا نعم البدل نہ مل پایا تو اُن کا کانگریس کی جانب مائل ہونا ناگزیر ہے۔ لطیف صرف علمی مباحثہ کی حد تک مسلمانوں کو سیاست میں دلچسپی لینے کی اجازت دیتے تھے۔ اُنھیں اس حد سے تجاوز کرنے دینا ان کے نزدیک ایسا ہی تھا جیسا بچوں کو آگ سے کھیلنے دینے کی اجازت دینا۔ چنانچہ ان دونوں بنگالی مسلمان رہنماؤں کے فکر و عمل میں کبھی بھی یگانگت پیدا نہ ہو سکی۔ بدقسمتی سے یہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی نہیں کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں علیحدہ علیحدہ سمتوں میں مصروفِ عمل رہے اور بعض اوقات تو ایک دوسرے کی مخالفت میں بھی انھوں نے کام کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس طرح ان دونوں ہنماؤں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی توانائیاں کسی تعمیری کام کی بجائے زیادہ تر ایکدوسرے کے خلاف معرکہ آرائی ہی میں ضایع ہوئیں۔[82]

امیر علی کی یادداشتیں Memoirs ان غیر معمولی الفاظ کے ساتھ شروع ہوتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "ہمارا شجرۂ نسب آنحضورؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہراؓ کی وساطت سے آنحضرت صلعم تک جا پہنچتا ہے۔ ہمارے جد اعلیٰ جناب علی جن کی کنیت الرضا تھی اور جو ہمارے آٹھویں امام ہیں، مشہد میں دفن ہیں جو شمال مشرقی ایران کے صوبے خراسان کا سب سے اہم شہر[83] ہے"۔ دراصل ان کے اسلاف میں سے ایک بزرگ عظیم ایرانی بادشاہ شاہ عباس ثانی کے دربار میں اہم عہدے پر فایز تھے۔ اُنھی کے خاندانی سلسلے میں ایک نامور سپاہی احمد فاضل بھی گزرا جو نادر شاہ کے ہمراہ ہندستان آیا تھا۔ اس حملے کے بعد فاضل دہلی ہی میں رُک گیا اور وہیں بود و باش اختیار کرلی۔ اس کے لڑکے نے جلد ہی اودھ کے نواب کے پاس ملازمت حاصل کرلی۔ اُس کا سعادت علی نامی ایک بیٹا تھا جو اودھ کی سلطنت کے خاتمے کے کچھ عرصہ قبل بنگال چلا آیا۔[84]

اُسی سعادت علی کے فرزند امیر علی نے ہگلی کالج میں اپنی تعلیم حاصل کی جہاں سے 1869ء میں انھوں نے سیاسیات اور معاشیات میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اگلے سال بڑے اعزاز کے ساتھ With Honours بی۔ ایل (B.L.) کی ڈگری حاصل کی۔ "اُن دنوں" امیر علی لکھتے ہیں" ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین کوئی تلخ اختلافات موجود نہیں تھے۔ وہ اخوت اور محبت سے ایکدوسرے کے ساتھ پیش آتے تھے۔ نماز کے اوقات میں مسجدوں کے آگے باجا بجانے یا بقرعید کے موقعے پر قربانی کی گایوں اور بچھڑوں کی اشتعال انگیز گشت پر ہونے والے جھگڑوں کا ان دنوں کوئی وجود نہیں تھا۔ اُس وقت تک دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والا "فرقہ وارانہ نمایندگی" کا مسئلہ چھڑا نہیں تھا۔ اور اس وقت تک دونوں قوموں کے رائے دہندگان کو ایک مشترکہ انتخابی کارروائی Hustings کے لیے جمع نہیں کیا گیا تھا ایک قوم کے سر میں غالب آجانے کا سودا نہیں سمایا تھا اور دوسری قوم کو مغلوب ہوجانے کا خوف نہیں ستا رہا تھا۔ اپنے ہندو ساتھیوں میں کئی میرے بہترین دوست تھے"۔[85]

کلکتہ میں ایک سال تک وکیل ہائی کورٹ کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امیر علی حکومتِ ہند کے وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لندن چلے گئے جہاں تین سال بعد انھوں نے بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر لی۔ وطن واپسی کے بعد انھوں نے کلکتہ میں دوبارہ قانونی پریکٹس شروع کر دی اور پریسیڈنسی کالج میں اسلامی قانون Muhammadan Law بھی پڑھایا۔ جلد ہی اُن کا تقرر پریسیڈنسی مجسٹریٹ اور بعد ازاں چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے عمل میں آ گیا۔ دریں اثنا 1883ء میں لارڈ رپن نے انھیں اپنی مجلس مقننہ کے رکن کی حیثیت سے نامزد کیا۔ سات برس بعد انھیں ترقی دے کر کلکتہ ہائی کورٹ کا جج بنا دیا گیا۔ وہ ہندستان کے دوسرے مسلمان تھے جنھیں اتنے اعلیٰ منصب پر فایز کیا گیا تھا اس بلند رتبے تک پہنچنے والے پہلے مسلمان، جیسا کہ ہم اس سے قبل دیکھ چکے ہیں، سید محمود تھے۔

ایک جج کی حیثیت سے امیر علی نے زبردست نام پیدا کیا۔ خاص طور پر اسلامی قانون کے تعلق سے اُن کے فیصلے بہت ہی صاف ستھرے ہوا کرتے تھے جن میں تبحر علمی کے ساتھ قانونی پیچیدگیوں کو بڑے ہی سلیقے کے ساتھ سلجھایا جاتا تھا۔ اسی بنا پر ان کے اِن فیصلوں کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ اکثر پریوی کونسل Privy Council کی قانونی کمیٹی اُنھی کے فیصلوں پر انحصار کیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک ذہین مصنف بھی تھے۔ انگریزی زبان پر انھیں مکمل عبور حاصل تھا۔ اسلامیات پر ان کی فخرِ روزگار کتابوں کے علاوہ اُن کی قانونی کتابوں نے بھی خاصی داد و تحسین حاصل کی اور متعلقہ مضامین کی حد تک انھیں سند کی حیثیت حاصل رہی۔[86]

1904ء میں امیر علی نے اپنی انگریز بیوی کے ہمراہ، جس سے انھوں نے اس سے قبل کے سفرِ انگلستان کے دوران شادی کی تھی، ہندستان کو خیرباد کہہ دیا اور انگلستان جا کر برک شایر Berkshire کے تاریخی جاگیری علاقے Hamen میں سکونت اختیار کر لی۔

امیر علی ایک ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ گزشتہ باب میں مَیں نے اُن کے مذہبی کارناموں پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح مناسب موقعوں پر میں نے ان کی بعض سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اگرچہ وہ انگریزوں کے ساتھ تعلقات کی اُستواری کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے تاہم انھوں نے اکثر ہمدردی کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُس فقدان کا گلہ بھی کیا ہے جو حاکم و محکوم کے مابین پایا جاتا تھا۔ وہ اُن انگریز عہدیداروں سے بھی نالاں تھے" جو قوموں کی عدم مساوات کے نظریے کے علاوہ اس بات کے بھی قایل تھے کہ اپنی ولایت دسر پرستی کے بندھنوں کا ڈھیلا کرنا سراسر حماقت کے مترادف ہے"[87] چنانچہ انھوں نے طریق نمایندگی کے وسیع تر اطلاق یا عاملانہ خدمات پر ہندستانیوں کے تقرر جیسے کانگریسی مطالبات کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ لیکن وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ ان میں ردّ و بدل کر کے ہندستان کے مخصوص حالات کے مطابق ڈھالا جانا چاہیے چنانچہ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کی انھوں نے آخر وقت تک مخالفت کی اور اس بارے میں کسی بھی سمجھوتے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ انھوں نے انگریزوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ" ایک مسلمان فرمانروا نے ایک نئے طریق انتخاب رائج کر کے دونوں قوموں کو یکجا کرنے کی کوشش کی لیکن اپنے مقصد میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کیا آپ دونوں کو ایکساتھ انتخابی کارروائی میں گھسیٹ کر اس مقصد کو حاصل کرنا ممکن سمجھتے ہیں؟[88]" لارڈ ہارڈنگ Lord Hardinge کے دور اقتدار میں جو مشترکہ طریق انتخاب کا زبردست حامی تھا، کانگریس نے جناح کے توسط سے انھیں اس شرط پر صدارت کی پیش کش بھی کی تھی کہ وہ علیحدگی پسندی کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں گے لیکن امیر علی نے اس پیش کش بھی کی تھی کہ وہ اور اپنے فرقہ وارانہ رویّے پر قایم رہے۔ ان کا خیال تھا کہ فرقہ وارانہ بنیاد پر حق نمایندگی حاصل کیے بغیر مسلمانوں کو" لامحالہ اکثریت کے رحم کے ساتھ بندھ جانا پڑے گا" اور" آخر کار اس دوڑ میں وہ ایسے روندے جائیں گے کہ ان کے پاس اقتدار کا شائبہ تک باقی نہیں رہے گا"[89]

زیر تحقیق مدت کے دوران وہ دیگر مسلم رہنما جنھوں نے ہندستانی معاملات میں کسی قسم کا اہم کردار انجام دیا، بمبئی یا مدراس کے صوبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ دونوں صوبے ہندستان کے بقیہ نصف حصے میں واقع تھے۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب میں شاہ دین محمد شفیع اور فضل حسین جیسے بعض مقامی رہنما ضرور موجود تھے لیکن ہنوز انھیں کُل ہند پیمانے پر اہمیت حاصل نہ ہو پائی تھی۔ اُسی طرح بہار میں بھی شریف الدین، سید علی امام اور مظہر الحق جیسے رہنما موجود تھے لیکن ان کے اثرات بھی اُنھی کے صوبے کی حد تک محدود تھے۔ سندھ میں تو کوئی بھی قابل ذکر رہنما موجود نہیں تھا، اور باقی صوبوں کی حالت بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کم و بیش اسی قسم کی تھی۔

بمبئی سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں میں سب سے نمایاں حیثیت بلاشبہ بدرالدین طیب جی 1906 - 1944 کی تھی۔ وہ بوہرہ فرقے سے تعلق رکھنے والے ایک امیر تاجر کے فرزند تھے۔ اُن کے والد کی بیرونی ممالک کے ساتھ زبردست تجارت تھی۔ اس کے علاوہ مقامی ہندو تاجروں کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات تھے اور اُبھرتے ہوئے ہندو دانشوروں میں وہ بے حد مقبول تھے۔ مذہب کی سخت پابندی کے باوجود طیب جی کے اہل خاندان کو اپنے ہندو پڑوسیوں اور دوستوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے میں کوئی مضایقہ نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ بچپن ہی سے بدرالدین کی تربیت صلح کل اور وسیع المشربی کے ماحول میں ہوئی۔ ان کے قریبی احباب میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے اور انھوں نے دونوں میں فرق کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔[90]

طیب جی نے اپنی ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں حاصل کی جہاں انھیں قرآن خوانی کے علاوہ اردو اور فارسی کی شُدبُد دی گئی۔ بعد ازاں انھوں نے الفنسٹن انسٹی ٹیوشن Elphinston Institute میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔ جلد ہی انھیں آنکھ کی شدید تکلیف کا علاج کروانے کے لیے فرانس لے جایا گیا۔ علاج کے مکمل ہو جانے پر وہ گھر لوٹنے کی بجائے سیدھے لندن چلے گئے۔ جہاں انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ 1867ء میں وہ بیرسٹر بن گئے۔ وطن واپس لوٹنے پر انھوں نے بمبئی ہائیکورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ اس معاملے میں انھیں اپنے بھائی قمرالدین سے بڑی مدد ملی جو ہندستان سے سب سے پہلے وکلا میں شامل تھے۔ قانونی پیشے میں نام پیدا کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے لہٰذا طیب جی کو کئی برسوں تک سخت محنت اٹھانی پڑی تب کہیں جا کر انھیں شہرت نصیب ہوئی۔ 1881ء تک وہ اس پیشے میں اتنے مشہور ہو گئے کہ ان کا شمار بمبئی کے گنے چنے سرکردہ وکلا میں ہونے لگا۔ شہرت کی اس منزل پر پہنچ کر وہ سیاست کی جانب متوجہ ہوئے۔ یہ وہ دن تھے جب ہندستان میں مالیاتی مناقشہ Fiscal Controversy چھڑا ہوا تھا اور انھوں نے عوامی جلسے میں کی گئی اپنی پہلی ہی تقریر میں مانچسٹر Manchester سے آئے ہوئے مال پر درآمدی محصول کی منسوخی پر کڑی تنقید کی۔ چونکہ مہتا، تیلنگ اور رانا ڈے جیسے ہندو رہنماؤں کے ساتھ ان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قریبی تعلقات تھے اس لیے انھیں سرسید کے فرقہ وارانہ رویے پر دکھ محسوس ہوتا تھا انھوں نے اپنی قوم کو یہ سمجھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا کہ ہندو اور مسلمان اس دھرتی کے لال ہیں لہٰذا دونوں کو تمام عوامی مسایل کے حل کے لیے متحدہ طور پر کوشش کرنی چاہیے یہ بات بقول اُن کے نہ صرف دونوں قوموں کے لیے بہتر ہے بلکہ انگریزوں کے مفاد میں بھی ہے!91

ایک موثر مقرر ہونے کی وجہ سے طیب جی جلد ہی تعلیم یافتہ اور سیاسی شعور رکھنے والے حلقوں میں مقبول ہو گئے۔ ہندستان کے مختلف گوشوں سے انھیں دعوت نامے وصول ہونے لگے اور اُن دنوں میں انھیں کئی جگہ تقریریں کرنی پڑیں۔ تاہم انھیں خطیب Orator نہیں کہا جاسکتا۔ اخبار The Times لکھتا ہے "اُن کی عوامی جلسوں میں کی ہوئی تقریریں اس وجہ سے بھی پرزور اور قایل کر دینے والی ہوتی تھیں کہ اظہار کی موزونیت کے علاوہ اُن میں منطقی دلایل سے کام لیا جاتا تھا....."92

وریں اثنا 1902ء میں بمبئی کے گورنر سر جیمس فرگیوسن Sir James Fergus on نے انھیں اپنی مجلس مقننہ کا رکن نامزد کیا۔ 1903ء میں وہ ہندستان کے پہلے مسلمان تھے جنھیں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں طیب جی نے کانگریس کے نمایندہ کردار پر زور دیا اور تاج برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمان قوم کانگریس کے خلاف ہے۔93 1895ء میں طیب جی نے کانگریس اور دیگر تمام سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی کیوں کہ اُس سال ان کی عزت افزائی کر کے انھیں بمبئی ہائیکورٹ کا جج بنا دیا گیا تھا۔ تاہم اپنے فاضل اوقات میں وہ مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی خدمات انجام دیتے رہتے تھے چنانچہ بمبئی میں انجمن اسلام کا قیام جس کے وہ ابتدا سے معتمد رہے اور بعد ازاں صدر بن گئے ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے' اس انجمن کی جانب سے مدرسوں اور اقامت خانوں کے علاوہ ایک ورزش گاہ اور ایک کلب کا قیام عمل میں آیا جہاں نہ صرف مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ترویج عمل میں آتی تھی بلکہ انھی اداروں کی مدد سے انھوں نے اپنی قوم میں کئی اصلاحی کاموں کی ابتدا بھی کی۔ وہ تعلیم نسواں کے بھی زبردست حامی تھے۔ وہ سب سے پہلے مسلمان نہ سہی لیکن ان ابتدائی مسلمانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں سے ایک ضرور تھے جنھوں نے اپنی لڑکیوں کو پردے سے باہر آنے کی اجازت دی تھی۔[94] علاوہ ازیں طیب جی کی کوششوں ہی کی وجہ سے بمبئی میں مسلمانوں کے لیے اسلام کلب اور اسلام جمنازیم Islam Gymnasium (جو اب جمخانہ کہلاتا ہے) جیسے ادارے قایم ہو سکے۔ طبعاً وہ ایک کھلاڑی واقع ہوئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ انھیں بیڈمنٹن Badminton اور ٹینس Tennis کھیلنے کا بے حد شوق تھا۔

زندگی کے آخری ایام میں، جبکہ کانگریس نے کُلّی طور پر ایک جارحانہ سیاسی تنظیم کا روپ دھار لیا تھا، طیب جی کو اس صورتِ حال پر شدید افسوس ہوا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے: "مجھے یہ دیکھ کر دہشت سی محسوس ہونے لگتی ہے کہ ہندستان کے نوجوانوں نے اپنی توجہات کو خالصتاً سیاست پر مرکوز کر دیا ہے اور انھیں تعلیم یا سماجی اصلاح کی زیادہ پرواہ نہیں ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے ایک ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری بہتری اور ترقی اس امر میں پوشیدہ نہیں ہے کہ ہم اپنی تمام تر توجہات کو ایک ہی سمت میں مرکوز کر دیں۔ ہمیں تو چاہیے کہ آج ہم جتنی محنت اپنی سیاسی حالت کو سُدھارنے کے لیے کر رہے ہیں اُسی کے ساتھ ساتھ اتنی ہی محنت اپنی تعلیمی اور سماجی حالت کو سُدھارنے کے لیے بھی کریں۔ اگر ہمارے ہم وطنوں کی بہت بڑی تعداد جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی رہے تو خواہ ہم مل جل کر ایک نمایندہ قسم کی حکومت کے لیے کتنی ہی جدوجہد کیوں نہ کر لیں اس سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔"[95]

اُن کی وفات پر پی۔ آنندا چارلو نے، جو بعد میں کانگریس کے صدر بھی بن گئے تھے، چنانچہ اس جہانِ فانی میں قیام کی مختصر مدت کے آخری دن تک وہ ایک مضبوط ایماندار، نڈر، بہادر اور ایک محبِّ وطن انسان کی طرح جیے جس پر مذہبی یا فرقہ وارانہ تنگ نظری کبھی اپنا اثر جما نہ سکی۔"[96]

وہ دوسرے مسلمان رہنما جنھیں کانگریس کا صدر بننے کا شرف حاصل ہوا، رحمت اللہ محمد سایانی 1947-1902 ہیں جن کا تعلق بھی بمبئی ہی سے تھا۔ طیب جی کی طرح وہ بھی ایک تاجر گھرانے کے فرد تھے۔ اُن کے والد ریاست کچھ کے ایک سرکردہ تاجر تھے۔ پیدایشی طور پر وہ ایک خوجہ مسلمان تھے اور آخر وقت تک اپنے فرقے کے مخصوص عقاید کے سختی سے پابند رہے۔[97]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سایانی نے اوایلِ عمر ہی میں انگریزی زبان سیکھنی شروع کر دی جس کی وجہ سے اُن کے اہلِ خاندان بے حد پریشان ہو گئے اور دوسرے خویجے سخت ناراض ہوئے۔ کئی بار انھیں سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ وہ اس "گناہ کے کام" کو ترک کر دیں لیکن وہ اپنے ارادے پر اٹل رہے۔ یکے بعد دیگرے وہ امتحانات کامیاب کرتے رہے جن میں انھوں نے کئی انعامات اور وظیفے بھی حاصل کیے۔ حتیٰ کہ 1868ء میں انھوں نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس اعزاز کو پانے والے سایانی نہ صرف یہ کہ پہلے مسلمان تھے بلکہ اگلے پچیس سال تک ان انعامات کو حاصل کرنے والے بھی واحد مسلمان تھے۔ یہ ان کی یقیناً ایک بے مثال کامیابی تھی۔ اُن کے پرنسپل سر الکزنڈر گرانٹ (Sir Alexander Grant) ہمیشہ اُن کی ذہانت اور لیاقت کی تعریف کیا کرتے تھے۔

1869ء میں قانون کے مضمون میں بیچلر Bachelor کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سایانی جے۔ پی بن گئے۔ جلد ہی انھوں نے سالیسیٹر Solicitor کا امتحان بھی کامیاب کر لیا اور قمرالدین طیب جی کی فرم سے منسلک ہو گئے جو بدرالدین طیب جی کے بھائی تھے۔ چند برسوں کے بعد ان کی کوششوں کے نتیجے میں 'پاین، گلبرٹ اور سایانی Payne, Gilbert and Jayani نامی فرم عالمِ وجود میں آئی۔ قانونی پیشے میں انھیں غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ ہم پیشہ وکلاء اور ہائی کورٹ کے ججوں کے مابین انھیں یکساں طور پر احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

1876ء میں سایانی پہلی بار بمبئی میونسپل کارپوریشن کے لیے منتخب ہوئے اور 1902ء میں اپنی وفات تک اُس کے رُکن بنے رہے۔ 1888ء میں وہ کارپوریشن کے صدر President بنے (اُن دنوں میئر Mayor کو اسی نام سے جانا جاتا تھا) اُسی سال بمبئی کی مجلسِ مقننہ کے لیے بھی اُن کی نامزدگی عمل میں آئی۔ 1896ء میں انھوں نے کلکتے میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے بارہویں سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے بڑی معقولیت کے ساتھ اپنے ہم مذہبوں سے اپیل کی کہ وہ کانگریس کے ساتھ اپنا مخاصمانہ رویہ ترک کر دیں۔ انھیں اس امر کا پورا اطمینان تھا کہ اگر مسلمانوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تو انھیں ہر وہ سہولت حاصل ہو جائے گی جس کے متقاضی وہ مخصوص حالات تھے جن سے اُن کی قوم دوچار تھی۔ ان کا کہنا تھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ مخالفت کرنے کی وجہ سے مسلمان کانگریس کا تو کوئی نقصان نہ کر پائیں گے البتہ انھی کی ترقی کی رفتار سست پڑ جائے گی۔ بمبئی کی مجلس مقننہ کے غیر سرکاری ارکان کے نمائندے کی حیثیت سے دو سال تک وہ امپریل لیجسلیٹو کونسل Imperial Legislative Council کی رکنیت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران جو متعدد امور زیر بحث آئے ان کے بارے میں ہمیشہ ہی انھوں نے غیر فرقہ وارانہ رویہ اپنایا۔ اس کی اس کارگزاری کو اس وقت کے وایسرائے لارڈ ایلگن Lord Elgin نے بے حد سراہا۔

ان کی وفات پر تبصرہ کرتے ہوئے بنگالی نے لکھا تھا "مسٹر سایانی اپنے زمانے کے سب سے زیادہ سرکردہ ہندستانیوں میں سے ایک تھے ..... وہ ہندستان کے ایک سچے فرزند تھے۔ ایک ایسے فرزند جن کا دل حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کے اعلیٰ جذبات کے ساتھ دھڑکتا تھا۔" اسی طرح دی ٹائمز آف انڈیا نے انھیں ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا،

> "وہ اُن گنے چنے مسلمانوں میں سے ایک تھے جو بڑی سنجیدگی سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ مستقبل قریب میں فرزندانِ اسلام بھی اس لائق ہو جائیں گے کہ دانشورانہ مقابلہ آرائی میں دوسری قوموں کی ہمسری کر سکیں۔ انھیں اس طرح کا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس ملک میں انتظامیہ اور سرکاری ملازمتوں میں تقرر کے مغربی طریقے اپنائے جائیں تو ان کی قوم اس دوڑ میں کافی پیچھے رہ جائے گی۔"[۱۹۵]

اگر کل ہند تناظر میں دیکھا جائے تو طیب جی اور سایانی جیسے لوگ مسلمانوں میں اقلیت میں تھے، تاہم مغربی ہند پر اُن کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ حتیٰ کہ ۱۸۹۳ء میں وقوع پذیر ہونے والے بمبئی کے فسادات کے دوران بھی ان دو رہنماؤں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پائے جانے والے پرخلوص تعلقات ان ہنگاموں کی وجہ سے متاثر نہ ہونے پائیں۔ بمبئی میں ان دونوں کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ جب ۱۹۰۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا تو اس کی صدارت طیب جی کو پیش کی گئی، حالانکہ ماضی میں سرسید کے تعلق سے ہمیشہ ان کا رویہ ناقدانہ رہا تھا۔ اپنے صدارتی خطبے میں جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بتلا چکے ہیں، طیب جی نے نہ صرف کانگریس کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعادہ کیا بلکہ کانفرنس کے نمایندگان کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ سیاسی امور میں اپنی فرقہ واریت کو ترک کرتے ہوئے ہندوؤں کے ساتھ مل جُل کر کام کریں۔

ان دونوں مسلم رہنماؤں کی وفات کے کئی سال بعد کانگریس کے ایک صدر ڈی۔ ای۔ واچھا D E Wacha نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا،

> یہ دونوں حضرات اعلیٰ درجے کے مہذب مسلمان تھے جو فکر و نظر کی آزادی کے علاوہ بہترین خدمتِ خلق اور اعلیٰ درجے کے حقیقی سیاسی شعور جیسی صفات سے متصف تھے۔ وہ فرقہ وارانہ تنگ نظری سے بالکل پاک تھے۔ اپنی وسیع النظری اور وسیع القلبی کی بنا پر انھوں نے اپنے پسماندہ ہم مذہبوں میں رواداری کا جذبہ پیدا کرنے کی انتھک کوشش کی اور انھیں کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل پر آمادہ کیا۔ انھیں اس امر کا پورا یقین تھا کہ ہندستان کی دونوں عظیم قوموں کے سیاسی مستقبل کی کامیابی کا دارومدار اسی بات پر منحصر ہے کہ یہ دونوں مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے ایکدوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ وہ اپنے دور کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایسے پیش رو محافظ تھے جنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے معیار کو بلند رکھا۔[۱۵۱]

جنوبی ہند، خصوصاً مدراس کی صورتِ حال بھی بمبئی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہاں بھی میر ہمایوں جاہ اور بعد ازاں اُن کے لایق اور زیادہ جانے پہچانے فرزند نواب سید محمد (متوفی 1919ء) کی وجہ سے کانگریس تحریک تعلیم یافتہ اور بااثر مسلم حلقوں میں بے حد مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ جب 1887ء میں مدراس میں کانگریس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت طیب جی نے کی تھی تو ہمایوں جاہ نے ایک خطیر رقم چندے میں دی تھی اور مجلسِ استقبالیہ کی مدد کئی اور طریقوں سے بھی کی تھی۔[۱۵۲]

1903ء میں جب دوبارہ کانگریس کا اجلاس مدراس میں منعقد ہوا تو اُن کے صاحبزادے سید محمد نے تمام انتظامات کی ذمہ داری اپنے سر لی اور مجلسِ استقبالیہ کی صدارت کے فرایض بھی خود ہی انجام دیئے۔ 1913ء میں جب کانگریس کا سالانہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو اِنھی سیّد محمد کو صدارت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس طرح وہ تیسرے مسلمان ہیں جنھیں کانگریس کی صدارت سے نوازا گیا۔

سیّد محمد کا تعلق جنوبی ہند کے اُسی مشہور و معروف خاندان سے تھا جس نے ماضی میں ٹیپو سلطان اور حیدر علی جیسے سپوتوں کو جنم دیا تھا۔ اسی وجہ سے سماجی اعتبار سے سبھی حلقوں میں یکساں طور پر انھیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کے والد ماجد میر ہمایوں جاہ نے پہلے ہی سے انگریزوں کے ساتھ بہترین تعلقات استوار کر رکھے تھے کئی برسوں تک انھوں نے مدراس کی مجلسِ مقننہ کے نامزد رکن کی حیثیت سے کام کیا اُن کے شاہی روابط کی وجہ سے برہمنوں اور با اثر ہندوؤں میں ان کی بڑی مانگ تھی۔

سیّد محمدؒ نے اپنی زندگی کی ابتدا انتہائی خوشگوار ماحول میں کی۔ وہ خود چونکہ کافی ذہین انسان تھے اس لیے انھوں نے درپیش تمام مواقع کا بہترین فایدہ حاصل ہوا۔ اُن کے والد نے اُن کی بہترین انگریزی تعلیم کا بندوبست کیا اور بچپن ہی سے اعلیٰ یورپین اور ہندو حلقوں سے اُن کا ربط قایم رکھا۔ 1896ء میں حکومت نے شہر کے لیے اُن کی عوامی خدمات کے اعتراف میں انھیں مدراس کا شریف بنا ڈالا۔ وہ مدراس کے پہلے مسلمان تھے جنھیں یہ شرف حاصل ہوا تھا۔

اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے سیّد محمد کو سیاست میں گہری دلچسپی تھی اور وہ اُن تمام جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے جو کانگریسی رہنما مدراس میں منعقد کیا کرتے تھے۔ ہندستانی مسایل کے بارے میں اُنھی رہنماؤں کے موقف سے متاثر ہو کر سیّد محمد نے بھی اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی دور ہی سے ہندو۔ مسلم سیاسی اتحاد کے نظریے پر زور دینا شروع کر دیا تھا۔ 1903ء میں مدراس میں کانگریس کے اجلاس کے دوران انھوں نے جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا اُس کا ماحصل یہی ہے کہ "اتحاد میں ہماری فتح ہے، پھوٹ میں ہماری شکست ہے۔" اسی وجہ سے 1906ء میں لارڈ منٹو کی خدمت میں مسلمانوں کا جو وفد پیش ہوا تھا اُس میں شامل ہونے سے انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ اس وفد کے بانیوں نے جب اُنھیں شرکت کی دعوت دی تو انھوں نے کہا تھا کہ وہ بخوشی اُس وفد میں شامل ہوں گے بشرطیکہ وہ اپنے مطالبات میں سے علیٰحدہ فرقہ وارانہ بنیاد پر نمایندگی کے مطالبے کو خارج کر دیں[103]۔ ظاہر ہے وہ لوگ اس تجویز کو ماننے والے نہیں تھے کیونکہ بقول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"وائسرائے" یہی مطالبہ تو آپ کے سپاسنامے کی جان[104] ہے"۔ اسی وجہ سے سید محمد اس تاریخی وفد میں شریک نہیں ہوئے حالانکہ محسن الملک اور دوسرے بااثر حضرات نے اُن پر ایسا کرنے کے لیے زبردست دباؤ ڈالا۔ اتفاقاً اس وقت وہ شملہ ہی میں موجود تھے اور وائسرائے کی مجلس مقننہ کے اجلاس میں شرکت کرنے کی غرض سے وہاں گئے ہوئے تھے کیونکہ وہ کئی برسوں تک اس مجلس کے رکن کی حیثیت سے بھی کارگزار رہے[105] تھے۔ بعد ازاں جب دسمبر کے مہینے میں ڈھاکے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو انھوں نے اس اقدام سے اپنی علیحدگی کا اظہار کرنے کے لیے کلکتہ میں مسلمانوں ہی کے دوسرے جلسے کی صدارت کی جو انھی دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی مفادات کی یکسانیت کا اظہار کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔

اپنی زندگی کے طویل عرصے میں سید محمد نے کبھی بھی ہندستانی سیاست میں مسلمانوں میں تنگ نظر فرقہ دارانہ تحریک کا ساتھ نہیں دیا۔ اُن کا انتقال 1919ء میں ہوا جب کہ ہندو مسلم اتحاد کا ستارۂ اقبال انتہائی عروج پر تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے سید محمد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا تھا کہ اُن دنوں بھی جب کہ مسلمانوں میں اتحاد کا نعرہ اتنا مقبول نہیں ہوا تھا مرحوم رہنما نے اس مقصد کے حصول کے لیے انتھک جدوجہد کی تھی[106]۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

دسواں باب (قیادت کی خصوصیات)

۱ ۔ اس نکتے کے تفصیلی افہام کے لیے ملاحظہ ہو جی۔ وی۔ پلیخانوف کی کتاب موسومہ
The Role of the Individual in History.

۲ ۔ ملاحظہ ہو سرسید کی مصنفہ اپنے نانا کی سیرتِ موسومہ سیرتِ فریدیہ (اردو متن)

3 ۔ حالی : حیاتِ جاوید (اردو متن)، 14 (حصہ اوّل)

۴ ۔ ملاحظہ ہو سرسید کی مصنفہ سیرتِ فریدیہ (اردو متن)، 54

5 ۔ غدر کے دوران بجنور کے محاصرے کے بارے میں اپنی سرکاری رپورٹ میں مسٹر شکسپیر نے لکھا تھا: "معقول وجوہات وجوہات کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ خاص طور پر صدر امین (سید احمد) اگر وقت پر مداخلت نہ کرتے تو عین ممکن تھا کہ نواب اپنے حامیوں کو قتل و غارت گری کی کھلی چھوٹ دے دیتا جس کا انجام ہمارے گروہ کے لیے یقیناً بڑا ہی تباہ کن ثابت ہوتا۔" ان الفاظ کو جی۔ ایف۔ آئی گراہم نے اپنی کتاب Life and work of Sir Syed کے صفحات 22-23 پر نقل کیا ہے۔

6 ۔ Ibid 15-23

7 ۔ ملاحظہ ہو حالی : حیاتِ جاوید (اردو متن) 67-68، (حصہ اوّل)

8 ۔ Sir Syed: The causes of the Indian Revolt pp 4-5

9 ۔ Ibid 5

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

10- Ibid

11- Ibid 7 - 8

12- Ibid 14 - 15

13 Sir Syed: The Loyal Mohammadan of India Part 1-5

14. Ibid part - 1 — 6.

15 - ملاحظہ ہو علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، بابتہ 3 رمئی 1877ء

16 - ابتدائی دنوں میں علی گڑھ کی سائنٹیفک سوسائٹی کے پہلے معتمد راجہ جے کشن داس بہادر سرسید کے قریب ترین رفقاء میں سے ایک تھے۔

17 - ملاحظہ ہو حالی: حیاتِ جاوید (اردو متن) 111 — 15

18 - سرسید: خطوط (اردو متن) 88 - 89

19 Proceedings of the Council of Governor General of India (1883). pp. 16-20

20 Quoted by G. F. I. Graham in his life and work of Sir Syed.

21 - ملاحظہ ہو 29 ستمبر 1893ء کے پایونیر میں سرسید کا بیان۔

22 - ملاحظہ ہو انڈین پولیٹیکل سائنس کانفرنس میں پڑھا گیا گورمکھ نہال سنگھ کا خطبۂ صدارت مطبوعہ انڈین جرنل آف پولیٹیکل سائنس، جلد چہارم صفحہ 382 نیز مزید ملاحظہ ہو اشوک مہتا اور اچوت پٹوردھن کی کتاب Communal Triangle in India صفحات 53 - 58

23 - ملاحظہ ہو لالہ جی کی یہ تقریر کانگریس کی سالانہ رپورٹ 1888ء میں

24 - 30 رمئی 1903ء کے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایک مضمون میں اس واقعے کا حوالہ ملاحظہ ہو۔

25 - بلنٹ Blunt نے بیک Beck کے علی گڑھ پہنچتے ہی اُن سے ملاقات کی اور اُن کے بارے میں اپنی ڈایری میں 19 رجنوری 1884ء کو یوں لکھا: "گلابی گالوں اور نیلی آنکھوں والا ایک خوبرو چھوٹا سا نوجوان جو بلاشبہ کوئی اوسط درجے کا انگریز نہیں ہے۔ اور ایک اوسط قسم کا کوئی انگریز یہاں (یعنی علی گڑھ میں) کامیاب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن بیک یہاں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ غالباً وہ کافی ذہین ہیں۔

W. W. Bluntt: India under Ripon: A Private Diary, 156

26 - مزید ملاحظہ ہو سرسید کی وفات پر بیک کی تقریر The Pioneer, Nov 28, 1898 جو اپریل 1896ء کے M. A. O College Magazine میں شایع ہوئی ہے۔

27 - یاد رکیا جاتا ہے کہ یہ مضمون شمال مغربی صوبے کی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سر آرتھر اسٹریچی Sir Arthur Stracey نے تحریر کیا ہوگا جو سرسید اور بیک دونوں ہی کے گہرے دوست ہوا کرتے تھے۔

28 - The Times, London, Sept 7, 1899

29 - اُن کا اصل نام سیّد مہدی علی تھا۔ "محسن الملک" وہ خطاب تھا جو انھیں نظام کی سرکار سے مرحمت ہوا تھا۔ بعدازاں وہ زیادہ تر اسی خطاب سے مشہور ہوئے اور جانے پہچانے جانے لگے۔

30 - ملاحظہ ہو Nateson: Nawab Mohamad Mahdi Ali Khan صفحہ 9۔ مزید ملاحظہ ہو "آج کے ہندستانی" نامی مضامین کے سلسلے میں نواب صاحب کی زندگی کا خاکہ جو 20 اکتوبر 1902ء کے پایونیر میں شایع ہوا۔

31 - حالی، حیاتِ جاوید، (اردو متن)

ایسا بھی نہیں کہ سرسید کی جانشینی کا مسئلہ اتنی آسانی سے طے پاگیا ہو۔ سرسید کی وفات کے فوری بعد جے کینڈی J. Kennedy نے "سرسید کی شخصی یادیں" میں تحریر کیا ہے: "جب کوئی پوپ انتقال کرجاتا ہے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسقفوں کی مجلس خاص Conclave of Cardinals سازشوں، گٹھ جوڑوں اور برقیوں Cables کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ سرسید کی وفات بھی کسی پاپائے اعظم کی وفات کی طرح ہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بیشتا حریف ان کی جگہ سنبھالنے کے لیے مسابقت میں مشغول ہیں لیکن ہنوز کسی ایک کو دوسرے سبھی کی حمایت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔"

32 - سرسید کو دی گئی مالی اعانت کا اندازہ کرنے کے لیے ملاحظہ ہوں محسن الملک کے نام ان کے چند خطوط (سرسید: خطوط۔ اردو متن۔ ۱۰۵-۱۰۰)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

33 ۔ حالی کا یہ فقرہ ٹیٹسن Nalesan نے اپنی کتاب موسومہ Nawal Kalsin ul Kulb کے صفحہ 15 پر نقل کیا۔

34 ۔ نیٹسن کی کتاب Nalesan Emerent Kusalman صفحہ 35-36 سے ماخوذ۔

35 ۔ حالی : یادگار غالب (اردو متن) 47

36 ۔ حالی : مسدس (اردو متن)، دیباچہ، 1-4

37 ۔ جیسا کہ ایک نقاد نے کہا ہے: "غالب نے انھیں سکھایا کہ گیت کس طرح گائے جاتے ہیں جبکہ سرسید نے انھیں سکھایا کہ گیت کس مقصد سے گائے جاتے ہیں"

[The Calcutta Review: Vol, cxxxi (1905) 467]

38. T. Graham Bailey: A History of Urdu Literature p.95

39 ۔ قیامت کے روز خدا جب مجھ سے دریافت کرے گا کہ دنیا سے اپنے ساتھ کیا لایا ہے تو میں اُس 'مسدس' کو حضورِ یزداں میں پیش کردوں گا جس کے لکھنے کی فرمائش میں نے حالی سے کی تھی" (سرسید نے یہ الفاظ اس خط میں تحریر کیے جو انھوں نے حالی کے نام اس عظیم نظم کے ایک نسخے کی وصولیابی کی اطلاع دینے کے لیے لکھا تھا) ملاحظہ ہو سرسید کے خطوط (اردو متن)،

40 ۔ ملاحظہ ہو حالی کی حیاتِ جاوید (اردو متن) ۔ ضمیمہ پنجم

41 ۔ حالی : مضامین حالی (اردو متن)، 21

42 Ibid 39-102

43 Ibid

44 ۔ اس نظم کا ایک مخصوص بند ملاحظہ فرمائیے :

ورنہ دن رات پھریں ٹھوکریں کھاتے در در
سیدیں چٹیاں دن رات دکھاتے در در
چاپلوسی سے دل اک اک کا بھلاتے در در
ذائقہ نفس کو ذلت کا چکھاتے در در
تاکہ ذلت سے بسر کرنے کی عادت ہو جائے
نفس جس طرح بنے لایقِ خدمت ہو جائے ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

45 ۔ انگریزی تعلیم کی مدافعت کرتے ہوئے نذیر احمد نے ایک دفعہ کہا تھا :

46 ۔ C. F Andrews: Zaka ullah of Delhi, 38.

47 ۔ کرامت اللہ : نذیر احمد دہلوی کے لکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری (اردو متن) 3

48 ۔ اویس احمد نے نذیر احمد کے تنقیدی مطالعے اردو کا پہلا ناول نگار (اردو متن) کے صفحات 10-11 پر نقل کیا۔ لیکن انھوں نے کالج میں دوسری بہت سی باتیں سکھیں جیسا کہ خود انھوں نے اپنی کتاب حیات النذیر (اردو متن) میں کہا ہے :

> اپنی معلومات کے دایرے کو وسیع کرنا اور اپنے خیالات و افکار میں آزادی پیدا کرنا، رواداری اور حکومت کے ساتھ سچی وفاداری، جد و جہد کا جذبہ اور اعلیٰ اخلاقی صفات پیدا کرنا یہی تعلیم کے بہترین ثمرات ہیں اور بلاشبہ زندگی کی لازمی ضروریات کا درجہ رکھتی ہیں جنھیں میں نے صرف کالج ہی میں سیکھا ہے۔ اگر میں نے کالج میں تعلیم حاصل نہ کی ہوتی تو کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ میں آج کیا ہوتا؟ میں ایک تنگ نظر، متعصب اور غیر مہذب مولوی ہوتا جو اپنے ضمیر کی آواز پر دھیان دیئے بغیر ہمیشہ دوسروں کی خامیوں اور کمزوریوں کو تلاش کرتا پھرتا ..... یقیناً اس صورت میں میں مسلمانوں کا ایک جاہل اور احمق دوست بن گیا ہوتا۔

49 ۔ ملاحظہ ہو نذیر احمد کی تصنیف فطرت اللہ (انگریزی ترجمہ) 17-18

50 ۔ اُن کے لکچروں کا مجموعہ میں ملاحظہ ہو کانگریس مخالف تقریریں۔

51 ۔ Saksena: A History of Urdu Literature 286

نذیر احمد کے اس ناول اور دیگر ناولوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو شایستہ اختر بانو سہروردی کی کتاب A critical Survey of the Development of the Urdu Novel and Short Story pp 41-65

52 ۔ ملاحظہ ہو ذکار اللہ کا ڈکٹوریہ نامہ جو اردو زبان میں ملکہ اور اس کے شاندار دورِ حکومت کا تعریفی بیان ہے۔

53 ۔ [illegible] History of Urdu Literature, 236

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

54. C. F. Andrews: Zaka Ullah of Delhi, 96

55. Ibid 111.

56. Ibid 113

57۔ ملاحظہ ہو شبلی کا سفرنامۂ مصر و شام و روم (اردو متن)

58۔ ملاحظہ ہو محمد یحییٰ تنہا کی سیر المصنفین (اردو متن) جلد دوم صفحہ 413

59۔ سرسید کی وفات کے فوری بعد انھوں نے M.A.O. College Magazine میں لکھا تھا: "دنیا جہاں کو اس بات کا علم ہے کہ مذہبی معاملات میں مجھے سرسید سے شدید اختلاف تھا۔ درحقیقت میں ان کے کئی مذہبی عقاید اور افکار کو یکسر غلط مانتا ہوں۔" 1898 May

60۔ سید علی بلگرامی کا ترجمہ کردہ یا اُن کی ادارت میں شایع کردہ ہندستان اور اسلام کے بارے میں اردو کتابوں کا وہ سلسلہ جس کی اشاعت نظام حیدرآباد کی زیر سرپرستی عمل میں آئی۔

61۔ ملاحظہ ہو 19 اکتوبر 1912ء کے مسلم گزٹ لکھنو میں شبلی کا مضمون جو اُن کے سیاسی مضامین کے سلسلے کی ایک کڑی تھا جو اُن دنوں انھوں نے اس رسالے کے لیے لکھے تھے۔

62۔ شبلی نے اس حقیقت کو یہ کہتے ہوئے آشکار کرنے سے انکار کر دیا کہ ایسا کرنا "نہ صرف یہ کہ غیر ضروری ہے بلکہ نقصان دہ بھی ہے۔"

63۔ ملاحظہ ہو ذکار اللہ کی تصنیف کردہ مولوی سمیع اللہ کی سوانح عمری (اردو متن)

64۔ ملاحظہ ہو 28 ستمبر 1907ء کے پایونیر میں "آج کے ہندستانی" نامی سلسلے میں شایع شدہ سمیع اللہ کی زندگی کا خاکہ۔

65۔ Ibid

66۔ ملاحظہ ہو سرسید: خطوط (اردو متن) 131-32 جس میں سرسید نے سمیع اللہ کے خلاف زہر افشانی کی ہے۔ مزید ملاحظہ ہو نیشن Nation کی کتاب موسومہ Emmet Muhammedan 131-42 اور 28 ستمبر 1893ء کے پایونیر میں "آج کے ہندستانی" نامی سلسلے میں شایع شدہ سمیع اللہ کی زندگی کا خاکہ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

67 Whitley Stokes: The Anglo-Indian Codes, XXVIII

68 ۔ اپنے فرزند کے استعفیٰ کے بارے میں ملاحظہ ہو سرسید کا تبصرہ جو علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ میگزین میں شایع ہوا۔ سرسید کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے پایونیر لکھتا ہے: "غالباً سرسید کے بہترین احباب بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ایک ایسے موضوع پر لب کشائی کرنے سے قبل جس کے بارے میں وہ محبت اور انصاف کے مابین بمشکل ہی توازن برقرار رکھ پانے کے اہل ہوں، انھیں اپنے وقار کا خیال رکھتے ہوئے، خموشی اختیار کر لینی چاہیے تھی۔

69 ۔ ملاحظہ ہو ستیش چندر بنرجی کی "شخصی یادیں" مطبوعہ ہندستان ریویو بابت مئی 1903ء صفحات 42 - 439

70 ۔ ملاحظہ ہو ہندستان ریویو مئی 1903ء 52 - 443

71 ۔ جیسے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، ایم۔ اے۔ او۔ کالج اور اینگلو محمڈن اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن۔

72 - The Hindustan Review May 1903, 442

73 ۔ مورین 1903-04 کے دوران وایسرائے کی مجلس مقننہ کے زاید رکن کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ وہ 1906-17 کے دوران کونسل آف انڈیا کے رکن رہے، اور 1913 - کے دوران آرم اسٹرانگ کالج نیوکیسٹل اپان ٹائن (Armstrong College Newcastle upon Tyne) کے پرنسپل رہے اور 1933-36 کے پیرس کے برٹش انسٹی ٹیوٹ کے ڈایرکٹر رہے۔

74 - The Times Feb. 15, 1936

75 ۔ دراصل عوامی زندگی میں مورلے کو مورین کے والد سے بڑی مدد اور ہمت افزائی حاصل ہوئی تھی۔ اُسی کی وجہ سے مورلے کو Fortnightly Review کی ادارت حاصل ہو سکی تھی کیونکہ مورین کے والد اس جریدے کے ڈایرکٹروں میں سے ایک تھے۔

76 ۔ ملاحظہ ہو 30 جولائی 1898ء کے مسلم کرانیکل کا اداریہ بعنوان
Reflections on the Aligarh Movement'

مزید ملاحظہ ہو C. F. Andrews - Zaka Ullah of Delhi کا باب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

89 - 102 صفحات The Ahrari Movement

77. 23, اگست 1900ء کے پایونیر میں یہ اقتباس نقل ہوا۔

78 The Pioneer, Aug. 1, 1901 ۔ میکڈونل کے کہنے کے مطابق اُس کی تقرر کردہ 249 آسامیوں میں سے 107 جگہیں مسلمانوں کو اور 142 جگہیں ہندوؤں کو دی گئیں۔ ملاحظہ ہو 2 اگست 1900ء کے بنگالی Bengalee کا تبصرہ۔

79 ۔ ہز ایکسلنسی سر بی۔ فلر گاوٹ (H E Sir B Fuller Govt) نے ڈویژنل کمشنروں اور ڈسٹرکٹ ججوں کے مابین جو مراسلہ گشت کرایا تھا اُس کے حسب ذیل اقتباس سے حقیقت حال کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

"منسلکہ گوشوارہ (جو اس کتاب میں ضمیمہ الف کے طور پر شامل کیا گیا ہے) تقابلی طور پر مشرقی بنگال کے تمام اضلاع میں اُن دفتری (صیغہ وارانہ) آسامیوں کی تعداد کو ظاہر کرتا ہے جن پر مسلمان مامور ہیں ساتھ ہی جملہ آبادی کے ساتھ مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ اس گوشوارے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جملہ آبادی کا دو تہائی حصہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کے پاس مذکورہ اسامیوں کا صرف ½ حصہ ہے۔ آبادی کے تناسب کی مناسبت سے اُنھیں 2741 اسامیاں ملنی چاہیے تھیں جبکہ دراصل وہ صرف 647 اسامیوں پر ہی مامور ہیں"۔

جولائی 1906ء کے پایونیر میں یہ اقتباس نقل ہوا۔

80 ۔ انڈین سول سروس کے ایف۔ ڈبلیو بریڈلے بٹ F.W. Bradley-Birt کے کہنے کے مطابق:

سن 1840ء کے ابتدائی ایام میں جبکہ عبداللطیف نے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنا شروع کیا تھا کافی تنازعے کے بعد انگریزی کی تعلیم وہاں رائج ہوئی۔ لیکن اب بھی اس کی مخالفت اتنی شدید تھی کہ طلباء انگریزی کی جماعتوں کا عملاً مقاطعہ کرتے تھے۔ انھیں عربی فارسی اور فقہ کی جماعتوں سے نکال کر انگریزی کی جانب راغب کرنا بہت وقت طلب کام تھا۔ فقریا اسلامی قانون تیزی سے ملکی قانون ہونے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیثیت کھوتا جا رہا تھا۔ انھیں یہ بتانا لاحاصل ہو رہا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں انگریزی کی تعلیم ناگزیر ہے اور اب عربی، فارسی اور اسلامی قانون کے مطالعے کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی ہے جو کسی دور میں ہوا کرتی تھی۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب Twelve men of Bengal in the Nineteenth century - 116

The Times Sept 4 1093 - 81

82 ۔ عبداللطیف اور امیر علی کے مابین پائی جانے والی رقابت اور شدید اختلافات کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ W. S Blunt کی کتاب

Ineha upto Ripon : A Private Diary 977 100

Ameer Ali " Memoirs in Islamic Culture - 83
Oct 1931 — 513

84 ۔ بقول شمبھو چندر ڈے "سعادت علی جن دنوں بنگال آئے اُس وقت وہاں ڈپچ لوگوں کی عملداری تھی" ملاحظہ ہو امیر علی کے بارے میں مصنف کا مضمون جو نومبر 1903ء کے ہندستان ریویو کے صفحات 418-29 پر شایع ہوا۔

Ameer Ali Memoirs in Islamic Culture Oct 1931 p 525 85

86 ۔ امیر علی کی قانونی کتابوں میں زیادہ اہم اور مشہور کتابوں کے نام اس طرح ہیں۔

Mohammadan Law: 2 Vols; Law of Evidence as Applicable to British India; Civil Procedure in British India and A Commentary on the Bengal Tenancy Act.

87 ۔ نیٹسن Nadeson کی کتاب Eminent Mohammadans 159

88 ۔ جولائی 1932ء کے اسلامک کلچر میں شایع شدہ "یادداشتوں" میں انھوں نے نقل کیا۔

89 ۔ نیٹسن Nadeson کی کتاب Syed Ameer Ali میں نقل ہوا۔

90 ۔ ملاحظہ ہو 7 دسمبر 1902ء کے پایونیر میں Indians of Today کے سلسلے میں شایع شدہ طیب جی کی زندگی کا خاکہ

91 ۔ ملاحظہ ہو نیٹسن Nadeson کی کتاب Badruddin Tyabji

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

92- The Times, Aug 21 - 1906.

93 Annual Congress Report (1887), 72.

94 ۔ تعلیم نسواں کے میدان میں طیب جی کی مساعی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ملاحظہ ہو شیخ عبدالقادر کا مقالہ بعنوان Young India, His hopes and Aspirations مطبوعہ Journal of the East India Association بابتہ اپریل 1906ء صفحات 62-63

95 نیٹسن کی کتاب Eminent Hindustanis کے صفحہ 159 پر منقول۔

96 ۔ ملاحظہ ہو ستمبر 1906ء کے Indian Review میں اُن کا مضمون "Bombay" صفحات 654-55

97 ۔ ملاحظہ ہو نیٹسن Natesan کی کتاب Rahmatullah Mohammad Sayani مزید ملاحظہ ہو سایانی کا سوانحی خاکہ جو 27 اکتوبر 1926ء کے پایونیر کے Indians of Today نامی سلسلے میں شایع ہوا۔

98 ۔ دراصل سایانی کی سربراہی کے زمانے میں ہی بمبئی میونسپل کارپوریشن نے حکومت کے روبرو یہ تجویز پیش کی تھی کہ اُس کے سربراہ یا صدر کو بھی لندن کے لارڈ میئر Lord Mayor کی طرح بمبئی کا لارڈ میئر تسلیم کیا جائے اور اُسی کی طرح اسے بھی عہدے کے اعزاز کے طور پر طلائی تمغہ اور طلائی زنجیر عطا کی جائے۔

99- The Bengalee June 9, 1902

100- The Times of India Overland weekly Edition June 7, 1902

101- Annual Congress Report (1913) 1-2

102 ۔ میر ہمایوں جاہ نے کانگریس کی کتنی مدد کی اس کے سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو، 14 جنوری 1888ء کے Indian Mirror کا اداریہ بعنوان "The Congress and the Madrasis"

103 ۔ ملاحظہ ہو وہ انٹرویو جو نواب صاحب نے Indian Daily News کے نامہ نگار کو دیا تھا جسے Bengalee نے اپنی 4 اکتوبر 1906ء کی اشاعت میں نقل کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

105 ۔ پایونیر کے مطابق "یہ سچ ہے کہ مجلس مقننہ کے وہ معزز رکن جو مدراس کی نمائندگی کرتے ہیں اس وقت شملہ ہی میں موجود تھے اور بعض اخبارات نے تو اُن کا نام وفد کے سربراہ کی حیثیت سے لینا بھی شروع کر دیا تھا لیکن آخری لمحات میں اُنھوں نے وفد کی جانب سے وایسرائے کی خدمت میں پیش کی جانے والی یادداشت کو جس شکل میں اس کے مسودے کو قطعیت دی گئی تھی' غیر مناسب قرار دے دیا۔"

(The Pioneer, NOV. 5, 1906)

106 ۔ Annual Congress Report (1919) p. 10.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گیارہواں باب

نتائج

بیسویں صدی کی ابتدا میں مسلمانانِ ہند کی ترقی کے تشکیلی دور کا مطالعہ جس شرح و بسط کے ساتھ کیا جا سکتا تھا تا حدِ امکان میں نے کیا۔ چونکہ بنیادی طور پر یہ ایک سیاسی تجزیہ ہے اس لیے یہ اُن کی زندگی کے ہر پہلو کا ہمہ گیر جایزہ نہیں بن سکتا۔ تاہم میں نے اُن کی زندگی کے ایسے تمام اہم گوشوں کا تفصیلی جایزہ لینے کی کوشش کی ہے جن کا راست اثر ان کی سیاسی فکر پر پڑ سکتا تھا۔ ممکن ہے بظاہر یوں محسوس کیا جائے کہ اس کتاب میں مسلمانوں کی بیداری کے جن مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ ایک غیر مربوط قسم کا مطالعہ بن کر رہ گئے ہیں تاہم بہ نظرِ غایر دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ یہ سبھی پہلو ایک دوسرے کے ساتھ ایک مضبوط رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ رشتوں کے اسی تسلسل کی وجہ سے بعض نتایج کا اخذ کرنا ممکن ہو سکا ہے جن کی توثیق بڑی حد تک حالات اور واقعات کے ذریعے بھی ہوئی ہے۔ یہ درست ہے کہ ان نتایج کو زیادہ سے زیادہ ظن و قیاس ہی قرار دیا جا سکتا ہے تاہم انھی کی بدولت ہم ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کے عروج، خاص طور سے اس عروج کی نوعیت اور اس کے نتایج کا جایزہ لے سکتے ہیں۔ اس باب میں اسی قبیل کے چند اہم ترین نتایج کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سب سے پہلے تو اُس دَور کی اُبھرتی ہوئی نسل کے لیے انگریزی تعلیم کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا اور اسی مسئلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین بنیادی فرق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پایا جاتا تھا۔ یہ فرق نہ صرف انگریزی تعلیم دلوانے کے وقت سے متعلق تھا بلکہ مسئلے کی نوعیت کے بارے میں بھی تھا۔ اسی فرق کی وجہ سے مغرب کے ساتھ دونوں قوموں کے روابط دو مختلف سطحوں پر استوار ہوئے۔ ہندوؤں نے لبرل خیالات کو اپنا لیا جبکہ مسلمان صدیوں پرانی جاگیردارانہ Aristocratic قدروں ہی سے چپکے رہے۔ اسی وجہ سے نفسیاتی طور پر ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے نزدیک جدید تعلیم نصاب کی ظاہری یکسانیت کے باوجود اپنی ہمہ گیری اور وسعت میں ایک کم تر درجے کی چیز قرار پائی۔ علاوہ ازیں سرسید کی وفاداری اور خدمات سے متاثر ہو کر برطانوی عہدیدار بھی مسلمانوں کے ردِ عمل اور تعصبات کے تعلق سے زیادہ ہی حساس ہو گئے تھے اور ہر قیمت پر مسلمانوں کے خدشات کو دور کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی جذبات و احساسات کا احترام کرنے کی خاطر انگریزوں نے جو بیشتر اقدامات کیے اُن کی وجہ سے مسلم سماج کا قدیم ڈھانچہ کمزور ہونے کی بجائے اور قوی ہو گیا اور ان کی قدیم طرزِ زندگی کو دوام حاصل ہو گیا۔

اس کے علاوہ سرسید کی ذات زیرِ تحقیق مدت کے دوران مکمل طور پر مسلمانوں کی سیاست پر چھائی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے ہم مذہبوں میں کئی جدید تحریکوں کو رائج کرنے کا سہرا اُنھی کے سر ہے۔ اُنھی کی کوششوں کی وجہ سے مذہبی فکر کو عقلیت کے سانچوں میں ڈھالا گیا۔ اُنھی کی وجہ سے اردو تحریر میں سادگی، بُرکاری کی شان پیدا ہوئی، اُنھی کی کوششوں کی وجہ سے مسلم دانشوروں کی رسائی انگریزی ادب کے خزانوں تک ہو پائی۔ یہ اُنھی کی ذات تھی جس نے علماء کے مذہبی کٹرپن سے ٹکر لی اور یہ اُنھی کی ذات تھی جس نے قومی نجات کے لیے جدید تعلیم کی اہمیت کو آشکار کیا۔ لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود آخر وقت تک وہ اپنی جاگیردارانہ ذہنیت اور امیرانہ رویے پر کاربند رہے اور ہمیشہ کسی تحریک میں عوام کی شرکت سے خائف رہے کہ مبادا وہ قابو سے باہر ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ہم عصر ہندو مصلح راجہ رام موہن رائے کے برخلاف سرسید نے نئی تعلیم کو محض سرکاری ملازمتوں کے حصول اور اپنی قوم اور برطانوی راج کے مابین وفادارانہ رابطے کا ایک ذریعہ سمجھا نہ کہ اُس سماج کو جدت عطا کرنے والی قوت جس کے ایک فرد وہ خود تھے اور جدت بھی سطحی معنوں میں نہیں بلکہ اُن لبرل اور سائنسی قوتوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی اصطلاح میں جو خاص اُس عہد کی آفریدہ تھیں۔ جیسا کہ حالی نے سرسید کی سوانح میں انکشاف کیا ہے' ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے بانی آخر وقت تک تکنیکی تعلیم کے خلاف رہے اور مسلمانوں میں اس کی ترویج کی مخالفت کرتے رہے۔ سرسید کے قریبی ساتھی بیک نے بھی اس امر کی وضاحت ۱۸۶۹ء میں پالیو فیر کے نام موسوم اپنے ایک مراسلے میں کی تھی۔ سرسید کے اس رویے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جدت پسندی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود مسلمانوں میں صرف محدود پیمانے پر بیداری پیدا ہو سکی جس کے باعث مسلمان قوم میں اُس قسم کی اصلاحات نہ کی جا سکیں جن سے ہندو قوم کی زندگی مختلف حیثیتوں میں متاثر ہونے لگی تھی اور جن کے باعث ان کے سماجی نقطۂ نظر کا از سرِ نو تعین کیا جانے لگا تھا۔ نہ صرف عام مسلمان بلکہ ان میں جدید ذہن رکھنے والے افراد بھی ماضی ہی سے چمٹے رہے جس کی وجہ سے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ اُن کی ہم آہنگی ایک دقت طلب، طویل اور اُکتا دینے والا عمل بن گئی۔

سرسید نے مسلمانوں کی اِس پسماندگی کی چار وجوہات بیان کی ہیں: (۱) سیاسی روایات (۲) سماجی رواجات (۳) مذہبی معتقدات اور (۴) غربت و افلاس۔ اس بارے میں انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

> مسلمان اپنی سماجی اور سیاسی حیثیت پر نازاں تھے۔ جن وجوہات کی بنا پر انھوں نے اپنے آپ کو انگریزی تعلیم سے الگ رکھا ان میں ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ سرکاری مدارس اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا میں بعض ایسے بھی ہوتے تھے جنھیں مسلمان' اپنے غیر ضروری فخر اور گھمنڈی پن میں اپنے آپ کو غیر معقولیت کے ساتھ دھوکہ دیتے ہوئے' سماجی طور پر نیچ اور قابلِ نفرت گردانتے تھے۔ ہزار کوشش کے باوجود یہ بات اُن کے ذہن نشین کرائی نہ جا سکی کہ عربی اور فارسی کے علاوہ بھی کچھ زبانیں ایسی ہو سکتی ہیں جن میں مفید اور معقول علم کے خزانے بھرے ہو سکتے ہیں۔ اخلاقی فلسفے کو بھی انھوں نے ایک مخصوص شکل دے رکھی تھی اور مذہبی اصولوں کی بنیاد پر استوار کیا تھا جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ حتمی اور قطعی اصول ہیں۔ ان حالات میں اُن کا خیال تھا کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یورپی علم و ادب کا سیکھنا قطعاً غیر ضروری ہے۔ مجھے اب تک وہ دن یاد ہیں جب شرفاء کے خاندانوں میں سرکاری یا اور کوئی منفعت بخش ملازمت کے حصول کی نیت سے انگریزی زبان کا سیکھنا انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب مسلمانوں کی اس تنگ نظری میں بڑی حد تک کمی واقع ہونے لگی ہے۔[2]

مزید یہ کہ وہ مسلمان جو انگریزی تعلیم کی جانب متوجہ ہوتے زیادہ تر قدیم جاگیردار اور زمیندار طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ مسلمانوں کو چونکہ دولت، ثروت اور اقتدار کے علاوہ بھی بہت کچھ نقصانات برداشت کرنے پڑے تھے اس لیے ایک جانب تو وہ ہر معاملے میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گئے تھے اور بعض اوقات اپنے مستقبل کے تعلق سے شدید خدشات محسوس کرتے تھے تو دوسری جانب اپنے قدیم رسم و رواج کے بے حد دلدادہ ہونے کے سبب فرسودگی کے جنجال سے آسانی سے دامن نہیں چھڑا پائے جتنی آسانی کے ساتھ ہندوؤں نے اپنا دامن چھڑا لیا تھا۔ اسی وجہ سے انگریزوں کے فراہم کردہ ترقی کے نئے مواقع کا وہ بھرپور فایدہ نہ اٹھا سکے۔ ہندوؤں میں انگریزی تعلیم سے آراستہ ہو کر ابھرنے والا نیا طبقہ جداگانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ چنانچہ 1861ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے جن 44 ہندو طلباء نے گریجویشن کی تکمیل کی اُن میں سے ایک کا بھی تعلق ہندوؤں کے طبقۂ شرفاء سے نہ تھا۔[3] جیسا کہ پانچ سال بعد سر ہنری مائین Sir Henry Maine نے واضح کیا تھا، "امر واقعہ یہ ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کے بانیوں نے جس وقت اس تعلیمی ادارے کی داغ بیل ڈالی تھی اُسی وقت اُن کے ذہن میں یہ بات محفوظ تھی کہ ایک اشرافی ادارہ Aristocratic Institution قایم کر رہے ہیں لیکن اُن کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ یونیورسٹی عامۃ الناس کا ادارہ بن گئی۔"[4] دونوں فریقوں کی تعلیم یافتہ نسلوں کی سماجی اور معاشی حیثیتوں کے اس فرق کا گہرا اثر اُس رویّے پر پڑا جو ان دونوں قوموں نے سیاسی اور سماجی مسایل کے تعلق سے اختیار کر رکھا تھا۔

اِنھی واقعات اور رجحانات نے فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھا۔ سیاسی اور معاشی مسایل نے دونوں قوموں کے مابین تفریق کو کم کرنے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بجائے اختلافات کی خلیج کو اور وسیع کیا جس کی وجہ سے پرانی دشمنی اور ٹکراؤ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ کئی معاملات میں اِن اختلافات نے جدید صورت اختیار کرلی۔ اختلافات کی بعض جدید صورتیں تو خالصتاً برطانوی راج کی پیدا کردہ تھیں جن کے باعث حالات میں مزید ابتری پیدا ہوگئی۔ مثلاً انگریزوں نے جو زرعی اور صنعتی اصلاحات نافذ کیں اُن کی بدولت مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو کہیں زیادہ فایدہ ہوا۔ اور مسلمان بُری طرح یاسیت اور احساس محرومی کا شکار ہو گئے۔ اسی طرح ہندی۔اردو قضیے نے باہمی نفرت اور رقابت کو کافی ہوا دی اور مسلمانوں کو اپنی تہذیبی انفرادیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ فسادات کی وجہ سے فرقہ واریت کا زہر پورے سماج میں پھیل گیا۔ سیاسی جلسے جلوسوں کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنا مستقبل معرضِ خطر میں نظر آنے لگا۔ اس کے علاوہ پریس کو عوامی زندگی میں کافی اہمیت حاصل ہوگئی اور اسی پریس کی وجہ سے ہندوؤں کا موقف مزید مستحکم ہوگیا۔ اس کے علاوہ بہ شمولِ انتظامیہ زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ ہندوؤں نے عملاً برتری حاصل کرلی جس کے باعث مسلمانوں کے دل و دماغ پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ اس صورتِ حال کی وجہ یہ تھی کہ ترقی کے ہر میدان میں مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں کوسوں پیچھے تھے۔

ان حالات کے علاوہ مسلمانوں کو آئے دن معمولی درجے کے انگریز عہدیداروں سے بھی واسطہ پڑتا تھا جن کی اپنی پسند اور ناپسند ہوا کرتی تھی۔ اپنی روزمرہ کی معاملت میں بعض انگریز عہدیدار ہندوؤں کو پسند کرتے تھے تو بعض مسلمانوں کو چاہتے تھے۔ اس رویے کی وجہ سے بھی بعض اوقات دونوں قوموں کی باہمی جارحیت جاگ اٹھتی تھی۔ اسی وجہ سے انگریزوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا۔ موریسن نے کیا خوب کہا ہے: "اس حقیقت کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ معلوم کرنا اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے کہ ہم نے ہندستان میں کبھی قومی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور جان بوجھ کر ایسی تحریکات شروع کیں جن کی وجہ سے انتشار اور پھوٹ کے جذبے کو ہوا ملی"[5] تاہم ہمیں اس حقیقت سے نظر نہ رکھنا چاہیے کہ دراصل ان تحریکات کی وجہ سے قومی اتحاد کے جذبے کو اتنی ٹھیس نہیں پہنچی جتنی کہ اُن تحریکوں کو چلانے کے مخصوص طریقوں کی وجہ سے پہنچی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاہم یہ کہنا غلط ہوگا کہ واقعی انگریزوں کے پاس پہلے سے طے شدہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی کوئی پالیسی موجود تھی جس پر برطانوی کابینہ یا وایسرائے عمل پیرا ہوا کرتے تھے بلکہ ڈھیر سا تحریری مواد آج بھی موجود ہے۔ جو اس نظریے کی نفی کرتا ہے نہ کہ اثبات۔ اس امر کا کھلے بندوں اعتراف کسی معمولی شخصیت نے نہیں بلکہ کانگریس کے سابق صدر سر ولیم ویڈر برن Sir William Wedderburn کے علاوہ نوروجی اور گوکھلے جیسے زعمائے ہندستانی رہنماؤں نے بھی کیا ہے۔ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" یہ انگریزوں کی پالیسی نہیں تھی۔ پھوٹ تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ اُن کی پالیسی تو کرزن کے کلاسیکی الفاظ میں یہ تھی کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین انصاف کی ترازو کے پلڑوں کا توازن برقرار رکھو"۔ چنانچہ اس پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کبھی اس قوم کو فوقیت دی گئی تو کبھی اس قوم کو۔ ایسا کرتے ہوئے انگریزوں نے اپنی مصلحتوں کے علاوہ حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرقہ دارانہ حسد اور رقابتوں میں کمی ہونے کی بجائے مزید اضافہ ہوگیا۔ اس پالیسی کو اپنانے میں اُن کا مقصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ رہا ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ بین۔ قومی ہم آہنگی جیسے اہم اور بنیادی مسئلے کے تعلق سے ان کا یہ غیر استدلالی Pragmatic رویہ اُن کے "مصلحانہ کردار" سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا یہ رویہ اُس جغرافیائی اتحاد کی عین ضد قرار پاتا ہے جو اُنھوں نے اس برِصغیر میں پیدا کیا۔ لیکن انھوں نے یہ جغرافیائی وحدت محض اپنی انتظامی ضروریات کی وجہ سے قایم کی تھی۔ اس کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ ماتحت رعایا کی دونوں قوموں کے باہمی تعلقات میں بھی توافق پیدا کیا جائے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کولون Colvin اور اسٹریچی Strachey جیسے بعض عہدیداروں نے مسلمانوں کی اس بات کے لیے ہمت افزائی کی کہ وہ ملکی معاملات میں اپنا ایک جداگانہ رویہ اختیار کریں۔ اسی طرح بعض انگریز عہدیداروں نے اس بات کی کوشش کی کہ ہندو اپنی ایک جداگانہ حیثیت کی تعمیر کریں جس کی اساس ان کی قدیم تہذیب اور تمدّن پر رکھی گئی ہو۔ اس حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دونوں قومیں قدیم قدیم اقتدار میں ایک مخصوص کشش محسوس کرنے لگیں۔ لیکن اپنے اصلاحی جوش و خروش کی وجہ سے ہندو قوم، اندھی جذباتی عقیدت میں ماضی پرستی کی راہ اختیار کرنے سے محفوظ رہی اور بڑی حد تک برطانوی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لبرل خیالات سے متاثر ہوئی۔

1875ء میں بمبئی میں دیانند سرسوتی نے آریا سماج کی داغ بیل ڈالی۔ اس تحریک نے مغرب زدگی کے رجحان کی روک تھام کرنے کی کوشش شروع کر دی اور ہندو ازم کے احیا کا نعرہ بلند کیا تاہم انگریزی تعلیم کے تعلق سے اس تحریک نے بڑا ہی واضح موقف اختیار کیا۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے متعدد مدراس اور کالج شروع کر کے اس تحریک نے اپنی قوم کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے۔ ان تعلیمی اداروں کے قیام کا مقصد قدیم ہندو نظریات کی تبلیغ اور اشاعت کرنا تھا لیکن عملاً ان اداروں نے مغربی دنیا کے ساتھ ہندوؤں کے روابط کی استواری کی ہمت افزائی کی خاص طور پر فنون اور تکنیکی میدانوں میں[8]۔ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے سیاسی اور سماجی امور میں جدید مغربی افکار کو اپنے لیے خیر موزوں پایا اور قدامت پرستی اور عہدِ قدیم کی فرسودہ روایات ہی سے چمٹے رہے۔ یہ بات ان کی تعلیم، ان کے پریس، ان کی سماجی اصلاحات اور اُن کے معاشی رویّے سے بخوبی ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں اپنے مخصوص پس منظر کی وجہ سے بخوبی ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں اپنے مخصوص پس منظر کی وجہ سے مسلم قایدین نے بھی عام مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کا اشتراکِ عمل کرنے سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ اُن کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے نہیں تھا کہ انھیں ہندوؤں سے نفرت تھی بلکہ اس وجہ سے تھا کہ جبلی طور پر وہ خود کو اور اپنی قوم کو ہندو اکثریت کے امکانی غلبے سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ انگریزوں کو بین قومی جھگڑوں کے حل کے لیے ثالث تصور کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بدیسی ہونے کی وجہ سے انگریزوں کو اس امر میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی اور تہذیبی انفرادیت کو مجروح کریں۔ اس کے برخلاف مسلمان رہنما سمجھتے تھے کہ ہندو قوم چونکہ اکثریت میں ہے اور کئی نسلوں تک غلامی کی ذلت برداشت کرتی آئی ہے اس لیے وہ ضرور اس بات کی کوشش کرے گی کہ اپنی برتری کو دوسروں پر مسلّط کر دے۔ مسلمانوں کے اس رجحان کی وجہ سے لبرل ہندو قیادت بطور خاص اُن کانگریسی رہنماؤں کو دلی تکلیف پہنچی جو دل سے اس بات کے متمنی تھے کہ وسیع تر قومی مفاد کے حصول کی خاطر مسلمان اُن کے ساتھ اشتراکِ عمل پر آمادہ ہوں۔ انھوں نے طرح طرح سے مسلمانوں کا دل جیتنے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوشش کی لیکن نتیجہ ہمیشہ مایوس کن رہا۔ مسلمان بدستور ہندوؤں کی جانب شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے اور انگریز حکمرانوں کی موجودگی کے باعث خود ہندو بھی مسلم اقلیت کے خدشات اور تعصبات کو دور نہ کر پائے۔

پھر سرسید نے بھی مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ رکھنے میں کوئی معمولی کردار انجام نہیں دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید کے پاس ایسا کرنے کی معقول وجوہات موجود تھیں جن پر گزشتہ ابواب میں سیر حاصل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ تاہم وہ چیز جس نے انھیں ہندوؤں کا پکا سیاسی حریف بنا دیا تھا، یہ تھی کہ وہ لوگ (ہندو) انتظامیہ اور قانون ساز اداروں میں زیادہ سے زیادہ نمایندگی دیے جانے کا مطالبہ کرنے لگے تھے ہندوؤں نے جب تک یہ مطالبہ نہیں کیا تھا اُس وقت تک خود سرسید بھی اس ملک کے مسلمانوں کو ہندو ہی کہا کرتے تھے۔ لیکن جوں ہی حکومت کے انتظامی اور پالیسی ساز اداروں میں ہندستانیوں کی شمولیت کی مانگ دُہرائی جانے لگی سرسید چوکنے ہو گئے۔ چنانچہ اُنھوں نے کانگریس کے ہر مطالبے کی مخالفت کرنی شروع کر دی خواہ وہ مطالبات کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں۔ اُنھوں نے اس تنظیم کو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ ہندستان کی دوسری اقوام کے لیے بھی یکساں طور پر خطرناک قرار دیا۔ انھیں اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ یہ تحریک مسلمانوں کی سالمیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسی وجہ سے وہ برطانوی حکومت کو اس ملک میں مشیتِ الٰہی کا مظہر تصور کیا کرتے تھے۔ سرسید کی وفات پر بیک نے کہا تھا "ایقان کی انتہائی پختگی کے ساتھ وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انتہائی فضل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندستانیوں کی تہذیب اور خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لیے ہم پر برطانوی حکومت نازل کی ہے۔ ایقان کی یہی پختگی ان کی شخصیت کا ایک غیر معمولی وصف تھی۔" نئی ہندو نسل کی ترقی اور کامرانی کی دل سے قدر کرنے کے باوجود اُن کا خیال تھا کہ بقول موریسن "دونوں قوموں میں ہم آہنگی برقرار رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے اقتدارِ اعلیٰ کی مضبوطی کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔"[12] وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا مسلمانوں کے لیے اذبس ضروری ہے کیونکہ خدانخواستہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو مسلمان جدید ہندو ازم کے امڈے ہوئے طوفان میں غرق ہو جائیں گے۔ اسی لیے سرسید نے اس بات پر زور دیا کیا اگر مسلمان انگریزوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے وفادار رہیں تو وہ محفوظ رہ سکیں گے۔ انھیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ آزمایش کی گھڑی میں انگریز مسلمانوں کا پورا ساتھ دیں گے۔ گو سرسید کے رفقا کا ایقان اس قدر راسخ اور پختہ نہیں تھا تاہم وہ اس بات کے لیے ہرگز آمادہ نہیں تھے کہ ہندو قیادت کی جانب سے تیقنات اور وعدوں کے جو سبز باغ انھیں دکھلائے جا رہے تھے ان کے عوض اس ایقان کا سودا کر لیں جو انھوں نے انگریزوں کی ذات سے وابستہ کر رکھا تھا۔ عارضی طور پر گو مسلمانوں کو اس رویّے کی وجہ سے بعض فواید بھی حاصل ہوئے اور کئی انگریز عہدیدار مسلمانوں کو ان کی قدیم تہذیب، شرافت اور شائستگی کی وجہ سے پسند بھی کرنے لگے۔ اس کے علاوہ مسلم قایدین کی قدامت پسندی میں انگریزوں کو وہ حربہ بھی دستیاب ہو گیا جس کے ذریعے وہ کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ اُن دنوں مسلمانوں کے اس رویّے کو کلکتہ اور لندن دونوں مقامات پر انتہائی گراں مایہ نعمت سمجھا گیا۔ اسی کی بنیاد پر اپنے تحکم پسندانہ طرزِ عمل کی حمایت میں دفترِ شاہی نے متعدد جواز اور دلیلیں وضع کیں۔

لیکن شترمرغ جیسے اس خود فریبانہ طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمانوں کو کوئی زیادہ فایدہ حاصل نہیں ہوا۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ مسلمانوں کی نگاہیں حال پر اتنی زیادہ مرکوز ہو گئی تھیں کہ مستقبل میں وہ ذرا دور تک بھی دیکھنے کے قابل نہیں تھے۔ اپنے مخصوص پس منظر کی وجہ سے مسلمان انگریزوں کی جانب سے طوعاً و کرہاً کیے گئے مختلف اقدامات کے عام سیاسی نتایج کی پیش بینی کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ انھیں ہرگز اس بات کا احساس نہیں تھا کہ برطانیہ قدیم نظم کو دوامًا برقرار رکھنے کی بجائے "تاریخ کا ایک غیر شعوری آلہ" بن کر "ہندوستان میں ایک سماجی انقلاب برپا کر رہا ہے"[13] چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان "مستفیدوں" کو اپنے انگریز "متولیوں" کے ہاتھوں پر نازک موڑ پر "کس مپرسی" کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ نئی قوتیں اس قدر اٹل ثابت ہوئیں کہ زیادہ دنوں تک ان کے خلاف مدافعت نہ کی جا سکی۔ تاریخ کے دھارے کو تو اپنا رُخ متعین کرنا ہی پڑا تھا، بدلتے ہوئے حالات اور تیزی سے گزرتا ہوا وقت مسلمانوں کی سہولت کے پیش نظر تھم نہیں سکتا تھا۔ جان بکھان John Buchan نے اس حقیقت کی جانب اپنی کتاب (Memoirs of Lord Minto) میں پرزور طرز پر اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلم وفد کے ساتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیے گئے وعدے کے باوجود گورنر جنرل کی یہ دلی خواہش تھی کہ اس ملک میں "پیروانِ اسلام کو بقیہ ہندستانی زندگی سے الگ تھلگ ایک منجمد علاقہ بننے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے"۔ پارلیمنٹ میں ہندستانی کونسلوں کے بل پر بحث کے دوران لارڈ مورلے Lord Morley نے تو یہاں تک کہا تھا کہ ہندو مسلم مسئلے کا سب سے بہترین حل غالباً یہ ہے کہ "متناسبہ نمایندگی کے اصول کی بنیاد پر ملے جُلے انتخابی اجتماع (Electoral College) قایم کیے جائیں"۔ لیکن آغا خان اور سید امیر علی کی مخالفت کی وجہ سے اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے اس کی جگہ ایک ہلکی پھلکی فرقہ وارانہ نمایندگی کی اسکیم کو منظوری عطا کی گئی۔ ہندستانی مسلمانوں کے مفادات کی وکالت کرنے والے ہمدردوں سے مورلے اس قدر تنگ آ چکے تھے کہ بالآخر انھیں منٹو سے کہنا پڑا "ہمیں اس احتیاط کو ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ مسلمان کو زمین سے اُٹھاتے ہوئے کہیں ہم ہندو کو ہاتھ سے نہ گرا دیں"[14]۔ مسلمانوں کے اس رویّے کا نتیجہ بالآخر یہ برآمد ہوا کہ انجام کار انھیں فایدہ کم اور نقصان زیادہ اٹھانا پڑا۔ مثال کے طور پر انھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ مسابقتی امتحانات کے سلسلے کو منقطع کر دیا جائے جبکہ رایل کمیشن نے سفارش کی کہ ان امتحانات کے انعقاد کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ انھوں نے دستوری سروس (Statutory Service) کی برقراری کا مطالبہ کیا جبکہ رائل کمیشن نے پرزور سفارش کی کہ اسے موقوف کر دیا جائے۔ انھوں نے لوکل بورڈوں اور بلدیاتی اداروں میں عوامی نمایندگی کے طریقے کی مخالفت کی جبکہ برطانوی حکومت نے اس طریقے کی ابتدا کرنے کی منظوری دی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ اردو زبان کی سرکاری طور پر سرپرستی کی جائے جبکہ برطانوی حکومت نے ہندی زبان کی پشت پناہی کی۔ انھوں نے برطانوی پارلیمان کے روبرو محضر پیش کیا کہ ہندستان میں کسی قسم کے پارلیمانی ادارے نہ قایم کیے جائیں جبکہ 1892ء کے کونسلس ایکٹ نے ایسے اداروں کے قیام کی راہیں ہموار کیں۔ انھوں نے حکومت سے التجا کی کہ بنگال کی تقسیم کو بحال رکھتے ہوئے فلر Fuller کو لفٹیننٹ گورنر کی حیثیت سے برقرار رکھا جائے جبکہ برطانوی حکومت نے اس صوبے کی تقسیم کو کالعدم قرار دیتے ہوئے دوبارہ اس پریسیڈنسی کو متحد کر دیا اور ہندوؤں کے احتجاج کے پیش نظر فلر کو واپس طلب کر لیا۔ آخر میں انھوں نے علیحدہ انتخابی حلقوں کا مطالبہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا جبکہ اس مطالبے کی مخالفت نہ صرف ہندستان کی مختلف صوبائی حکومتوں نے کی بلکہ بلکہ بشمول مورلے متعدد ممبرانِ پارلیمنٹ نے بھی اس کے خلاف رائے دی حالانکہ مورلے نے اس سے متضاد قسم کے تیقنات دے رکھے تھے[16] اس میں شبہ نہیں کہ آخرکار مسلمانوں کو علیحدہ انتخابی حلقے دے دیئے گئے لیکن انھوں نے جتنی نشستوں کا مطالبہ کیا تھا اُس کے مقابلے میں انھیں بہت کم نشستیں دی گئیں۔ حالانکہ کانگریس قیادت انھیں مشترکہ انتخابی حلقوں میں مسلمانوں کے لیے نشستیں مختص کرکے اس سے بہت زیادہ نشستیں دینا چاہتی تھی۔ یہ ایسی تجویز تھی کہ جسے قبول کرلیا جاتا تو مسلمانوں کے مفادات کا بڑی حد تک تحفظ بھی ہوجاتا اور وہ نئے ابھرنے والے قومی ڈھانچے کا جزو لاینفک بھی بن جاتے لیکن برطانیہ کے ساتھ وفاداری کے بلند بانگ دعوے کرنے کے باوجود مسلم قیادت یہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ محدود ترین جمہوریت میں بھی ان کی اقلیتی قوم اکثریت کے دستوری مقام تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی۔

اگرچہ اس مدت کے اختتام تک مسلمانوں کے خوابوں کا طلسم ٹوٹ چکا پھر بھی انھوں نے اپنی تمام تر توقعات انگریزوں ہی سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ تجربات کی تلخی سے انھوں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ مشرقی بنگال کے ایک مسلم رہنما' ڈھاکے کے سید نواب علی چودھری نے بڑے ہی رقت آمیز لہجے میں محسن الملک کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا تھا: "اگر مسلمانانِ بنگال بھی حکومت کی اطاعت و فرمانبرداری کی بجائے ہندوؤں کی طرح احتجاج کرتے اور تمام ہندستان کے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرکے اپنی آواز پارلیمنٹ تک پہنچاتے تو آج انھیں یہ بُرے دن دیکھنا نصیب نہ ہوتے[17]" اس خط کے طویل اقتباسات کو نقل کرتے ہوئے محسن الملک نے مسٹر آرچ بولڈ Mr. Archbold کو لکھا تھا:

> "جس قسم کے خطوط مجھے آجکل ہندستان کے طول و عرض سے موصول ہونے لگے ہیں، یہ ان کا محض ایک مختصر سا اقتباس ہے۔ لوگوں کی یہ عام شکایت ہے کہ سرسید کی اور میری پالیسی کی وجہ سے مسلمانوں کا کچھ بھی بھلا نہ ہوا۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ حکومت نے اپنی کارگردگی سے یہ ثابت کردیا ہے کہ احتجاج کے بغیر کوئی قوم اپنی بات حکومت سے تسلیم کروانے کی اُمید ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں رکھ سکتی اور یہ کہ اگر ہم اُن کے لیے کچھ نہ کر پائے تو ہمیں کالج کے معاملے میں اُن سے کسی قسم کے تعاون کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ مختصر یہ کہ مسلمان عام طور پر ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے کیوں کہ کالج کی پالیسی اُن کے مفادات کے سلسلے میں سدِّ راہ بنی ہوئی ہے۔ میرے عزیز آرچ بولڈ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کے موجودہ احساسات اور جذبات کا کوئی جواز موجود نہیں ہے ہماری لبرل حکومت ہی اِن تمام واقعات کے پسِ پشت کارفرما ہے اور اُسی پر موجودہ حالات کی تمام تر ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک غلط پالیسی ہے جو حکومت نے ہندستان کے اصل حالات سے لاعلمی کی وجہ سے اختیار کر رکھی ہے۔ مسٹر جان مورلے Mr John Morley ایک فلسفی ہیں جو فلسفیانہ درس دے دے کر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں اور ہمیں اس بات پر کفِ افسوس ملنے کے سوا اور کچھ چارہ نظر نہیں آتا کہ ہندستان کا مقدر اُن جیسے شخص کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا ہے۔ اُن کی پالیسیوں کی وجہ سے اب تک ہندستان کو کافی نقصان بھگتنا پڑا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ بھگتنا پڑے گا۔ کیا حکومت کے لیے جایز ہے کہ ہندستانی رعایا کے ایک ایسے اہم طبقے کو اس حد تک مایوس کر دیا جائے کہ وہ بھی ہندوؤں کی طرح احتجاج کا راستہ اپنانے پر مجبور ہو جائے، جس نے ہمیشہ حکومت کی حمایت کی ہو اور اپنے مفادات کے تحفظ کو حکومت ہی سے وابستہ کر رکھا ہو؟ میں امید رکھتا ہوں کہ حکومتِ ہند مسلمانوں کی شکایات کے ازالے کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ اقدامات کرے گی تاکہ ان کی کسمپرسی اور مایوسی دور کی جا سکے۔[19]

اس مکتوب کے اختتامی نوٹ میں محسن الملک نے لارڈ منٹو کی خدمت میں ایک وفد بھیجے جانے کے تصور کی جانب بھی اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا: "میں سوچیس الاتوشے Sir James da Touche کو اپنی اس تجویز سے مطلع کر چکا ہوں کہ میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ وائسرائے کی خدمت میں ایک وفد تفصیلی یادداشت کے ساتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھجوایا جائے"۔ محسن الملک کے اس معروضے پر ہمدردانہ غور و خوض کرنے کی سفارش کرتے ہوئے مسٹر آرچ بولڈ نے وایسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر ڈنلپ اسمتھ (Mr. Dunlop Smith) کو لکھا:

اگر مسلمانوں کو (خانگی طور پر) مطلع کر دیا جاتا ہے کہ اُن کے وفد کو خوش آمدید کہا جائے گا اور ان کے مطالبات کے بارے میں بیان بھی جلدی کیا جائے گا تو اس کے جواب میں ہندستان کے مختلف علاقوں سے مسلمانوں کے نمایندے شملہ آکر انتہائی محتاط انداز میں تیار کیا ہوا اپنا ایک محضر وایسرائے کی خدمت میں پیش کریں گے۔ اس وفد کے ارکان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوگی کیونکہ صرف وہی لوگ اس وفد میں شامل کیے جائیں گے جو ملت کے جانے پہچانے افراد ہوں۔ اس وفد کے رہنماؤں کے تعلق سے اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ معمولی درجے کی بھی غیر وفاداری یا کسی اور قابلِ اعتراض بات کا اظہار نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ حکومت کو کسی قسم کی تکلیف میں مبتلا کریں۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں وہ اپنے مستقبل کے تعلق سے ایک طرح کے کرب اور یاسیت کا شکار ہیں اور انھیں ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ مبادا اُنھیں بے حسی کے ساتھ یکہ و تنہا نہ چھوڑ دیا جائے[20]

مسٹر آرچ بولڈ کے اس تیقن کی بناء پر مسٹر اسمتھ نے محسن الملک کو مطلع کیا کہ "ہز ایکسلنسی وفد کا استقبال کر کے خوشی محسوس فرمائیں گے"[21] چنانچہ وفد کی ملاقات کو کسی معنی میں بھی "شاہی حکم کی تعمیل میں دکھلایا گیا کرتب"[22] قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ تو محسن الملک اور اُن کے رفقاء کی جانب سے کی جانے والی وہ آخری جان توڑ کوشش تھی جس کے ذریعے یہ لوگ نہ صرف خود کے موقف کو مستحکم بنانے بلکہ اپنی قوم کے حق میں انگریزوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں کی نیت یہ ہرگز نہیں تھی کہ وقت پر مسلمانوں کا "ساتھ چھوڑ دیں" بلکہ انھوں نے اکثر ان کے ساتھ نہایت ہمدردانہ برتاؤ روا رکھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ مطلق العنان فرمانرواؤں جیسا برتاؤ روا رکھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ وہ مطلق العنان فرمانرواؤں جیسا برتاؤ روا نہ رکھ سکے جس میں کہ ہر قسم کی مخالفت کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ انگریز ہندستانی عوام کی اُمنگوں کو نظر انداز نہ کر سکے اور اپنے راج کی بقاء کی خاطر محض اقلیتوں پر تکیہ نہ کر سکے۔ بسا اوقات اُنھیں اپنی مرضی کے خلاف اُن نئی اُبھرتی ہوئی طاقتوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لینا پڑا جو کم و بیش انھیں کی پیدا کی ہوئی تھیں۔ ان جدید قوتوں نے بعض ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جن کا وہ خود اپنی مسلمان رعایا ہی کی طرح شکار ہو گئے تھے۔ اُن کا انتظامیہ محض برطانوی ڈھنگ کا تھا جس میں لاکھ فہمیتی ہی سہی لیکن ایک خاص قسم کی پارلیمانیت کا عنصر ضرور جھلکتا تھا۔ انھوں نے صنعت کاری کو اس ملک میں رائج کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس کی وجہ سے قدیم معاشی نظام درہم برہم ہو جائے۔ انھوں نے بنک کاری اور جدید کاروباری طریقوں کی پشت پناہی کی۔ ان اقدامات کا خاطر خواہ فایدہ صرف وہ لوگ حاصل کر سکتے تھے جو بہتر طور پر تربیت یافتہ ہوں یعنی جن کی تربیت جدید ترین خطوط پر عمل میں آئی ہو اور سب سے آخری بات یہ کہ برطانوی عہدیداروں نے ہندستانیوں کو انگریزی زبان سکھادی جس نے ہندستانیوں کو انتظامیہ کے ایک جدید تصور سے روشناس کرایا۔ یہ لازم تھا کہ انتظامیہ کا یہ جدید تصور ایک سے زیادہ مفاہیم میں برطانوی طرز کا ہو۔ دراصل دس سال سے بھی کم مدت میں منٹو کے جانشین لارڈ ہارڈنگ Lord Hardinge کو برسرِ عام تعلیم کرنا پڑا "حکومتِ خود اختیاری کے تصور کو ہندستان کے قومی نصب العین کے طور پر تسلیم کر لینے میں مجھے ایک لمحے کو بھی تامل محسوس نہیں ہوتا"[23] یہی تو وہ چیز تھی جس کا مطالبہ 1905ء میں کلکتہ میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کے دوران دادا بھائی نوروجی نے اپنے صدارتی خطبے میں کیا تھا۔ "ہم حکومت سے کسی رعایت یا نوازش کا مطالبہ نہیں کرتے..... ہم صرف انصاف چاہتے ہیں..... تمام معاملے کا فیصلہ صرف ایک لفظ پر سمجھوتہ کر کے کیا جا سکتا ہے اور وہ لفظ ہے سوراج یا اُس قسم کی حکومت خود اختیاری جو برطانیہ یا دیگر نوآبادیوں میں رائج ہے۔"

ہندو چونکہ اس ملک کی غالب اکثریت ہیں لہٰذا ان تمام تبدیلیوں کا بھرپور فایدہ مسلمانوں کو نہیں بلکہ اُنھی کو حاصل ہوا۔ مسلمان جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، ہر میدان میں ہندوؤں کے مقابلے میں میلوں پیچھے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ جب جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لندن میں قدامت پسندوں کو اقتدار حاصل ہوا تب تب ان تبدیلیوں کی رفتار قدرے ماند پڑ گئی لیکن جن دنوں لبرل پارٹی برسرِ اقتدار رہی اُن دنوں انتظامی سطح پر نہ سہی کم از کم اخلاقی اور سیاسی سطح پر کانگریس تحریک کو حکومتِ برطانیہ کی زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل ہوتی رہی۔

لیکن ان صداقتوں کا سامنا کرنے کی بجائے مسلمان قائدین نے تحفظات کے لیے واویلا مچانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ انگریز چوں کہ ہندستان کے مخصوص حالات سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے بیشتر مطالبات کو تسلیم بھی کر لیا ان تحفظات کی وجہ سے اُس وقت تک تو مسلمانوں کا مقصد حل ہوتا رہا جب تک انگریز ہندستان کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ جائیں گے؟

مسئلے کا یہی ایک پہلو ایسا ہے جس پر اُس دور کے مسلم قائدین نے شاید ہی کبھی سنجیدگی سے سوچا ہو۔ اگر ان کے پاس دور رس نگاہیں ہوتیں اور وہ مستقبل کو اُس کے مناسب تناظر میں دیکھ پاتے تو شاید بعد کے حالات اُس المناکی کا شکار نہ ہو پاتے جس کی انتہا ملک کی تقسیم میں ظاہر ہوئی۔ لیکن کیا واقعی وہ خود کو ماضی کے تعصبات اور خدشات کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب ہو پاتے؟ مزید برآں، دونوں فریقوں کو ایکدوسرے کی نیت پر کیا اچانک طور پر یقین پیدا ہو جاتا جب کہ ایک فریق کا ذہن خدشات سے اور دوسرے کا شبہات سے بھرا ہوا تھا اور جب کہ ایک فریق کا نظریۂ اتحاد کا صرف زبانی اظہار کر رہا تھا اور دوسرا اس کی مخالفت پر کمربستہ تھا؟ اسی طرح جبکہ بعض ہندو اور مسلمان رہنما مذہبی تعصبات، سماجی عدم مساوات اور ثقافتی علیحدگی پسندی کے رجحانات کی زور شور سے مذمت کر رہے تھے کیا ان لوگوں نے اِن برائیوں کو صحیح معنوں میں دور کرنے کے لیے کوئی قابلِ قدر ٹھوس اقدامات بھی کیے؟ حقایق اس بات کے شاہد ہیں کہ ان لوگوں کو اپنے مقصد میں بُری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جوں جوں انتظامیہ میں عوامی اشتراک کے امکانات روشن ہونے لگے توں توں دونوں فریقوں کی مذہبی وفاداریوں میں بھی مزید شدت پیدا ہونے لگی۔ اگر زیادہ مسلسل اور وسیع تر پیمانے پر اور جذباتی سے زیادہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عقلی بنیادوں پر دونوں قوموں کو متحد کرنے کی کوششیں کی جاتیں تو ممکن تھا کہ آئندہ حالات موجودہ کے مقابلے میں زیادہ بہتر شکل اختیار کر پاتے۔ لیکن یہ بھی اسی قسم کے "اگر" اور "لیکن" ہیں جن سے تاریخ عالم بھری پڑی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریحات وحوالہ جات

گیارہواں باب (نتائج)

1۔ Pioneer January 7, 1891

2۔ سرسید کے مضمون بعنوان In Support of Muslim Education کا اقتباس ملاحظہ ہو ضمیمہ۔

3۔ Calcutta University Calendar (1861-62) 1902-12

راجہ نریندر پرشاد نے 2 جولائی 1870ء کو ٹاؤن ہال کلکتہ میں کی گئی اپنی تقریر میں کہا تھا: انگریزی تعلیم "بنگال کے اُن ذہین باشندوں" کی حد تک محدود تھی جن میں اتنی بھی صلاحیت موجود نہیں تھی کہ اس تعلیم کی فیس ادا کر سکتے۔

مزید ملاحظہ ہو ڈبلیو۔ آر۔ کولھٹ کر Kolhatkar کا وہ بیان جو Report by the Central Provinces Provincial Committee of the Education Commission کے صفحہ 270 پر شایع ہوا۔

4۔ یہ الفاظ آرتھر بیول Arthur Benell نے اپنی کتاب کے صفحہ 216 پر نقل کیے۔

5۔ Theodore Morison. Imperial Rule in India

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صفحات 8 - 7 - مزید ملاحظہ ہو مارچ 1904ء کے ہندستان ریویو میں رام پرشاد چندا کا مضمون بعنوان Racial Dissension in India صفحات 270-79

6 - ملاحظہ ہو 19 اگست 1900ء کے New York Sun کے نام موسومہ سسر ولیم ویڈربرن کا مراسلہ جسے 7 ستمبر 1900ء کے India نے نقل کیا۔

7 - ملاحظہ ہو 28 دسمبر 1901ء کے St. James Gazette کے اداریہ شذرات۔

8 - مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو لاجپت رائے کی کتاب The Arya Samaj (مطبوعہ لندن 1915ء)

9 "قوم" کے لفظ سے میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی مراد لیتا ہوں..... میرے خیال میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اُن کے مذہبی معتقدات کیا ہیں کیونکہ ہم اُن معتقدات کو نہیں دیکھ سکتے لیکن وہ چیز جو ہمیں دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی دھرتی پر بستے ہیں ایک ہی حکمران ہم پر فرمانروائی کرتا ہے، ایک ہی جیسے ذریعوں سے منفعت حاصل کرتے ہیں اور قحط کی مصیبت کو مل جُل کر جھیلتے ہیں۔ یہی وہ مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ہندستان میں بسنے والی دونوں قوموں کے لیے واحد اصطلاح 'ہندو قوم' کا استعمال کرتا ہوں۔"
— سرسید نے یہ الفاظ 3 فروری 1884ء کو اس سپاسنامے کے جواب میں کہے تھے جو اُن کی خدمت میں لاہور کی انڈین ایسوسی ایشن نے پیش کیا تھا۔ ملاحظہ ہو سید احمد خان کا سفرنامہ پنجاب (اردو اور انگریزی متن) 156-70

10 - اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر سرسید نے ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا تھا جس میں اُنھوں نے پھر ایک بار ہندستانیوں کو کانگریس تحریک میں مضمر خطرات سے آگاہ کیا تھا۔ ملاحظہ ہو سرسید، آخری مضامین (اردو متن) صفحات 55-58

11 M.A.O. College Magazine Apr. 1898

12 - 11 جنوری 1901ء کے India نے نقل کیا۔

13 Karl Marx, Letters on India (edited by P.P.L. and Freda Bedi), 3

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

John Buchan, Memoirs of Lord Minto

Parliamentary papers, Col. 4436.

Replies of the local Governments and c.

۱۶۔ ملاحظہ ہو:

مثال کے طور پر حکومتِ پنجاب کا کہنا تھا کہ "مسلمانوں کے انتخابات کی تشہیر اور انتخابی فہرستوں کی تیاری کی وجہ سے اُن استثنائی رعایتوں کی خواہ مخواہ تشہیر ہوگی جو انھیں حاصل ہیں۔ (ملاحظہ ہو۔ (Ibid, vol II, part II, Encl No XXI)

جبکہ مشرقی بنگال کی حکومت کا خیال یہ تھا کہ "محض مسلمان ووٹروں کی کاہلی اور نکمے پن کی وجہ سے انھیں اپنی تعداد کی مناسبت سے نمایندگی حاصل نہ ہو سکی۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا زیادہ مناسب ہوگا کہ آئندہ سے وہ ان اختیارات کا فعال طور پر استعمال کیا کریں گے جو انھیں حاصل ہیں بجائے ان اقدامات کے ذریعے تحفظات حاصل کرنے کی کوشش کے جو فی الوقت زیرِ غور ہیں۔" (ملاحظہ ہو (Ibid vol II, Part II, Encl No: XXIII) مرکزی صوبجات کے چیف کمشنر کا رویہ بھی کچھ کم ناقدانہ نہیں تھا۔ اُس نے لکھا تھا: "میں اس بات کو ہرگز مناسب نہیں سمجھتا کہ ایسے افراد پر مشتمل حلقہ ہائے انتخاب ترتیب دیئے جائیں جن کے مابین بجز پیشے یا عقیدے کے دوسری کوئی اور قدر مشترک نہ پائی جاتی ہو۔"

(ملاحظہ ہو (Ibid Vol II, Part II, Encl No XXIV

۱۶۔ کئی لبرل ممبران پارلیمنٹ نے مسلمانوں کے لیے کسی قسم کے "جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب" کے تشکیل کی مخالفت کی۔ ڈاکٹر رد تھر فورڈ Dr Rutherford نے تو اسے "ایک بُرا اصول" قرار دیا۔ (ملاحظہ ہو Hansard, Debates on Indian Affairs, Session, 1908, 18

دراصل 17 دسمبر 1908ء کو مسٹر بکانن Mr Buchanan نے، جو انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے عہدے پر قابض تھے، لارڈ مورلے کی جانب سے پارلیمنٹ کو اس امر کا یقین دلایا کہ "ہم نے حکومتِ ہند کو ایسی تجاویز سے مطلع کر دیا ہے جن کی رو سے ملک کے زیادہ ترقی یافتہ صوبوں میں ایسے انتخابی اجتماعوں (Electoral Colleges) کی تشکیل ممکن ہو جائے گی جہاں کہ مسلم زمیندار اور دوسری خاص قومیتیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کونسلوں میں اپنی تعداد اور اہمیت کی متناسب نمایندگی حاصل کرسکیں گی اور اس کے لیے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے تشکیل کی ضرورت چنداں لاحق نہیں ہوگی۔"

(Ibid - 1027)

17۔ خط مورخہ بمبئی، 18 اگست 1906ء میں منجانب محسن الملک موسومہ ڈبلیو۔ اے۔ جے۔ آرچ بولڈ جسے سید رضی واسطی نے اپنی کتاب Lord Minto and the Indian Nationalist Movement 1905 to 1910 Oxford 1964 کے صفحات 231-32 پر نقل کیا۔

18۔ Ibid 232

19۔ Ibid 233

20۔ مکتوبات منجانب ڈبلیو۔ اے۔ جے۔ آرچ بولڈ موسومہ ڈنلپ اسمتھ مورخہ شملہ 9 اگست 1906ء (منقولہ Ibid 220-22)

21۔ مکتوبات منجانب ڈنلپ اسمتھ موسومہ محسن الملک مورخہ شملہ 13 ستمبر 1906ء

22۔ اس اصطلاح کا استعمال 1924ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کیا تھا۔ متعلقہ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

چند ماہ قبل شملہ میں مسلمانوں کے ایک وفد نے وائسرائے لارڈ منٹو سے شرفِ باریابی حاصل کرکے ان کی اور ان کی حکومت کی خدمت میں منٹو۔ مورلے اصلاحات کے سلسلے میں جو اُس وقت معرضِ بحث میں تھیں مسلمانوں کے مطالبات پر مبنی ایک محضر پیش کیا ہے۔ جنگ کے دوران برطانوی صحافی جس قسم کا انداز اختیار کرتے ہیں اُسی انداز میں آج اس حقیقت کو منکشف کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے، کہ اس وفد کی کارگزاری "شاہی حکم کی تعمیل میں دکھایا گیا ایک کرتب" قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ ظاہر تھا کہ حکومت زیادہ عرصے تک تعلیم یافتہ ہندستانیوں کے مطالبات سے اغماض نہیں برت سکتی تھی اور حسبِ سابق خیرات کا ایک نوالہ اُن کے حلق میں ٹھونسنے کا وقت آچکا تھا تاکہ آئندہ چند برسوں تک اُن کا مُنہ بند رہ سکے۔ اس وقت تک مسلمانوں کا طرزِ عمل انصاف کے کٹہرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں کھڑے اُس آئرستانی قیدی Irish prisoner کی مانند تھا جس نے مقدمے کی سماعت کرنے والے جج کے اس استفسار کے جواب میں کہ آیا اُس نے اپنے مقدمے کی پیروی کرنے کے لیے کسی وکیل کی خدمات حاصل کی ہیں؟ بڑی بے تکلفی سے جواب دیا تھا کہ اس نے اپنی پیروی کے لیے کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کی ہیں کیونکہ "جیوری میں اُس کے بہت سے احباب موجود ہیں"۔ لیکن مسلمانوں کے "جیوری میں موجود احباب" نے خود بخود طور پر انھیں مشورہ دیا ہے کہ دیگر ملزمین کی طرح وہ بھی کسی مستند وکیل کی خدمات حاصل کرلیں۔ خدا جانے انھیں کس ذریعے سے تحریک حاصل ہوئی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دفعہ مسلمانوں کے مفادات کی نہایت مناسب طور پر نمایندگی کی گئی۔ بلاشبہ مشترکہ علاقائی حلقہ ہائے انتخاب میں مسلمان مناسب یا حقیقی نمایندگی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ کاش کہ وہ لوگ جنھوں نے مسلمانوں کے مانگے ہوئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی تشکیل کی مذمت کی تھی اور اس پر بڑے افسوس کا اظہار کیا تھا اس حقیقت کو فراموش نہ کرتے کہ وہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب جن کی تشکیل کا مسلمانوں نے مطالبہ کیا تھا، دراصل مسلمانوں اور ان کے بے شمار ہندو بھائیوں کے مابین پائے جانے والے جداگانہ پن کا نتیجہ تھے، اُس کا سبب نہ تھے۔

23۔ ملاحظہ ہو 16-1915ء کے گورنر جنرل کی مجلس مقننہ کے اجلاس کی روایداد میں شامل لارڈ ہارڈنگ کا پڑھا ہوا الوداعی خطبہ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ا

APPENDIX - A

"ہندستان میں 1867ء، 1868ء، 1869ء، 1870ء اور 1871ء کے دوران ایسی آسامیوں کی تعداد بتانے والا گوشوارہ جن کا ماہانہ مشاہرہ ڈیڑھ سو روپے (Rs 150/-) سے کم نہیں اور جو یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان آسامیوں میں سے کتنی پر ہندو اور کتنی پر مسلمانوں کا تقرر عمل میں آیا تھا۔"

جارج ہیملٹن

انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا

انڈیا آفس، 17 فروری 1875ء

	1867		1868		1869		1870		1871	
	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان
بنگال	137	16	129	13	193	17	177	15	88	11
بمبئی	50	8	63	2	120	7	53	6	51	5
سندھ	9	3	4	1	9	5	5	2	3	1
	*1			*2						
مدراس	67	4	62	3	80	5	69	2	70	1
شمال مغربی صوبہ جات	33	21	31	20	26	16	21	22	30	16
پنجاب	27	24	50	32	53	37	43	28	51	31
برٹش برما	—	—	2	1	—	—	1	—	—	1

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اودھ	11	6	13	13	8	7	5	5	6	5
مرکزی صوبہ جات	18	12	10	1	3	4	3	2	4	2
کورگ	NIL									
اجمیر	1	—	5	1	2	1	—	—	2	—
میسور	16	—	30	7	21	5	25	3	10	4
حیدرآباد	14	3	7	1	6	2	3	4	5	2
پورٹ بلیر	1	—	1	—	1	—	—	—	1	—
	‡1									
محکمہ خارجہ کی ماتحت سیاسی ایجنسیاں	2	2	1	1	*1	2	*1	—	—	—
محکمہ خارجہ	NIL									
محکمہ فوج	15	—	10	1	15	3	9	1	15	1
محکمہ داخلہ	—	—	—	—	1	—	2	—	1	—
محکمہ فینانس	1	—	—	—	5	—	—	—	—	—
محکمہ مال (ریونیو)	1	1	—	2	—	3	1	4	3	—
						†1				
محکمہ تعمیرات عامہ	4	—	5	—	6	—	10	—	7	—
محکمہ مقننہ	NIL									
ڈائریکٹر جنرل آف پوسٹ آفس	5	1	10	—	4	—	4	—	1	—
			*2		*1					
	918	101	438	101	555	101	376	94	348	80

پارسیوں کو ہندوؤں میں شامل کیا گیا ہے۔ * پارسی، † بری، ‡ بری جسٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ب

APPENDIX — B

دی یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے اصول وضوابط
مع مکتوبات سرپرستان و فہرست ملحقہ اسلامی ادارہ جات ۔

اصول وضوابط

I ۔ یہ ایسوسی ایشن "دی یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" کہلائے گی۔

II ۔ اس ادارے کے اغراض و مقاصد میں حسب ذیل امور شامل ہوں گے:

(ا) ۔ ممبرانِ پارلیمنٹ، انگریزی جریدوں اور برطانیہ عظمیٰ کے عوام کی اطلاع کے لیے کتابچے اور پمفلٹ شایع کر کے اُن غلط بیانیوں کی نشاندہی کرنا جن کے ذریعے انڈین نیشنل کانگریس کے حامی انگریز عوام کو غلط طور پر یہ باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندستان کی تمام قومیں اور تمام ہندستانی سردار اور حکمران نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد سے متفق ہیں۔

(ب) ۔ انھی ذرایع کی مدد سے ممبرانِ پارلیمنٹ اور برطانیہ عظمیٰ کے اخبارات اور عوام کو عام طور پر ہندستانی مسلمانوں، اسلامی انجمنوں اور ایسے ہندوؤں اور اُن کی تنظیموں کے خیالات سے واقف کروانا جنھیں نیشنل کانگریس کے مقاصد سے اختلاف ہو۔

(ج) ۔ ہندستان میں امن کی بحالی اور برطانوی حکومت کے استحکام کے لیے جدّوجہد کرنا اور عوام کے دلوں کو ایسے تمام مہلک جذبات سے پاک کرنا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو ملک کے طول و عرض میں کانگریس کے حامی عوام کے دلوں میں بھڑکا رہے ہیں اور جن کی وجہ سے عوام میں برطانوی حکومت کے تعلق سے بے اطمینانی پیدا ہونے لگی ہے۔

III ۔ اُن تمام ہندستانی حکمرانوں اور سرداروں سے اس ایسوسی ایشن کی سرپرستی قبول کرنے کی درخواست کی جائے گی جنھیں اس ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد سے اتفاق ہو۔

IV ۔ بجز اُن افراد کے جن کی صراحت ضابطہ نمبر V میں کی گئی ہے، ہر وہ شخص بلا لحاظ مذہب و ملت اس ایسوسی ایشن کا رکن بن سکتا ہے جو اس ادارے کے اغراض و مقاصد کے ساتھ اتفاق رکھتا ہو اور جو رکنیت کی پیشگی سالانہ فیس 12 روپے سے لے کر 60 روپے تک حسبِ خواہش ادا کرے۔

V ۔ حکومت کا کوئی تنخواہ یاب ملازم اس ایسوسی ایشن کا رکن نہیں بن سکتا۔

VI ۔ ارکان کے علاوہ ایسوسی ایشن ایسے افراد سے بھی عطیے Donations قبول کرے گی جو ایسوسی ایشن کے کام میں تعاون کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ایسے تمام عطیہ دہندگان جو اس ایسوسی ایشن کے باضابطہ رکن نہیں ہیں، کے اسمائے گرامی علیحدہ فہرست میں شایع کیے جائیں گے۔

VII ۔ ایسی تمام اسلامی انجمنوں اور ہندو سوسائیٹیوں کے نام علیحدہ فہرست میں شایع کیے جائیں گے جنھوں نے اس ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہو۔

VIII ۔ یہ ایسوسی ایشن ایسے تمام ارکان، عطیہ دہندگان اور انجمنوں کے ناموں کی فہرست اپنے ہر پمفلٹ کے ہمراہ بغرض تشہیر انگلستان بھجوائے گی جنھوں نے اس ایسوسی ایشن کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہو۔

IX ۔ انگلستان میں تقسیم کرنے کے لیے ایسوسی ایشن جو بھی پمفلٹ شایع کروائے گی وہ تمام اُن ارکان کو مفت بھجوائے جائیں گے جنھوں نے رکنیت کی سالانہ فیس ساٹھ روپے (Rs 60/-) ادا کی ہو۔ دیگر تمام اراکین کو یہ پمفلٹ قیمتاً حاصل کرنے ہوں گے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

X ۔ ایسوسی ایشن کی کارکردگی پر مشتمل سالانہ رپورٹ جس میں سال بھر کی آمدنی اور خرچ کا حساب بھی شامل ہوگا بلا معاوضہ تمام اراکین اور مذکورہ بالا انجمنوں اور سوسائٹیوں کو پیش کی جائے گی۔

XI ۔ کتابچوں (پمفلٹوں) کی تیاری کے کام میں مدد دینے کے لیے بحیثیت مدیر (ایڈیٹر) کسی یورپین شخص کا تقرر کیا جائے گا۔

XII ۔ مطبوعہ کتابچوں (پمفلٹوں) کا مواد حسب ذیل اقسام کا ہوگا:

ا) ۔ ایسے ہندستانی اخبارات سے مضامین اور خبروں کا انتخاب کیا جائے گا جو اس ایسوسی ایشن کے ہمدرد ہوں۔ اسی طرح دیسی زبانوں کے اخبارات میں شایع شدہ مواد کے تراجم بھی شامل کیے جائیں گے۔

ب) مسلمانوں اور ہندوؤں کے جلسوں میں منظور کردہ قراردادیں اور آراء جن میں ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہو۔

ج) ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کی تائید میں ارکان اور غیر ارکان کی جانب سے لکھے گئے مضامین، مقالے اور خطبے، عموماً ہر تحریر کے ہمراہ اُس کے مصنف کا نام شایع کیا جائے گا بجز ان صورتوں کے جہاں مصنف نے اس امر کی خواہش ظاہر کی ہو کہ اس کے نام کو مخفی رکھا جائے اور پمفلٹ کی اشاعت کا نگرانِ کار اس شکل میں مذکورہ تحریر کی اشاعت کو مناسب سمجھتا ہو۔

XIII ۔ ایسوسی ایشن کے بعض ارکان کو اس غرض سے منتخب کیا جائے گا کہ وہ مدیر (ایڈیٹر) کے ساتھ اشتراک عمل کرتے ہوئے پمفلٹوں وغیرہ کے لیے مواد کا انتخاب کریں اور اس کی اشاعت کی منظوری دیں۔

XIV ۔ تمام مراسلت عزت مآب سرسید احمد خاں بہادر، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی (K.C.S.I) کے نام بمقام علی گڑھ کی جائے گی جو متبادل انتظامات کی تکمیل تک اس ایسوسی ایشن کے معتمد اعزازی اور خزانچی Treasurer کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔

شرح دستخط سید احمد معتمد اعزازی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ب)

سرپرستوں کے مکتوبات

(1) ہز ہائی نس دی نظام آف حیدر آباد (دکن)

ایسوسی ایشن کے معتمد کے نام ہز ہائی نس حضور نظام کے وزیر اعظم سر آسمان جاہ کا ۲۹ ستمبر 1888ء کا مکتوب۔

مائی ڈیر سر سید احمد

آپ نے اور ملک کے دیگر بہی خواہوں نے مل کر دی یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نامی جو انجمن قایم کی ہے اس کے لیے حسب الارشاد ہز ہائی نس ان کی جانب سے مبلغ Rs. 1000/- روپے کا چیک آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے بے پایاں مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ میں اس امر کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ایسوسی ایشن کے اغراض مقاصد سے ہز ہائی نس کو مکمل ہمدردی ہے۔

مائی ڈیر سر سید فقط
آپ کا مخلص
شرحدستخط۔ آسمان جاہ

(2) ہز ایکسلنسی نواب سالار جنگ۔ کے۔سی۔آئی۔ای

ایسوسی ایشن کے معتمد کے نام ہز ایکسلنسی نواب سر سالار جنگ کے۔سی۔آئی۔ای کا ۲ ستمبر 1888ء کا مکتوب۔

مائی ڈیر سر سید احمد

آپ کے اس نوازش نامے کا شکریہ جس میں آپ نے دی یونائیٹڈ انڈین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی نوعیت اور اُس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ایسوسی ایشن کے ایک سرپرست کی حیثیت میں منتخب کیے جانے پر مجھے ازحد مسرت محسوس ہوئی۔ اس موقع پر میں اس امر کی وضاحت کردینا چاہتا ہوں کہ آپ نے اُس جماعت کی شرارت آمیز تعلیمات کا رد کرنے کے لیے جس نے خود کو انڈین نیشنل کانگریس کا نام دے رکھا ہے، جو پُرجوش اور بروقت اقدام کیا ہے میں صدق دل سے اس اقدام کی حمایت کرتا ہوں۔ کوئی شخص جو مذکورہ کانگریس کے عناصر ترکیبی یا اس کے اغراض و مقاصد سے واقفیت رکھتا ہو، ایک لمحے کے لیے بھی اسے صحیح معنوں میں ایک قومی National یا نمایندہ تنظیم تسلیم نہیں کرسکتا۔ دراصل آج کے دور میں کسی نمائندہ جماعت کا وجود ایک انتہائی مہمل اور ناقابلِ تصور بات ہے خاص طور پر اُس وقت جب کہ ہم اس ملک کی غیر متجانس آبادی کو پیش نظر رکھیں جس کے مذاہب، رواج، عادات و اطوار اور روایتی ہمدردیاں اور اختلافات ایکدوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ کیا مستقبل میں ایسی کسی قومی تنظیم کا قیام ممکن ہوسکے گا؟ اس مسئلے پر رک کر غور کرنے کی آج ہمیں قطعی ضرورت نہیں ہے۔ آج ہمارا واسطہ جس چیز سے ہے وہ زمانہ حال ہے اور ہمیں صرف یہ سوچنا ہے کہ زمانۂ حال میں ہم حالات کو کس طرح پاتے ہیں۔ موجودہ حکومت اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود بلاشبہ نہ صرف ہر اُس قسم کی حکومت سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع قسم کی ہے جسے ماضی کے حکمرانوں نے یہاں قایم کیا تھا بلکہ آج کے دور میں پائی جانے والی اُن ممالک کی حکومتوں سے بھی بدرجہا بہتر ہے جو دنیا بھر میں مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کہلاتے ہیں۔ آخر ہندستان کے علاوہ یورپ کا وہ کونسا ملک ہے جہاں کی رعایا کو یہاں کی رعایا کے مقابلے میں زیادہ آزادیٔ تقریر و عمل حاصل ہے؟ کتنے ملک ایسے ہیں جہاں کے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ اتنا کم ہے؟ وہ کونسا ملک ہے جہاں کے شہریوں کے حقوق کا تحفظ وہاں کا قانون اس سے بہتر طریقے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برکرتا ہے ؟ یا وہ کونسا ملک ہے جہاں کے باشندوں کے مذاہب اور سماجی رسم ورواج کے تعلق سے اتنی رواداری برتی جاتی ہے ؟ کانگریس کی تحریک چلانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ حکومتِ ہند جس شکل میں کہ آج یہ موجود ہے، انتظامیہ کے کسی خام یا انوکھے تجربے پر مبنی نہیں ہے بلکہ نتیجہ ہے برس ہا برس کی تاریخی جدوجہد اور فلسفیانہ غور وتدبر کا۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں اس انصاف پسند اور غیر جانبدار حکومت کی کارکردگی کی وجہ سے انھیں امن وامان کا جو ایک طویل وقفہ میسر آیا ہے اُسی کی بدولت یہاں خوشحالی کو پروان چڑھنے کا موقع نصیب ہوا اور ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اس ملک کی رعایا کا بہت بڑا طبقہ امن اور خوشحالی کی اس فضا کو بے حد عزیز رکھتا ہے۔

ہم نے اپنے بزرگوں اور دانشوروں سے سُنا ہے کہ انسان جو بُرے کام کرتا ہے وہ اس کی وفات کے بعد بھی برقرار رہتے ہیں۔ یہ انتہائی افسوسناک امر ہے کہ کانگریس کی اس بدبختانہ تحریک کو اس حد تک پھیلنے دیا جاتا جیسا کہ آپ واقف ہیں یہ تحریک جو غیر فطری طور پر پیدا ہوگئی ہے، اگر بالفرض اپنی موت آپ مربھی جاتی ہے تب بھی کانگریس کے ارکان آئے دن جن پمفلٹوں، سوالناموں catechisms اور رسالوں کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا رہے ہیں وہ تمام کے تمام رائیگاں جائیں گے یہ ممکن نہیں ہے۔ اس گمراہ کُن پروپیگنڈے کے جس کم سے کم اثر کی توقع ہم کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کی بدولت عامۃ الناس میں بے اطمینانی اور بے چینی کی لہر دوڑ جائے گی اور اس کے نتیجے میں حکومت کو سنگین پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تاہم یہ جان کر بڑا اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ متعدد مہذب، شائستہ اور ذی حیثیت مسلمانوں نے شروع ہی سے کانگریس کو منہ نہیں لگایا جبکہ بعض ایسے دوسرے اصحاب نے بھی، جنھوں نے بلا سوچے سمجھے اس تحریک میں شمولیت اختیار کرلی تھی، اب قریب سے اس تنظیم کے حقیقی اغراض ومقاصد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور طور طریق سے واقفیت بہم پہنچا لینے کے بعد اس تنظیم سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ حکومتِ ہند کے اختیارات اور خاص طور پر ہنگامی حالات کے ساتھ پھرتی اور مستعدی کے ساتھ نپٹنے کی صلاحیت کا دارومدار بالکلیہ طور پر اقتدار کی مرکزیت پر ہے۔ جن مسلمانوں نے ہندستان پر حکومت کرنے والے مختلف خاندانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اور انھی کی طرح متعدد باشعور ہندو برادرانِ وطن بھی محسوس کرتے ہیں کہ کانگریس کے مطالبے اور دعوے کس قدر خطرناک اور ناقابلِ عمل ہیں۔ اچانک طور پر وقوع پذیر ہونے والی ہر قسم کی جارحانہ تبدیلی نہ صرف ہندستانیوں بلکہ بلادِ مشرق کے اکثر عوام کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ اُسی چیز کو پسند کرتے ہیں جس کے وہ عادی ہوتے ہیں اور وہ اُسی قسم کے حالات کو پسند کرتے ہیں جس قسم کے حالات میں وہ برس ہا برس سے زندگی گزارتے چلے آئے ہیں۔ انجانی، غیر موزوں اور غیر محرب باتوں کو وہ فطری کمل اور مستحکم طور پر ناپسندیدہ قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ اگر یورپ والے سیاسی تجربات کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں تو یہاں کے عوام تو انھیں لامتناہی حد تک ناپسند کرتے ہیں۔ پارلیمانی طرزِ حکومت کے درآمد کردہ بیرونی نظریات کا ہندستان میں بارآور ہو پانا اُس وقت تک ممکن نہیں ہے۔ تاوقتیکہ یہاں بھی کم و بیش انگلستان جیسے ہی حالات پیدا نہیں ہو جاتے اور آنے والے کئی برسوں تک ہم اس بات کی توقع ہی نہیں رکھ سکتے۔ اس ملک کی آبادی کا بڑا حصّہ نمایندہ اداروں کے تصوّر سے قطعی نابلد ہے اور یہی وہ ادارے ہیں جن کے قیام کے لیے کانگریس مصروفِ پیکار ہے آپ کی قایم کردہ جب الوطنی کے جذبے پر مبنی اس مفید تحریک کی کامیابی کے لیے میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ مجھے اس بات کا یقینِ واثق ہے کہ اس کام کو آگے بڑھانے میں بلا لحاظ مذہب و ملت آپ کو اُن تمام لوگوں کا اشتراک اور پُرخلوص ہمدردیاں حاصل ہوتی رہیں جنھیں ہندستان کی حقیقی ضروریات اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغلات کا شعور حاصل ہے۔

بصد عجز و نیاز ــــ!

آپ کا مخلص

(دستخط) سالار جنگ

ملحقہ اسلامی انجمنوں کی فہرست

1 ۔ انجمن اسلامیہ، لاہور، پنجاب۔
2 ۔ انجمن اسلامیہ، ہنگانی، لدھیانہ، پنجاب۔
3 ۔ دی سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، ہیڈ کوارٹرز، کلکتہ
4 ۔ انجمن اسلامیہ، امرتسر، پنجاب۔
5 ۔ انجمن حمایتِ اسلام، امرتسر، پنجاب۔
6 ۔ انجمن اسلامیہ، بریلی۔ شمال مغربی صوبہ جات
7 ۔ دی نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، بھاگل پور
8 ۔ انجمن اسلامیہ، چھپرہ، ضلع سارن، بنگال۔
9 ۔ انجمن علمی، بدایوں، شمال مغربی صوبہ جات۔
10 ۔ انجمن اسلامیہ، بدایوں، شمال مغربی صوبہ جات۔
11 ۔ دی جوبلی محمڈن ایسوسی ایشن، بدایوں، شمال مغربی صوبہ جات۔
12 ۔ انجمن اسلامیہ، بانکی پور، بنگال
13 ۔ مجلس اسلامیہ، لدھیانہ، پنجاب۔
14 ۔ انجمن اسلامیہ، ڈنڈی گل، مدراس۔
15 ۔ برانچ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، مدناپور، بنگال
16 ۔ مجلس اسلامیہ، میرٹھ، شمال مغربی صوبہ جات۔
17 ۔ انجمن اسلامیہ، میمن سنگھ، مشرقی بنگال۔
18 ۔ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، برانچ، شیخوپورا۔
19 ۔ انجمن اسلامیہ، گجرات، پنجاب۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

20 - انجمن اسلامیہ، جھاری جھر، ضلع روہتک، پنجاب۔
21 - ممڈن انجمن مفید عام۔ قصور، پنجاب۔
22 - انجمن اسلامیہ، جبل پور، مرکزی صوبہ جات۔
23 - انجمن اسلامیہ، وزیر آباد، پنجاب۔
24 - انجمن حمایت اسلام، لاہور، پنجاب۔
25 - انجمن ہمدردی، امرتسر، پنجاب۔
26 - انجمن معین الاسلام، اجمیر، راجپوتانہ۔
27 - مجلس اسلام، بنگلور اور مجلس اسلام، ہامن میسور۔
28 - انجمن اسلامیہ، کانپور، شمال مغربی صوبہ جات۔
29 - انجمن باب السلام، پریامن، پرتاب گڑھ، اودھ۔
30 - نیشنل ممڈن ایسوسی ایشن، برانچ ایلور، مدراس۔
31 - انجمن دار السلام، لکھنؤ، اودھ۔
32 - انجمن اسلامیہ، ملتان، پنجاب۔
33 - انجمن اسلامیہ، امبالہ، پنجاب۔
34 - انجمن اسلامیہ، جالندھر، پنجاب۔
35 - انجمن مفید الاسلام، جنگ پارہ، موہن گنج، میمن سنگھ، بنگال۔
36 - نیشنل ممڈن ایسوسی ایشن، برانچ پابنا، بنگال۔
37 - انجمن اسلامیہ، اجمیر، راجپوتانہ۔
38 - ممڈن سنٹرل نیشنل ایسوسی ایشن، لاہور، پنجاب۔
39 - بلگرام انسٹی ٹیوٹ، بلگرام، ہردوئی، اودھ۔
40 - انجمن اسلامیہ، رنگپور، بنگال۔
41 - انجمن تہذیب اسلام، آرہ، بنگال۔
42 - انجمن احباب، بمبئی۔
43 - انجمن اسلامیہ، پشاور، پنجاب۔
44 - انجمن اسلامیہ، لکھنؤ، اودھ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

45 ۔ انجمن مؤیدالاسلام، سہارنپور، شمال مغربی صوبہ جات۔
46 ۔ سندھ برانچ۔ سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، کراچی، سندھ۔
47 ۔ انجمن حامیٔ اسلام، ناگپور، مرکزی صوبہ جات۔
48 ۔ ہگلی ڈسٹرکٹ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، بنگال۔
49 ۔ انجمن اُمتیہ اسلامیہ، دیناپور، بنگال۔
50 ۔ انجمن اسلامیہ، گرداسپور، پنجاب۔
51 ۔ انجمن اسلامیہ، ویزاگاپٹم، مدراس۔
52 ۔ انجمن اسلامیہ، رُڑکی، شمال مغربی صوبہ جات۔
53 ۔ انجمن نصیرالاسلام، ناگپور، مرکزی صوبہ جات۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ج

APPENDIX - C

مغربی تعلیم کی حمایت میں

از : سیّد احمد خان

1854ء کو گزرے ہوئے تیس سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس مدت کے دوران ہندستان کئی تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔ 1854ء میں جبکہ مذکورہ مراسلہ تحریر کیا گیا تھا بلاشبہ ہندستان میں ایسے حالات موجود تھے جن میں ہم یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ ہندستانی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنا کر ہم اپنی فوری ضروریات کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ لیکن آج حالات ویسے نہیں ہیں۔ دیسی زبانوں میں حاصل کی گئی تعلیم روز مرّہ کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ناکافی تصور کی جا رہی ہے۔ ایسی تعلیم اب صرف ہماری خانگی اور گھریلو ضروریات کی حد تک ہی کارآمد ہے۔ اس غرض کے لیے دیسی مدارس میں حاصل کی ہوئی تحت انوی اور وسطانوی درجے کی لیاقت سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے اور نہ ہی ملک کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہے۔ آج نہ صرف یہاں کے عوام کو بلکہ اس ملک کو بھی روز مرّہ کی ضروریات کے لیے انگریزی تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک معمولی دوکاندار کو جو نہ خود انگریزی سے واقفیت رکھتا ہے اور نہ اپنے پاس کوئی انگریزی داں ملازم رکھتا ہے اپنے کاروبار میں ہزاروں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انتہا یہ کہ ہاتھ گاڑیوں پر یا سروں پر ٹوکرے رکھ کر گلی گلی گھوم کر چھوٹی موٹی چیزیں فروخت کرنے والے بیوپاری بھی شدت سے اس بات کو محسوس کرنے لگے ہیں کہ انھیں کم از کم اتنی انگریزی ضرور جاننی چاہیے کہ وہ مختلف بیچی جانے والی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چیزوں کے نام اور اُن کی قیمتیں انگریزی زبان میں اپنے گاہکوں کو بتلا سکیں۔ مجھے اگر اس قسم کی تعلیم کو عوامی تعلیم کا نام دینے کی اجازت دی جائے تو میں ضرور کہوں گا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب کہ حکومت اور عوام مل کر اس عوامی تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں۔

دیسی زبانوں اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے تحت ثانوی اور وسطانوی مدارس میں جو صرف اُنھی درجوں تک تعلیم دینے کے لیے قایم کیے گئے ہیں اور جن کا مقصد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے امیدواروں کو تیار کرنا نہیں ہے اگر مغربی علوم دیسی زبانوں میں پڑھائے جاتے ہیں تو اس سے بلاشبہ ملک کے مفادات کو تقویت حاصل ہوگی لیکن اگر انگریزی کو ذریعہ تعلیم کے اُن تحت ثانوی مدارس میں یوروپی علوم دیسی زبانوں میں سکھائے جاتے ہیں جن کا قیام اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ایک مرحلے کے طور پر کیا گیا ہے تو ایسا کرنے سے تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ابتدا میں اس خیال کا حامی تھا کہ ہمارے ملک کا مفاد اس بات میں مضمر ہے کہ ہم یوروپی علوم کو ہندستانی زبانوں ہی میں سیکھیں۔ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے 1835ء میں لارڈ میکالے کی اس تجویز کو غلط قرار دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ مشرقی تعلیم کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے مغربی علوم اور ادب کے مطالعے کی سفارش کی جائے۔ میں اُن دنوں اس بارے میں کوئی اندازہ قایم نہ کر سکا تھا کہ یوروپی علوم کو دیسی زبانوں میں سکھانے سے دیسی عوام کو کیا فایدہ پہنچے گا۔

میں نے اپنے خیالات کو صرف نظریاتی حد تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی۔ مختلف جلوس اور اجتماعات میں میں نے انھی خیالات کو موضوعِ بحث بنایا اور اس مسئلے پر متعدد مضامین اور پمفلٹ تحریر کیے اور مقامی اور اعلیٰ حکومتوں کو یادداشتیں بھجوائیں۔ خاص اسی مقصد کے حصول کے لیے "دی سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ" نامی ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے کئی سائنسی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے دیسی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ لیکن بالآخر مجھے اپنی رائے کی غلطی کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔ میں اُس لبرل سیاست داں کی کہی ہوئی بات کی حقانیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا جس نے کہا تھا کہ "آج کے ہندستان کو جس چیز کی ضرورت ہے، خواہ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندو ہو یا مسلمان وہ یہ ہے کہ اُسے اُس علم و ادب سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا ہو جائے جو اُس کے اپنے دور کی زندگی کا آئینہ دار ہو اور ساتھ ہی ساتھ اُس بلند حوصلہ قوم کی نمایندگی بھی کرے جسے وہ تمام علم اور تمام قوت کی مظہر سمجھتا ہے۔" جس وقت لارڈ ولیم بنٹنک Lord William Bentinck نے اعلان کیا کہ "حکومت کا عظیم مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہندستان کے دیسی باشندوں میں یورپی ادب اور سائنس کو فروغ دے" اُس وقت میں اُن کی اختیار کردہ حکمتِ عملی کی صداقت اور خلوص کا قایل ہو گیا۔

ذاتی طور پر میں اس خیال کا حامی ہوں کہ ترویج علم کے بارے میں حکومت کا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ خود ہو کر لوگوں کو تعلیم مہیا کرے بلکہ اُس کا فرض تو یہ ہے کہ لوگوں کی مدد اس طرح کرے کہ وہ اپنے آپ علم حاصل کر سکیں۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ عوامی احساسات میرے اس خیال سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ لوگ اپنے استدلال کی بنیاد اس حقیقت کو قرار دیتے ہیں کہ ہندستان میں عوامی فلاح کے تمام امور کا دارومدار ہمیشہ حکومت پر ہی رہا ہے۔ تعلیم کا مسئلہ بھی چونکہ عوام ہی کے فلاح و بہبود سے تعلق رکھتا ہے اس لیے انھیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آخر اس بارے میں بھی حکومت پر ہی تکیہ کیوں نہ کیا جائے۔ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر اچھی طرح غور و خوض کر چکنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس ملک کے باشندوں کو اُس وقت تک موزوں تعلیم حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنی تعلیم کے انتظام کو خود اپنے ہاتھوں میں نہیں لے لیتے۔ اور یہ کہ حکومت کے لیے تعلیم کے کسی ایسے نظام کو وضع کرنا ممکن نہیں ہے جو تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے اور عوام کے مختلف طبقوں کی مخصوص ضروریات کو بھی پورا کر سکے۔ اس لیے یہ بات ملک کے عین مفاد میں ہوگی کہ حکومت تعلیم کے مسئلے کو عوام کے حوالے کر دے اور اس میں دخل اندازی سے احتراز کرے۔ عوامی رائے اس خیال کی موافقت میں نہیں ہے چند روز قبل مجھ سے ایک انتہائی قابل اور ذہین ہندستانی نے کہا تھا کہ یہ نظریہ کہ اپنی تعلیم ہم لوگ خود اپنے طور پر حاصل کریں انتہائی غلط نظریہ ہے کیونکہ ہندستانی عوام کے لیے کسی قومی مفہوم میں "ہم لوگ" کی اصطلاح کا استعمال قطعاً غیر موزوں ہے کیوں کہ کوئی بھی قوم اُس وقت تک کسی عظیم کام کی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتی تاوقتیکہ اونچے اور نچلے سبھی طبقوں کا تعاون حاصل نہ ہو خواہ اس طبقاتی تفریق کا تعلق دولت سے ہو یا سیاسی اور انتظامی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قوت سے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ ہندستان میں اعلیٰ درجے کی سیاسی اور انتظامی قوت اِس وقت حکومت اور اُس کے انگریز عہدیداروں کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ ہندستان میں تجارتی کاروبار سے بڑی حد تک متمتع ہونے والے بھی یہی یورپین لوگ ہی ہیں۔ اسی وجہ سے درحقیقت یہ لوگ ہندستانی آبادی کا اہم ترین جز بن گئے ہیں۔

اسی کی مناسبت سے مجھے ایک واقعہ بیان کرنے کی اجازت دی جائے جو خود میرے ساتھ پیش آیا۔ جس وقت میں نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج قایم کیا تھا اُس وقت میں نے حکومت کے ایک اعلیٰ یوروپین عہدیدار سے اس ادارے کو کچھ امداد دینے کی استدعا کی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ وہ اس معاملے میں ہماری امداد کرنے کا پابند نہیں ہے اور یہ کہ یہ ادارہ ہمارا لفظِ نوزائیدہ ہے نہ کہ اُس کا۔ اسی لیے جہاں تک اُس سے ہو سکے گا وہ یہی کوشش کرے گا کہ اِسے پدری شفقت کے ساتھ سینے سے چمٹائے رکھنے کی بجائے حقارت کے ساتھ اپنے سے دور ہی رکھنے کی کوشش کرے۔

یہاں اُن چار قسم کے عوامل کا مختصر تذکرہ بے محل نہ ہوگا جن کی وجہ سے مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے ساتھ سرد مہری برتی۔ وہ عوامل ہیں اُن کی سیاسی روایات، سماجی رسوم، مذہبی معتقدات اور افلاس۔ گزشتہ دو صدیوں کی تاریخ کے مطالعے سے ان کی سیاسی روایات کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ مسلمان عوام نے ہندستان میں برطانوی حکومت کے قیام کی مخالفت نہیں کی اور نہ ہی برطانوی حکومت کے قیام نے اُس قوم میں کسی قسم کی سیاسی بے چینی اور عدم اطمینان کو جنم دیا۔ لاقانونیت اور ظلم و استبداد کے اُس دور میں جبکہ اس ملک کو کسی ایک عظیم طاقت کی شدید ضرورت تھی ہندستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا تمام دیسی باشندوں نے دل سے خیر مقدم کیا اور مسلمانوں نے بھی اس سیاسی تبدیلی کو اطمینان اور پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا لیکن اس سیاسی تبدیلی کے لازمی نتیجے کے طور پر جو ذیلی ردّ و بدل واقع ہوا وہ مسلمانوں کی حالت کے لیے زبردست اور غیر متوقع صدمے کا باعث بنا اسی وجہ سے ان میں انگریز بیزاری کا رجحان اس حد تک پیدا ہو گیا کہ اُنھیں ہر اُس شئے سے تنفر پیدا ہو گیا جس کا تعلق انگریزوں کی ذات سے ہو۔ اِنھی وجوہات کی بنا پر انھیں انگریزی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زبان اور اُن تمام علوم سے ایک قسم کی چڑ سی پیدا ہوگئی جن کی تدریس اس زبان میں کی جارہی تھی لیکن جوں جوں مسلمانوں میں تعلیم کی روشنی پھیلتی جارہی ہے توں توں اُن کی اِس چڑ اور تنفر میں کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔

مسلمان اپنے سیاسی اور سماجی موقف پر نازاں تھے اور ان کی جانب سے خود کو انگریزی تعلیم سے علیٰحدہ رکھنے کی ایک وجہ کسی حد تک یہ بھی تھی کہ ان دنوں سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں مسلمان طلباء کے ساتھ ساتھ ایسے طلبا بھی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے جنھیں مسلمان غیر ضروری تفاخر اور غیر معقول خود فریبی اور گھمنڈی پن کی وجہ سے سماجی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ یہ بات کسی طور تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ عربی اور فارسی کے علاوہ کسی اور زبان میں بھی جامع اور مفید علوم کا وجود ہوسکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے فلسفۂ اخلاق کو ایسی مذہبی بنیادوں پر استوار کر کے ایک مخصوص شکل عطا کر رکھی تھی جنھیں وہ حتمی اور بے خطا تصور کرکے تھے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ انھیں یورپی علم و ادب کی تحصیل کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ مجھے آج تک وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے جب کہ سرکاری یا دیگر منفعت بخش ملازمت کے حصول کی نیت سے انگریزی زبان کے سیکھنے کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن آج یہ تعصب بڑی حد تک کمزور پڑ چکا ہے۔

اس مسئلے کے مذہبی پہلو کا میں پہلے ہی جایزہ لے چکا ہوں۔ جہاں تک مسلمانوں کے افلاس اور نکبت کا سوال ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ اس پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ میں اس خیال کا حامی ہوں کہ مذکورہ بالا سماجی اور سیاسی عوامل اگرچہ آج بھی کارفرما ہیں تاہم اُن میں بڑی حد تک کمی ہوچکی ہے اور مسلمان رفتہ رفتہ اپنا دامن قدیم تعصبات کے چنگل سے چھڑاتے ہوئے انگریزی علوم و ادب کے مطالعے کی جانب بڑھنے لگے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ د

APPENDIX - D

انڈین نیشنل کانگریس کی دستوری تجاویز کے بارے میں دارالعوام میں
مسلم عرضداشت مع وضاحتی بیان بابت دستخط کنندگان

(الف) عرضداشت

حسب ذیل دستخط کنندگان مسلمانانِ ہند، برطانیہ عظمیٰ اور آیرلینڈ کی پارلیمنٹ میں دارالعوام کے معزز ارکان کی خدمت میں اپنی ناچیز عرضداشت پیش کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں :

عرضی گذاران اس معزز ایوان کی خدمت میں عرض پرداز ہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس کی خواہش کے مطابق ہندستانی کونسلوں کے دستور میں اصولِ انتخاب کو شامل نہ کیا جائے۔

کیونکہ عرضی گذاران کو اس امر کا یقینِ واثق ہے کہ اس اصول کی شمولیت کے باعث وہ مساویانہ انصاف تباہ و تاراج ہوجائے گا جو آج تک برطانوی راج کا طرۂ امتیاز اور بنیاد رہا ہے۔ اس اصول کی شمولیت نہ صرف عرضی گذاران بلکہ دیگر اقلیتوں کو بھی اُن طبقات کی ناقابلِ برداشت غلامی اور دست نگری کا طوق پہنا دے گی جو فعال طور پر ان کی فلاح و بہبود کے تعلق سے جارحانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

عرضی گذاران حسب ذیل حقایق کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں :

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1 ۔ کہ ہندستانی مسلمان، باوجودیکہ وہ ہندستان کی جملہ آبادی کا صرف $\frac{1}{5}$ واں حصہ ہیں، ملک کا واحد سب سے بڑا فرقہ ہیں ہیں کی تعداد 50,000,000 افراد پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ملکہ معظمہ کی رعایا کے اتنے بڑے طبقے کی فلاح و بہبود کا سوال کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی جانب سے یہ معزز ایوان صرفِ نظر کر سکے۔

2 ۔ کہ اپنی تاریخ، روایات، شجاعت اور ذہانت کے اعتبار سے ہندستان کی مسلمان قوم ہندستانی سیاست میں ایک اہم فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔

3 ۔ جہاں تک ہندستانی مسلمانوں کا تعلق ہے وہ یورپ کی مختلف قومیتوں کی طرح کسی مخصوص علاقے سے واسطہ نہیں رکھتے ہیں بلکہ برِ صغیر ہندستان کے طول و عرض و بسنے والی مختلف قوموں اور ذاتوں کے مابین منتشر زندگی گزارتے ہیں اسی اسی وجہ سے ملک کے اکثر علاقوں میں وہ ایک قابلِ لحاظ اقلیت بن گئے ہیں۔ چنانچہ انتخابات کا کوئی سا طریقہ اپنایا جائے وہ بہرحال ووٹوں کے اعتبار سے خسارے ہی میں رہیں گے۔ موجودہ بلدیہ جاتی ادارے اس امر کا بین ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ بلا خوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انتخابات کے دوران اگر اُسی قسم کا احتجاج شروع کیا جاتا ہے جیسا کہ آج کل گاؤکشی کے امتناع کے سلسلے میں چل رہا ہے اور جو کامیاب ہو جائے تو اَن گنت فریب مسلمان اپنی غذا کے ایک اہم ترین جُز سے محروم ہو جائیں گے تو ان حالات میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے والا ایک بھی مسلمان انتخاب نہیں جیت سکے گا۔

4 ۔ کہ صرف انگریزی تعلیم یافتہ ہندوؤں ہی کا ایک طبقہ ایسا ہے جو حکومتِ ہند کو انتخابی طریقہ اپنانے پر مجبور کر رہا ہے اور یہ وہ طبقہ ہے جو خود کی بات کو ہندستان اور برطانیہ میں منوانے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتا ہے جبکہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ انگریزی تعلیم کے معاملے میں بے انتہا پچھڑے ہوئے ہیں اور اپنی بات کو دوسروں تک ہندوؤں کی طرح موثر انداز میں نہیں پہنچا سکتے لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ معزز ایوان نیشنل کانگریس کی چیخ پکار اور تحریک سے متاثر ہو کر اُن دیسی عوام کی آواز کو کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے بے وقعت اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غیر اہم نہ سمجھے جو کانگریس کے مطالبات کی مخالفت کرتے ہیں۔

5۔ کہ متناسب نمایندگی کا کوئی بھی طریقہ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کسی طور پر بھی موزوں نہیں ہے۔ جہاں تک ہندوؤں کا سوال ہے ان کی تمام ذاتیں مل کر ہمیشہ چار کے مقابل ایک کی اکثریت میں رہیں گی۔ چونکہ کونسل کے تمام امور سادہ اکثریت کی بنیاد پر طے پائیں گے لہٰذا مسلمان ارکان کو ہمیشہ اکثریتی ووٹوں سے شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عرضی گذاران اس معزز ایوان سے درخواست کرتے ہیں کہ ہندستانی کونسلوں میں ارکان کی نامزدگی کے موجودہ سرکاری طریقے کو بحال رکھا جائے کیوں کہ صرف اسی طریقے سے نہ صرف اُن کے بلکہ دیگر اقلیتوں کے مفادات کا بھی تحفظ کیا جاسکتا ہے۔

کہ عرضی گذاران کو اس امر کا پورا یقین ہے کہ معزز ایوان اُن کے معروضات پر مکمل ہمدردی کے ساتھ غور کرے گا۔

اور عرضی گذاران اس امر کے باعث ہمیشہ دست بہ دعا رہیں گے۔

(ب) معتمد یونائٹیڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی جانب سے جاری کردہ وضاحتی بیان بابت دستخط کنندگان

ذیل میں اُن مقامات کی وضاحت کی گئی ہے جہاں کے عرضی گذاران سے دستخط حاصل کیے گئے ہیں۔ اسی طرح اس بات کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ ہر مقام سے کتنے دستخط حاصل کیے گئے۔ جہاں کسی ایک ہی ضلعے کے دو یا دو سے زیادہ شہروں یا قصبوں سے دستخط حاصل کیے گئے ہوں انھیں اس ضلعے کے سب سے اہم شہر کے ذیل میں درج کیا جائے گا۔ چنانچہ اِن ناموں کے اندراج کا مقصد اضلاع کی نشاندہی کرتا ہے نہ کہ شہروں کی۔

دہلی (پنجاب)	4,183	مرادآباد	(N.W.P)	1,745
شاہجہاں پور	(N.W.P)	3,193	بٹالہ	(پنجاب)	1,613
علی گڈھ	(N.W.P)	2,817	لکھنؤ	(اودھ)	1,512
لاہور	(پنجاب)	2,223	آگرہ	(N.W.P)	1,503
الاآباد	(N.W.P)	1,959	کانپور	(N.W.P)	1,304

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایٹہ	(N.W.P)	1,118	رائی پت	(پنجاب)	170
فتح گڑھ	(N.W.P)	1,125	قصور	(پنجاب)	170
غازی پور	(N.W.P)	1,112	کرنال	(پنجاب)	169
فیروز پور	(پنجاب)	1,080	رنگ پور	(بنگال)	164
گجرات	(پنجاب)	914	کراچی	(سندھ)	148
مظفر نگر	(N.W.P)	907	مونگھیر	(بنگال)	144
اجمیر	(راجپوتانہ)	784	شیرکوٹ	(سندھ)	131
متھرا	(N.W.P)	771	پانڈوا	(بنگال)	127
جون پور	(N.W.P)	752	بھوپال	(راجپوتانہ)	125
بجنور	(N.W.P)	717	سیوان	(بنگال)	125
مین سنگھ	(بنگال)	693	مین پوری	(N.W.P)	125
کلکتہ	(بنگال)	577	شکارپور	(سندھ)	124
پٹنہ	(بنگال)	445	منڈاور	(میسور)	114
میرٹھ	(N.W.P)	314	مالی سنگھ پور	(؟)	91
سندھیلہ	(اودھ)	309	مظفر گڑھ	(پنجاب)	90
ریواری	(پنجاب)	308	دیناج پور	(بنگال)	86
اعظم گڑھ	(N.W.P)	281	اندور	(راجپوتانہ)	83
حیدرآباد	(سندھ)	230	سکھر	(سندھ)	81
ناگپور	(مرکزی صوبجات)	226	ٹمکر	(مدراس)	80
بلند شہر	(N.W.P)	226	روہتک	(پنجاب)	67
بدایوں	(N.W.P)	217	بلگرام	(اودھ)	67
جالندھر	(پنجاب)	195	ڈنڈی گل	(مدراس)	63
ہوشیارپور	(پنجاب)	192	بھگوان پورہ	(پنجاب)	63
امبالہ	(پنجاب)	187	فتح پور	(N.W.P)	59
دربھنگہ	(بنگال)	173	چھپرہ	(بنگال)	55

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارہ بنکی (اودھ)	54	پرتاب گڑھ (اودھ)	26
ڈم کل	48	جبلپور (مرکزی صوبہ جات)	22
ہگلی (بنگال)	41	سورت (بمبئی)	19
اناؤ (اودھ)	39	مظفر پور (بنگال)	13
بریلی (N.W.P)	38	بدنا پور (بنگال)	157

جملہ 29,299

مندرجہ بالا دستخطوں میں ملتِ اسلامیہ کی کئی باوقار اور ذی اثر شخصیتوں کے دستخط شامل ہیں۔ 4,568 دستخطوں کے تجزیاتی مطالعے سے دستخط کنندگان کے دھندوں اور پیشوں سے متعلق حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

زمیندار	1,068
تاجر	643
ملازمین	637
دوکاندار	563
طلباء	281
کاریگر	151
کاشتکار	113
ماہرین طب	75
علماء (پیش امام)	69
اساتذہ	65
ماہرین قانون	48
سرکاری وظیفہ یاب	35
متفرق	316
غیر واضح	505

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ھ

APPENDIX-E

بالائی ہند کی محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن کے اصول وضوابط

1 - یہ ادارہ بالائی ہند کی محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن کہلائے گا۔

2 - اس کے اغراض ومقاصد اس طرح ہوں گے۔

ا) انگریز عوام اور حکومتِ ہند کے روبرو مسلمانوں کے افکار وخیالات کی نمایندگی کے ذریعے اُن کے مفادات کا تحفظ کرنا۔

ب) مسلمانوں میں عوامی، سیاسی تحریکات کے فروغ کی روک تھام کرنا۔

ج) اُن اقدامات کی حمایت کرنا جن کا مقصد برطانوی حکومت کے استحکام میں اضافہ کرنا اور سلطنت (امپائر) کا تحفظ کرنا ہے۔ ہندستان میں امن کی بحالی کے لیے جدوجہد کرنا اور رعایا میں وفاداری کے جذبے کو اُبھارنا۔

3 - بہ جُز اُن افراد کے جن کی وضاحت ضابطہ نمبر 4 میں کی گئی ہے، ہر وہ شخص جو اس ادارے کے اغراض ومقاصد کے ساتھ اتفاق رکھتا ہو سالانہ تین روپے فیس ادا کر کے اس کی رکنیت حاصل کر سکتا ہے۔

4 - حکومت کا کوئی تنخواہ یاب ملازم یا کوئی طالبِ علم اس ایسوسی ایشن کا رُکن نہیں بن سکتا۔

5 - اس ایسوسی ایشن کی حکمتِ عملی ایک کونسل وضع کرے گی جو اس ادارے کے تمام امور کی ذمہ دار ہوگی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

6 ۔ ابتداً کونسل حسب ذیل اصحاب پر مشتمل ہوگی :

خان بہادر برکت علی خاں	ایم ۔ شاہ دین ' بیرسٹر ایٹ لا
خواجہ یوسف شاہ	عبدالرحمٰن خاں ' بیرسٹر ایٹ لا
نیاز محمد خاں	عبدالحکیم خاں ' بیرسٹر ایٹ لا
سرسید احمد خان بہادر	تھیوڈور بیک
عزت مآب اسماعیل خاں	سید محمود
نواب محسن الملک	محمد میر

7 ۔ کونسل کے موجودہ ارکان ایسوسی ایشن کے دیگر ارکان کو بھی کونسل میں شامل کر سکتے ہیں۔ اگر دس ارکان میں سے ایک رکن بھی کسی شخص کے خلاف ووٹ دیتا ہے تو اُس شخص کا انتخاب نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی کسی شخص کا نام کونسل کے انتخاب کے لیے تجویز کیا جائے تو لازم ہوگا کہ اس کا نام بذریعہ ڈاک کونسل کے تمام ارکان کے پاس بھیجا جائے ۔ تحریری طور پر وصول ہونے والے ووٹوں کے لحاظ سے انتخاب کا فیصلہ کیا جائے گا۔

8 ۔ اگر کونسل کے ارکان کی تعداد 24 سے تجاوز کر جاتی ہے اُس صورت میں ایک سال میں کونسل کے لیے تین سے زیادہ ارکان کا انتخاب عمل میں نہیں لایا جائے گا۔

9 ۔ کونسل کے ارکان سالانہ پانچ روپے بطور رکنیت فیس ادا کریں گے ۔

10 ۔ ایسوسی ایشن کا معتمد اعزازی وقتاً فوقتاً کونسل کا اجلاس اُن مقامات پر طلب کرے گا جو اس کی رائے میں موزوں ہوں گے ۔ بشرطیکہ معتمد اعزازی کونسل کے ارکان کی اکثریت، جن کی تعداد اُس وقت کونسل کے جملہ اراکین کی نصف سے کم نہیں ہوگی، کونسل کا اجلاس اُس مقام یا اُس تاریخ پر طلب کرے گا جس کی خواہش ارکان نے ظاہر کی ہوگی ۔

11 ۔ کونسل اگر کوئی عرضداشت یا میمنی فیسٹو جاری کرنا چاہے تو مجوزہ عرضداشت یا میمنی فیسٹو کی ایک ایک نقل کونسل کے تمام ارکان کے پاس منظوری سے قبل ہی بھیجی جائے گی تاکہ وہ اُس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں ۔ کونسل کے تمام فیصلے وصول شدہ آراء کی اکثریت کے لحاظ سے کیے جائیں گے ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

12 ۔ ایسوسی ایشن کے عہدیداروں کا انتخاب کونسل ہی کرے گی۔

13 ۔ اس ایسوسی ایشن کی جانب سے جاری کی جانے والی تمام یادداشتوں، مینی فیسٹو اور دیگر مطبوعات کے نسخے ایسوسی ایشن کے تمام ارکان کو بھیجے جائیں گے۔

14 ۔ ارکان کے علاوہ دیگر ایسے اصحاب سے بھی عطیے قبول کیے جائیں گے جو ایسوسی ایشن کے کام میں مدد دینے کے خواہشمند ہوں۔

15 ۔ ایسوسی ایشن کے ان قواعد وضوابط میں اُس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکے گی جب تک کہ کونسل کے ارکان کی دو تہائی اکثریت ایسا نہ چاہے۔ اس سلسلے میں ارکان اپنے ووٹ شخصی یا تحریری طور پر دے سکتے ہیں۔

16 ۔ ایسوسی ایشن کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مندرجہ بالا اصول وضوابط کی روشنی میں کونسل ذیلی قوانین ترتیب دینے کی مجاز ہوگی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ و

APPENDIX — F

سپاس نامہ وفدِ اسلامی مع اسمائے اراکین اور لارڈ منٹو کی جانب سے دیا گیا اُس سپاسنامے کا جواب

مسلمانوں کے وفد کی جانب سے پیش کردہ سپاسنامہ

۱ — خدا کرے کہ یہ سپاسنامہ حضور والا کے لیے باعثِ شادمانی ہو

۔ ہم حسب ذیل دستخط کنندگان جن کا تعلق ہندستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والے نوابوں، جاگیرداروں، تعلقداروں، وکیلوں، زمینداروں، تاجروں اور دیگر طبقات سے ہے جو ملک معظم شہنشاہ والا تبار کی مسلمان رعایا کے ایک بہت بڑے طبقے کی نمایندگی کرتے ہیں حضور والا کی حسب اجازت خدمتِ اقدس میں بصد عجز و احترام حسب ذیل سپاسنامہ پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں تاکہ حضور اس پر ہمدردانہ غور فرما کر ممنون فرمائیں۔

2 ۔ ہمیں اس امر کا اچھی طرح احساس ہے کہ ہندستان کے اس وسیع و عریض برصغیر میں بسنے والے کروڑوں عوام جن کا تعلق مختلف مذاہب اور مختلف قوموں سے ہے برطانوی راج کی بے شمار برکتوں سے مستفید ہوئے ہیں۔ اس حکومت کے سائے میں ہمیں جو امن، تحفظ، شخصی آزادی اور عبادات کی آزادی حاصل ہے اُس کے لیے ہم بے انتہا ممنون ہیں۔ انتہائی معقول وجوہات کی بنا پر ہم حکومت کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دانشورانہ روشن خیالی سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ ان فایدوں اور برکتوں میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا اور مستقبل میں اقوام عالم کی برادری میں ہندستانی موقف کی اہمیت بڑھتی ہی رہے گی۔

3 ۔ ہندستان میں برطانوی حکمتِ عملی کی سب سے اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ ابتدا ہی سے حکومت نے ممکنہ حد تک اس ملک کے عوام کی خواہشات اور جذبات کا احترام کیا جن کا تعلق اُن کے مفادات سے ہے۔ ایسا کرتے ہوئے حکومت نے ہمیشہ اس ملک میں بسنے والے عوام کی مذہبی اور قومی بوقلمونی کو ملحوظِ خاطر رکھا جو تمام ہندستانی مسایل کی ایک اہم ترین خصوصیت ہے۔

4 ۔ ملک کے مختلف گوشوں میں بسنے والی اہم قوموں کے با اثر افراد کے ساتھ مخلصانہ اور رازدارانہ مشوروں سے ابتدا کر کے اس اصول کو مزید توسیع دی گئی اور مسلمہ سیاسی اور تجارتی انجمنوں کے اس حق کو تسلیم کر لیا گیا کہ وہ عوامی اہمیت کے حامل تمام اقدامات کے تعلق سے عہدیدارانِ بالا کو اپنی تنقیدوں اور نظریات سے آگاہ کر سکتی ہیں اور اس اصول کی توسیع کے آخری مرحلے میں حکومت نے بلدیہ جات، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور سب سے بڑھ کر ملک کی مجالس مقننہ پر نامزدگی اور انتخابات کے ذریعے عوام کے نمایندوں کو بالراست اپنی آراء اور تنقید پیش کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ حضورِ والا ۔۔۔ خصوصی کمیٹی تشکیل دی ہے جو اس آخرالذکر توسیع کا جایزہ یہ معلوم کرنے کے لیے لینے والی ہے کہ نامزدگی اور انتخابات کے اس طریقے میں مزید توسیع کس طرح کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ آج ہم لوگ حضورِ والا کی خدمت میں خاص اسی غرض سے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کے روبرو اس توسیع شدہ طریق نمایندگی میں مناسب حصّہ عطا کیے جانے کے علاوہ بعض دیگر ایسے مطالبات بھی پیش کر سکیں جن کا تعلق بڑی حد تک ہماری قوم کے مفادات سے ہے۔

5 ۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندستانی مسلمانوں کی تعداد چھے کروڑ دو لاکھ ہے جو ہز میجسٹی کی سلطنت کے ہندستانی علاقے میں بسنے والی جملہ آبادی کے ¼ اور ⅕ کے درمیان ہے۔ اور اگر آبادی کی جملہ تعداد میں سے غیر مہذّب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وحشی مظاہر پرست animists قبائل اور دیگر چھوٹے غیر ابراہیم مذاہب کے ماننے والوں ماننے والوں کو خارج کر دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اُن تمام طبقوں کو بھی خارج کر دیا جائے جن کا اندراج تو ہندوؤں کی حیثیت سے کیا گیا ہے لیکن جو دراصل ہندو نہیں ہیں تو ایسی صورت میں ہندو اکثریت کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب کافی حد تک بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نمایندگی کا محدود طریقہ رائج کریں یا وسیع طریقے کو اپنائیں ہم بہ حیثیت ایک ایسی قوم کے جو اپنی تعداد کے اعتبار سے روس کو چھوڑ کر یورپ کی کسی بھی درجہ اوّل کی طاقت سے بڑی ہے' منصفانہ طور پر اس امر کا مطالبہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں مملکت کا ایک اہم ترین عنصر تسلیم کیا جائے۔ ہم لوگ حضورِ والا کی اجازت سے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے یہ عرض کرنے کی جرأت بھی کرتے ہیں کہ نمایندگی کی بالواسطہ شکل ہو یا بلاواسطہ مسلمان قوم کو اس میں اور دیگر تمام امور میں جو بھی ایسا حصّہ دیا جائے گا جس کے باعث اُن کی حیثیت اور اثر و رسوخ میں تبدیلی واقع ہوتی ہو' وہ حصّہ نہ صرف ان کی تعداد کے ساتھ متناسب ہو بلکہ ان کی سیاسی اہمیت اور سلطنت کے دفاع کے لیے وہ جو قربانیاں پیش کرتے ہیں اُن کی قدر و قیمت کے ساتھ بھی مناسبت رکھتا ہو۔ ہمیں اس بات کی بھی توقع ہے کہ حضور والا اس سلسلے میں مسلمانوں کے اُس مقام کو بھی پیشِ نظر رکھیں گے جو ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصہ قبل انھیں ہندستان میں حاصل تھا۔ جس کی یادیں فطری طور پر ابھی تک ان کے اذہان سے محو نہیں ہو پائی ہیں۔

6۔ مسلمانانِ ہند نے ہمیشہ اپنے حکمرانوں کی انصاف پسندی اور غیر جانبداری پر تکیہ کیا ہے اسی وجہ سے اُنھوں نے کبھی بھی اپنے مطالبات منوانے کے لیے ایسے طریقے استعمال نہیں کیے جو حکمرانوں کے لیے پریشانی کا باعث ہوں لیکن ہماری اس شدید خواہش کے باوجود کہ مستقبل میں بھی مسلمان اپنی ان قدیم اور عمدہ روایات پر کاربند رہیں' ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ حالیہ واقعات نے اُن میں' بطورِ خاص مسلمانوں کی نوجوان نسل میں' ایسے جذبات پیدا کر دیئے ہیں جن پر قابو پانا بعض حالات اور بعض حادثات کی وجہ سے سنجیدہ اور معتدل مزاج رہنماؤں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے ممکن نہ رہے گا۔

7 - لہٰذا ان معروضات پر، جنھیں ہم نے ہندستان کے سبھی علاقوں میں بسنے والے اپنے ہم مذہب بھائیوں کے نظریات اور خواہشات پر نہایت محتاط طریقے سے غور و خوض کرنے کے بعد مرتب کیا ہے، ہم بذریعہ ہذا حضور والا کی خدمت میں اس استدعا کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں کہ ان پر عالی جاہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں۔

8 - ہمیں امید ہے کہ عالی جاہ ہمیں معاف فرمائیں گے اگر ہم ابتدا ہی میں یہ واضح کر دیں کہ ہندستانیوں کے لیے یورپی طرز کے نمایندہ ادارے بالکل ایک نئی چیز ہیں ہماری قوم کے بیشتر سنجیدگی اہلِ فکر اصحاب کی رائے یہ ہے کہ اگر ان اداروں کو کامیابی کے ساتھ ہندستان کے سماجی، مذہبی اور سیاسی حالات کے مطابق اس ملک میں اپنانا ہے تو اس کے لیے زبردست پیش بینی، احتیاط اور غور و فکر کی ضرورت لاحق ہوگی اور یہ کہ اس معاملے میں اگر اس طرح کے غور و فکر اور احتیاط کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو عین ممکن ہے کہ ان اداروں کی شروعات کی وجہ سے من جملہ متعدد برائیوں کے ایک بڑی بات یہ پیدا ہو جائے گی کہ ہمارے قومی مفادات کا انحصار ایک ایسی اکثریت کے رحم و کرم پر ہو جائے گا جس کا رویہ ہمارے تعلق سے انتہائی غیر ہمدردانہ ہے تاہم چونکہ ہمارے حکمرانوں نے اپنی قدیم روایات اور جبلتوں کے پیشِ نظر اس امر کو قرینِ مصلحت سمجھا ہے کہ ان اداروں کو اس ملک کی حکومت میں بتدریج اہمیت عطا کریں۔ چنانچہ ہمارے اپنے قومی مفادات کے منصفانہ تحفظ کے لیے لازم ہے کہ ہم مسلمان بھی اپنی علیحدگی پسندی کو ختم کرتے ہوئے اُس قسم کے حالات کی تشکیل میں ہاتھ بٹائیں جیسے کہ ہمارے حکمران یہاں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم بصد امتنان و تشکر اس امر کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں کہ آج تک مسلمانانِ ہند کو ان اداروں میں جو کچھ بھی نمایندگی حاصل ہوتی رہی وہ نتیجہ ہے حضور والا کی اور آپ کے قابل پیشرو وائسرایان ہند اور مقامی حکومتوں کے سربراہوں کی انصاف پسندی اور غیر جانبداری کا جو بلا استثنا مجلس مقننہ کی رکنیت کے لیے مسلمانوں کو نامزد کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ہم یہ عرض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیے بنا نہیں رہ سکتے کہ ہمیں اس طرح حاصل ہونے والی نمایندگی نہ صرف یکطرفہ
یہ کہ ہماری ضروریات سے بہت کم ہوا کرتی تھی بلکہ اکثر صورتوں میں تو اس طرح نامزد
کیے جانے والے امیدواروں کو ان لوگوں کی حمایت بھی حاصل نہیں ہوتی تھی جن
کی نمایندگی کرنے کے لیے حکومت انھیں نامزد کرتی تھی۔ اُس دور میں پائے
جانے والے حالات میں یہ صورتِ حال گویا ناگزیر ہی تھی کیونکہ ایک جانب تو وائسرائے
اور مقامی حکومتوں کی جانب سے نامزد کیے جانے والے نمایندوں کی تعداد انتہائی
محدود ہوا کرتی تھی دوسری جانب حکومت کے پاس ایسے کوئی قابلِ اعتماد ذرایع موجود
نہیں تھے جنھیں استعمال کر کے وہ یہ معلوم کر سکتی کہ حقیقی عوامی رجحان کیا ہے جس کی
وجہ سے صحیح معنوں میں مناسب نمایندوں کا انتخاب کرنا اتنا آسان کام نہ تھا جہاں
تک انتخابات کے نتایج کا تعلق ہے اُن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ جس
انداز سے آجکل انتخابی ادارے تشکیل دیے جا رہے ہیں اُسے دیکھ کر بخوبی اندازہ
لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ادارے شاید ہی کسی مسلمان امیدوار کا نام منظوری کے لیے
حکومت کے روبرو پیش کریں بجز اُس شخص کے جو تمام اہم معاملات میں اکثریت
کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہو۔ ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے غیر مسلم
برادرانِ وطن کی اس خواہش میں بھی کسی قسم کا نقص تلاش نہیں کر سکتے۔ جو یہ چاہتے
ہیں کہ اپنی اکثریتی طاقت کا بھرپور فایدہ حاصل کرتے ہوئے صرف اپنی ہی قوم کے
نمایندوں کو ووٹ دیں یا پھر اُن غیر ہندو نمایندوں کی حمایت کریں جن سے یہ توقع
کی جاتی ہو کہ وہ بھی اُنھی لوگوں کو اپنے ووٹ دیں گے جنھیں ہندو اکثریت کی
حمایت حاصل ہو کیونکہ مستقبل میں دوبارہ انتخاب جیتنے کے لیے انھیں پھر کسی
اکثریتی فرقے کی حمایت پر انحصار کرنا پڑے گا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے بھی کئی اہم
مفادات ہندو برادرانِ وطن کے ساتھ مشترک ہیں اور یہ امر ہمارے لیے بڑی
طمانیت کا باعث ہوگا کہ مجالسِ مقننہ میں ہمیشہ ایسے نمائندے موجود رہیں جو بلا
لحاظ قومیت اِن مفادات کا تحفظ کرتے رہیں۔ تاہم اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا
کہ ہم مسلمان ایک ایسی منفرد قوم ہیں جو اپنے مخصوص مفادات کی حامل ہے جن میں
کوئی اور قوم حصے داری کا دعویٰ نہیں کر سکتی اور انھی مفادات پر آج تک اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجہ سے ضرب پڑتی رہی ہے کہ ان کی آج تک مناسب نمایندگی ہی نہیں ہو پائی ہے حتیٰ کہ اُن صوبوں میں بھی جہاں مسلمانوں کو جملہ آبادی میں واضح اکثریت حاصل ہے۔ اکثر ہمارے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا گیا گویا کہ ہم وہاں بھی سیاسی اقتدار سے آبادی کا ایک ایسا جُز ہیں جسے کسی بے انصافی کے بغیر بہ آسانی نظر انداز کیا جاسکتا ہو۔ کسی حد تک ایسی صورتِ حال پنجاب میں رہی لیکن انتہائی شدید حد تک ایسی صورتِ حال سندھ اور مشرقی بنگال میں پائی جاتی ہے۔

۹۔ نمایندگان کے انتخابات کے بارے میں اپنے خیالات و نظریات کے اظہار سے قبل ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ کسی قوم کی سیاسی اہمیت میں کمی یا اضافہ ہونے کا دارومدار اس حقیقت پر مبنی ہوتا ہے کہ اُس قوم کے افراد کو صوبائی ریاست کی سرکاری ملازمتوں میں کیا مقام حاصل ہے۔ اگر سرکاری ملازمتوں میں کسی قوم کو مناسب نمایندگی حاصل نہیں ہوتی، جیسا کہ بدقسمتی سے مسلمانوں کا حال ہے، تو وہ قوم اپنا اثر اور وقار کھو دیتی ہے جو بربنائے انصاف اُس قوم کا حق ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم حکومت سے استدعا کریں گے کہ آئندہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھے کہ ہندستان کے مختلف صوبہ جات کی گزیٹیڈ اور ماتحت اور ضیغہ دارانہ ملازمتوں میں مسلمانوں کو ہمیشہ مناسب نمایندگی حاصل ہوتی رہے۔ بعض صوبائی حکومتوں نے اس قسم کے احکامات بھی جاری کیے لیکن بدقسمتی سے اُن احکامات پر ہر جگہ مناسب عمل آوری نہیں کی گئی جس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ملازمتوں کے لیے درکار معیارِ قابلیت رکھنے والے مسلمان مہیا نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ ایک زمانہ ایسا ضرور تھا جب کہ اس قسم کا اعتراض درست قرار دیا جاسکتا تھا لیکن آج کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے اور ہم حضور والا کو بہ مسرت یہ تیقن دلانا چاہتے ہیں کہ آج ہر اُس جگہ مطلوبہ معیارِ قابلیت پر پورے اترنے والے مسلمانوں کی کم از کم اتنی تعداد ضرور موجود رہتی ہے جتنی اسامیاں تقرر طلب ہوتی ہیں بشرطیکہ تقرر کنندگان کے دل میں انھیں بہ ہر حال مسترد کرنے کا جذبہ موجود نہ ہو۔ آج چونکہ اہلیت رکھنے والے مسلمانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے اس لیے بدقسمتی سے انھیں اس بنا پر مسترد کر دینے کا رجحان تقویت پانے لگا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ اُن کے مقابلے میں دوسری قوم کے نمایندوں کا معیار قابلیت مطلوبہ معیار سے زیادہ بلند ہوتا ہے جس کی بنا پر انھیں ترجیح دی جاتی ہے۔ اس رجحان کی وجہ سے دونوں قوموں کے مابین ایک بھیانک قسم کا مسابقتی جذبہ پروان چڑھنے لگا ہے اور ہمیں حضور والا کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کروانے کی اجازت دی جانی چاہیے کہ سرکاری عہدوں پر صرف ایک طبقے کی اجارہ داری قایم ہو جانے کی وجہ سے اسے جو اثر و رسوخ حاصل ہو گیا ہے اُس کی خاصی سیاسی اہمیت بھی ہے۔ اس ضمن میں ہم اس امر کی جانب بھی اشارہ کرنا چاہیں گے کہ تعلیمی تحریک کے ابتدائی دور ہی سے مسلمان ماہرینِ تعلیم نے اپنی قوم کی کردار سازی پر زیادہ زور صرف کیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایک اچھا سرکاری ملازم بنانے کے لیے کسی فرد کے ذہن کی جو صیقل گری کی جاتی ہے اُس کے مقابلے میں یہ کردار سازی بدرجہا بہتر ہے۔

۱۰۔ ہم یہ عرض کرنے کی جسارت بھی کرتے ہیں کہ عام طور پر ہندستان کے تمام ہی علاقوں کے مسلمان اس بات پر دکھ محسوس کرتے کہ محکمہ عدلیہ کی ہائی کورٹوں اور چیف کورٹوں میں مسلمان ججوں کا تقرر تواتر کے ساتھ عمل میں لایا نہیں جاتا۔ ان عدالتوں کی تخلیق کے بعد سے اب تک صرف تین مسلم وکلاء کو ان معزز عہدوں پر فایز کیا گیا کیونکہ ان تینوں حضرات نے ان اعلیٰ عہدوں پر فایز کیے جانے کے لیے خود کی اہلیت کو ثابت کر دکھایا تھا جبکہ آج صورتِ حال یہ ہے کہ ان عدالتوں میں آج ایک بھی مسلمان جج موجود نہیں ہے جبکہ کلکتہ ہائی کورٹ میں تین ہندو جج فایز ہیں جہاں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مسلمانوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ اُسی طرح پنجاب کی چیف کورٹ میں دو ہندو جج فایز ہیں جہاں آبادی کے اعتبار سے مسلمان اکثریت میں ہیں۔ لہٰذا ہمارا یہ مطالبہ ہرگز بیجا تصوّر نہیں کیا جائے گا کہ ہر ہائی کورٹ اور چیف کورٹ میں کم از کم ایک مسلمان جج فائز کیا جائے۔ اس عہدے کے لیے مطلوبہ معیارِ قابلیت رکھنے والے مسلمان وکلاء بہ آسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اگر کسی ایک صوبے میں کوئی اہل امیدوار دستیاب نہ ہو سکے تو اُسے دوسرے صوبے میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی جائے کہ ان عدالتوں میں ایسے ججوں کی موجودگی جو اسلامی قانون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں مہارت رکھتے ہوں یقیناً عدالتی امور کی بہتر کارکردگی کے لیے باعثِ تقویت ہوگی

11 ۔ میونسپل اداروں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو اُن اہم مقامی مفادات سے واسطہ پڑتا ہے جن کا تعلق بڑی حد تک صحت، آرام، تعلیمی ضروریات اور باشندوں کے مذہبی معاملات سے ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم دیگر اہم اور بڑے مسایل کی جانب عالی جاہ کی توجہ کو مبذول کروائیں، ہم توقع رکھتے ہیں کہ ہمیں حضور والا معاف فرمائیں گے اگر ہم عالی جاہ کی توجہ کو ان اداروں میں مسلمانوں کے موجودہ موقف کی جانب مبذول کروائیں۔ یہی ادارے جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، حکومتِ خود اختیاری کے زینے کی ابتدائی سیڑھیاں ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں اصولِ نیابت اچھی طرح عوام کے ذہن نشین کروایا جاتا ہے۔ لیکن فی الحال ان بورڈوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کے بارے میں کوئی ایسے رہنما اصول موجود نہیں ہیں جن کا یکساں طور پر ہر جگہ استعمال کیا جاسکے۔ مختلف علاقے میں مختلف طریقے رایج ہیں۔ مثلاً علی گڑھ کی بلدیہ چھ وارڈوں میں منقسم ہے اور ہر وارڈ میں ایک ہندو اور ایک مسلمان کمشنر منتخب ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہی اصول پنجاب اور دیگر صوبوں کے متعدد بلدیہ جات میں اپنایا جاتا ہے۔ لیکن کئی بلدیہ جاتی ادارے ملک بھر میں ایسے بھی ہیں جہاں مسلمان معصول دہندگان کو کافی نمایندگی حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا ہم مودبانہ عرض کریں گے کہ تمام مقامی اداروں کو اس بات کے لیے پابند کیا جائے کہ وہ ہر صورت میں اس بات کا اعلان کریں کہ ہر میونسپلٹی اور ہر ڈسٹرکٹ بورڈ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے کتنی کتنی نشستیں مخصوص کی گئی ہیں۔ نشستوں کی تعداد کا تعین دونوں قوموں کی آبادی کے تناسب، سماجی حیثیت، مقامی اثر و رسوخ، اور ہر قوم کی خصوصی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ جب اس طرح نشستوں کی تعداد کا تعین ہو جائے تب ہمارا مشورہ ہے کہ دونوں قوموں کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ الگ الگ اپنے نمائندوں کو منتخب کرسکیں۔ جیسا کہ یہ طریقہ پنجاب کے کئی شہروں میں رایج ہے۔

12 ۔ ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ ہندستانی جامعات کی مجالسِ عاملہ Senates اور اُن مجالس کی خصوصی مجلسوں Syndicates کے بارے میں بھی اسی قسم کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتظامات کیے جائیں۔ یعنی یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اس بات کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا جانا چاہیے کہ جامعات کے ان اداروں میں مسلمان کس تناسب میں نمایندگی حاصل کر سکتے ہیں۔

13۔ اب ہم ملک کی مجالس مقننہ میں اپنی نمایندگی کے مسئلے کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ صوبائی کونسلوں سے ابتدا کرتے ہوئے ہم نہایت مؤدبانہ طریقے سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بلدیہ جات اور ڈسٹرکٹ بورڈوں ہی کی طرح یہاں بھی مسلمانوں کو ڈی جانے والی نمایندگی کا تعین کیا جانا چاہیے۔ اُن کے نمایندوں کی تعداد کا تعین کرتے وقت ان تمام اہم امور کو پیش نظر رکھا جانا چاہیے جن کا تفصیلی ذکر ہم نے اس عرضداشت کی پانچویں شق میں کیا ہے اور یہ کہ اہم مسلم زمینداروں، وکیلوں، تاجروں اور دیگر اہم پیشوں سے تعلق رکھنے والے نمایندوں، میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے مسلمان ممبروں اور جامعات سے فارغ ہونے والے اُن مسلمان گریجویٹوں پر مشتمل جنھیں کم از کم پانچ سالہ تجربہ ہو، ایک انتخابی کالج Electoral College کی تشکیل کی جانی چاہیے جسے اس بات کا اختیار دیا جانا چاہیے کہ وہ مطلوبہ تعداد میں اپنی قوم کے نمائندے منتخب کر سکے۔ اس مقصد کے لیے حضور والا کی حکومت ضروری قواعد و ضوابط وضع فرمائے جن کی روشنی میں مذکورہ انتخابی کالج اپنی قوم کے نمایندوں کا انتخاب عمل میں لا سکے۔

14۔ جہاں تک شاہی مجلس مقننہ Imperial Legislative Council کا تعلق ہے اُس میں مسلمانوں کے مفادات کی مناسب نمایندگی کا مسئلہ خاصی اہمیت رکھتا ہے اس سلسلے میں ہم حسب ذیل تجاویز پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں:

(1)۔ کہ اس مجلس میں مسلمان نمایندوں کے تناسب کا تعین کرتے وقت جملہ آبادی میں ان کی تعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہیں کیا جانا چاہیے اور یہ کہ کسی صورت میں بھی مسلمان نمایندوں کو ایک غیر موثر اقلیت بننے نہیں دینا چاہیے۔

(2)۔ جہاں تک ممکن ہو سکے ان نمایندوں کے تقررات کے دوران انتخابی طریقے کو نامزدگی کے طریقے پر ترجیح دی جانی چاہیے۔

(3)۔ مسلم نمایندگان کو منتخب کرنے کے لیے مسلمان زمینداروں، وکیلوں،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاجروں اور دیگر اہم پیشوں سے متعلقہ صاحبِ حیثیت لوگوں، جن کا تشخص حضور والا کی حکومت بعد ازاں فرمائے، صوبائی کونسلوں کے مسلم ممبروں اور جامعات کے مسلم رفقا Fellows کو انتخابی اختیارات عطا کیے جائیں جنھیں وہ حضور والا کی حکومت کی جانب سے مرتب کردہ لائحہ عمل کے مطابق استعمال کر سکیں۔

15۔ کئی دنوں سے وایسرائے بہادر کی مجلس عاملہ Executive Council پر ایک یا ایک سے زیادہ ہندستانیوں کے تقرر کو قرینِ قیاس تصور کیا جانے لگا ہے۔ اگر واقعی ایسے تقررات کیے جاتے ہیں تو ہم عرض کرنا چاہیں گے کہ اس ضمن میں مسلمانوں کے استحقاق کی اَن دیکھی نہیں ہونی چاہیے۔ ہم یہ واضح کرنے کی جسارت بھی کریں گے کہ اس مقصد کے تحت ایک سے زیادہ مسلمان اس ملک میں ایسے ملیں گے جو اس ذی شان ایوان میں امتیاز کے ساتھ خدمات انجام دے سکیں۔

16۔ اب ہم حضور والا کی خدمت میں ایک ایسا مسئلہ پیش کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں جس کا راست تعلق ہماری قومی فلاح کے مسئلے کے ساتھ منسلک ہے۔ ہمیں اس امر کا پورا یقین ہے کہ من حیث القوم ہماری آرزوؤں کا مرکز اور ہمارے مستقبل کی ترقی کا بڑی حد تک دارومدار ایک ایسی مسلم یونیورسٹی کے قیام پر ہے جو ہماری مذہبی اور دانشورانہ زندگی کا مرکز بن سکے۔ لہٰذا ہم بصد احترام عرض پرداز ہیں کہ عالی جاہ اس عظیم کام میں ہماری مدد فرمائیں جس میں ہماری قوم کو بہت گہری دلچسپی ہے۔

17۔ اور آخر میں ہم حضور والا کو اس امر کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہندستانی امور کے اس ارتقائی مرحلے میں اُن خطوط پر ملک معظم کی مسلمان رعایا کی مدد فرما کر جن کی صراحت اس یادداشت میں کی گئی ہے، دراصل عالی جاہ برطانوی تختِ و تاج کے ساتھ مسلمانوں کی غیر متزلزل وفاداری کو مزید استحکام عطا فرمائیں گے اور اس طرح مسلمانوں کی سیاسی ترقی اور قومی خوشحالی کا سنگِ بنیاد حضورِ عالی مرتبت ہی کے ہاتھوں رکھا جائے گا اور اُن کی آنے والی نسلیں آیندہ کئی برسوں تک حضور کے نام کو جذبۂ احسان مندی کے ساتھ یاد رکھیں گی ہمیں امید

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ حضور والا ہمارے ان معروضات پر سنجیدگی سے غور فرما کر ممنون فرمائیں گے

وائسرائے بہادر کی خدمت میں یکم اکتوبر 1906ء کو شرفِ باریابی حاصل کرنے والے مسلم وفد کے ارکان کے اسمائے گرامی کی فہرست

الف۔) حسب ذیل حضرات نے وائسرائے سے شرفِ ملاقات حاصل کیا:

1 ۔ ہز ہائی نس آغا سر سلطان محمد شاہ آغا خاں۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ (بمبئی)
2 ۔ شہزادہ بختیار شاہ، او۔ آئی۔ ای، سربراہ خاندانِ میسور، کلکتہ۔
3 ۔ عزت مآب ملک عمر حیات خاں۔ سی۔ آئی۔ ای۔ سترہویں پرنس آف ویلز کے تیوانہ لانسرز کے لفٹیننٹ، تیوانہ، شاہ پور، (پنجاب)
4 ۔ عزت مآب خان بہادر میاں محمد شاہ دین، بار ایٹ لا، لاہور۔
5 ۔ عزت مآب مولوی شرف الدین، بار ایٹ لا، پٹنہ۔
6 ۔ خان بہادر سید نواب علی چودھری، میمن سنگھ (مشرقی بنگال)
7 ۔ نواب بہادر سید امیر حسین خاں، سی۔ آئی۔ ای۔ کلکتہ۔
8 ۔ نصیر حسین خاں خیال، کلکتہ۔
9 ۔ خان بہادر مرزا شجاعت علی بیگ۔
10 ۔ ایران کے قونصل جنرل۔ مرشد آباد، کلکتہ (بنگال)
11 ۔ سید علی امام، بار ایٹ لا۔ پٹنہ (بہار)
12 ۔ نواب سر فراز حسین خاں، پٹنہ (بہار)
13 ۔ خان بہادر احمد محی الدین خاں۔ کرناٹک خاندان کے وظیفہ خوار (مدراس)
14 ۔ مولوی رفیع الدین احمد، بار۔ ایٹ۔ لا (بمبئی)
15 ۔ ابراہیم بھائی آدم جی پیر بھائی، جنرل مرچنٹ (بمبئی)
16 ۔ مسٹر عبدالرحیم۔ بار۔ ایٹ۔ لا۔ کلکتہ
17 ۔ سید اللہ داد شاہ، اسپیشل مجسٹریٹ اور زمینداروں کی ایسوسی ایشن کے نائب صدر، خیرپور (سندھ)
18 ۔ مولانا ایچ۔ ایم۔ ملک، مہدی بار، بوامبیر کے صدر ناگپور (مرکزی صوبہ جات)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

19 - مشیر الدولہ، ممتاز الملک، خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین۔ رکن اسٹیٹ کونسل پٹیالہ (پنجاب)
20 - خان بہادر کرنل عبدالمجید خاں، وزیر خارجہ، پٹیالہ (پنجاب)
21 - خان بہادر خواجہ کسوت شاہ۔ اعزازی مجسٹریٹ، امرتسر (پنجاب)
22 - میاں محمد شفیع، بار۔ ایٹ۔ لا۔ لاہور (پنجاب)
23 - شیخ غلام صادق، امرتسر (پنجاب)
24 - حکیم محمد اجمل خاں، دہلی (پنجاب)
25 - منشی احتشام علی، زمیندار و رئیس، کابوری (اودھ)
26 - سید نبی اللہ، بار۔ ایٹ۔ لا۔ رئیس کارا، ضلع الہ آباد
27 - مولوی سید کرامت حسین۔ بار۔ ایٹ۔ لا۔ الہ آباد
28 - سید عبدالروف، بار۔ ایٹ۔ لا۔ الہ آباد
29 - منشی عبدالسلام خاں، سب جج۔ وظیفہ یاب، رامپور
30 - خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں، زمیندار، معتمد انجمن زمینداران، صوبہ جات متحدہ اور شریک معتمد متولیان ایم۔ اے۔ او۔ کالج۔ علی گڑھ۔
31 - حاجی محمد اسماعیل خاں، زمیندار، علی گڑھ۔
32 - صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ بار۔ ایٹ۔ لا۔ علی گڑھ۔
33 - مولوی مشتاق حسین، رئیس امروہہ، صوبجات متحدہ
34 - مولوی حبیب الرحمٰن خاں زمیندار بھکن پور، صوبجات متحدہ۔
35 - نواب سید سردار علی خاں ولد مرحوم نواب سردار دلیر الملک بہادر۔ سی۔ آئی۔ ای حیدرآباد (دکن)
36 - مولوی سید مہدی علی خاں (محسن الملک) معتمد اعزازی ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ۔ اٹاوہ۔ صوبہ جات متحدہ

(ب) حسب ذیل اصحاب وفد میں شرکت کے خواہاں تھے لیکن علالت یا دیگر وجوہات کی بناء پر شرکت سے قاصر رہے۔

1 - عزت مآب نواب خواجہ سلیم اللہ، نواب آف ڈھاکہ
2 - عزت مآب نواب حاجی محمد فتح علی خاں قزلباش۔ لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

3 - عزت مآب سید زین العبد روسی - سورت
4 - خان بہادر قاسم میر غیاث الدین پیرزادہ آف بھروچ۔
5 - خان بہادر راجہ جہاں داد آف ہزارہ
6 - شیخ شاہد حسین آف لکھنؤ۔

لارڈ منٹو کا جواب

آپ نے اپنی عرضداشت میں جو معروضات پیش کیے ہیں اُن کا جواب دینے سے قبل میں آپ تمام حضرات کا شملہ میں تہہ دل سے استقبال کرتا ہوں۔

آج آپ حضرات کی یہاں موجودگی بڑی پُرمعنی ہے۔ آپ نے آج میری خدمت میں جو دستاویز پیش کی ہے اس پر ملک معظم کی مسلمان رعایا کے نوابوں، متعدد ریاستوں کے وزیروں، بڑے زمینداروں، وکیلوں، تاجروں اور دیگر کئی لوگوں کے دستخط ثبت ہیں۔ میں آپ کے وفد کی نمایندہ حیثیت کو تسلیم کرتا ہوں اور مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ آپ حضرات ہندستانی مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کی آرزوؤں اور اُمنگوں کی ترجمانی فرما رہے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اپنی عرضداشت میں آپ حضرات نے جو کچھ کہا ہے وہ دراصل آپ کی قوم کی نمایندہ جماعت کے خیالات ہیں جس نے اپنے نظریات کی بنیاد آج کے ہندستان میں پائے جانے والے سیاسی حالات کے عمیق غور و تدبر پر رکھی ہے قطع نظر اس کے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں آپ کی قوم کے معدودے چند افراد کی سیاسی ہمدردیاں یا عدم دلچسپیاں کچھ اور رہی ہوں۔ میں آپ تمام کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے یہ موقع عنایت فرمایا کہ میں فرزندانِ اسلام کے جائز مقاصد کو سمجھ سکوں۔ آپ حضرات نے ہماری سلطنت کی سیاسی تاریخ سازی میں حصہ لینے کا جو عزم صمیم کر رکھا ہے میں اُس جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

آپ کا وائسرائے ہونے کی حیثیت سے مجھے اس بات پر فخر ہے کہ آپ حضرات اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ برطانوی راج نے اس وسیع و عریض برصغیر میں بسنے والی مختلف قوموں کو جو مختلف مذہبوں پر عمل پیرا ہیں۔ اَن گنت برکتوں سے فیض یاب کیا ہے آج خود آپ حضرات نے، جو ایک فاتح اور حکمران قوم کی اولاد ہیں، میرے روبرو اُس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شخصی آزادی، عبادت کی آزادی، امن عامہ اور روشن مستقبل کا امکان، جیسی چیزوں کے لیے اپنے جذبۂ ممنونیت کا اظہار کیا ہے جو اس ملک کے لیے یہ تمام نعمتیں برطانوی استعمار کی دین ہیں۔

ماضی میں کس طرح انگریزوں نے مسلمان رعایا کو سرکاری ملازمتوں کا اہل بنانے کی کوشش کی اس امر کا جائزہ لینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ 1782ء میں وارن ہسٹنگز نے "کلکتہ مدرسہ" کی بنیاد اسی غرض سے ڈالی کہ یہاں کے طلباء کو اس قابل بنایا جا سکے کہ وہ "سرکاری ملازمتوں کے حصول کے لیے ہندوؤں کے ساتھ زیادہ مساویانہ سطح پر مسابقت کر سکیں۔" 1911ء میں میرے جدِ اعلیٰ لارڈ منٹو نے اس مدرسے میں بہتری پیدا کرنے اور ہندستان بھر کے دیگر مقامات پر مسلم کالجوں کے قیام کی پرزور وکالت کی تھی۔ بعد کے برسوں میں محمڈن ایسوسی ایشن کی مساعی کی وجہ سے حکومت کو اپنی 1885ء والی قرارداد منظور کرنی پڑی جس کا تعلق مسلمان قوم کے تعلیمی موقف اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے تقرر سے تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی تعلیمی مساعی کے نتیجے میں علی گڑھ کے مقام پر ایک کالج کا قیام عمل میں آگیا۔ یہ وہ عظیم ادارہ ہے جسے سرسید احمد خان جیسی شریف النفس اور وسیع القلب شخصیت نے اپنے ہم مذہبوں کے نام معنون کیا ہے۔ جولائی 1877ء میں جس وقت لارڈ لٹن نے علی گڑھ میں اس ادارے کا سنگِ بنیاد رکھا اُس وقت سرسید احمد خاں نے وائسرائے کو مخاطب کرتے ہوئے یہ لافانی الفاظ کہے تھے:

> آپ نے میری جو شخصی عزت افزائی فرمائی ہے اُس کے باعث مجھے ایک عظیم حقیقت کا تیقن حاصل ہونے لگا ہے اور مجھ میں ایسے جذبات پیدا ہونے لگے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے شخصی جذبۂ امتنان و تشکر سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہیں۔ مجھے اس امر کی مکمل طمانیت حاصل ہے آپ کو، جو اس موقعے پر برطانوی حکومت کی نمایندگی فرما رہے ہیں، ہماری مساعی اور تگ و دو کے ساتھ ہمدردی ہے اور میرے لیے یہ طمانیت نہ صرف ایک قیمتی سرمایہ ہے بلکہ خوشی اور انبساط کا بہت بڑا ذریعہ بھی ہے۔ زندگی کے اس مرحلے میں میرے لیے یہ امر بڑے اطمینان کا باعث ہے کہ جن کام کے لیے میں نے برسوں تک تگ و دو کی اور جو آج میری زندگی کا واحد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقصد بن چکا ہے، اُسی کام نے ایک جانب تو میرے اپنے ہم وطنوں کے جوشِ عمل کو ابھارا ہے تو دوسری جانب اس کام کے لیے ہمیں برطانوی رعایا میں شامل ہمارے دیگر برادرانِ وطن کی ہمدردیاں اور ہمارے حکمرانوں کی استعانت حاصل ہوئی ہے۔ مجھے امید ہے آج سے چند سال بعد اس زندگی کی مدت پوری کر چکنے کے بعد جب میں آپ کے درمیان موجود نہیں رہوں گا تب بھی یہ کالج پھلتا پھولتا رہے گا اور اس ادارے میں میرے ہم وطن ملک کے ساتھ ویسی ہی محبت کرنا سیکھیں گے یہاں ان میں برطانوی حکومت کے لیے ویسا ہی وفاداری کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے گا، یہاں کے طلباء اُسی طرح برطانوی حکومت کی لائی ہوئی نعمتوں اور برکتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے اور انھیں اُسی خلوص اور جذبۂ اخوت کے ساتھ برطانوی رعایا میں شامل دیگر برادرانِ وطن کے ساتھ پیش آنے کا سلیقہ سکھایا جاتا رہے گا جیسی کہ یہ سب باتیں میری اپنی زندگی کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔

علی گڑھ کالج کو اپنے قیام کے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ اس ادارے کے طلباء مضبوط مذہبی معتقدات اور حبّ الوطنی اور وفاداری کے مستحکم جذبات کے ساتھ جنگاہِ حیات میں اُتر پڑے ہیں اور اب جب کہ ہندستان کے سیاسی مستقبل میں انھیں کئی نازک مرحلوں سے گزرنا ہے اسلامی تاریخ کے ان مایہ ناز سپوتوں کے چہرے اُس وجدان، وفاداری، عقلِ سلیم اور صحت مند معاملہ فہمی کے نور سے جگمگانے لگے ہیں جس کا اظہار آپ حضرات نے اتنی عمدگی کے ساتھ اپنے سپاس نامے میں کیا ہے۔

لیکن حضرات! جیسا کہ ابھی آپ مجھے بتا چکے ہیں کہ آپ لوگ بڑے اخلاص کے ساتھ اپنے حکمرانوں کی انصاف پسندی اور غیر جانبداری پر یقین رکھتے ہیں اور یہ کہ کوئی مشکل مسئلہ کھڑا کر کے آپ انھیں ہراساں و پریشان بھی نہیں کرنا چاہتے، آپ ضرور اس حقیقت سے واقف ہوں گے بعض "حالیہ واقعات" نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں بعض ایسے جذبات پیدا کر دیئے ہیں جن پر قابو پانا، ہو سکتا ہے کہ قوم کے "معتدل اور سنجیدہ مزاج" رہنماؤں کے بس کی بات نہ رہے۔ فی الوقت میں مشرقی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نگال اور آسام کے معاملات کی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا ۔ تاہم مجھے امید ہے کہ کسی
دل آزاری کیے بغیر میں نئے صوبے میں بسنے والی مسلمان قوم کا شکریہ اس لیے
ادا کر سکتا ہوں کہ باوجود یہ کہ وہ ایک بالکل ہی نئی صورتِ حال سے دوچار تھے جس کے
رے میں بلاشبہ متعدد غلط فہمیاں موجود تھیں' انھوں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا
ر اعتدال پسندانہ رویے پر کاربند رہے ۔ ساتھ ہی ساتھ میں بنگالیوں کے جذبات
ں پائے جانے والے تمام پُرخلوص عناصر کے ساتھ اپنی ہمدردی کے اظہار کو بھی
روری سمجھتا ہوں ۔ لیکن ان تمام امور سے قطع نظر میں آپ کو جس چیز کا یقین دلانا چاہتا
ں وہ یہ ہے کہ وائسرائے اور حکومتِ ہند نے نئے صوبے کے تعلق سے' جس کا
ستقبل روشن نظر آتا ہے' جو حکمتِ عملی اختیار کی ہے اُس کے وضع کرتے وقت اس
مر کو ملحوظ رکھا گیا کہ کونسی چیز اُس صوبے کی موجودہ اور آیندہ جملہ آبادی کے لیے بلالحاظ
ہب وملت بہتر ثابت ہو سکتی ہے ۔ اور یہ کہ مشرقی بنگال اور آسام کی مسلمان قوم اپنی
فاداری کو منوانے اور اپنے مفادات کا تحفظ کروانے کے سلسلے میں ہمیشہ کی طرح آج
بھی پورے اعتماد کے ساتھ انگریزوں کے انصاف اور غیر جانب داری پر تکیہ کر سکتی ہے ۔

حضرات آپ نے مجھ سے ایک ایسے وقت شرفِ تخاطب حاصل کیا ہے جبکہ
سیاست کے مطلعے پر تغیرات کے بادل چھائے ہوئے ہیں ۔ ہم سبھی کو اس امر کا اچھی طرح
احساس ہے اس صورتِ حال کی موجودگی کا اظہار کرنا ایک بڑی حماقت کی بات ہوگی ۔
ایسی آرزوئیں اور امنگیں عوام میں بیدار ہو رہی ہیں جو ہندستان کے لیے بالکل نئی
ہیں ۔ ہم اُن کو نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ اگر ہم نے ایسا کرنے کی غلطی کی تو یہ ہماری
فاش غلطی ہوگی ۔ لیکن اس تمام بے چینی کی وجہ کیا ہے ؟ اسے لاکھوں عوام پر کی جانے
والی جابرانہ حکومت کے خلاف بے چینی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اگر کوئی واقعی ایسا سمجھتا
ہے تو میں اُس کی بات کی تردید کرتا ہوں ۔ اس بے چینی کو ٹھکرائی ہوئی رعایا کی
بغاوت بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ یہ بے چینی دراصل نتیجہ ہے اُس تعلیمی ترقی کا جس میں اب
تک رعایا کے ایک اقل ترین طبقے نے حصہ لیا ہے ۔ اس تعلیم کا بیج سب سے پہلے
انگریزوں نے ہی اس ملک میں بویا تھا اور اب برطانوی حکومت اسی بیج سے پیدا
ہونے والی فصل کی نگہداشت پر اپنی پوری توجہ صرف کر رہی ہے ۔ تاہم ہم جو فصل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کاٹ رہے ہیں اُس میں ہوسکتا ہے کہ گھاس پھوس بھی شامل ہوگیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس مغربی طرز کی فصل ہم نے یہاں بوئی ہے وہ ہندستانیوں کی ضروریات سے مطابقت نہ رکھتی ہو لیکن جوں جوں وقت گزرتا جائے گا تعلیم کی کھیتی اور زیادہ لہلہانے لگے گی۔ اس فصل سے حاصل ہونے والی غذائیت اور صحت آفرینی کا دارومدار اُس کی محتاط نگہداشت اور اُس سے تیار ہونے والی اشیاء کی مناسب تقسیم پر ہے۔

حضرات! آپ کو یہ کہتے ہوئے کسی معذرت خواہی کی ضرورت نہیں ہے کہ "یورپی طرز کے نمائندہ ادارے ہندستانی عوام کے لیے بالکل ہی نئی چیز ہیں" یا یہ کہ ان اداروں کی اس ملک میں ترویج کے لیے بہت زیادہ غور وفکر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں خود اس بات کو پسند نہیں کروں گا کہ مغربی دنیا کی تمام سیاسی مشنری کو مشرقی اقوام کی موروثی جبلتوں اور روایتوں پر مسلط کردوں۔ مغربی فکر کی وسعت، مغربی ثقافت کی تعلیمات، برطانوی انفرادیت کی آزادی سب ایسی چیزیں ہیں لیکن آپ کے ساتھ میں بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ان تمام اچھی باتوں کے ساتھ مغربی دُنیا کے سیاسی طور طریقوں کو قبول کرنے کی شرط منسلک نہیں ہونی چاہیے۔

اور حضرات! اب میں آپ کے سیاسی مستقبل کے مسئلے کی جانب رجوع کرتا ہوں۔ یعنی مسلمان قوم کے موقف کی جانب جس کی نمایندگی آپ حضرات کرتے ہیں۔

یقیناً آپ میری اس بات سے متفق ہوں گے کہ میرے لیے فی الفور اس بات کا تفصیلی جایزہ لینا ممکن نہیں ہے کہ سرکاری امور کی انجام دہی میں کس قدر حصہ طلب کرنے کا حق آپ کی قوم کو حاصل ہے اور اس معاملے میں موجودہ صورتِ حال کیا ہے۔ فی الوقت تو میں صرف بعض عمومی مسائل پر ہی گفتگو کرسکتا ہوں۔ آپ واقف ہیں کہ جو مسائل آپ نے چھیڑے ہیں وہ اُس کمیٹی کے زیرِغور ہیں جو میں نے حال ہی میں نمایندگی کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے قایم کی ہے۔ آپ کی عرضداشت کو میں اس کمیٹی کے روبرو غور و خوض کے لیے پیش کروں گا۔ لیکن اسی کے ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ میں آپ کی عرضداشت کے عام منشا کے تعلق سے اس طرح جواب دے سکتا ہوں کہ جسے مذکورہ کمیٹی کی رپورٹ سازی کے کام میں بیجا مداخلت نہ تصور کیا جائے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ کے سپاسنامے کا ماحصل یہ ہے کہ نمایندگی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے کسی نظام میں بھی، خواہ اس کا تعلق بلدیہ سے ہو یا ڈسٹرکٹ بورڈ سے یا مجلس مقننہ سے، جس میں انتخابی طریقے کو رائج کرنے کی تجویز ہو، مسلمانوں کو من حیث القوم نمایندگی حاصل ہونی چاہیے۔ آپ کا کہنا ہے کہ آج کے انتخابی ادارے جس انداز سے ترتیب دیے گئے ہیں اُس سے اس بات کی توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ ان کے ذریعے کسی مسلمان امیدوار کو منتخب کروایا جا سکتا ہے اور یہ کہ اگر اتفاقاً ایسا ہوتا بھی ہے تو اس کے لیے امیدوار کو اُس اکثریت کے حق میں اپنے نظریات کی قربانی دینی پڑے گی جو اُس کی اپنی قوم کی مخالفت پر کمربستہ رہتی ہو۔ اس طرح کامیابی حاصل کرنے والا امیدوار کسی طور پر بھی آپ کی قوم کی نمایندگی نہیں کر سکتا۔ آپ کا یہ کہنا برحق ہے کہ آپ کے موقف کا تعین صرف آپ کی عددی قوت کے لحاظ سے نہ کیا جائے بلکہ آپ کی قوم کی سیاسی اہمیت اور اُن خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا جانا چاہیے جو اُس نے سلطنت کے لیے انجام دی ہیں مجھے آپ سے سو فی صدی اتفاق ہے۔ براہِ کرم مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجیے میں یہ ستلانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں کہ مختلف قوموں کو نمایندگی کا حق کس طور سے عطا کیا جائے لیکن مجھے اس بات کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ میں سمجھتا ہوں آپ کو بھی ہے کہ ہندستان میں انتخابی نمایندگی کا ہر وہ طریقہ بُری طرح ناکام رہے گا جس میں اس برصغیر میں بسنے والی مختلف قوموں کے اعتقادات اور روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے محض انفرادی بنیاد پر ہر شخص کو رائے دہندگی کا حق عطا کر دیا جائے۔ ہندستانی عوام کی ایک بہت بڑی تعداد نمایندہ اداروں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ حضرات! میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ بلدیہ اور ڈسٹرکٹ بورڈ ہی حکومت خود اختیاری کے زینے کی ابتدائی سیڑھیاں ہیں اور یہ کہ انھی اداروں سے ابتدا کر کے ہمیں بتدریج عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنا چاہیے دریں اثنا، میں آپ سے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان قوم کو اس بات کا اطمینان رکھنا چاہیے کہ ہر اس انتظامی تنظیم نو کے دوران جس کا تعلق مجھ سے ہو ایک قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کیا جائے گا اور یہ کہ آپ اور ہندستان کے دوسرے لوگ اس بات کا پورا اطمینان رکھیں کہ برطانوی حکومت ملک معظم کی ہندستانی سلطنت میں بسنے والی بے شمار رعایا کے مذہبی معتقدات اور قومی روایات کا آئندہ بھی اُسی طرح احترام کرتی رہے گی جیسا کہ وہ ماضی میں بڑے ہی فخر کے ساتھ کرتی آئی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ز

APPENDIX-G

مسلم آل انڈیا کنفیڈریسی ڈھاکے کے نواب صاحب کا منشور

چونکہ نواب صاحب ڈھاکہ یکم اکتوبر 1906ء کو وائسرائے بہادر کی شرفِ باریابی حاصل کرنے والے وفد میں شریک نہ ہو سکے تھے لہٰذا انھوں نے اپنے ہم مذہب اصحاب کے پاس ایک یادداشت روانہ کر دی جس میں مسلم مفادات کے تحفظ کے لیے ایک کل ہند ایسوسی ایشن کے قیام کی تجویز رکھی تھی۔ اس تجویز پر شملہ میں وفد کے ارکان نے کافی غور و خوض کیا جس کے نتیجے میں اس تجویز کو خاصی حمایت حاصل ہوئی۔ بعد ازاں نواب صاحب نے اپنی تجاویز کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ مرتب کیا تاکہ آئندہ متوقع کانفرنس میں پیش کر سکیں۔ بعد ازاں یہ کانفرنس کرسمس کے ہفتے میں ڈھاکے میں منعقد ہوئی۔ نواب صاحب نے اپنی تجاویز کو ایک تفصیلی یادداشت کی شکل میں شایع کروایا۔ حسبِ ذیل اقتباسات اسی سے ماخوذ ہیں:

> میں ایسے کئی واقعات سے بخوبی واقف ہوں جن میں بعض غیر ذمہ دار مسلم حضرات اور اداروں نے (جنھیں دراصل ہماری قوم کے ساتھ کسی قسم کی دلی ہمدردی نہیں ہے) ملت کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ مطلبی لوگ محض اپنی سیاسی اہمیت پیدا کرنے کے لیے اس قسم کے ادارے قایم کر لیتے ہیں اور اُن کی جانب سے حکومت کے پاس محضر اور عرضداشتیں پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ ملک بھر میں ایسا کوئی شخص موجود نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جو ان شر پسند حضرات کو ان کی ان مذموم حرکات پر ٹوک سکے چونکہ حکومت کسی فرد یا ادارے کی جانب سے پیش کردہ عرضداشت کو وصول کرنے سے انکار نہیں کر سکتی خواہ وہ قوم کے منفرد اداروں اور شخصیتوں کی جانب سے پیش کی گئی ہوں یا کسی غیر مجاز شخصیت یا ادارے کی جانب سے وصول ہوئی ہو تاہم ایسی تمام نمایندگیاں اس وجہ سے غیر موثر ثابت ہوتی ہیں کہ حکام کو اس امر کا علم ہی نہیں ہو پاتا کہ ان عرضداشتوں میں پیش کردہ نظریات کس حد تک بہ حیثیت مجموعی مسلمان قوم کے نظریات کے ساتھ ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اگر میری تجویز کردہ کل ہند ایسوسی ایشن کے قسم کا نمایندہ ادارہ موجود ہوتا تو حکومت اس قابل ہوتی کہ مجھ بیداروں کو وصول ہونے والی تمام عرضداشتیں اس کے پاس یہ جاننے کے لیے بھجواتی کہ قوم کا مدعا اور منشا دراصل کیا ہے اور تب ان عرضداشتوں پر احکامات صادر کرتی۔ اگر ایسا ادارہ قایم ہو جائے تو پھر اس بات کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا کہ کوئی فریق یا فریقین محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر حکومت کے روبرو حقایق کو توڑ مروڑ کر پیش کر سکیں۔

(الف) اغراض و مقاصد

یہ از بس ضروری ہے کہ مذکورہ ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کو واضح طور پر بیان کر دیا جائے اگرچہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میرے بعض ہم مذہب حضرات تہہ دل سے اس کام میں میری حمایت نہیں کریں گے تاہم جہاں تک میرا تعلق ہے میں بڑی ایمانداری کے ساتھ اس بات کا یقین رکھتا ہوں کہ اگر ہم اس ایسوسی ایشن کو ایک قوت اور ایک مستحکم فلاحی ادارے کی شکل میں ابھرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہوں تو اب وہ وقت آ گیا ہے جبکہ ہمیں ابتدا ہی میں اس ادارے کی حکمت عملی اور مقاصد کو واضح الفاظ میں بیان کر دینا چاہیے۔ چنانچہ میں ذیل میں انھی چیزوں کو بیان کر رہا ہوں:

کہ اس ایسوسی ایشن کی بنیادی غرض و غایت یہ رہے گی کہ حکومت کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانب سے کیے جانے والے اقدامات کی حتی الامکان حمایت کی جائے اور ملک بھر میں بسنے والے اپنے ہم مذہب لوگوں کے مقاصد کی تکمیل اور مفادات کا تحفظ کیا جائے (ہ) نام نہاد انڈین نیشنل کانگریس کے پھیلتے ہوئے اثرات کی روک تھام کی جائے جس کا منشا یہ ہے کہ ہندستان میں برطانوی حکومت کو غلط رنگ میں پیش کر کے اُسے زک پہنچائی جائے یا اسی نوعیت کے قابلِ مذمت حالات پیدا کر دیے جائیں (ط) ہماری قوم کے ایسے تمام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو، جنھوں نے اس قسم کی ایسوسی ایشن کی عدم موجودگی کی وجہ سے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی ہے اُن کی قابلیت اور موزونیت کی بنا پر عوامی زندگی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

(ب) دستور

جہاں تک مجوزہ ادارے کے دستور کا سوال ہے اس ضمن میں حسبِ ذیل تجاویز پیش کی گئیں :

یہ کنفیڈریسی سرپرستوں، تاحیات ممبروں اور سادہ اراکین پر مشتمل ہوگی، اس کی مجلس انتظامی ایک کونسل، ایک صدر، چھ عدد نائب صدور اور تیس ممبروں پر مشتمل ایک اور کارگزار کمیٹی، دو معتمدوں اور ایک خزانچی پر مشتمل ہوگی۔ کونسل کے ارکان کا تقرر ہر سال کیا جائے گا اور سبکدوش ہونے والے اراکین دوبارہ انتخاب میں حصہ لینے کے اہل ہوں گے۔

	سالانہ روپے
1۔ سرپرست بننے کی فیس	1,000
2۔ تاحیات ممبر بننے کی فیس	100
3۔ رُکن بننے کی فیس	10
4۔ صدارت یا معتمدی کے علاوہ دیگر کوئی عہدہ سنبھالنے کی فیس	30

اگر میری تجویز کردہ تعداد کے مقابلے میں نائب صدور اور کمیٹی کے ارکان میں اضافہ کیا جاتا ہے تو اس پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا تاہم میں سمجھتا ہوں کہ جس نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس تعداد کا تعین کیا ہے اُس سے ایک عمدہ فعال مجلس کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم بہ آسانی اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ خالصتاً اسلام کی خاطر نہ صرف ایک سو بلکہ دو سو کے قریب افراد اس سوسائٹی کی سرپرستی قبول کرنے پر بہ خوشی آمادہ ہو جائیں گے۔ یہ تجویز بھی پیش کی جاتی ہے کہ مندرجہ بالا خطوط پر تشکیل کردہ یہ کنفیڈریسی ایک ایسا اعلیٰ ادارہ ہوگا جسے یہ اختیار حاصل ہوگا کہ اپنے تسلیم کردہ دیگر اداروں یا انجمنوں کے مابین اگر کوئی غلط فہمیاں یا نزاعات پیدا ہو جائیں تو ان کی شکایات کی سماعت کر کے اپنا فیصلہ صادر کر سکے۔

اس کے علاوہ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ تمام تسلیم شدہ ادارے اپنی سالانہ آمدنی کا 2.5 فی صد حصہ اس کنفیڈریسی کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے اُس کے حوالے کر دیا کریں گے۔ نواب صاحب نے اس بارے میں وضاحت کی تھی کہ "یہ کنفیڈریسی کی آمدنی کا وہ ذریعہ ہوگا جس پر کوئی ایسوسی ایشن معترض نہیں ہو سکے گی۔ اس طرح اپنا حصہ ادا کر کے ہر ایسوسی ایشن کنفیڈریسی کے مالیے کو مستحکم کرے گی جس کے اغراض و مقاصد بعینہٖ وہی ہیں جو کہ خود اُسی ایسوسی ایشن کے۔"

یہ طے کیا گیا تھا کہ یہ کنفیڈریسی اپنا کام کاج اُنہی خطوط پر انجام دے گی جن پر کہ مختلف چیمبرس آف کامرس یا برٹش انڈین ایسوسی ایشن وغیرہ جیسے ادارے انجام دیتے ہیں۔ اس ادارے کی مجلسِ عاملہ کو اُسی سال کے دوران یہ اختیار دیا جانے والا تھا کہ وہ حکومت اور دیگر عوامی اداروں کے روبرو ملک کو درپیش غیر معمولی اہمیت کے مسایل کے تعلق سے اپنے موقف کو پیش کر سکے خاص طور پر اُن مسایل کے سلسلے میں جن سے مسلمان قوم براہ راست متاثر ہوتی ہے۔ اس ادارے کے فرائض میں ایک بات یہ بھی داخل تھی کہ حسب ضرورت اپنی مسلمہ انجمنوں کے توسط سے، وہ عوام کو حکومت کے اُن اقدامات سے واقف کروائے جو اس ملک کی فلاح و بہبود کے لیے کیے جا رہے ہوں۔ اس ادارے سے یہ توقع بھی وابستہ تھی کہ وہ مسلمان قوم کی اخلاقی اور مادّی ترقی کے لیے مناسب اقدامات کرے اور خاص طور پر اپنی قوم کے ہونہار تعلیم یافتہ اور باصلاحیت نوجوانوں کو منظرِ عام پر لے آئے۔ اس بات کی تجویز بھی کی گئی تھی کہ ادارے کا صدر سال کے اختتام پر اپنے صدارتی خطبے میں اس ادارے کی سال بھر کی کارکردگی کا جائزہ پیش کرے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ کتب

(A) Parliamentary Documents

Parliamentary Debates on Indian Affairs including Questions and Answers
Parliamentary Papers on the various indian Questions, particularly Public Services, Legislative Councils, Administration and Hindu-Muslim riots
Statements exhibiting the Moral and Material Progress of India (Annual and Decennial Volumes)

(B) Government Documents

Proceedings of the Legislative Councils of the Governor-General and of the various Governors
Annual Administrative Reports of the various Provinces
Reports of, and Evidence and Statements given to, the Royal Commission on Education (1884) and on the Public Services (1888)
General Reports on Public Instruction of the various Provinces (Annual and Quinquennial Volumes)
A Review of Education in India (1881-2 to 1885-6) by Sir Alfred Croft

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Quinquennial Reviews on the Progress of Education in India:
1887-8 to 1892-3 by A. M. Nash
1892-3 to 1896-7 by J. S. Cotton
1896-7 to 1901-2 by R. Nathan
1901-2 to 1906-7 by W. H. Orangle
Memoranda of the Government of India and the India Office to the Indian Statutory Commission (1930)
Indian Industrial Commission: Minutes of Evidence. Vol. I (1918)
Report of the Indian Universities Commission (1902)
Gazette of India and Provincial Government Gazettes
Report of the Committee on Local Self-Government in Madras (1882)
Urdu Petitions: Translation of Urdu petitions, etc., made under the order of the Government of India for Her Majesty's Civil Service Commissioners (1869)
Proceedings of the Trial of Bahadur Shah II before a Military Commission (1895)
Statistics of British India, Vol. I (1920)
Sylhet District Records, ed. by Walter F. Firminger, Vol. I (1770-1785)
Assam District Gazetteers, Vol. II (Sylhet), by B. C. Allen
An Inquiry into the Economic Conditions of the Agricultural and Labouring Classes in the North-West Provinces and Oudh (1888)
Census of India: General Reports of 1891, 1901 and 1911
Selections from the Records of the Bengal Government relating to Native Printing Presses and Publications, No. XXII, by Rev. J. Long
Memorandum on the Progress of the Madras Presidency during the last Forty Years of British Administration
India List, Civil and Military, issued by permission of the Secretary of State for India in Council, London

(C) Newspapers

The Aligarh Institute Gazette (Aligarh)
The Bengalee (Calcutta)
The Bombay Gazette (Bombay)
The Civil and Military Gazette (Lahore)
The Englishman (Calcutta)
The Hindoo Patriot (Calcutta)
The Indian Mirror (Calcutta)
The Indian Spectator (Bombay)
The Moslem Chronicle (Calcutta)
The Pioneer (Allahabad)
The Statesman (Calcutta)
The Times (London)
The Times of India (Bombay)
The Tribune (Lahore)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

BIBLIOGRAPHY

The following have been consulted passim:

The Amrita Bazar Patrika (Calcutta)
The Indian Observer (Calcutta)
The Manchester Guardian (Manchester)
The Morning Post (London)
The Muslim Herald (Madras)
The Muslim Gazette (Lucknow)
The Muslim Patriot (Madras)
The Punjab Observer (Lahore)
Reynold's News (London)
St. James's Gazette (London)

(D) Journals and Periodicals

Aligarh Monthly (Aligarh)
The Asiatic Quarterly Review (London)
Asre Jadeed (Allahabad)
The Calcutta Review (Calcutta)
The Contemporary Review (London)
The Empire Review (London)
India (London)
The Indian Review (Madras)
Journal of the East India Association (London)
Journal of the National Indian Association in Aid of Social Progress and Education in India (London)
The Kayastha Samachar and *Hindustan Review* (Allahabad)
Makhzan (Lahore)
The M.A.O. College Magazine (Aligarh)
The Nineteenth Century (London)
Tahzibul Akhlaq (Aligarh)

The following have been consulted passim:

Allahabad Review (Allahabad)
The Bengal Magazine (Calcutta)
Dilgudaz (Lucknow)
The Educational Review (Madras)
Indian Journal of Political Science (Allahabad)
Indian Textile Journal (Bombay)
International Review of Missions (U.S.A.)
Islamia College Monthly (Lahore)
Islamic Culture (Hyderabad)
Journal of the Anjuman-i-Himayat-i-Islam (Lahore)
Journal of the Punjab University Historical Society (Lahore)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(E) PROCEEDINGS, REPORTS AND PUBLICATIONS OF CONGRESSES, ASSOCIATIONS, SOCIETIES, ETC.

Anjuman-i-Himayat-i-Islam
Fitratulla, lecture by Nazir Ahmed Khan at the eighth annual meeting of (English and Urdu), Lahore (1893)
Lecture by Khwaja Kamaluddin at the ninth annual meeting of, Lahore (1894)
Lecture by Nazir Ahmed Khan at the tenth annual meeting of, Delhi (1895)
"Muhammadan India—Its Today and Tomorrow", speech delivered by Professor Khwaja Ziauddin of Islamia College, Lahore, on the occasion of the twelfth anniversary of, Lahore (1897)

Anjuman-i-Islam of Lucknow
Rules of the, Lucknow (1874)
Proceedings of seven monthly meetings of, Lucknow (1875-76)

Anjuman-i-Rifah-i-Ra'ya: Bye-laws of the Muhammadan Reform Association of Delhi, Delhi (1875)

Anjuman-i-Taraqqui-Urdu (Society for the Advancement of Urdu), First Annual Report (Salanah Report), Hyderabad (1903)

British India Association of the N.W.P., Byelaws and Publications of the (English and Urdu), 7 parts, Aligarh (1867-69)

Central National Muhammadan Association
Prospectus of the, Calcutta (1878)
and its Branch Associations, Rules and Objects of, with quinquennial and annual reports and lists of members, Calcutta (1885)

Committee for the Better Diffusion and Advancement of Education among the Muhammadans of India, Banaras (1871)

Congress, Indian National
Annual Reports of
Seditious Character of the, and the Opinions Held by Eminent Natives of India Who are Opposed to the Movement, Allahabad (1888)

Delhi College, Sixth annual meeting of, lecture by Nazir Ahmed Khan

Dastural amal Anjuman-i-Islayah: Rules of the Society for the Progress of Islam in India, Sialkot (1890)

Education
Report of the members of the Select Committee for the advancement of learning among the Muhammadans, ed. by Sir Syed, Banaras (1872)
Report of the public meeting of the inhabitants of Bengal on the education question, held at the Town Hall of Calcutta on July 2, 1870, with reports of mofussil meetings, Calcutta (1882)

Educational Conference, Muhammadan
Majmu'a-e-Resolutionka-i-Deh Saleh, resolutions passed at the annual meetings of, 1886-1895, edited by Sjr Syed Ahmed, Aligarh (1896)
Musalmanon ki Kismat ka Faisla, speeches delivered by Sir Syed and others at, Aligarh (1894)
Khulasa-i-Karwae-i-Yaz Deh Saleh, abstract of the proceedings of, 1886-96 edited by Mehdi Ali Khan Agra (1897)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

BIBLIOGRAPHY

Breidade Majlis-i-, proceedings of a meeting of the Conference held on November 17, 1896 for the purpose of appointing a Local Standing Committee with the rules of the Central Standing Committee passed at that meeting, Agra (1897)

ka Nawwan Salana Jalsa, proceedings of the ninth annual meeting, Agra (1895)

ka Dasvan Salana Jalsa, proceedings of the tenth annual meeting, Agra (1896)

Khat dar Babe Muhammadan Educational Conference, a letter regarding the work of, Agra (1896)

Presidential Address by Syed Hussain Bilgrami at the eleventh annual meeting of, Madras (1897)

Report by Shaikh Khaisuddin of the third annual meeting of, Lahore (1889)

ssionary Conference

General, Report of the, Allahabad (1872-3)

Decennial, Report of the, Calcutta (1883)

Decennial, Report of the, 2 volumes, Bombay (1893)

'Muhammadan World of Today", papers read at the First Missionary Conference held at Cairo, April 4-9, 1906, edited by S. W. Zwener and others, New York (1906)

ssions to Muslims, General Conference on, papers (for private circulation only) read and discussions on the training of missions and literature for Muslims, Lucknow (1911)

hammadan Anglo-Oriental (M.A.O.) College, Aligarh

Rueidade number sat Ijlas-i-Trustian-i-, proceedings of the seventh meeting of, Agra (1895)

Report Taraqui-e-Talim-i-Madrastal Ulam-i-Musalmanon, report of the M.A.O. College, Aligarh, 1894-95, Agra (1895)

Fund Committee of, Circular from the, Banaras (1872)

Rules for the management of, by Sir Syed, Lucknow (1874)

Rules and regulations of, Agra (1892)

Proceedings of meetings of the trustees and managing committee of, 1892-94, Agra (1893-94)

Proceedings of the eighth and ninth meetings of the trustees of, Agra (1894)

Proceedings of the eleventh meeting of the trustees of, Agra (1895)

Annual Reports of, 1893-94, Agra (1894); and 1894-95, Agra (1895)

Muhammadan Educational Conference, *see* Educational Conference, Muhammadan

uslim League, All India

Rules and Regulations of, Allahabad (1907)

Report of the Inaugural Meeting of, London (1908)

"Indian Muhammadans and the Government", a pamphlet issued by the, London (1909)

'A Talk on Muslim Politics", a pamphlet issued by the, Allahabad (1910)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Muhammadan Literary Society
Abstract of Proceedings of meeting held in Calcutta on November 23, 1870
and Public Services Commission, Answers to Questions, Calcutta (1886)
A Quarter Century of the, Calcutta (1889)
Nadwatul Ulama, abstract of the proceedings of the Society from Shawal 1311 to Rabi I, 1312, A.H., Lucknow (1894)
Nainital Institute, Lecture on Nagri *vs.* Urdu delivered by Babu Bodhee Bullubh Punt and other proceedings of a meeting of the Institute

(F) Contemporary Works

Ahmed, D. H.: *Essays on the Reform of Muhammadan Society*, Calcutta (1895)
Ahmed, Nazir and Zaka Ullah: *Musalmanoki Maujudah Halat-i-Talim*, lectures on the present state of education among the Muslims, Agra (1889)
Ali, Syed Ameer
The Ethics of Islam, Calcutta (1893)
Islam, London (1906)
The Spirit of Islam, London (1896)
A Short History of the Saracens, London (1896)
Ali, Syed Iqbal (ed.): *Syed Ahmed Khan Ka Safernama-i-Punjab*, Aligarh (1884)
Arnold, T. W.: *The Preaching of Islam*, London (1896)
A.W.P.: *Local Self-Government*, Meerut (1882)
Baird, J. G.: *Private Letters of the Marquis of Dalhousie*, London (1910)
Balfour, Lady Betty (ed.): *Personal and Literary Letters of Lord Lytton*, 2 vols., London (1906)
Banerjea, Sir S.
A Nation in the Making, London (1927)
Speeches, Calcutta (1908)
Beck, Theodore: *Essays on Indian Topics*, Allahabad (1888)
Besant, Annie
India, A Nation, London (1915)
How India Wrought for Freedom, London (1915)
Bilgrami, Syed Amir Ali: *English Education in India*, Madras (1902)
Blunt, W. S.: *India under Ripon: A Private Diary*, London (1909)
Bukhari, Hashim Shah: *National Congress Se Musalmanon Ko Bachana Chahiye*, a pamphlet urging Muslims not to join the Congress, Firozpur (1888)
Caine, W. S.: *India as seen by*, Lucknow (1889)
Calcutta University, Convocation Addresses of, 6 vols., Calcutta (1914-1933)
Campbell, Sir George: *Memoirs of My Indian Career*, 2 vols., London (1893)
Carpenter, Edward: *From Adam's Peak to Elephanta*, London (1892)
Chatterjee, Bankim Chandra: *Ananda Math or the Abbey of Bliss*, tr. by N. S. Sengupta, Calcutta (1906)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

BIBLIOGRAPHY

Chesney, Col. George: *Indian Polity*, London (1860)

Chirag Ali

Tahzibul Akhlāq, a collection of his Articles in the journal, Lahore (1934)

A Critical Exposition of the Popular 'Jihad', Calcutta (1885)

The Proposed Political, Legal and Social Reforms, London (1883)

Chirol, Sir Valentine: *Indian Unrest*, London (1910)

Colvin, Sir A.: *Two Letters on Certain Aspects of the Indian National Congress Movement*, Simla (1888)

Cotton, Sir Henry: *New India or India in Transition*, London (1907)

Curzon, Marquis of

British Government in India, 2 vols., London (1925)

Speeches, 4 vols., Calcutta (1900-06)

Dar, Bishan Narayan: *An Appeal to the English Public on behalf of the Hindus of the N.W.P.*, Allahabad (1894)

Digby, W.: *'Prosperous' British India*, London (1901)

Din, Muhammad Shah: *Syed Ahmed Khan as a Religious Reformer*, Allahabad (1904)

Duff, Alexander: *Missionary Addresses*, 2 vols., Edinburgh (1838)

Dutt, Romesh C.: *The Economic History of India in the Victorian Age*, London (1906)

Dwarka Das, Lala: *Hindi vs. Urdu*, Lahore (1882)

Elgin, Earl of: *Speeches*, Calcutta (1899)

Fazl, Syed Abu: *On the Muhammadans of India*, Calcutta (1872)

Fuller, Sir Bampfylde: *Studies of Indian Life and Sentiment*, London (1910)

Ghani, Muhammad Abdul: *Our Young Generation*, Lahore (1891)

Ghose, Lal Mohan: *Speech of—*, ed. by Asutosh Bannerji, Calcutta (1883)

Gokhale, G. K.: *Speeches*, Madras (1909)

Graham, G. F. I: *Life and Work of Sir Syed Ahmed Khan*, London (1909)

Hali, Altaf Husain

Dewan-i-Hali, poems of Hali with an Introduction on Urdu poetry, Kanpur (1893)

Ek Bewah ki Munajat, a poem describing the miserable condition of widows in India, Delhi (1892)

Hayat-e-Javeed, life of Sir Syed, 1st ed., Kanpur (1901); 2nd ed., Agra (1908)

Majmuah-i-Nazm-i-Hali, a collection of miscellaneous poems, Delhi (1890)

Mazamin-i-Hali, a collection of 33 essays, Panipat (1903)

Musaddas-i-Hali, a poem on the rise and fall of Islam, 1st ed., Delhi (1886)

Rubaiyat-i-Hali, quatrains, Kanpur (1904), English renderings by G. W. Ward, London (1904) and N. C. Chatterjee, Calcutta (1918)

Shakwah-i-Hind, a poem on changes among the Muslims in India, Panipat (1903)

Yadgar-i-Ghalib, life of the poet Ghalib, Kanpur (1897)

Maqalat-i-Hali, selected essays, Aurangabad (1934-6)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Hamilton, Lord George: *Parliamentary Reminiscences—1886-1906*, London (1922)

Heber, R.: *Narrative of a Journey through the Upper Provinces of India*, 3 vols., London (1828)

Hobart, Lord: *Essays and Miscellaneous Writings*, ed. by Mary, Lady Hobart, 2 vols., London (1885)

Hunter, Sir W.W.

Indian Musalmans, London (1871)

The India of the Queen and Other Essays, London (1903)

Husain, Syed Ameer: *On Muhammadan Education in Bengal*, Calcutta (1880)

Khan, Haji Muhammad Ismail: *Political Essays* (reprinted from the *Aligarh Institute Gazette*), Aligarh (1898)

Khan, Hamid Ali: *The Vernacular Controversy—An Account and Criticism of the Equalisation of Nagri and Urdu*, Lucknow (1900)

Khan, Medi Ali (Mohsinul Mulk)

Tahzibul Akhlaq, a collection of his articles in the journal, Lahore (1934)

Causes of the Decline of the Muhammadan Nation, Bombay (1891)

Khan, Mustafa: *An Apology for New Light*, Allahabad (1891)

Khan, Nazir Ahmed

Ibnul Wakt, the tale of a Westernised Indian Muslim, Delhi (1890)

Mu'izah-i-Hasnah, a collection of letters, ed. by Muhammad Abdul Ghafur Shahbaz, Delhi (1891)

Miratul Arus, a tale of Muslim domestic life, English translation by G. E. Ward, London (1903)

Itham-Hujjat, a poetic exhortation to the Muslims to strive after greatness, Delhi (1898)

Lecturon ka Majmu'a, a collection of speeches, October 1888 to December 1898, ed. by Muhammad Nazir Husain, Delhi (1892-99)

Khan, Sir Syed Ahmed

Tafsirul Quran, an incomplete commentary on the Quran, Lahore (1903)

Resal-i-Khair-Khwahan Musalman, An Account of the loyal Muhammadans of India, 2 parts (Urdu and English), Meerut (1860)

Akkam-i-ta'am-i-Ahli-Kitab, on dining with the 'People of the Book', Lahore (1899)

Asbabe Baghawat-i-Hind, the causes of the Indian Revolt, Agra (1903), English translation by Sir Auckland Colvin and G.F.I. Graham, Banaras (1873)

Sirat-i-Faridiyah, a life of Sir Syed's grandfather, Khwaja Fariddud-Din, Agra (1896)

Tahzibul Akhlaq, a collection of Sir Syed's articles in the journal, Lahore (1896)

Khutbate Ahmadiyah, a series of essays on the life of Muhammad (English and Urdu), English translation supposed to be by his son, Syed Mahmud, London (1870)

Asarus Sanadid, a history and description of Delhi and of its principal buildings and monuments with illustrations, Delhi (1854)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

BIBLIOGRAPHY

Tabyinul Kalam, a Muhammadan commentary on the Holy Bible (English and Urdu), Aligarh (1865)
Review of Dr. Hunter's 'Indian Musalmans' (English and Urdu) Banaras (1872)
Lecturon ka Majmu'a, complete collection of the lectures and speeches, 1863-1898, ed. by Imamud-Din, Lahore (1900)
On the Present State of Indian Politics, Allahabad (1888)
Khutut, letters, Lucknow (1924)
Akhiri Mazamin, last writings, Lahore (1898)
Tasanif-i-Ahmadiyah, selected works of Sir Syed, 8 parts, Agra (1903)
Lansdowne, The Marquis of: *Speeches*, Calcutta (1895)
Latif, Nawab Abdul
A Short Account of My Public Life, Calcutta (1885)
A Short Account of My Humble Efforts to Promote Education, especially among Muhammadans, Calcutta (1885)
The Present Condition of Indian Muhammadans, Calcutta (1883)
Lawrence, Sir W. R.: *The India We Served*, London (1928)
Leupolt, C. B.: *Recollections of an Indian Missionary*, London (1842)
Lyall, Sir Alfred
Rise and Expansion of the British Dominion in India, London (1894)
Asiatic Studies, 2 vols., London (1899-1907)
Maclean, J. N.: *Recollections of Westminster and India*, Manchester (1901)
Mahamud, Syed
A History of English Education in India—1781-1893, Aligarh (1895)
A Lecture on English Education, Agra (1895)
Marshman, J. C.: *Carey, Marshman and Ward*, London (1859)
Martin, Henry: *Journals and Letters of*, ed. by the Rev. S. Wilberforce, 2 vols., London (1837)
Marx, Karl: *Letters on India*, ed. by B.P.L. and Freda Bedi, Lahore (1936)
Mazumdar, Amrika Charan, *Indian National Evolution*, Madras (1915)
Mehta, Sir P. M.: *Speeches and Writings*, Allahabad (1905)
Minto, Lord: *Speeches in India*, Calcutta (1910)
Minto, Mary, Countess of: *India, Minto and Morley (1905-10)*, London (1934)
Mohsinul Mulk *see* Khan, Medi Ali
Morison, Theodore
History of the M.A.O. College, Allahabad (1903)
Imperial Rule in India, London (1899)
Economic Transition in India, London (1911)
Morley, John
Indian Speeches, Madras (1909)
The Reform Proposals, Madras (1909)
Recollections, 2 vols., London (1917)
Muir, Sir William, *Life of Muhammad*, 4 vols. (1858-61)
Mukherji, P.: *Indian Constitutional Documents*, 2 vols., Calcutta (1918)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Mumtaz Ali, Syed: *Hukuk-i-Niswan*, the social position and legal rights of women according to Muhammadan law, Lahore (1898)

Naoroji, Dadabhai: *Poverty and Un-British Rule in India*, London (1901)

National Congresski-nisbat Musalmanonki rai, Muslim opinions on the Congress, Lahore (1893)

Press Guide, Indian, a list of the daily, weekly, and other newspapers, magazines, reviews and periodicals issued in India and other countries in the East, London (1885)

Rai, Lala Lajpat, *The Arya Samaj*, London (1915)

Raleigh, Sir T. (ed.): *Lord Curzon in India, Being a Selection of His Speeches*, London (1906)

Ranade, M. G.

Essays on Indian Economics, Bombay (1899)

Rise of the Maratha Power, Bombay (1900)

Roberts, Lord: *Letters Written during the Indian Mutiny*, London (1924)

Roy, Ram Mohan: *English Works*, ed. by J. C. Ghose, 2 vols., Calcutta (1887)

Russell, W. H.: *My Diary in India, 1858-59*, 2 vols., London (1860)

Sadiq, Shaikh Ghulam: *Ek Musalman ki Iltimas Kombi Khidmat Main*, a pamphlet on political controversies, Amritsar (1893)

Sain, Kanwar: *Jawab-i-Lectures*, a reply to Sir Syed on the aims of the Indian National Congress, Sialkot (1890)

Seely, Sir John: *The Expansion of England*, London (1883)

Shamsuddin, Shaikh Muhammad: *A'inah-i-National Congress*, a lecture in opposition to the Congress, Gurdaspur (1889)

Sharar, Muhammad Abdul Halim: *Kuwwat-i-Intizamiyah*, a tale on the advantages of female education and social reform, Lucknow (188

Shibli, Muhammad (Nu'mani)

Siratun Nabi, life of Muhammad, 3 vols. (vols. 2 and 3 completed by his pupil, Syed Suleman Nadvi), Azamgarh (1928)

Resa'il-i-Shibli, eleven historical essays, Aligarh (1898)

Safarnamah-i-Rum-o-Misr-o-Sham, travels in Turkey, Egypt and Syria, Delhi (1901)

Subh-i-Ummeed, a poem on the progress of education among Muslims, Agra (1903)

Khutut-i-Shibli, a collection of letters (1913)

Muqalat-i-Shibli, a collection of magazine articles, Azamgarh (1930)

Sleeman, Sir W. H.: *Rambles and Recollections of an Indian Officer*, 2 vols., London (1893)

Strachey, Sir John: *India—Its Administration and Progress*, London (1903)

Townsend, Meredith: *Asia and Europe*, London (1905)

Thorburn, S. S.: *Mussalmans and Moneylenders in the Punjab*, London (1886)

Trevelyan, Sir G. O.

On the Education of the People of India, London (1838)

The Competition Wallah, London (1864)

What Shall We Do with the Musalmans?, London (1858)

Wedderburn, Sir William: *Allan Octavian Hume*, London (1913)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

BIBLIOGRAPHY

Zaka Ullah, Muhammad

A'in-i-Kaisari, an account of the administrative changes and progress in India under Victoria, Delhi (1904)

Swaneh-i-Umri Malikah-i-Mu'azzamah, life of Queen Victoria and the Prince Consort, Delhi (1904)

Karzan Nama, an account of the viceroyalty of Lord Curzon, Delhi (1907)

Swaneh-i-Umri Haji Muhammad Samiullah, a life of the Muslim leader, Samiullah, Hyderabad (1909)

(G) Other Works

Abdullah, S. M.: *The Spirit and Substance of Urdu Prose under the Influence of Sir Syed Ahmed Khan*, Lahore (1940)

Aga Khan, H.H. The: *India in Transition*, London (1918)

Ali, Abdullah Yusuf: *A Cultural History of India during the British Period*, Bombay (1940)

Ali Mohamed

Thoughts on the Present Discontent, Bombay (1907)

The Proposed Muhammadan University, Bombay (1904)

Ambedkar, B. R.: *Thoughts on Pakistan*, Bombay (1942)

Andrews, C. F.: *Zaka Ullah of Delhi*, Cambridge (1929)

and Girija Mookerjee: *The Rise and Growth of the Congress in India*, London (1938)

Asooli, F. D.: *Early Revenue History of Bengal*, Oxford (1917)

Bhajiwalla, R. P.: *Maulana Shibli and Umar Khayyam*, Surat (1932)

Balfour: Lady Betty: *The History of Lord Lytton's Indian Administration*, London (1899)

Barns, M.: *The Indian Press*, London (1940)

Beams, John: *Comparative Grammar of the Modern Aryan Languages of India*, Vol. 1, London (1872)

Beni Prasad: *India's Hindu-Muslim Question*, London (1946)

Bhavnagri, M. M.: *Indian Political Estimate of, or the Bhavnagri Boom Exposed*, Bombay (1897)

Bombay Gazette (reprinted from): *The Muhammadan and Hindu Riots in Bombay, August 1893*, Bombay (1893)

Bradley-Birt, F. B.: *Twelve Men of Bengal in the Nineteenth Century*, Calcutta (1910)

Buchanan, D. H.: *Development of Capitalistic Enterprise in India*, Cambridge (USA) (1934)

Buchan, John: *Life of Lord Minto*, London (1924)

Buckland, C. E.

Dictionary of Indian Biography, London (1906)

Bengal Under the Lieutenant-Governors from 1854-1898, Calcutta (1901)

Calcutta University, *Convocation Addresses*, 6 vols., Calcutta (1914-33)

Cambridge History of India, Vol. V, 1497-1858, and VI, 1858-1918; Cambridge (1934)

Carpenter, Lant: *A Review of the Labours of Raja Ram Mohan Roy*, London (1833)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Chailley, J.: *Administrative Problems of British India*, Tr. by Sir William Meyer, London (1910)

Chintamani, C. Y.
Indian Politics since the Mutiny, London (1940)
Indian Social Reforms—A Collection of Essays, Addresses and Speeches, Madras (1901)

Congress, The Indian National, Its Origin, History, Constitution and Objects, Madras (1888)

Coupland, Sir Reginald
The Indian Problem, 1833-1935, London (1942)
India—A Restatement, London (1945)

Crawford, A. T. (ed.): *England's Sympathies with the People of India—Opinions of the English and Anglo-Indian Press, 1894-99*, London (1901)

Cross, C. M. P.: *Development of Self-Government in India, 1858-1914*, Chicago (1922)

Cumming, Sir John (ed.): *Political India, 1832-1932*, London (1932)

Cunningham, Sir H. H.: *Earl Canning*, Oxford (1897)

Darling, M. L.: *The Punjab Peasantry in Prosperity and Debt*, Oxford (1925)

Durand, H. M.: *Life of Sir H. M. Durand*, 2 vols., London (1883)

Encyclopaedia Britannica, 11th Ed., Vol. XIII, Cambridge (1910)

English Visitors, Two: *Impressions of Two English Visitors to the Indian National Congress at Allahabad, 1888*, London (1889)

Escott, T. H. S.: *Pillars of the Empire*, London (1872)

Franklin, F.: *History of the Reign of Shah Aulum*, London (1929)

Farquhar, J. N.: *Modern Religious Movements in India*, New York (1918)

Forrest, G. W.
Life of Clive, 2 vols., London (1918)
The Administration of Lord Lansdowne, Calcutta (1894)

Fraser, Lovat: *India under Curzon and After*, London (1911)

Gadgil, D. R.: *Industrial Evolution in India*, London (1924)

Ganesh & Co.: *Indian Nation Builders*, 3 parts, Madras (1912)

Garth, Sir R.: *A Few Plain Truths about India*, London (1888)

Ghar ka Bhedi (pseud.): *Akhbar-nawison ke Asrar*, an exposure of the dishonest methods adopted by so-called editors of certain vernacular newspapers, Lahore (1902)

Grahame Bailey, T. A.: *A History of Urdu Literature*, London (1932)

Griswold, H. D.: *Mirza Ghulam Ahmed*, Ludhiana (1902)

Hindu, A (pseud.): *The Mutinies and the People or A Statement of Native Fidelity during the Outbreak of 1857-58*, Calcutta (1905)

Holmes, T. R.: *History of the Indian Mutiny*, London (1898)

Howell, A.: *Education in British India prior to 1854 and in 1870-1*, Calcutta (1872)

Hughes, T. P.: *A Dictionary of Islam*, London (1895)

Hunter, Sir W. W.: *Life of Lord Mayo*, 2 vols., London (1876)

Husain, M. T.: *Hali, the Poet, the Critic and the Biographer and His Influence on Urdu Literature* (Ph.D. thesis in typescript), London (1934)

Islam, Hafiz Sadrul: *Remarks on India*

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

BIBLIOGRAPHY

Iyer, G. Subramania: *Some Economic Aspects of British Rule in India*

Ja'afar Sharif: *Quanoon-e-Islam*, the customs of the Musalmans of India, Madras (1895)

Jain, L. C.: *Indigenous Banking in India*, London (1929)

James, H. R.: *Education and Statesmanship in India, 1797-1910*, London (1911)

Jathar, G. B. and S. G. Beri: *Indian Economics*, 2 vols., Bombay (1928-9)

Jones, Bevon L.: *The People of the Mosque*, London (1932)

Jurji Zaidan: *Hayate—Sir Syed Ahmed*, a short life-sketch in Arabic, originally published in the Arabic journal, *al-Hilal* of Cairo, October 1898. Urdu translation by Muhammad Faroq Ansari, Aligarh (1903)

Kale, V. G.: *Indian Industrial and Economic Problems*, Madras (1912)

Karim, Abdul: *Muhammadan Education in Bengal*, Calcutta (1901)

Karivi, Azim: *Hindi Shairi*, an account of Hindi poetry (Urdu and Hindi text), Allahabad (1931)

Karmat Ullah: *Nazir Ahmed Dehalvi ke Lecturon ka Majmu'a'ma Mukhtasir Swarch Umri*, a collection of Nazir Ahmed's lectures with a short sketch of his life by the editor, Lahore (1890)

Kaye, Sir John and Col. G. Malleson: *History of the Indian Mutiny*, 6 vols., London (1888-89)

Keir Hardie, J.: *Speeches in Parliament on Indian Affairs*, Madras (1907)

Keynes, J. M.: *Indian Currency and Finance*, London (1913)

Khan, Syed Sirdar Ali

Lord Curzon's Administration of India—What He Promised; What He Performed, Bombay (1905)

The Unrest in India, Bombay (1907)

Khuda Buksh, S.: *Essays Indian and Islamic*, London (1912)

Kidwai, Mushir Husain: *Pan-Islamism*, London (1968)

Kohn, Hans: *A History of Nationalism in the East*, London (1929)

Krishna, K. B.: *The Problem of Minorities or Communal Representation in India*, London (1939)

Latif, Syed Abdul: *The Influence of English Literature on Urdu Literature*, London (1924)

Latifi, A.: *The Industrial Punjab*, Bombay (1911)

Law, Sir Algernon: *India under Lord Ellenborough*, London (1926)

Lillingston, F.: *The Brahmo Samaj and the Arya Samaj*, London (1901)

Lokanathan, P. S.: *Industrial Organisation in India*, London (1935)

Lovatt, Major A. C. and G. F. MacMunn: *The Armies of India*, London (1911)

Lovett, Sir Verney: *History of the Indian Nationalist Movement*, London (1919)

Lyall, Sir Alfred: *Life of the Marquis of Dufferin and Ava*, London (1905)

Lyall, C. J.: *A Sketch of the Hindustani Language*, Edinburgh (18[illegible]

Macdonald, D. B.: *Development of Muslim Theology, Jurisprudence and Constitutional Theory*, London (1903)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

RISE OF MUSLIMS IN INDIAN POLITICS

Majumdar, Bimanbihari: *History of Political Thought from Ram Mohan to Dayananda*

Manglori, Syed Tufail Ahmed: *Musalmanon ka Roshan Mustabfil*, a history of Muslim politics under the British, Badaun (1943)

Manshardt, Clifford: *The Hindu-Muslim Problem in India*, London (1936)

Masani, R. P.: *Dadabhai Naoroji*, London (1939)

McCully, B. T.: *English Education and the Origins of Indian Nationalism*, New York (1940)

Mehta, Asoka and Achyut Patwardhan: *Communal Triangle in India*, Allahabad (1942)

Mitra, K. C.: *Memoir of Dwarkanath Tagore*, Calcutta (1870)

Mitra, Peary Chandra: *Biographical Sketch of David Hume*, Calcutta (1877)

Mitra, Mahendra Chandra: *Life of Haji Muhammad Mohsin*, Calcutta (1880)

Mody, H. P.: *Sir Pherozeshah Mehta*, 2 vols., Bombay (1921)

Muhammad Husain, Mahmud: *Faryadi-i-Muslimin*, a collection of articles in the form of questions and answers on the differences between Muslim sects and other subjects affecting the welfare of the community, Amritsar (1890)

Muir, Ramsay: *The Making of British India*, Manchester (1915)

Murdoch, John: *Hindu and Muhammadan Festivals*, Madras (1904)

Natesan, G. A. (ed.)

Introduction to Indian Politics, Madras (1891)

Eminent Musalmans, Madras (1925)

Sir Syed Ahmed Khan—A Sketch of His Life and Career, Madras (?)

Nawab Mohsinul Mulk—A Sketch of His Life and Career, Madras (?)

Badruddin Tyabjee—A Sketch of His Life and Career, Madras (?)

Rahimtulla Sayani—A Sketch of His Life and Career, Madras (?)

The Rt. Hon. Syed Ameer Ali—A Sketch of His Life and Career, Madras (?)

Nawazish Ali, Syed: *Hayate—Sir Syed*, a life of Sir Syed, Lahore (1904)

Nevison, H. W.: *The New Spirit of India*, New York (1908)

Newton, Lord: *Life of Lord Lansdowne*, London (1929)

Noel, B. W.: *England and India, An Essay on the Duty of Englishmen towards the Hindus*, London (1859)

Nowrosjee, Barjorjee: *Selected Cartoons from the "Hindi Punch"* about the Indian National Congress, Bombay (1905)

O'Malley, L.S.S.

History of Bengal, Bihar and Orissa under British Rule, Calcutta (1925)

The Indian Civil Service, 1801-1930, London (1931)

Modern India and the West, London (1941)

Parekh, C. L.: *Eminent Indians on Indian Politics*, Bombay (1892)

Pillai, P. Padmanabha: *Economic Conditions in India*, London (1925)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

BIBLIOGRAPHY

Plekhanov, G. V.: *The Role of the Individual in History*, Moscow (1945)

Quadri, Syed Shamsullah: *Tarikhe-Zaban-i-Urdu*, a history of the Urdu language, Lucknow (1930)

Qazi, Muhammad Abdul Ghaffar: *Asare Jamaluddin Afghani*, a critical study of al-Afghani, Delhi (1940)

Quadir, Shaikh Abdud: *The New School of Urdu Literature*, Lahore (1898)

Rai, Lajpat: *The Arya Samaj*, London (1915)

Ratcliff, S. K.: *Sir William Wedderburn and the Indian Reform Movement*, London (1923)

Risley, Sir Herbert: *The People of India*, Calcutta (1908)

Ronaldshay, Lord
The Heart of Aryavarta, London (1925)
Life of Lord Curzon, 3 vols. (1928)

Saeed (pseud.): *The Future of the Muhammadans of Bengal*, Calcutta (1880)

Saksena, R. B.: *A History of Urdu Literature*, Allahabad (1927)

Singh, Gurmukh Nihal: *Landmarks in Indian Constitutional Development*, Banaras (1933)

Sitaramayya, B. P.: *History of the Indian National Congress*, Madras (1935)

Smith, W. C.: *Modern Islam in India*, Lahore (1940)

Smith, William Roy: *Nationalism and Reform in India*, London (1938)

Somerville, A.: *Crime and Religious Beliefs in India*, Calcutta (1931)

Spear, T. G. P.: *The Nabobs*, London (1932)

Suharwardy, Shaista Akhtar Banu: *A Critical Survey of the Development of the Urdu Novel and Short Story*, London (1945)

Sutherland, W. A.: *The British Government, the Hindus, the Muhammadans and Swaraj in India*, Madras (1907)

Talib Allahabadi: *Akbar Allahabadi*, a work on the life and writings of the Urdu poet, Allahabad (?)

Talyarkhan, D. A.: *The Riots of 1874, Their True History and Philosophy*, Bombay (1874)

Tanha, Muhammad Yahya: *Saiyarul Musanifin*, an account of the Urdu prose writers, 1798-1924, 2 vols., Delhi (1924)

Tarachand, Dr.: *Influence of Islam on Indian Culture*, Allahabad (1936)

Tawney, R. H.: *Religion and the Rise of Capitalism*

Thomas, F. W.
The History and Prospect of British Education in India, London (1891)
Mutual Influence of Muhammadans and Hindus, Cambridge (1892)

Thompson, E.
The Other Side of the Medal, London (1925)
and G. T. Garatt: *The Rise and Fulfilment of British Rule in India*, London (1934)

Times of India, reprinted from the: *The Bombay Riots of August 1893*, Bombay (1893)

Titus, Murray T.: *Indian Islam*, London (1930)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Uvais Ahmed, Adib: *Urdu ka Pahla Naval Nigar*, a critical study of the life and work of Nazir Ahmed, Allahabad (1934)
Watsi, Syed Razi: *Lord Minto and The Indian Nationalist Movement, 1905 to 1910*, Oxford (1964)
Weitbrecht: *Indian Islam and Modern Thought*
Wilson, S. G.: *Modern Movements among Muslims*, London (1915)
Wolf, L.: *Life of the First Marquis of Ripon*, 2 vols., London (1921)
Zahur Ahmed Shahjanpuri: *Sir Syed ki Swanih-Umri*, a biographical sketch, Lahore (1904)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ واساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

ارتھ شاستر

مرتب:
آچاریہ چانکیہ/
شان الحق
صفحات: 529
قیمت: -/109

بھارت 2001

مرتب:
قومی اردو کونسل
صفحات: 865
قیمت: -/250

قدیم ہندوستان کی تاریخ

مرتب:
راما شنکر ترپاٹھی
صفحات: 584
قیمت: -/114

جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانی

مرتب:
مشیر الحسن
صفحات: 358
قیمت: -/114

تاریخ تمدنِ ہند

مرتب:
پروفیسر محمد مجیب
صفحات: 279
قیمت: -/72

مغل دربار کی گروہ بندیاں اور سیاست

مرتب:
ڈاکٹر ستیش چندر/
ڈاکٹر قاسم صدیقی
صفحات: 266
قیمت: -/72

954 J 228 H

काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066